جولائی - دسمبر ۱۹۳۹

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے

سیاست کی پہلی کتاب　　قیمت　۸؍

اجتماعی زندگی کی ابتداء ۔۔۔ 〃 ۔۔۔ ۸؍

ہندوستان کا دیہی قرض ۔۔۔ 〃 ۔۔۔ ۸؍

مسئلہ آبادی ۔۔۔۔۔۔۔۔ 〃 ۔۔۔ ۸؍

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ا	جولائی ۱۹۳۹ء	جلد ۴۲

فہرست مضامین

۱- جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانان ہند کے تعلیمی مسائل — از جناب ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب

۲- روس کی جنگی قوت پر اندرونی حالات کا اثر — از ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب پی ایچ ڈی ۹

۳- قومی منصوبہ اور مکمل آزادی — از پنڈت جواہر لال نہرو صدر قومی صنعتی تنظیمی کمیٹی ۵

۴- قومی معاشی تنظیم — از جناب محمد عاقل صاحب ایم اے استاد معاشیات ۷

۵- معاشی نظم — از جناب محمد احمد صاحب سبزواری ایم اے عثمانیہ ۸

۶- ہوائی جہاز کی کہانی — " ... ۲

۷- دنیا کی رفتار — م-م ۷

۸- تنقید و تبصرہ — " ... ۱

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱- سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲- مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳- ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴- جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانان ہند کے تعلیمی مسائل

(از جناب ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

۲۔ نفس انسانی

گذشتہ[1] مضمون میں ہم مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین سے بحث کر چکے ہیں یہ نصب العین ہے عام تمدنی مظاہر اور خصوصاً اسلامی تمدنی مظاہر کے ذریعہ نفس انسانی کی امکانی صلاحیتوں کی اس طرح نشو ونما کرنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صفات ربانی کے مماثل ہو جائیں۔ نصب العین کے اس تعین ہی سے ظاہر ہے کہ ذرائع تعلیم میں ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم نفس انسانی ہے کیونکہ بغیر نفس انسانی کے تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک مظاہر فطرت جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں اور مظاہر تمدن جن کی انسان خود تخلیق کرتا ہے، ضروری ہیں لیکن بہر صورت یہ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور نفس انسانی کی تعمیر کے سلسلہ میں یہ صرف آلہ کا کام دیتے ہیں۔

نفس انسانی کو سمجھ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے ڈانڈے نفس ربانی سے جا کر ملتے ہیں۔ مَن عَرَفَ نفسہٗ فقد عَرَفَ ربہٗ، جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا اور خدا کی حکمتوں اور دانائیوں کو سمجھنا فہم انسانی کے لئے کچھ آسان نہیں ہے۔ نفس انسانی کو سمجھ لینا در اصل زندگی اور اس کی ماہیت اصلی کو سمجھ لینا ہے اور زندگی کی اصل کو سمجھنے سے اکثر انسانی عقل عاجز رہتی ہے۔ افلاطون سے لے کر اس وقت تک برابر نفس انسانی کی تحقیقاتیں جاری ہیں لیکن ہنوز چند سطحی مظاہر سے زیادہ کا انسان پتہ نہیں چلا سکا ہے۔ یہ معمہ کبھی حل ہوگا بھی یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم نفس انسانی کے چند خاص خاص مظاہر پر نظر ڈالنے پر اکتفا کریں گے۔

---

[1] جس مضمون کی طرف اشارہ ہے وہ رسالہ جامعہ بابت اپریل سنہ ۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

انسان جمادات نباتات اور حیوانات سے ترقی کر کے موجودہ منزل پر پہنچا ہے۔ اس لئے ہنوز اس کی بنیادیں جماداتی، نباتاتی اور حیوانی عناصر پر استوار ہیں۔ ان عناصر سے وہ خود کو کم از کم اس دنیا میں تو کلیتاً آزاد نہیں کر سکتا۔ انسان کو سمجھنے کے لئے درحصل ان مختلف عالموں کے اصولوں کو بھی سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان تمام عالموں کے قوانین انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہیں انسان خلاصہ ہے دنیا کی زندگی کا۔ وہ ارتقا کا انتہائی بلند نقطہ ہے جس پر اس وقت تک دنیا پہنچ چکی ہے۔ عالم جمادات کا قانون میکانکی ہے۔ یہاں مادہ صرف دوسرے کی تحریک ہی سے حرکت کرتا ہے۔ اس میں بالذات نہ نمو کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن جب جمادات ارتقا کرکے ایک منزل آگے بڑھتے ہیں تو ان میں فطری اپج اور نمو کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہاں وہ عالم نباتات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عالم نباتات کا قانون نشو و نما ہے لیکن یہ نشو و نما بالارادہ نہیں بلکہ صرف فطری اپج کے باعث ہے۔ عالم نباتات زمین سے وابستہ ہوتا ہے اور وہ خود کو اس سے آزاد نہیں کر سکتا۔ عالم نباتات اپنے ارتقا میں ایک منزل اور آگے بڑھتا ہے تو وہ حیوانات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں وہ اب زمین کا پابند نہیں رہتا بلکہ اس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اب خود حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن یہ حرکات ہنوز جبلی ہوتی ہیں اور اس میں ارادہ بہت پایا جاتا ہے یا اگر بعض ترقی یافتہ حیوانات میں پایا بھی جاتا ہے تو بہت ہی ابتدائی قسم کا۔ پروفیسر کوہلر (برلن) نے اپنے تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ بندروں میں بھی کسی قدر ذہانت پائی جاتی ہے ذہانت اور ارادہ چاہے بہت ہی ابتدائی شکل میں حیوانوں میں بھی پایا جائے لیکن ہم انہیں صحیح معنوں میں عقل بالارادہ نہیں کہہ سکتے ان کے اکثر اعمال جبلت پر ہی مبنی ہوتے ہیں عقل اور ارادہ کا اصلی ظہور درحصل انسان ہی میں ہوتا ہے جو ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ حیوان ہے۔

لیکن انسان اپنی مابہ الامتیاز خصوصیتیں حاصل کرنے کے پہلے وہ تمام منازل ارتقا طے کر لیتا ہے جو تمام کائنات اس وقت تک طے کر چکی ہے لیکن یہ منازل ارتقا اب بہت جلد طے ہو جاتی ہیں

بہت سے مسائل تو جیسا ماہرین علم جنین ثابت کر چکے ہیں، انسان شکم مادر ہی میں طے کر لیتا ہے وہاں وہ مختلف حیوانوں کی سی زندگی گذارتا ہے اور پانی اس کا خاص ماحول ہوتا ہے جس سے انسانی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس پر ہم اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ پیدائش کے وقت سے انسان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم ان تحقیقات کے لیے عہد جدید کے محققین میں سے خاص طور پر پروفیسر ولیم اسٹرن (ہامبرگ، جرمنی)، پروفیسر جان ڈیوی (امریکہ)، پروفیسر کرشن اشٹائنر (میونخ، جرمنی)، پروفیسر اشپرانگر (برلن، جرمنی) اور پروفیسر برٹرینڈ رسل (انگلستان) کے ممنون ہیں۔

نفسیاتی اعتبار سے ہم انسانی زندگی کو مندرجہ ذیل مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان کی نفسی زندگی کا سانچہ وہی ہو جو ہم پیش کر رہے ہیں بعض انسانوں میں نفسی ارتقا جلد ہوتا ہے اور بعض میں دیر سے۔ بعض میں پختگی بہت جلد آجاتی ہے لیکن وہ مرجھا بھی جلد جاتے ہیں بعض میں عدم صلاحیت کے باعث یا مناسب ماحول نہ میسر ہونے کے باعث اُن چند صلاحیتوں کا اظہار ہی نہیں ہوتا جن کا ہم ذکر کریں گے۔ غرضکہ نفسی زندگی انفرادیت کا جامہ زیب تن کئے رہتی ہے جو بہت ہی مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ تاہم اس انفرادیت میں سے جو کچھ بھی عام قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور ان کو انسانی زندگی کے مختلف عہدوں سے وابستہ کیا جا سکتا ہے اس کو پیش کرنے کی ہم ذیل میں کوشش کریں گے۔ انسانی زندگی کے مختلف ادوار مندرجہ ذیل ہیں۔

عمر	نوعیت اعمال	غالب نفسی عنصر
۱۔ شروع کے دو برس	عہد شیرخوارگی یا جبلتوں کا عہد	(جبلت)
۲۔ تین برس سے ۷ برس تک	طفولیت یعنی کھیل کود یا بلا مقصد صلاحیتوں کی نمو کا عہد	(خواہش)
۳۔ ۷ برس سے ۱۴ برس تک	عنفوانِ شباب یعنی بالارادہ افعال کا عہد	(جذبات)
۴۔ ۱۴ برس سے ۲۵ تک	عہد شباب یعنی رجحانات کی نشو و نما کا عہد	(رجحانات)

۵۔ ۲۵ برس سے ۴۰ تک آدمیت یعنی ارادہ وعقل کی نشو ونما کا عہد (ارادہ وعقل)

۶۔ ۴۰ برس سے موت تک پختگی یعنی روحانی احساس کی نشو ونما کا عہد (روحانیت)

انسانی زندگی کے ان چھ ادوار کے خصائص پر ہم ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔عہد شیر خوارگی | شیر خوارگی کا عہد عموماً بچہ کے شروع کے دو سال رہتا ہے۔ بچہ کے تمام اعمال اس عہد میں صرف جبلت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کا بچہ کو کوئی شعور نہیں ہوتا۔ اس وقت اس میں کسی قسم کی ذاتی قوت ارادی بھی نہیں پائی جاتی صرف جبلت ہی اس کو اکسانی رہتی ہے اس عہد میں خارجی تاثرات بچہ پر بہت مرتب ہوتے ہیں۔ خارجی تاثرات سے اثر پذیری کے باعث اس وقت بچہ میں کسی قسم کا رجحان نہیں پیدا ہوتا۔ چیزوں کی قدر کا احساس بچہ میں پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ صرف مادی اور لذتی قدور ہوتی ہیں۔ مثلاً بھوک و پیاس، گرمی اور روشنی کی ضرورت، ہمدردی اور نفرت کے باعث چیزوں میں ایک قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عہد دراصل ایک قسم کا حیوانی عہد ہوتا ہے جس میں صرف جبلی ضرورتوں کا غلبہ ہوتا ہے اس عہد کی خصوصیت غرضکہ جبلی طور پر اعمال کا صادر ہوتا ہے بچہ کی جبلتوں کو اس عہد میں روکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان کو اظہار کا خوب موقعہ دینا چاہیئے، مثلاً اسے خوب حرکت کرنے دینا چاہیئے اس عہد کی نفسیات پر سب سے جامع تحقیقات ولیم اسٹرن نے اپنی کتاب بچہ کی نفسیات میں پیش کی ہیں۔

۲۔عہد طفولیت | بچپن کا یہ عہد ۲ برس سے عموماً ۸ برس تک رہتا ہے بچہ کو اس عہد میں کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے تمام کام اس وقت بلا ارادہ اور بلا مقصد ہوتے ہیں۔ اس وقت بچہ کی جبلتیں ہزاروں طریقہ پر خارجی تاثرات سے گھل مل جاتی ہیں اس وقت بچہ میں اس قسم کی سینکڑوں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں جو اس کی حیوانی اور جبلی قدور پر مبنی ہوتی ہیں۔ بچہ کی زندگی پر انہیں خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اور صرف انھیں خواہشات کے ذریعہ اس کی خوابیدہ زندگی کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ کچھ کچھ اب قوت ارادی کا بھی اظہار شروع ہوتا ہے لیکن اس کا مقصد ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی مطلوبہ خواہشوں کو پورا کیا جائے، کسی خاص خواہش پر بچہ اپنی توجہ کو مرکوز نہیں کر سکتا بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے۔ صرف خارجی تاثرات

کے باعث ہی یہ توجہ بدلتی نہیں رہتی ہے بلکہ داخلی طور پر بھی بچہ میں بڑا انقلاب ہوتا رہتا ہے جس کے باعث اس کی خواہشوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تصورات کے ان تغیرات کے باعث بچہ ہمیشہ بہت ہی مختلف کھیلوں کا طالب ہوتا ہے وہ ایک غیر محدود خیالی دنیا میں زندگی گذارتا ہے جس میں کسی قسم کی وحدت نہیں پائی جاتی۔ اس کے تمام اعمال کا محرک کوئی خاص اعلیٰ تصور نہیں ہوتا۔ یعنی اس کا کوئی خاص ارادہ یا مقصد یا تصور نہیں ہوتا۔ وہ انھیں افعال کو قابل قدر سمجھتا ہے جو اس کی جبلت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ قدر عمل سے کلیتاً وابستہ ہوتی ہے اور بالآخر وہ لامحدود اشیا بھی جو عمل کا ذریعہ ہوتی ہیں بچہ کے لئے ایک قدر ہو جاتی ہیں۔

لیکن بچہ میں بہت جلد مقصد کا شعور بھی پیدا ہو جاتا ہے عمل کے ذریعہ بچہ میں کارکردگی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اب عمل صرف عمل کی خاطر نہیں بلکہ کارکردگی کی صلاحیت پیدا کرنے کی خاطر کرتا ہے۔ بچہ کو اب یہ علم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خود محرک ہے اور اسے اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ مقصد حاصل کرنے کے لئے خود کارکردگی کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے اب اس کے اعمال بالذات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے انجام دئے جاتے ہیں لیکن یہ مقصد ہمیشہ ایک خواہش کو پورا کرنا ہوتا ہے اور یہ خواہش ہمیشہ ایک مادی لذت یا مسرت ہوتی ہے۔ بچوں کے کھیلوں میں بھی اب تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اب ایک قانون اور نظام کے تحت میں آجاتے ہیں۔ اس عہد کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بچہ کے مندرجہ ذیل اعمال کا مطالعہ کرنا چاہئے مختلف کھیل کسی چیز کو پیش کرنے کے خیال سے نقوش اتارنا زیت میں بغیر کسی مقصد کے چیزیں بنانا، واہمہ کے مطابق چیزیں بنانا، مقصد کو پیش نظر رکھ کر چیزیں بنانا، بڑی احتیاط کے ساتھ ایک مقصد کے مطابق چیزیں بنانا، بغیر کسی مقصد کے کودنا، اچھلنا، ناچنا وغیرہ۔ بچہ اب اس کا خیال نہیں کرتا کہ وہ کیا کرتا ہے بلکہ اس کا بھی کہ وہ کس طرح کرتا ہے۔ وہ اپنے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے مہارت کو بھی ایک ذریعہ خیال کرتا ہے۔ لیکن اس وقت تک بچہ صرف اس قسم کے مقاصد تعین کرتا ہے جو بہت قریبی ہوں اور جو بہت جلد حاصل کئے جائیں لیکن آہستہ آہستہ جسمانی

اور نفسی ترقی کے ساتھ وہ بعید تر مقاصد بھی متعین کرنا شروع کرتا ہے۔ اب وہ ان بعید مقاصد کے حصول کے ذریعوں کی بھی ایک قدر تسلیم کرتا ہے۔

۲۔ عہد عنفوان شباب | عنفوان شباب عہد شباب کا پہلا دور ہے شباب کا عہد زندگی کی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں کا عہد ہے۔ یہاں زندگی بجلی کی طرح کوندتی، بادل کی طرح کڑکتی اور بارش کی طرح برستی ہے۔ طرح طرح کے ہزارہا خودرو پھول باغ ہستی میں اگ جاتے ہیں اور کائنات کی فضا ان کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے عہد طفولیت کی معصومیت کی جگہ شباب کی نیرنگیاں لیتی ہیں۔ یہ طوفان دبلا کا ایک دور ہوتا ہے جس میں نفس انسانی کی ہزارہا کشتیاں غرق ہو جاتی ہیں اور جو بچ کے نکل آتی ہیں وہ اکثر سکون و استقلال سے سفر کے بقایا مراحل طے کر کے ساحل مراد تک پہنچ جاتی ہیں۔ نفسی اعتبار سے یہ عہد سب سے زیادہ قابل مطالعہ ہے۔ یہاں جو تنوع، جدت، اپج، جوش نمو، اور فطری ترنگ پائی جاتی ہے اس کا پتہ دوسری جگہ نہیں ملتا۔ عہد طفولیت میں اکثر بے رنگی ہوتی ہے تو عہد آدمیت میں جذبات میں سکون کے باعث یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر زندگی کی رنگا رنگی دیکھنا چاہو تو وہ صرف عہد شباب کے شب و روز ہی میں دکھائی دے سکتی ہے۔

اس عہد میں ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو مقاصد پر مبنی ہوتی ہیں اور جو ایک عرصہ تک قائم بھی رہتی ہیں۔ عہد طفولیت میں جن قدروں کا تجربہ کیا گیا تھا اور جو کلیتاً حیوانی اور جبلی تھیں، اب ان کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عملی مقاصد مثلاً اشیا کا فراہم کرنا، مکان، راستہ اور مدرسہ کے لئے مختلف اسباب مہیا کرنا، واقعات کو تمثیل کے ذریعہ پیش کرنا، پڑھی ہوئی چیزوں کو ناٹک کے ذریعہ پیش کرنا وغیرہ کا اس وقت تک استعمال کیا جاتا ہے جس وقت تک کہ وہ اس عہد میں مقررہ مقاصد کے حصول میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے دوران میں اس طرح مشق کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب مہارت، فنی صلاحیت، استقلال، ضبط نفس، محنت، صبر، اور اطاعت کو نوجوان قابل قدر عناصر تصور کرتا ہے بلکہ وہ بالذات مقاصد بھی تصور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح قوت ارادی اخلاقی نشو و نما کی مدد کرتی ہے اور وہ اخلاقی ذریعوں میں شوق پیدا کر دیتا

ہے یہ دو قسم کا ہوتا ہے ۔

(الف) شعوری اثباتِ ذات

(ب) شعوری نفیِ ذات

اس کے متعلق جان ڈیوی کہتا ہے کہ "جب لڑکا جان بوجھ کر اپنے کام کا مقصد متعین کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے مقاصد کے ساتھ منسوب کرنا چاہتا ہے اور ان کو دوسروں کے مقاصد سے جدا کرنا چاہتا ہے ۔ اس طرح دوسرے سے تضاد کا شعور انسانی نفس میں پیدا ہو جاتا ہے ۔ بلاشک اس وقت اور زیادہ جب ذاتی قوت ارادی اور اثبات ذات میں کسی قسم کی خامی ہو ۔ لیکن اپنی ذات اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب سماجی قدور کا دوستی یا خاندان میں عملاً تجربہ کیا جائے ۔ اس تجربہ قدر کے باعث خاندان اور دوستی کے مقاصد متعین کئے جاتے ہیں جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بچہ خود کو ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور جس حد تک سماجی قدور کا صحیح تجربہ کیا جا سکتا ہے اسی حد تک تجربہ شدہ قدر کے لئے انسان اپنی ذات پر قبضہ حاصل کرتا ہے ۔"

لیکن اس زمانہ میں تمام جسم اور نفس کی نشو و نما فطری اپج کے باعث زیادہ ہوتی ہے ۔ خارجی تاثرات کے مقابلہ میں اثر پذیری کا بھی بہت زیادہ مادہ ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں اسی سلئے بہت سی مختلف قسم کی چیزوں سے مشغولیت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے ذریعہ قدور کا اظہار کیا جا سکے جن مقاصد کے حصول کے لئے ایک زمانہ دراز درکار ہوتا ہے وہ اس وقت ممکن نہیں ہوتے ۔ اشیا کی قدر پر اس عہد میں غور و فکر نہیں کیا جاتا بلکہ اشیا اور ان کے افعال کو ماحول کے معیار پر جانچا جاتا ہے ۔ اصولوں کی بنا پر اس وقت تک اعمال سرزد نہیں ہوتے کیونکہ اس کے لئے تو زبردست قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس وقت مفقود ہوتی ہے ۔

ارادے کے برخلاف عقل اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ مقصد اور ذرائع کے تعلقات متعین کرتی ہے ۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیت کی کارکردگی کی بھی جانچ کرتی ہے ۔ مقاصد کے حصول

کے دوران میں ذاتی امتحان کے بہت سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ ہم اس پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس دور کے آخر میں لازماً افراد میں نظری رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ طالب العلم اپنے مقاصد کے لئے نظری قوانین بناتا ہے یہ نظری رجحان لیکن کلی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق صرف خاص چیزوں سے ہوتا ہے۔ عام طور پر اس عہد میں رجحان عملی جسمانی جدوجہد اور اس کے لئے مفید ذریعوں کی طرف ہوتا ہے۔ طالب العلم کے لئے وہ تمام مقاصد قابل قبول ہوتے ہیں جن کے حصول میں نہ صرف وہ معلومات بلکہ جسمانی مہارتیں بھی حاصل کرتا ہے اور خارجی حواس کے کاموں کے ذریعہ وہ خود اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے۔ جن مدرسوں میں جسمانی کام بھی داخل کر دیا گیا ہے وہاں اس رجحان کا بہت زیادہ پتہ چلتا ہے۔ یہاں طالب العلم بہت شوق سے اپنا کام انجام دیتے ہیں لیکن ذاتی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں دوسرے افراد اور ماحول کا بھی قوی شعور موجود ہوتا ہے۔

۴۔ عہد شباب | جوانی کا یہ عہد عموماً ۱۴ برس سے لے کر ۲۵ برس تک رہتا ہے۔ اس عہد میں کام سے زیادہ دلچسپی بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی اسی قدر زیادہ بڑھتی ہے جس قدر کہ اس کے قبل کا دور ایک موزوں ماحول میں گذر چکا ہو۔ نوجوان کو اب یہ احساس شروع ہوتا ہے کہ وہ قدر کا حامل ہے۔ اس کو اپنے علیحدہ وجود اور علیحدہ قدر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ قدر کا ایک قوی احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ماحول، چیزوں اور افراد کی تنقید کرے۔ اس کے مقاصد اب ہمہ گیر ہونا شروع ہوتے ہیں اور زبردست سماجی احساس پیدا ہو جاتا ہے اپنے خاندان اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ وہ زیادہ وابستگی محسوس کرتا ہے۔ نفسی ارتقا اس زمانہ میں بہت کافی ہوتا ہے اور نفسی قدور کا تجربہ اب نفسی ذرائع سے کیا جاتا ہے۔ اشیا میں اب بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اشیا خود نئے نئے نفسی تجربات کا باعث ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں ان کے تمام افعال ایک واحد مقصد کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ بہت سے مختلف مقاصد بیک وقت پیدا ہوتے ہیں جہاں نوجوانوں کو تربیت ادنیٰ درجہ کے ماحول میں ہوتی ہے وہاں اسے

صرف حسی اور عام طور پر صرف مادی مقاصد ہی سے دلچسپی ہوتی ہے۔

اس عہد کے پہلے دور میں نوجوانوں کی توجہ صرف عملی کاموں کی طرف ہوتی ہے اور ہر جگہ وہ اثباتِ ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔ ذاتی جذبہ کا اس پر تسلط پایا جاتا ہے بمعروضی احساس میں اس وقت بڑی خامی ہوتی ہے۔ اکثر چیزوں کو موضوعی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے بہت سی اشیا کو ان کی قدر کے اعتبار سے یا تو قبول کر لیا جاتا ہے یا رد کر دیا جاتا ہے مروجہ قدر کی اکثر مخالفت کی جاتی ہے کیونکہ ذاتی خیالات اکثر سماج کے مطالبات کے مخالف ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تعلیم ایک صحیح تعلیمی ماحول میں ہوتی ہے وہاں ہمہ گیر نفسی اشیا نوجوانوں کی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ مثلاً دوستی، اخوت، شہرت، عزت، آزادی، اخلاق فرض، مادر وطن، جمعیتِ قومی، خدا وغیرہ کے تصورات نوجوانوں کی زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جہاں نفسی زندگی ماحول سے بہت زیادہ وابستہ ہوتی ہے وہاں حسی قدور مثلاً لذت، ملکیت، طاقت اور قوت نوجوان کی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ پہلے فریق کے بہترین لوگ نفی ذات اور ایثار کو اپنا اعلیٰ ترین مطمح نظر سمجھتے ہیں اور دوسرے فریق کے اکثر لوگ جسمانی لذت، مسرت، جسمانی طاقت اور دوسروں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تعلیم اچھے ماحول میں ہوتی ہے وہاں خاص خاص نفسی رجحانات کی نشو و نما ہو جاتی ہے لیکن یہ اسی وقت ہوتی ہے جب نوجوانوں میں اس کی امکانی صلاحیت بھی موجود ہو۔ افراد کے مقاصد اور قدور کے اختلافات کا اب پتہ چلنے لگتا ہے۔

خارجی تعلیم کی زبردست طاقت اب ختم ہو جاتی ہے۔ ذاتی متعین شدہ مقاصد کے ذریعہ اب تعلیم کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعلیمی اعمال کو اب خود متعین کیا جاتا ہے اور خود اختیاری کا پھر تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اگر خاص صلاحیت کے باعث نوجوان کو اپنے اصلی پیشہ کا خود بخود پتہ نہیں چلتا تو وہ اپنی داخلی صلاحیت کے پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں نوجوان کو اپنی داخلی صلاحیتوں کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ انہیں کی مناسبت سے اپنے پیشہ کا بھی انتخاب کر لیتا ہے

اور اس میں اس کا دل بھی لگ جاتا ہے وہاں نوجوان کو اپنے پیشہ کا ایک نصب العین بھی ہاتھ لگ جاتا ہے اور اب اس کے تمام اعمال اس نصب العین کے تحت آجاتے ہیں۔ اب وہ اپنا کام صرف کام کی خاطر انجام دینے لگتا ہے لیکن اس قسم کی نشو ونما صرف ایک قلیل اقلیت ہی کی ہوتی ہے اکثر نوجوان جنھیں اوائل زندگی ہی میں مجبوری کے باعث کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا جس سے انھیں داخلی طور پر کوئی مناسبت نہ تھی اس قسم کی نشو ونما سے بالکل محروم رہتے ہیں۔

ہم نے انسانی زندگی کے چار ادوار کے خصائص مختصراً بیان کر دیے یہ تصویر کرشن اشٹائنر سے ماخوذ ہے جو اس نے اپنی مشہور کتاب "نظریہ تعلیم" میں پیش کی ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں غیر یقینی اور قابل سوال ہیں لیکن ایسے بہت سے مستحکم نقطے بھی موجود ہیں جن پر شک نہیں کیا جاسکتا لیکن اس امر پر ہم پھر زور دینا چاہتے ہیں کہ نفس انسانی اپنی مختلف سمتوں میں بیک وقت ترقی نہیں کرتا۔ بسا اوقات نفس انسانی کا ایک پہلو بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرا پیچھے رہ جاتا ہے۔ انسان کا ماحول بھی مختلف قسم کا ہوتا ہے جو انسان پر بہت ہی مختلف تاثرات مرتب کرتا ہے اور طالب العلم کی تعلیمی صلاحیت بھی بہت ہی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔

اس وقت ہم نے انسانی زندگی کے جن دوروں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق مدرسہ کی تعلیم سے ہے۔ اس میں سے عہد شیر خوارگی اور بچپن کے چند برس کو علیحدہ کر دینا چاہیئے، جو بچہ ماں کی گود یا گھر میں اپنی ماں کے ساتھ بہت مربوط زندگی گذارتا ہے۔ ان ادوار میں اور اس کے بعد لڑکپن اور جوانی میں بھی انسان بہت کچھ دوسروں کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ وہ دوسروں سے علم حاصل کرتا ہے، وہ دوسروں کے خیالات جذب کرتا ہے، وہ دوسرے لوگوں کو بحیثیت نصب العین اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اثر پذیری کا زمانہ ہوتا ہے اور اسی لئے صحیح معنوں میں تعلیم کا زمانہ ہے۔ تقریباً ۲۵ برس میں انسان کے مدرسہ کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسانی تعلیم کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ دوسروں پر نہیں بلکہ کلیتاً اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم ان ادوار کا کچھ ذکر کریں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نفسیات کے بیان کردہ علم کی روشنی میں ہم

ان چند تعلیمی اصول بیان کر دیں۔

۔ اصول پابندی ماحول | انسان کو اپنے ماحول سے یکایک علیحدہ نہیں ہونا چاہیئے اس سے اس کے
سی توازن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ پستالوزی ماحول کی اس پابندی پر بہت زور دیتا تھا۔ اس کا خیال
ا کہ اگر انسان اپنے ماحول کا پابند نہ رہے تو اس کی صحیح تعلیم ہی نہیں ہو سکتی۔ جدید ماحول سے
طابقت کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے وہ اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا
ر قدیم ماحول سے وابستہ رہنے سے جو خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے
س کا یہ مفہوم نہیں کہ ہندوؤں کی ذات پات کی طرح بہر حال و بہر صورت نسلاً در نسلاً ایک ہی
بائی پیشہ اختیار کرنا چاہیئے لیکن ایک پیشہ کی جگہ دوسرے پیشہ کو بہت ہی احتیاط سے اختیا
رنا چاہیئے اور وہ بھی جب انسان اس کی فطری صلاحیت رکھتا ہو۔ دوسرا پیشہ اختیار کرنے سے
نسان کا پورا ماحول بدل جاتا ہے جس کا اثر انسان کی پوری نفسی زندگی پر مرتب ہوتا ہے وہ
اہے معاشی ہو یا اخلاقی۔

۔ اصول آزادی | دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر نفسی دور کے خصائص کے مطابق
ذارنی چاہیئے یعنی اگر عہد شیر خوارگی کی اصل خصوصیت جبلتیں ہیں اور ان جبلتوں کے باعث ہی
چہ کے تمام اعمال سرزد ہوتے ہیں تو ان جبلتوں کے اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیئے
لکہ انھیں اظہار کا خوب موقعہ دینا چاہیئے۔ بچپن کے عہد کی خصوصیت کھیل کود ہے اس لئے
چہ کے کھیل کود کے لئے بہت اسباب مہیا کرنا چاہیئے۔ آئندہ کی تربیت یا تعلیم کے خیال سے
چہ کی فطری اپج میں مزاحمت نہ پیدا کرنی چاہیئے لڑکپن میں عموماً لڑکے جذبات سے معمور ہوتے
یں۔ اس جذباتی زندگی کے اظہار کا انھیں موقعہ ملنا چاہیئے۔ البتہ ان جذبات کو خاص خاص سمت
یں موڑا جا سکتا ہے۔ جوانی کا زمانہ انسان کے رجحانات کی تربیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ بہتر ہے
ہ نوجوان اپنے ارادے اور عقل سے کوئی کام کر کے ناکامیاب ہو جائے اس کے کہ اسے غلطی
رنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ غلطی کر کے انسان پھر سنبھل سکتا ہے تاہم اس طرح اس کی قوت ارادی

عقل اور دیگر رجحانات کی تربیت ہوتی ہے لیکن جو کبھی خود کوئی ارادہ ہی نہیں کرتا اس کے رجحانات کی تربیت ہی نہیں ہو سکتی۔

غرضکہ انسانی زندگی کے ہر نفسی دور میں انسان کو پورا پورا حصہ لینا چاہیئے۔ انسان کو بچپن میں بچہ کی طرح، لڑکپن میں لڑکے کی طرح اور جوانی میں جوان کی طرح زندگی گذارنی چاہیئے ورنہ اس کی زندگی میں خامی رہ جائے گی اور وہ نشو دنما کی آئندہ منزل کے لیئے ناکافی مستحکم نہ ہوگا۔ جو معلمین لڑکوں میں جب کہ وہ خواہشات سے لبریز ہوتے ہیں ضرورت سے زائد عقل پیدا کرنا چاہتے ہیں اکثر ان کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں فطری صلاحیت کے خلاف عمل کرنے کا نتیجہ اکثر رد عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور لڑکا پھر کسی بھی قابل نہیں رہتا۔ غرضکہ ہر عہد کی بنیادی نفسی صلاحیتوں کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے یعنی جبلتوں، خواہشوں جذبات ارادوں اور عقل کو اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ ایک نفسی عہد سے دوسرے عہد میں انسان کو یکایک داخل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ یہ داخلہ تدریجی ہونا چاہیئے اور وہ بھی اس وقت جب پہلے عہد کی مکمل نفسی زندگی گذاری جاچکی ہو۔ بغیر اس فطری اصول کی پابندی کے صحیح تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

<u>۳۔ اصول کلیت</u> نفس انسان ایک وحدت ہے۔ وہ ایک کل ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ نفس انسانی کے ہم علیحدہ علیحدہ ٹکڑے نہیں کر سکتے۔ جذبہ، ارادہ، عقل وغیرہ کلیتاً علیحدہ نہیں ہیں بلکہ وہ شعور انسانی کے مختلف شعبے ہیں۔ نفس انسانی کی یہ سہ گونہ تقسیم فلاطون کی وقت سے برابر چلی آرہی ہے لیکن اکثر عقلی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور نفس انسانی کے دوسرے شعبوں کو عقل کے ماتحت قرار دیا گیا ہے لیکن نفس انسانی کی کلیت کا جو تصور آج کل ہے اس سے قبل موجود نہ تھا۔ ہرسرل نے شعور کو ایک وحدت قرار دیا اور علم کی بنیاد ایک وحدانی عمل کو قرار دیا جو بیک وقت شعور انسانی سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن ہوسرل خود کو عقلیت سے کلیتاً آزاد نہ کر سکا۔ فرائڈ نے نفس انسانی کی اصل خواہشات جنسی کو قرار

دیا۔ آڈلر نے اس کے برخلاف طاقت کے جذبہ کو۔ برگساں نے وجدان کو۔ اشپرانگر نے نفس انسان کو چھ شعبوں یعنی سیاسی، معاشی، سماجی، علمی، جمالی اور مذہبی میں تقسیم کیا لیکن بنیادی جذبہ مذہبی قرار دیا۔ ان محققین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ نفس انسانی کی بنیاد کیا ہے لیکن اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے کہ نفس ایک وحدت اور کل ہے اور دوسرے تمام شعبے اس بنیادی شعور (شعور سے یہاں مراد صرف عقلی شعور نہیں ہے بلکہ نفسی کلی شعور ہے) کے مظاہر ہیں۔ نفسیات کی اس بنیادی حقیقت سے یہ تعلیمی اصول مرتب ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تربیت کلی طور پر ہونی چاہیئے۔ ہم عقل کی تربیت کے لئے جذبہ یا ارادے کو قربان نہیں کر سکتے۔ ولیم اسٹرن تو اپنی تحقیقات میں سب سے آگے ہے۔ وہ نہ صرف نفس انسانی کی وحدت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ انسان کی نفسی اور مادی پہلو میں بھی کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ اسی لئے وہ نفسی قوی اور جسمانی قوی کی تفریق سے انکار کر دیتا ہے اور ان کو شخصیت کے دو پہلو قرار دیتا ہے جو بیک وقت نفسی اور جسمانی دونوں ہیں۔ اس کے نزدیک نفس اور جسم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بلکہ وہ صرف شخصیت کے دو پہلو ہیں نفس باطنی پہلو ہے اور جسمانی ظاہری اور یہ بھی ایک دوسرے سے کلیتاً مخلوط۔ اسی بنا پر اسٹرن کے لئے تعلیم ایک وحدانی عمل ہے جس میں نفسی اور جسمانی تعلیم لازماً شریک ہے۔

۴۔ اصول تخلیق: سب سے آخری مگر سب سے اہم نفسی مظہر تخلیق ہے۔ اسی بنا پر تعلیم میں اصول تخلیق سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ جمادات حرکت کے خارجی محرکات کی محتاج ہیں، نباتات میں فطری نمو کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ بھی زمین کی پابند ہیں۔ حیوانات خود بخود حرکت کرتے ہیں لیکن یہ حرکات جبلی ہوتی ہیں، صرف انسان ہی میں آ کر ایک آزاد ارادہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد خود متعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع تلاش کرتا ہے ان ذریعوں سے وہ مقاصد کو حاصل کرنے کی جد و جہد کرتا ہے۔ دوران سفر میں عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرضکہ انسان کی حرمت صرف اسی لئے ہے کہ وہ ایک آزاد اخلاقی

شخصیت ہے۔ وہ خلاق ہے، فعال ہے، تعلیم میں جس حد تک انسان کی اس بنیادی صفت کا اظہار ہوگا اسی حد تک وہ زیادہ کامیاب ہوگی۔ اثر پذیری کی بجائے اثر اندازی اس کا مقصد ہونا چاہیے، انفعالی کی بجائے فعالی خاص اس کا وصف ہونا چاہیے۔ تعلیم کے ذریعہ کوشش کرنی چاہیئے کہ انسان تدریجاً خارجی تاثرات سے آزاد ہو جائے۔ وہ خود اپنے مقاصد متعین کرے اور ان مقاصد کو خارجی تاثرات سے لاپرواہ ہو کر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

(اقبال)

اپنی دنیا آپ بسانا ہی زندگی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اور تعلیم سوائے اس کے اور کیا ہے کہ وہ زندگی کی توتوں کو سمجھے، انھیں بیدار کرے، انھیں نشو ونما دے، اور انھیں ایک اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرے۔ زندگی بالذات تخلیق ہے اسی لئے انسانی زندگی میں تخلیق سب سے زیادہ ہمہ گیر اور فعال عنصر ہے چاہے وہ مادی ہو یا نفسی۔ تعلیم کو اسی بنیادی نفسی اصول کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اسی بنا پر تعلیم تعلیم ہی نہیں ہے اگر وہ تخلیق نہیں ہے یعنی اگر طلبا میں تخلیق کا مادہ پیدا نہیں کرتی ہے۔ تعلیم میں اصول تحکم اسی بنا پر کچھ کارآمد چیز نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کی تمام ذاتی اپج، اور جوش نمو کو ختم کر دیتا ہے۔ البتہ محبت اور توجہ کے ساتھ انسانی فطرت کے امنڈتے ہوئے دریا کو مختلف کھیتوں کی طرف موڑ دینا تاکہ وہ سیراب ہو جائیں معلم کا ایک اہم ترین فرض ہے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب معلم خود زندگی کے تخلیقی قوانین سے واقف ہو اور خود ان کا مظہر بھی ہو۔

ان چاروں ادوار کے ساتھ صحیح معنوں میں تعلیم کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے گر ہم انسانی زندگی کے بقایا دو ادوار کا بھی ذکر کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ بغیر اس کے ہم ان ادوار کی ماہیت اصلی کا پتہ نہیں چلا سکتے اور نہ نفس انسانی پر پوری روشنی پڑ سکتی ہے۔

۵۔ عہد آدمیت | عہد آدمیت تقریباً ۲۵ برس سے شروع ہو کر چالیس برس تک رہتا ہے۔ اس عہد

ں محدود معنوں میں تعلیم یعنی مدرسہ کی تعلیم کا دور ختم ہو جاتا ہے اور ذاتی تعلیم کا دور شروع ہوتا ہے۔
جذبات کی جو فراوانی جوانی میں ہوتی ہے وہ کم ہو جاتی ہے ان میں سکون پیدا ہو جاتا ہے
نسان کی توجہ اب بہت سی مختلف چیزوں کی طرف نہیں ہوتی بلکہ وہ اب کسی ایک کام میں لگ
تا ہے جذبات کی کمی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان میں جذبات بالکل مفقود ہو جاتے ہیں بلکہ وہ
ب کسی ایک یا چند چیزوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں جوانی میں جذبات میں سطحیت ہوتی ہے
ں ان میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے انسانی نفس اب شور مچانے والے نالوں اور ندیوں جیسا
یں رہتا بلکہ پرسکون دریا کی طرح ہو جاتا ہے جس پر زندگی کی کشتی زیادہ پرامن طریقہ پر اپنا سفر طے کرتی ہے۔
قوت ارادی اس وقت جوانی سے بہت زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی ارادی
ت کو بہت ہی مختلف کاموں میں منتشر نہیں کرتا بلکہ ان کو چند مقاصد کے حصول کے لئے
ز کرتا ہے۔ انسانی قوت ارادی کے جتنے عظیم الشان مظاہر ہیں وہ تقریباً اسی عہد سے
ق رکھتے ہیں۔ اس عہد میں انسان تخیلات کی دنیا سے زائد واقعات کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے
لی کی خیالی دنیا کی بجائے وہ اب حقیقت کی دنیا میں رہنا چاہتا ہے یہ تغیر مختلف نفوس میں
ں صلاحیت کے مطابق یقیناً مختلف ہوتا ہے مثلاً عسکری صلاحیت رکھنے والے اس زمانہ
ں اپنی جرأت کا بہترین مظاہرہ کرسکتے ہیں۔ اسی طرح شاعر بھی روحانیت کو چھوڑ کر اس عہد میں حقیقت
ی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔
لیکن اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت عقل کی ہمہ گیری ہے۔ عقل نفس انسانی کے
سرے شعبوں پر چھا جاتی ہے۔ انسان اپنے جذبات میں احتیاط اور اپنے ارادوں میں
ینی کو پیش نظر رکھتا ہے جن لوگوں میں عقلی صلاحیت بہت زائد ہوتی ہے وہ تو اور بھی زیادہ
ٹھتی ہے۔ مثلاً اکثر فلاسفہ نے اپنے نظامات عقل اسی عہد میں مرتب کئے۔ جوانوں کی طرح
وقت علوم کا نقطہ نظر موضوعی نہیں رہتا بلکہ معروضی ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت کو صرف اسی طرح
ا چاہتا ہے جس طرح کہ وہ ہے انسان انفرادی نفس کی رنگین عینک کو علیحدہ کر دینا چاہتا ہے

تاکہ وہ اشیا کا ان کی اصلی حالت میں مطالعہ کر سکے جس میں در اصل اسے کامیابی نہیں ہوتی۔

بدیہی اعیان کا پتہ انسان کو اسی عہد میں چلتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کیف وکم، وحدت، کثرت، نیکی، صداقت، حسن، اور اخلاق کے تصورات صرف انفرادی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی ایک مجموعی حیثیت ہے اور جو تمام انسانیت کے لئے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ یہ اعیان چونکہ تمام انسانوں میں یکساں پائے جاتے ہیں اس لئے انفرادی نہیں ہو سکتے بلکہ ماورئی انسانی ہیں۔ انفرادی نفس نے ان اعیان کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ انفرادی نفس میں وہ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ علم ریاضی خاص طور پر انسان کو ان اعیان کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ صداقت، حسن و نیکی کے اعیان چونکہ در اصل ایک ہی شعور کے مظاہر ہیں، اس لئے انسان کو ایک عمومی شعور ماننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ شعور عمومی سے ہمارا مفہوم ہیگل کی طرح صرف عقل کل نہیں ہے بلکہ نفس کل ہے جس میں عقلی عناصر کے دوش بدوش جمالی اور اخلاقی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ شعور عمومی یا نفس کلی مادہ کی پیداوار نہیں ہو سکتا کیونکہ مادہ بے حس و حرکت ہے۔ خود شعور کے باعث مادہ حرکت میں آتا ہے اس لئے وہ کس طرح ایک ایسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے جو خود فعال اور خلاق ہو شعور کی اس عام، آزاد، بارادہ، فعال و خلاق دنیا کو کانٹ اس دنیا کے مقابلہ میں جسے وہ PHENOMENA عالم مظاہرات کہتا ہے (NOUMENA) عالم ماورئی مظاہرات کہتا ہے۔ انسان کا مادی وجود "مظاہرات" سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا نفسی وجود مظاہرات سے ماورئی دنیا سے۔ انسان کی جسمانی احساسات و تاثرات "مظاہرات" سے لیکن اس کی عقل و ارادہ مظاہرات سے ماورئی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مظاہرات کی دنیا میکانکی ہے اور علت معلول کی پابند، ماورئی مظاہرات کی دنیا نامی ہے جس میں آزاد ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ کانٹ کی اس دوئی کو جرمن فلسفہ میں بہت جلد اسکے جانشین فشٹے نے مٹا دیا۔ نفس و مادہ دونوں ازلی عناصر نہیں ہیں بلکہ نفس نے اپنی تخلیقی قوت کے باعث مادہ کو اپنے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے۔ نفس کلی یا شعور عامہ دنیا کا

خالق ہے اور انفرادی نفوس اس کے مختلف مظاہرات فلسفیانہ یعنی عقلی غور وفکر کی یہ انتہائی بلندی ہے جس حد تک انسان اس عہد میں پہنچ سکا ہے لیکن باوجود اس تمام غور وفکر کے نفس انسانی کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ حقیقت کے لئے اپنے نفس میں ایک کسک اور ایک چبھن برابر محسوس کرتا ہے۔ کائنات کی گتھیاں اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ طرح طرح کے سوال اسے پیش آتے ہیں لیکن اس کی عقل ان کے جوابات دینے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ بالآخر حقیقت کو کلی طور پر سمجھنے کے لئے اس کو بے بضاعتی علم کا یقین ہو جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں ان لوگوں میں جن میں اس کی فطری صلاحیت موجود ہوتی ہے ایک نیا احساس بیدار ہونا شروع ہوتا ہے جو ان کے دل کو تسکین وتشفی دیتا ہے اور یہ روحانی احساس ہے۔ یہ روحانی احساس بہت ہی کم لوگوں میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ اکثر لوگ چوپایوں اور حیوانوں کی سی زندگی گذارتے ہیں اور اگر آگے بڑھتے بھی ہیں تو ان کی زندگی خواہشات وجذبات کی زندگی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یا اگر اور ترقی کی تو وہ اپنی خواہشات کے لئے عقل کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ خالص عقلی زندگی یعنی علوم وفنون کے لئے بھی زندگی گذار دیتے ہیں لیکن روحانی احساس کی بیداری تک جو نفسی زندگی کے ارتقا کا انتہائی نقطہ ہے بہت کم لوگوں کی رسائی ہوتی ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

روحانی احساس کی یہ بیداری عموماً چالیس برس کے لگ بھگ میں ہوتی ہے اس لئے ہم اس پر بحث انسانی زندگی کے آخری دور میں کریں گے۔

۶۔ پختگی کا عہد | چالیس برس کی عمر میں انسان کے جذبات، قوت ارادی اور عقل میں پختگی آ جاتی ہے ان تینوں قویٰ کی انتہائی ترقی انسان کو روحانیت کی سرحد پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ عقلی غور وفکر سے کس طرح انسان ایک عام شعور کے یقین تک پہنچ جاتا ہے اس کا مختصر تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں۔ اسی طرح جذبات کی گہرائی اور بلندی ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے

جس کے باعث انسان ایک ہمہ گیر روحانی وجود میں تعین کرنے لگتا ہے۔ پھر قوت ارادی کے
سے بھی انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسانی قوت ارادی ایک ہمہ گیر اعلیٰ ارادہ کا صرف ایک جز
ہے۔ غرضکہ شاعر اپنے وجدان، فلسفی اپنے عقلی غور وفکر اور عملی انسان اپنی اخلاقی بالارادہ جدوجہد
سے ایک اعلیٰ روحانی نظام پر یقین کرنے لگتا ہے۔ انسان میں روحانی صلاحیت موجود ہے
پر یہ تمام مظاہر شاہد ہیں۔ قرآن مجید میں ہے

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ

(ہم اپنی نشانیاں جہاں میں اور انسانوں میں دکھاتے ہیں تاکہ ان پر حقیقت ظاہر ہو)

آفاق اور جہاں کی نشانیوں یعنی فطرت کے مظاہر کا ادراک حواس خمسہ کے ذریعہ کیا
جاسکتا ہے۔ یہ تمام کام علوم ظاہری کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے اور فطرت کے مطالعہ کے
ذریعہ بھی انسان ایک ہمہ گیر روحانی نظام کا قائل ہوجاتا ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

لیکن اس طرح انسان ایک روحانی نظام کو تسلیم تو کرنے لگتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ نہیں
کرسکتا۔ حقیقت کے بلاواسطہ مشاہدہ کے لئے خود نفس انسانی پر غور وخوض کی ضرورت ہے

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

نفس انسانی پر غور وخوض کا آلہ خود نفس انسانی ہے۔ اس لئے اس کی تربیت وتعلیم کی بھی
ہے اسے حس باطنی بھی کہتے ہیں اسے ہم نفس انسانی یا روح بھی کہتے ہیں۔ یہ روح وہ با
جوہر ہے جو انسان کے جسم پر حاوی ہے اور وہ اس سے جس طرح چاہے کام لیتی ہے جس طرح
اعیان کا پتہ خارجی تاثرات کے باعث نہیں چلتا بلکہ خود عقل پر غور کرنے سے چلتا ہے۔
طرح نفس کو بحیثیت کلی سمجھنے کے لئے نفس انسانی پر غور وخوض کی ضرورت ہے اسی نفسی آلہ میں
فطری صلاحیت کو ابھارنے کی ضرورت پڑتی ہے جو اس میں موجود ہے۔ اس کے لئے اسے پا

وصاف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ صفائی مجاہدہ کے ذریعہ کی جاتی ہے جو نفس انسانی سے اس کی تمام مادی کثافتوں کو دور کر دیتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

روح میں یہ صفائی پاکی اور روشنی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خارجی تاثرات سے اپنے آپ کو جہاں تک ہو سکے آزاد کر لے اور خود اپنے نفس کی گہرائیوں میں غرق ہو جائے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے روح کی تربیت کے لئے دو بہت اچھی مثالیں دی ہیں ہم انھیں یہاں دہرانا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ روح ایک آئینہ کے مانند ہے جس پر مادی کثافت چھا گئی ہے قرآن مجید میں ہے

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

مجاہدہ کے ذریعہ آئینہ کے اوپر کے گرد و غبار اور زنگ کو دور کر دینا چاہیئے تاکہ وہ مصفیٰ ہو جائے اور حقیقت اعلیٰ کا نور اس میں دوبارہ جھلکنے لگے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ باطن میں غرق ہو کے حقیقت کا علم حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان زمین کھودے حتیٰ کہ زمین کے اندر سے پانی کے چشمے ابل پڑیں۔ اس کے برخلاف خارجی علوم کی مثال یہ ہے کہ کسی حوض میں باہر سے پانی آرہا ہو۔ صوفیا جو یہ کہتے ہیں کہ علوم ظاہری اصلی حقیقت کے احصا کے لئے حجاب ہو جاتے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ جب تک خارجی تاثرات سے انسان خود کو آزاد نہ کرے وہ باطنی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز ہی نہیں کر سکتا۔

انسان کا یہ باطنی پہلو انسانی روح ہے جس کی حقیقت بیان کرنا بہت دشوار ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ

روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ "عالم خلق جدا ہے اور عالم امر جدا جس چیز کے ناپ، اندازہ اور کمیت ہے اسے عالم خلق کہتے ہیں اس لئے کہ لغت میں خلق کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور آدمی کی روح کے لئے اندازہ اور کمیت نہیں۔ اسی لئے اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی

اگر اس کی تقسیم ہو سکتی تو اس کے ایک جانب کسی چیز کا علم ہوتا اور دوسری طرف جہل۔ اور یہ ایک ہی وقت میں عالم اور جاہل بھی ہوتا اور یہ باتیں محال ہیں۔ باوجودیکہ روح قسمت پذیر نہیں ہے اور مقدار کو اس میں دخل نہیں ہے۔ مگر مخلوق ہے اور پیدا کی ہوئی ہے اور جس طرح خلق پیدا کرنے کو کہتے ہیں ویسا ہی اندازہ کرنے کو کہتے ہیں پس اس لحاظ سے روح عالم خلق سے ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے عالم امر سے ہے نہ کہ عالم خلق سے۔ عالم امر ان چیزوں سے مراد ہے جن کے لئے ناپ اور اندازہ نہیں اور جن لوگوں نے روح کو قدیم سمجھا ہے غلط ہے اور جنھوں نے عرض کہا ہے وہ بھی غلطی پر ہیں کیونکہ عرض کے لئے خود قیام نہیں اور وہ دوسروں کا تابع ہوتا ہے۔ روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ فرشتوں کی جنس سے ایک جوہر ہے جس کی حقیقت جاننا مشکل ہے جو ریاضت اور مجاہدہ کرے گا اس کی پہچان خود بخود اسے حاصل ہوگی"

امام غزالی کا عالم امر اور عالم خلق کانٹ کے "عالم مظاہرات" PHENOMENA اور "عالم ماورائے مظاہرات" NOUMENA سے کس قدر مشابہ ہے۔ عالم امر اپنے ارادوں میں آزاد ہے عالم خلق محکوم و پابند ہے۔ روح انسانی کا تعلق دونوں عالموں سے ہے۔ عالم امر کے جوہر کی حیثیت سے وہ آزاد ہے اور عالم خلق کے عنصر کی حیثیت سے پابند ہے۔ یہاں انسانی روح کے تعلق جبر و اختیار کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس حد تک روح انسانی روح کلی کی جزو ہے وہ مجبور ہے لیکن چونکہ وہ روح کلی کے اختیار کا محل وقوع بھی ہے اس لئے آزاد ہے اس مسئلہ کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے دراصل روح کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے جس کا بہت کم علم انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ روح کلی ناقابل تقسیم ہے اور وہ تمام کائنات کا باطنی عنصر ہے اس لئے جو کچھ ہے وہ اسی کا مظہر ہے اور اسی کے ارادہ سے ظہور میں آیا ہے۔ اسی لئے روح کلی میں مکمل اختیار اور ارادہ پایا جاتا ہے بسیط اور ناقابل تقسیم روح کے ارادہ کا اظہار تمام عالم میں ہو رہا ہے۔

غرضکہ روح انسان ایک ملکوتی جوہر ہے اور نفس انسان کی یہ اعلیٰ ترین صلاحیت ہے

اس کی تربیت سے انسان نہ صرف عالم محسوسات پر مکمل دسترس حاصل کر لیتا ہے بلکہ عالم ملکوتی میں جا داخل ہوتا ہے۔ اس کے خارجی و باطنی قوٰی میں وہ غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا بیان حد امکان سے باہر ہے۔ جب انسان میں یہ باطنی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا و مافیہا کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ زمین و آسمان کے ملائک اسے دکھائی دیتے ہیں۔ مشرق و مغرب اس کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

رُوِیتُ لِی اَلاَرضِ مَا رَئیتَ مَشَارِقُہَا وَمغَارِبُہَا

(پس دکھائی گئی مجھ کو زمین پس دیکھا میں نے مشرق و مغرب کو)

قرآن مجید میں ہے

وَکَذٰلِكَ نُرِیٓ اِبرٰاھِیمَ مَلَکُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ

(اور اسی طرح دکھایا ہم نے ابراہیم کو عالم ملکوت زمین و آسمان کے)

آنحضرت صلعم سے کسی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ پانی پر چلتے تھے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر ان میں روحانی طاقت اور زیادہ ہوتی تو وہ ہوا پر اڑ سکتے تھے۔ جس طرح عقل کے ذریعہ مادی دنیا کی تسخیر ممکن ہے اسی طرح روح کے ذریعہ کل کائنات کی تسخیر ممکن ہے۔

غرضکہ نفس انسانی کو سمجھنا در اصل حقیقت اصل کو سمجھنا ہے۔

اِنَّ اللہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ

(اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ روح کی شکل میں ایزدی عنصر انسانی زندگی میں کارفرما ہے اور اسی کی نشوونما انتہائی زندگی کا بلند ترین مقصد ہے۔ یہ ایزدی جوہر لافانی ہے اس لئے روح انسانی کو فنا نہیں ہے۔ وہ برابر ترقی کے منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ جمادات سے اس نے نباتات کی شکل اختیار کی نباتات سے حیوانات کی حیوانات سے انسان کی اور انسان سے وہ ملائکہ میں تبدیل ہو جائے گا اور ملائکہ کے بعد بھی اس کے ارتقا کے منازل کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ دنیا

دراصل ارتقا کی راہ میں ایک منزل ہے جسے عبور کر کے انسانی روح آگے چلی جاتی ہے۔ لیکن ہم جس طرح تعلیمی اصولوں میں بیان کر چکے ہیں اگر وہ اس دنیا سے چشم پوشی کرے گا اور یہاں کی زندگی بھی اسی طرح نہ گذارے گا جس طرح اسے گذارنا چاہیئے تو روح انسانی کے ارتقا میں خامی رہ جائے گی اسی لئے روح انسانی کو دنیا میں اس طرح زندگی گذارنا چاہیئے کہ وہ ارتقا کی آئندہ منزل یعنی آخرت کے لئے تیار رہے۔ یا آئندہ منزل کے ماحول سے خود کو مطابق کر سکے۔ کمزوریوں اور خامیوں کے باعث اس کا آئندہ ارتقا رک نہ جائے اور اس کا ارتقا نباتات اور حیوانات تک ہی ہو کر نہ رہ جائے۔

ہماری ان تحقیقات سے پتہ چلا کہ انسانی تعلیم کا نصب العین کہیں خارج میں وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ باطنی طور پر خود روح انسانی میں موجود ہے۔ وہ امکانی طور پر ہر نفس انسانی میں پایا جاتا ہے اسی کا پتہ چلانا اور اسی کی نشو و نما کرنا نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی انسانی تعلیم کا اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔

فان اللہ خَلَقَ آدَمَ عَلیٰ صُوْرَتِہٖ فاعرف نفسک یا انسان تعرف ربک

(پس پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پس پہچان اپنے نفس کو اے انسان تاکہ پہچانے اپنے رب کو)

غرضکہ انسان کے بنیادی نفسی عناصر جبلتیں، خواہشات جذبات رجحانات، ارادے، عقل، اور روح (یعنی ولایت اور نبوت کی صلاحیت) ہیں اور انھیں کی بتدریج نشو و نما کے لئے نفس انسانی پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نفس انسانی چونکہ نفس اعلیٰ کا مظہر ہے جو خلاق و فعال رحمٰن و رحیم حسین و جمیل وغیرہ ہے اسی لئے یہ صلاحیتیں بھی انسانی نفس میں امکانی طور پر پائی جاتی ہیں انھیں صلاحیتوں کی نفوس انسانی اور مظاہر تمدن میں غیر محدود نشو و نما انسان کی انتہائی سعادت ہے فطری اپج، جوش نمو اور روحانی ترنگ وہ نفسیاتی بنیادیں ہیں جن پر زندگی کا قصر تعمیر کرنا انسان کا سب سے بڑا تعلیمی فریضہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

روس کی جنگی قوت پر اندرونی حالات کا اثر

(از ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب پی۔ایچ۔ڈی۔ ریڈر تاریخ یوپ ڈھاکہ یونیورسٹی)

سنہ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب ہوا۔ انقلاب کے بعد ایک عرصہ تک روسی حکومت کے ساتھ ایک اچھوت کا سا برتاؤ کیا جاتا رہا۔ دوسری قومیں روس سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ اور اگر کوئی تعلق تھا تو وہ دشمنی اور عداوت کا تھا۔ مگر ادھر کچھ عرصہ سے دوسری قوموں کو روس کی بین الاقوامی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔ اور اس وقت (جون سنہ ۱۹۳۹ء) انگلستان اور فرانس خاص طور پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ روس کو کسی طرح سے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جمہوری ملکوں کا دوست بن کر جرمنی اور اٹلی کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی روک تھام کرے اور ان کی جابرانہ سیاست کا خاتمہ کرے۔

ان حالات میں یہ سوال خاص طور پر دلچسپ ہے کہ اگر جنگ واقع ہوئی تو روس کی اندرونی سیاست اور حال کی تاریخ کا اس کی جنگی قوت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس موضوع پر کچھ عرصہ ہوا رسالہ PACIFIC AFFAIRS میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا ملخص ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر جنگ پیش آجائے تو روس کی جنگی طاقت کتنی ہوگی؟ اس سوال کا جواب دیتے وقت یہ ضروری ہے کہ روس کے معاشی نظام کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں پیش نظر رکھی جائیں سب سے بڑی خصوصیت روسی نظام کی یہ ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں کی آپس کی کشمکش کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس قسم کی کشمکش جنگ کے زمانہ میں بڑی دقتیں پیدا کرتی ہے اور ان کی جنگی طاقت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے یہ صحیح ہے کہ روس میں بھی اس کا امکان ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں اور بعض اقسام کے مشترکہ مزروعوں کے ارکان میں بعض مسائل مثلاً کھانے پینے کی چیزوں کی

قیمتیں مقرر کرنے پر اختلاف رائے ہو۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام میں جو مخالفت سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ہوتی ہے اس سے اس اختلاف رائے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح روس میں اشتراکی نظام کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ ملک کے تمام حصوں سے پورا معاشی استفادہ کیا جاسکے۔ روس ایک بہت بڑا ملک ہے مختلف اقوام کی تعداد جو روس میں بستی ہیں نیز رقبہ کے اعتبار سے اس کا مقابلہ یا تو براعظموں سے کیا جاسکتا ہے اور یا پھر سلطنت برطانیہ سے مگر برطانیہ اب تک قومی آزادی کے مسئلہ کو کامل طور پر حل نہیں کرسکا ہے اور نہیں معلوم کہ جنگ ہونے کی صورت میں محکوم اقوام کا کیا رویہ ہو۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی جہاں پر اکثر قومیں ایک دوسرے میں مدغم ہو چکی ہیں حبشیوں کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ مگر روس نے سامراج کی بجائے اشتراکی عمل کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے اور اس طرح کمزور اقوام کے مسئلہ کو حل کیا ہے۔ جو قوت زاری حکومت کے زمانہ میں آپس کی لڑائی میں صرف ہوتی تھی وہ اب روس کی حمایت میں لگائی جاسکے گی۔

اگر روس کے بیرونی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو خاص بات یہ معلوم ہوگی کہ روس کو دنیا میں پہلا اشتراکی ملک ہونے کی وجہ سے نہ صرف روس بلکہ دنیا کے مزدوروں اور محکوم اقوام کی ہمدردی حاصل ہے۔ اور اس ہمدردی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس سے روس کی قوت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اصول ایسے ہیں جن پر روس کی سیاست خارجہ کا دارومدار رہا ہے اور جس کا بار بار روس میں ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ روس کسی ملک کی آزادی چھیننے کی خواہش نہیں رکھتا، یا یہ کہ روس جنگ کا سخت مخالف ہے۔ ان باتوں کا عام لوگوں پر خواہ وہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں، بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ روس کے باشندہ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ اگر جنگ واقع ہوئی تو وہ اپنی حفاظت کے لئے ہوگی اور اس لئے نہیں کہ دوسروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا مقصود ہے۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روس کے عام لوگوں کے معیار زندگی پر اشتراکی نظام

کا بحیثیت مجموعی اچھا اثر پڑا ہے۔ خصوصاً گذشتہ پانچ سال میں ان کی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے
اس سے پہلے بعض وجوہ ایسے اور بھی گذرے جب حالت ناگفتہ بہ تھی۔ معاشی نظام میں ایک
انقلاب برپا تھا۔ اور اس سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہو رہی تھیں مگر حکومت کے پیش نظر جو لائحہ
عمل تھا اسے پورا کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ حکومت اس معاملہ میں سمجھوتہ کے لیے تیار نہ
تھی ورنہ یہ ممکن تھا کہ روس میں زاری حکومت کا خاتمہ ہونے اور مزدوروں کی حکومت کے
قائم ہونے کے بعد بھی مغربی قسم کی معتدل سی جمہوریت قائم ہو جاتی جس میں دولت پیدا کرنے
کے اہم ذرائع ریاست کے ماتحت آجاتے مگر اشتراکی جماعت اس پر تیار نہ تھی کہ اپنے پروگرام
کو خیرباد کہدے اور روس کی جنگی طاقت کو ویسا ہی کمزور رہنے دے جیسی کہ زار کے زمانہ میں
تھی۔ اشتراکی جماعت کا پختہ ارادہ تھا کہ ملک کے اندر بے دھڑک صنعتوں کو رواج دیا جائے اور
زراعت کو بڑے پیمانہ پر جاری کرنے کے لئے مشترکہ مزروعوں کی بنا ڈالی جائے۔ چنانچہ پہلے
پنج سالہ منصوبہ کے دوران میں حکومت نے جو رویہ اختیار کیا اس سے قوم کی بہت بڑی تعداد
اس کی حامی بن گئی۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ قربانی کے مطالبہ کی وجہ سے بڑبڑاتے بھی تھے مگر
یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ لاکھوں انسانوں میں اس کی بدولت اشتراکی نظام سے خاص وابستگی پیدا
ہو لی۔ جس کسی نے پہلے پنج سالہ منصوبہ کی مخالفت کی اسے سزا بھگتنی پڑی۔ سازشیں ہوئیں ضرور
مگر کامیاب نہ ہوئیں اور ان کی شکست نے حکومت کو اور مستحکم کر دیا۔

اب صورت یہ ہے کہ لاکھوں آدمی آج ایسی زندگی گذار رہے ہیں جو پہلے ان کے خواب
وخیال میں بھی نہ آسکتی تھی ۱۹۲۸ء سے پہلے تو یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عیش و آرام جیسی
چیزیں اکثریت کے نصیب میں آسکتی ہیں اور اب بھی یہ ظاہر ہے کہ اکثریت کی ساری ضرورتیں
اور خواہشیں تو پوری نہیں ہو سکتیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آج عوام کی حالت گذشتہ زمانہ کے مقابلہ
میں کیسی ہے۔ یہ ایک نامناسب بات ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے معیار زندگی سے
روس کا مقابلہ کیا جائے۔ اب اگر روسی کسان یا مزدور اپنے آپ کو اس وجہ سے خوش نصیب

سمجھے کہ اس کے گھر میں سینے کی مشین گراموفون ریڈیو اور بائیسکل موجود ہیں تو بالکل بجا ہے۔
اسی طرح کارخانہ میں کام کرنے والی عورت جس کے پاس چند سال پہلے صرف ایک بدنما اوپری پوشاک ہوا کرتی تھی، اور جو ننگے پاؤں رہتی تھی اب اگر اچھے سلے ہوئے کپڑے پہنتی ہے اور پاؤں میں پہننے کی اس کے پاس جوتیاں بھی ہیں تو وہ اپنی حالت پر جتنی بھی خوشی منائے کم ہے۔
اب سوال یہ کیا جا سکتا ہے اگر عام لوگوں کی حالت پہلے سے بہتر ہے اور مختلف قوموں اور طبقوں کی کشمکش بھی بڑی حد تک مٹا دی گئی ہے تو پھر ان تمام سازشوں، مقدموں اور سزاؤں کے کیا معنی ہیں جو بڑی تعداد میں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ روس کی حکومت کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ چونکہ روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے اور اس کے چاروں طرف ایسی ریاستیں واقع ہیں جو سرمایہ داری کی زبردست حامی ہیں اس لئے ایسے لوگوں کو جو موجودہ نظام سے خوش نہیں ان ریاستوں سے ساز باز کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ دوسری ریاستوں کی مدد سے روس میں اشتراکیت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ آپس کی مخالفتیں انتہا کو پہنچ چکی ہوں اور اس کی ذرا وضاحت ہونی ضروری ہے۔
قصہ یہ ہے کہ جب روس اس مشکل دور سے گذر رہا تھا جبکہ ایک طرف تو صنعتوں کو فروغ دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف زراعت پر مشترکہ قبضہ کی بنا ڈالی جا رہی تھی اس وقت ملک میں ایسے سیاسی لیڈر بھی تھے جن کا خیال تھا کہ یہ تجربے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اپنی پرانی عادت کے بموجب انھوں نے اس جماعت کی نکتہ چینی شروع کی جو برسر حکومت تھی۔ نکتہ چینی اور اعتراض کرنا گویا ان کے خمیر میں داخل تھا۔ انھوں نے بات کا بتنگڑ بنانا شروع کیا۔ اس وقت ایسے انقلابیوں کے لئے جو اس گتھی کو تشدد کی پالیسی سے سلجھانا چاہتے تھے کچھ نہ کچھ پیرو بھی مل جاتے تھے۔ خاص کر بالائی کساؤں اور ان علاقوں میں جہاں پر خالص روسیوں کے علاوہ دوسری اقوام آباد ہیں۔ باغیوں کے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ اپنے گروہ بنائیں اور دوسرے اسی قسم کے گروہوں کے ساتھ مل کر سازشیں کریں۔ یہاں تک کہ جب موقع آئے تو فوج کو بغاوت

پر آمادہ کر کے حکومت کو الٹ دیں مگر چونکہ ایسی گروہوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ملک کی اکثریت کو اپنے ساتھ کرلیں، اس لئے وہ اس فکر میں بھی رہتے کہ باہر سے مدد حاصل کی جائے۔ بیرونی امداد ہر وقت ان کے لئے موجود تھی۔ چنانچہ جب ۳۴-۱۹۲۲ء کی فوجی سازشیں کی گئیں تو یہ ضروری تھا کہ غیر اقوام سے بھی مدد لی جائے۔ یہ خیال صحیح نہیں جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ کسی طرح کی سازش تھی ہی نہیں۔ یہ دعویٰ تو اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ بھی مان لیا جائے کہ روسی حکومت کے لئے یہ ممکن ہے کہ محض شخصی مخاصمتوں کی بنا پر اپنی بین الاقوامی وقار کو اتنا زبردست صدمہ پہنچانے اور ایسے خطرہ کے وقت اپنی فوجی طاقت کو کمزور کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر اتنی بڑی تعداد میں روس کے سیاسی لیڈروں اور فوجی افسروں کا اقبال جرم کرنا بھی اپنی جگہ پر اس نظریہ کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مقدموں کے دوران میں حکومت نے پروپیگنڈے کی خاطر سازشوں کا یہ پہلو خاص طور پر نمایاں کر کے دکھایا مگر اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، واقعہ یہ ہے کہ اندرونی سازشوں کا بیرونی ممالک سے ایک منطقی تعلق ہے۔ اور جب صورت یہ ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ روسی حکومت نے سازشوں کو ختم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اس سے بجائے کمزوری کے روس کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ اگر متعدد سیاسی لیڈر اور اعلیٰ فوجی افسر مارے گئے تو بلا سے۔ جنگ کی صورت میں یہ لوگ بہت نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ان کی قابلیت سے روس کو اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا ان کی سازشوں سے نقصان ہوتا۔

روس کی متوقع جنگی قوت کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھا جائے اور روس کی گذشتہ چند سال کی ترقی کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے جس کا بس ایک مقصد تھا یعنی روس کی قوت میں اضافہ کرنا اس نکتہ پر زور اس لئے دیا جا رہا ہے کہ اکثر لوگ اس مرکزی حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں۔ روس میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو محض ایک خیال پرستی کی بنا پر موجودہ حکومت سے خفا ہیں وہ اپنے سیاسی اور معاشی نظریوں پر الیسا

کامل ایمان رکھتے ہیں کہ جہاں ذرا سا کسی کو مقرر کی ہوئی راہ سے بھٹکتا ہوا پایا اور اسے غدار سمجھا۔
بس یہ ہے راز ان سراسر ناقابل عمل کوششوں کا جو آئے دن حکومت کو تباہ کرنے کے لئے
کی جاتی ہیں۔

لیکن اگر اوپر کے لوگوں میں اس قسم کی مخالفتیں ہیں تو ہوا کریں۔ اس لئے کہ اس
کی کاٹ کے لئے حکومت کے ساتھ عوام الناس کی ہمدردی موجود ہے اور یہ چیز ہے جو جنگ
کے وقت روس کے بڑے کام آئے گی۔ عوام الناس، خاص طور پر کسان طبقہ اب گرمجوشی
کے ساتھ موجودہ نظام کا حامی ہے۔ حکومت پر اس کا اثر ہے۔ حکمت عملی وہی مقرر کرتا ہے۔
اور یہ وہ چیز ہے جو اب تک روس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے ان سازشوں کی
ناکامی کا جن کا حال اکثر سننے میں آتا ہے۔

قومی منصوبہ اور مکمل آزادی

(از پنڈت جواہر لال نہرو صدر قومی صنعتی تنظیمی کمیٹی)

ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ ہم ہندوستان کے لئے قومی منصوبہ مرتب کریں یا بہر حال اس قسم کے منصوبہ کی عام نوعیت ظاہر کردیں بعد میں وقتاً فوقتاً اس کی تفصیلات کو پر کیا جاسکتا ہے اس سے قبل کہ ہم قومی ترقی کا وہ منصوبہ مرتب کریں جو پبلک کی مادی اور تمدنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر لے گا ہمیں چاہیئے کہ ہم ان مقصدوں اور بنیادی مسئلوں کی طرف سے اپنے دماغوں کو صاف کرلیں جن کے ماتحت اس قسم کا منصوبہ مرتب ہوگا۔ یہ امر واضح ہے کہ ایک جامع قومی منصوبہ کی ترتیب اس وقت تک ذہنی کھیل ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ اس کے ذمہ دار اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ اگر اس منصوبہ کے بنانے والوں کو کوئی اختیار نہیں ہے یا ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے اور وہ محدود ہیں تو وہ منصوبہ نہیں بنا سکتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو قومی ذمہ دار لوگ منصوبہ بنائیں انہیں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا بھی پورا پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ اس لئے منصوبہ بنانے کے قبل اس بات کی ضرورت ہے کہ مکمل آزادی ہو۔ ملک آزاد ہو اور بیرونی نگرانی دور ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کو اپنے اقتدار بالادست کے ماتحت اس بات کا پورا اختیار حاصل ہو کہ وہ جو تدبیر اور پالیسی چاہے اختیار کرے۔ ملک اور عوام کے مفاد میں افسران با اختیار دوسرے ملکوں سے جو تعلقات بھی قائم کرنا چاہیں اس کی انہیں آزادی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی آزاد اور مساوی قوموں کے اتحاد کی صورت میں اس اقتدار بالادست کو اپنی ذاتی تنظیم اور تعاون کے مفاد میں کچھ حد تک رضاکارانہ طور پر محدود کرنا پڑے۔ لیکن اس قسم کے حالات قومی منصوبہ بنانے کے راستے میں حائل نہیں ہوں گے اگر صحیح اصول پر یہ وقوع پذیر ہوئے تو اس سے قوم کی اندرونی تنظیم تک میں مدد ملے گی۔ فی الحال ہمیں اس

مسئلہ کو زیر غور نہیں لانا چاہیئے کیونکہ اس کا امکان ابھی بہت دور ہے۔

پس مختلف پہلوؤں کو چلانے کے لئے جو ضروری اقدامات کرنے پڑیں گے ان کے لئے ابتدائی طور پر آزادی لازمی چیز ہے۔ کسی دوسری بنیاد پر منصوبہ مرتب کرنا ممکن ہی نہیں ہے موجودہ حالات میں ہندوستان کو نہ صرف قومی آزادی حاصل نہیں ہے بلکہ ہم پوری طرح بندھے اور جکڑے ہوئے ہیں۔ بے شمار پابندیاں، حدیں، تحفظات درمیان میں حایل ہیں اور ہماری تنظیم اور ترقی کے راستے کو روکے ہوئے ہیں۔

ہمیں آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے قومی ترقی کا منصوبہ مرتب کرنا چاہیئے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمیں منصوبہ والی معاشی زندگی کی ترقی کے لئے کچھ کرنے سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ہمیں موجودہ حالات میں بھی ملکی ذرائع کو ترقی دینے اور عوام کے معیار کو بلند کرنے والی تمام تدبیریں اور پالیسیاں اختیار کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور یہ تمام کوششیں اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ہونی چاہیئیں جو ہم نے آزاد ہندوستان کی لئے مرتب کیا ہے۔

چنانچہ ہمیں ایک مکمل منصوبہ مرتب کرنا ہے جس کا پورا اطلاق تو آزاد ہندوستان پر ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں قومی تحریک کے مختلف شعبوں میں اس پر عمل درآمد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرایا جائے اور یہاں جمہوری ریاست قائم کی جائے۔ اس قسم کی مکمل جمہوری ریاست میں ہر فرد کو خودی کی تکمیل اور اظہار کا حق دیا جائے گا یہ ہمارے منصوبہ کا پس منظر یا بنیاد ہوگی۔

قومی معاشی تنظیم

(از جناب محمد عاقل صاحب ایم اے ۔ استاد معاشیات جامعہ)

(قومی معاشی تنظیم کا مسئلہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی اب اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ۔ کانگریس کی طرف سے ایک قومی صنعتی تنظیم کمیٹی کا تقرر کیا جا چکا ہے جس نے ابتدائی مشاورت سے اپنے حدود عمل کو کم و بیش متعین کر لیا ہے اور اب زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے کام کو شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ اس موقع پر ضروری ہے کہ قومی معاشی تنظیم کی ضرورت اس کی گذشتہ تاریخ، مختلف ملکوں میں اس کے تجربوں، آئندہ کے لئے ترقی کے امکانات اور معاشی تنظیم کے عام اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے ۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جامعہ کی آئندہ کسی اشاعت کو پورے طور پر اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے وقف کر دیں ۔ جامعہ کے اس نمبر میں ہم اس بحث کی صرف ابتدا کر رہے ہیں اور ملک کے اہل فکر حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے گراں مایہ خیالات سے قارئین جامعہ کو مستفید فرمائیں ۔

اس رسالہ میں کسی اور جگہ آپ کو محمد احمد صاحب سبزواری کا اسی موضوع پر ایک مضمون ملے گا جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر انور مراد صاحب قریشی ایم اے ۔ ایم ۔ ایس سی ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی کتاب "ڈی اسٹیٹ اینڈ اکانمک لائف" کی مدد سے تصنیف کیا ہے ۔ ڈاکٹر قریشی صاحب معاشیات میں مخالف تنظیم مسلک کے پیرو معلوم ہوتے ہیں ۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد تھے اور اب انجمن اقوام میں کسی خدمت پر مامور کر دیے گئے ہیں ۔ محمد احمد صاحب سبزواری اسی سال عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم ۔ اے معاشیات کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں اول آئے ہیں ۔ سبزواری

صاحب کے اس مضمون سے قارئین کو معاشی تنظیم کے مخالفوں کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

قومی معاشی تنظیم کا مسئلہ چونکہ اب ملک کی عملی سیاسیات میں داخل ہو گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کیا جائے تاکہ جلد بازی میں ہم کوئی ایسی پالیسی اختیار نہ کریں جس سے ملک کو فائدہ کی جگہ الٹا نقصان اٹھانا پڑے۔ مدیر)

معاشیات کے ابتدائی ماہر معاشی آزادی کے بہت بڑے حامی تھے۔ معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت کو وہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ہر شخص کو اپنے ذاتی نفع حاصل کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے از خود کل جماعت کو نفع پہنچتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے معاشی زندگی کی مختلف تصویریں پیش کر کے کہتے تھے کہ دیکھیے کس طرح خود بخود تمام کاروبار ٹھیک ٹھیک چل رہے ہیں۔ کوئی منصوبہ بنانے والا، کوئی نگرانی کرنے والا، کوئی زور اور دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے لیکن پھر بھی جتنی مقداروں میں جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ مہیا کی جارہی ہیں۔ کھانے کی چیزوں کی جہاں جتنی مانگ ہے کھانے کی چیزیں وہاں موجود ملتی ہیں۔ جہاں کپڑا چاہیئے وہاں کپڑا مل جاتا ہے۔ رہنے کے لئے مکان موجود ہیں۔ سفر کے لئے سواریاں چل رہی ہیں عیش وآرام کی سب چیزیں نہایت پابندی اور سلیقہ سے ضرورت اور ذوق کا لحاظ کر کے فراہم کی جاتی ہیں۔ ہر طرح کے کام کرنے والے لوگ موجود ہیں ان میں تقسیم عمل پائی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے کام کے پورا کرنے میں مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جتنی چیزوں کی ضرورت ہے اتنی ہی پیدا کی جاتی ہیں نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ وقتی طور پر عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے لیکن خود ہی اس میں اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ کسی خارجی مداخلت کی ضرورت پیش نہیں آتی اور کام عموماً ٹھیک ٹھیک ہوتا رہتا ہے اس لئے حکومت یا جماعت کو نہ تو پیشے کے انتخاب پر کوئی پابندی لگانی چاہیئے نہ مال کی

آمد و رفت پر۔ نہ اجرت۔ لگان اور سود مقرر کرنا چاہیئے نہ قیمت۔ نہ اشیا کی رسد کو اپنی نگرانی میں لینا چاہیئے نہ خدمتوں کی تقسیم کو۔ حکومت یا جماعت کا کام صرف ملکیت ذاتی کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کے بعد ہر شخص کو پورے طور پر آزاد رکھنے سے ہی سب کی بھلائی حاصل ہو سکتی ہے۔ غرضکہ یہ زمانہ انفرادیت اور آزادی کی تعریف و توصیف اور ترقی کا زمانہ تھا۔

اس سے پہلے حکومت یا جماعت کی طرف سے معاشی زندگی کی اصلاح کے لئے جو مداخلتیں کی جایا کرتی تھیں ان کی ناکامی اور خرابی کی ایک لانبی فہرست ان لوگوں کے پاس موجود تھی اور یہ تفصیل کے ساتھ تبلایا کرتے تھے کہ حکومت یا جماعت نے جب کبھی مداخلت کی اس سے اگر ایک خرابی دور ہوئی تو اس کی جگہ سینکڑوں نئی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ مختلف پیشوں کے انتخاب اور اختیار کرنے پر جب پابندیاں لگائی گئیں تو اہل لوگوں کو پہنچنے اور ترقی پانے کا موقع نہیں رہا اور ہر پیشہ میں نااہل اور قدامت پسند لوگوں کی کثرت ہو گئی جو اپنے ذاتی میلان اور اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ محض ایک خاص پیشہ ور کے گھر میں اتفاقی طور پر پیدا ہو جانے کی وجہ سے مخصوص پیشوں کے ساتھ عمر بھر کے لئے منسلک رہنے لگے۔ ایسے ہی ناپسندیدہ نتائج چیزوں کی نوعیت کے معیار مقرر کرنے، سود لگان اجرت اور قیمتوں کے مقرر کرنے، افلاس زدہ لوگوں کی امداد کے لئے قوانین وغیرہ بنانے، مال کی درآمد و برآمد پر پابندی لگانے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ غرض کہ حکومت اور جماعت کی مداخلت کی ناکامی کی اتنی کثیر مثالیں ان کے سامنے تھیں کہ یہ کسی حالت میں حکومت یا جماعت کی مداخلت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک قدرتی قوانین موجود تھے جن سے انحراف یا سرتابی کرنا ممکن نہیں تھا اور جب کبھی اپنے محدود علم اور فہم کے زعم میں ان قوانین کی مخالفت کرتے ہوئے موجودہ حالات کو اجتماعی کوششوں سے بہتر بنانے کی سعی کی گئی معاملات اور زیادہ پیچیدہ اور خراب ہو گئے۔

لیکن معاشیات کے ابتدائی ماہروں کا یہ دلفریب نظام آزاد مقابلہ اور مسابقت کی بنیاد

پر قائم تھا۔ مقابلہ سے اس نظام میں اہلیت، مستعدی، کفایت اور جماعتی بہبود پیدا ہوتی تھی۔ ہر شخص کو دوسروں کے مقابلہ کے ڈر کی وجہ سے چاق و چوبند، مستعد و کارگزار رہنا پڑتا تھا کیونکہ ذرا اس کی طرف سے کوئی کسر ہوئی اور فوراً اس کی جگہ پر دوسرا زیادہ اہل اور کارگزار شخص قبضہ کرلیتا تھا۔ ہر مزدور کو کمترین اجرت پر انتہائی محنت، ایمانداری اور عقل مندی سے کام کرنا پڑتا تھا۔ کاریگر کو مہارت اور صفائی کے ساتھ چیزوں کو بنانا ہوتا تھا۔ دوکاندار کو کمترین قیمت پر اچھی چیز کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے وہ مقابلہ سے خارج ہو جاتے تھے اور جب تک وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے تھے ان کی چیز خریدنے کے لئے کوئی گاہک تیار نہیں ہوتا تھا اور انھیں ناکامی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ زندگی کے لئے ایک جد و جہد اور کشمکش جاری تھی اور وہی اس میں کامیاب ہوتے تھے جو سب سے زیادہ اہل ہوتے تھے۔ ہر چند ہر شخص اپنے ذاتی نفع کے لئے کام کرتا تھا اور جماعت کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بناتا تھا لیکن پھر بھی نتیجہ کے طور پر اس سے جماعت کی خدمت ہوتی تھی اور عام مرفہ الحالی میں اضافہ ہوتا تھا اور جو شخص جتنا زیادہ جماعتی دولت کے اضافہ کا موجب ہوتا تھا اتنا ہی اجرت، سود، لگان یا منافع کی شکل میں جماعت کے انعام کا مستحق قرار پاتا تھا۔ دولت کی پیدائش میں محنت کے علاوہ سرمایہ، زمین اور تنظیم کو بھی شریک سمجھا جاتا تھا۔ سرمایہ کے اجتماع کو پس اندازی اور کفایت شعاری کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا اس لئے سرمایہ دار کو دولت کے صرف سے مجتنب رہنے کا انعام سود کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ لگان، امتیازی فوقیت کی بنا پر ملتا تھا اور منافع میں تنظیم خطرپسندی اور ہدایت وغیرہ کے معاوضے شامل ہوتے تھے جب کسی چیز یا خدمت کی ضرورت زیادہ اور اس کی رسد کم ہوتی اس کی قیمت از خود بڑھ جاتی تاکہ بڑھی ہوئی قیمت کے لالچ میں ضرورت کے مطابق چیزوں کے پیدا کرنے کی طرف لوگ مائل ہوں اور جب رسد زیادہ ہوتی تو قیمت از خود گر جاتی۔ تاکہ ضرورت کے مطابق رسد کو محدود کیا جا سکے مثلاً جہاں پس اندازی، اجتناب اور کفایت شعاری کی عادت یا موقع کم ہوتا تھا وہاں ان کو ترقی دینے کے لئے شرح سود کو زیادہ رکھنا

پڑتا تھا اور جہاں اس کی عادت یا موقع زیادہ ہوتا تھا وہاں از خود یہ شرح سود کم ہو جاتی۔ غرضکہ اس نظام میں جس قدر ممکن تھا جماعت کی ضرورتوں کو انتہائی خوبی، خوش اسلوبی اور تشفی بخش طریقہ پر پورا کیا جاتا تھا اور اس کے چلانے کے لئے خارجی نگرانی اور انتظام کی بالکل ضرورت نہیں تھی یہ خود بخود چلتا رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں کچھ مصیبت زدہ لوگ بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی مصیبتیں یا تو خود اپنی پیدا کی ہوئی ہوتی تھیں یا لاعلاج ہوتی تھیں اور ان دونوں صورتوں میں خارجی مداخلت غیر مناسب تھی کیونکہ اس قسم کی مداخلت سے دولت کی مجموعی مقدار اور اس نظام کی اہلیت اور کارگزاری پر خراب اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مثلاً اجرتیں جب ان کو قدرتی طور پر نہ بڑھنا چاہیئے تھا بڑھا دی جاتی تھیں، سود یا قیمتیں جب ان کو قدرتی طور پر نہ گھٹنا چاہیئے تھا خارجی مداخلت سے کم کر دی جاتی تھیں جب ہمدردی کے جذبہ اور انسداد افلاس کے قوانین کی وجہ سے ان لوگوں کو جنھیں مفلس رہنا چاہیئے تھا افلاس کی سختیوں سے نجات مل جاتی تھی تو اس نظام کا توازن بگڑ جاتا تھا اور توازن کی یہ خرابی بعد میں زیادہ پیچیدہ اور تکلیف دہ صورتوں میں کہیں نہ کہیں ظاہر ہو کر رہتی تھی۔ غرضکہ آزاد مقابلہ کی سختیوں اور انصاف پسندیوں سے اس نظام کی تندرستی اور اہلیت کارگزاری قائم تھی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں معاشیات کے ماہروں کے لئے اس قسم کے خیالات وعقاید رکھنے کے لئے ایک حد تک خاصے معقول وجوہ موجود تھے۔ ان کے زمانہ کا سرمایہ دار واقعتہً دولت کے صرف سے اجتناب کر کے سرمایہ جمع کرتا تھا۔ نہایت معمولی حیثیت سے وہ اپنی زندگی شروع کرتا تھا اور آہستہ آہستہ اپنی ذاتی سعی، عاقبت اندیشی، دولت اندوزی کی غیر معمولی قابلیت، ہدایت اور خطر پسندی سے کام لے کر نفع کماتا تھا اور اس نفع کو خرچ کرنے کی جگہ دوبارہ سرمایہ کی شکل میں لگا کر اپنے کاروبار کو وسیع کرتا رہتا تھا۔ پھر اسی زمانہ میں سرمایہ داروں کے درمیان مسابقت بھی خوب پائی جاتی تھی۔ ان کے بہت سے حریف موجود ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا ہر ایک مالک پیداوار کے صرف ایک حصہ کو تیار کرتا تھا۔

اور اپنے مال کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو اپنے گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ ہر صناع وتاجر اپنے حریف کے ساتھ مقابلہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنی اہلیت کو بڑھانے اور اپنی لاگت کو کم کرنے کے لئے مجبور رہتا تھا ورنہ اسے اپنے گاہکوں کے چھن جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ اہلیت پیدائش میں جس قدر اضافہ یعنی لاگت میں جس قدر کمی کی جاتی تھی اسی نسبت سے کم قیمت پر گاہکوں کے ہاتھ مال فروخت کیا جاسکتا تھا اور مقابلہ میں کامیابی کے امکانات کو بڑھایا جاسکتا تھا۔ سرمایہ دار کی شرح منافع میں اس کی ذاتی اہلیت اور کارگزاری کو بڑا دخل ہوتا تھا۔ رسد کو محدود کرکے زیادہ قیمت پر مال کو گاہک کے ہاتھ فروخت کرنے کا موقع اسے اکثر حالتوں میں حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ صناعوں کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے خریداروں کو چیزیں عموماً کم ترین قیمت پر مل سکتی تھیں اور جماعت اہلیت پیدائش کے اضافہ سے ایک بڑی حد تک فائدہ اٹھا سکتی تھی یہ حالات تھے جن کی موجودگی میں دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں' افراد اور جماعت دونوں کے فائدہ کو سامنے رکھ کر معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے عدم مداخلت کے اصول وضع کئے تھے اور معاشی آزادی کو بہترین پالیسی سمجھا تھا۔

لیکن جب دولت کی پیدائش بڑے پیمانہ پر شروع ہوگئی اور اکثر صورتوں میں کسی نئے شخص کے لئے چھوٹے پیمانہ پر پیدایش دولت کے کام کو شروع کرنا نفع بخش نہیں رہا تو کھلا مقابلہ اور مسابقت کی آزادی ختم ہوگئی اور معاشی آزادی کے وہ تمام فائدے جن کی معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے اضافہ مقدار دولت کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس قدر تعریفیں کی تھیں غائب ہوگئے۔ اب سرمایہ داروں کے لئے اپنے مال کی رسد کو محدود کرنا' اپنے منافع کی شرح کو بڑھائے رکھنا' دولت کی مجموعی مقدار میں اضافہ کی کوشش نہ کرنا۔ سب کچھ ممکن ہوگیا۔ اب دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں یعنی سرمایہ داروں اور جماعت کے مفاد کا تصادم واضح طور پر نمایاں ہونے لگا۔

اس کے علاوہ مزدوروں کی بے بسی بھی اب خوب ظاہر ہوگئی۔ سرمایہ دار کو مزدور پر آمرانہ اقتدار حاصل ہوگیا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی حیثیت مساوی نہیں رہی بلکہ مزدور محکوم بن گئے۔ قوت محرکہ سے چلنے والی بیش قیمت مشینوں نے ان کے دستی اوزاروں کو بے کار کر دیا۔ اب وہ آزادی کے ساتھ اپنے طور پر مال پیدا کر کے گاہکوں کے ہاتھ فروخت نہ کر سکتے تھے۔ نہ اوزار ان کے پاس رہے، نہ کچا مال نہ کام کرنے کی جگہ۔ مصنوعہ مال کے صرف ایک حقیر حصہ کے بنانے میں وہ شریک ہوتے تھے اور بنے ہوئے مال کو وہ اپنا بنایا ہوا نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ صرف اپنی محنت کو بازار میں فروخت کر سکتے تھے اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ بھوک اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے فوری طور پر مجبور رہتے تھے اس لئے اپنی محنت کا پورا معاوضہ وصول نہیں کر سکتے تھے۔ جن اجرتوں اور شرائط کے ساتھ بھی سرمایہ دار ان کی محنت سے فائدہ اٹھانے کے لئے آمادگی کا اظہار کرتا تھا انھیں صبر و خاموشی کے ساتھ ان ہی کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داروں نے اپنے اس اقتدار اور مزدوروں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ مقابلہ میں مساوات باقی نہیں رہی جو معاشی آزادی کی کامیابی کے لئے لازمی شرط ہے۔ مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر حکومت پر زور ڈالا جانے لگا کہ حکومت کو جو کمزوروں کے حقوق کی حامی ہے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مداخلت کرنا چاہیئے، یعنی حکومت کو چاہیئے کہ مزدوروں کے کام کے اوقات مقرر کرے، بچوں اور حاملہ عورتوں سے کام لینے کے لئے قوانین بنائے، ناگہانی حادثوں کی صورت میں مزدوروں اور ان کے ورثا کو ان کے نقصان کا معاوضہ دلائے، بڑھاپے کی پنشن کا بندوبست کرے۔ کمترین اجرتوں کا تعین کرے اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے اور دوسرے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے۔

اس کے علاوہ زراعتی ملکوں میں جہاں جدید صنعتوں نے ترقی نہیں پائی تھی اور جو معاشی آزادی کی صورت میں ترقی یافتہ صنعتی ملکوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے

تھے اور ایسے صنعتی ملکوں میں بھی جہاں کی صنعتوں کو دوسرے ملکوں کے مقابلہ سے خطرہ تھا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا جانے لگا کہ وہ ملکی صنعتوں کے تحفظ کے لئے قانون بناکر مداخلت کرے۔

پھر ایک اور سمت میں بھی خصوصاً جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد حکومت کی مداخلت کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ ایک زمانہ تک سونا چاندی زر کے فرائض کو خاصی خوبی کے ساتھ پورا کرتے رہے اور ان کی قدر کا ثبات بھی خاصا اطمینان بخش رہا۔ چونکہ سونے چاندی کے سکوں کی قدر کا تعین ان کی قدر ذاتی کی وجہ سے از خود ہوتا تھا اور کاغذی زر اور اعتباری زر نقد پزیر تھا اس لئے زر کی ملکی اور بین الاقوامی قدر کے تعین اور زر کے انتظام کے سلسلہ میں حکومت کو بہت کم مداخلت کرنا پڑتی تھی۔ لیکن جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد سونا چاندی کے ذخیرے اکھٹے کرنے اور اعتباری زر کے غیر نقد پزیر ہو جانے کی وجہ سے مبادلات خارجہ کے تعین کے سلسلہ میں اور قیمتوں کی اندرونی سطح کی نگرانی کے لئے حکومتوں سے مداخلت کے مطالبے کئے جانے لگے۔ پھر حالیہ کساد بازاری کے زمانہ میں حکومت سے اور بھی زیادہ مداخلت کے لئے مطالبہ کیا گیا کہ وہ زر کی مناسب پالیسی اختیار کرکے ملک کی مرفہ الحالی کو دوبارہ زندہ کرے۔

غرضکہ اس طرح معاشی آزادی کے ان اصولوں میں جن کی معاشیات کے ابتدائی ماہروں نے بے انتہا تعریف کی تھی خامیاں اور خرابیاں نظر آنے لگیں اور معاشیات کے ماہروں میں ایسے لوگ پیدا ہونا شروع ہو گئے جو مداخلت کے اصولوں کے حامی تھے۔ جیساکہ اوپر بیان کیا گیا حکومت کی مداخلت کو چار اہم سمتوں میں ضروری خیال کیا جانے لگا:۔

(۱) مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۲) ملکی صنعتوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۳) دولت کے صرف کرنے والوں یعنی کل جماعت کے مفاد کے تحفظ کے لئے۔

(۴) ملک کے زر اور اعتبار کے نظام کی مناسب نگرانی کے لئے۔

معاشیات کے ابتدائی ماہر مقابلہ اور مسابقت کی فائدہ مندیوں کے بہت زیادہ قائل

تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ آزاد مقابلہ کی موجودگی میں مندرجہ بالا تینوں مفادوں کا تحفظ از خود ممکن ہے۔ رہ گیا زر اور اعتبار کا مسئلہ سو اسے بھی معیار طلا کو اختیار کرکے خوبی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے اور ان سب معاملات میں حکومت کی خارجی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کی وجہ سے مقابلہ کرنے والوں کی وہ مساوات مٹ چکی ہے جو مقابلہ کو فائدہ مندی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ طاقتور شخص بہت زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں اور کمزور بہت زیادہ کمزور اور دونوں میں مقابلہ ممکن نہیں رہا ہے۔ سرمایہ دار جو بھی اجرت دینا چاہتا ہے مزدور اس کے قبول کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے مقابلہ میں پس ماندہ ملکوں کی پرانی صنعتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور نئی صنعتیں ترقی نہیں پا سکتیں۔ خریدار کے لئے بھی فروشندہ کے باہمی مقابلہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ہو گیا ہے۔ مال پیدا کرنے والا جیسا اور جتنا مال جس قیمت پر اور جن شرائط کے ساتھ بیچنا چاہتا ہے اسی قیمت اور شرطوں کے ساتھ خریدار کو اسے خریدنا پڑتا ہے معیار طلا کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس سے کام لینا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے اور اس کی پرانی کارگزاریاں اب صرف ایک افسانہ ماضی بن کر رہ گئی ہیں۔

رائے عامہ کے ان تمام مطالبوں کا اثر حکومت کی پالیسی پر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ مزدوروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے قوانین بنائے جانے لگے اور مزدوروں کی تنظیم جتنی زیادہ اچھی ہوتی رہی اتنی ہی ان کے مطالبوں کی طرف توجہ بھی زیادہ کی جانے لگی۔ لیکن یہ قوانین کسی ہمہ گیر، مسلسل اور ترقی پذیر مقصد کے پیش نظر نہیں بنائے گئے بلکہ وقتی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پورا کرنے اور ناقابل برداشت خرابیوں کو رفع کرنے کے لئے بنائے جاتے رہے۔ نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی کرنا، خرابیوں کے امکانات کا سد باب کرنا، برائی کو جڑ سے اکھاڑنا ــــ یہ مقصد نظر کے سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ پیوند اور جوڑ لگا کر موجودہ نظام کو زندہ رکھنا اور چلاتے رہنا یہ حکومت کی پالیسی کا مقصد ہو گیا۔

اسی طرح غیر ترقی یافتہ زراعتی ملکوں میں جہاں نئی صنعتوں کو ترقی دینے یا پرانی صنعتوں کے تحفظ کرنے کی کوششیں کی گئیں وہاں بھی قومی صنعتوں کی ترقی کا کوئی ہمہ گیر منصوبہ نہیں بنایا گیا بلکہ مختلف صنعتوں کو انفرادی طور پر محاصل درآمد لگا کر یا امداد انعام دے کر تحفظ کیا جاتا رہا۔ اس کے باز اثر کے طور پر حریف ملکوں نے بھی اپنی صنعتوں کو تحفظ اور انھیں ترقی دینے کے لیے معاشی آزادی میں مداخلتیں کرنا شروع کیں اور تقریباً ہر ملک محاصل درآمد کی دیواروں کے درمیان محصور ہو گیا۔

پھر خریداروں کو ان طاقتور لوگوں کی غلامی سے بچانے کے لئے جو بڑے پیمانہ پر دولت پیدا کرنے کی وجہ سے (جن میں کسی دوسرے شخص کے لیے ان کا حریف بننا سہل نہیں تھا) اجارہ دار بن گئے نئے قوانین بنائے گئے۔ لیکن یہاں بھی اسی پیوند لگانے والی اور نمایاں خرابیوں کو دور کرنے والی پالیسی کو اختیار کیا گیا اور کسی واضح اور ہمہ گیر مقصد کے ماتحت معاشی زندگی کی تنظیم نہیں کی گئی۔

زر اور اعتبار کے انتظام کے سلسلہ میں حکومتوں کو جنگ عظیم کے بعد سے خاص طور پر پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ روایتی رجحان معیار طلا کی طرف دوبارہ لوٹ جانے کی طرف تھا۔ لیکن جدید حالات کی روشنی میں اس پر عمل درآمد مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس شش و پنج کی حالت میں حکومتوں کو بہت سی قلابازیاں کھانا پڑیں۔ کبھی معیار طلا اختیار کیا کبھی چھوڑا۔ تلاش ایک ایسے نظام کی تھی جو از خود چلتا رہے لیکن زر اور اعتبار کا ایسا نظام اب عنقا ہو گیا تھا۔ حکومتوں کو مداخلتیں کرنا پڑیں لیکن یہاں بھی خیالات کی الجھنوں اور مقاصد کے عدم تعین کی وجہ سے وہ اپنی مشکلات میں اضافہ کرتی رہیں۔

اوپر جو حالات درج کئے گئے ہیں وہ برابر معاشی مفکروں کے زیر مطالعہ رہے۔ انھوں نے دیکھا کہ معاشی زندگی میں حکومتوں کی مداخلت کا سلسلہ خاصا ترقی کر چکا ہے۔ ان مداخلتوں کا اثر معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی مرکزی مقصد کوئی

منصوبہ کوئی بڑا تعمیری نصب العین موجود نہیں ہے ۔ انھوں نے سوچا کہ اگر مداخلت ناگزیر ہی ہو گئی ہے تو پھر اصول اور طریقہ کے ساتھ کیوں نہ کی جائے ۔ موجودہ بے ڈھنگی مداخلت تو بالکل بے نتیجہ ہے ۔ دوسری طرف آمران مطلق مثلاً مسولینی اور ہٹلر کے برسر اقتدار آجانے کی وجہ سے قومی زندگی ایک واحد مرکزی وجود میں مجتمع ہو گئی اور قومی زندگی کے تمام شعبے اسی سرچشمہ ہدایت سے رہنمائی کے طالب اور جویا ہو گئے ۔ پھر تیسری طرف روس کی معاشی تنظیم اور اس کے پنج سالہ پروگراموں کی کامیابی نے لوگوں کو حیرت میں ڈال کر اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا ۔ غرضکہ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتوں نے مشورہ دینے والی معاشی کونسلیں اور "ذہنوں کے اتحاد" (BRAIN TRUST) وغیرہ بنانا شروع کر دیے اور حکومتوں کی طرف سے معاشی آزادی میں خوب مداخلتیں کی جانے لگیں ۔ اجرتیں ، قیمتیں ، مال کی پیداوار ، اشیاء کی نوعیت ـــــ سب کا فیصلہ حکومت کی طرف سے کیا جانے لگا اور اس کام کو قومی معاشی تنظیم کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ۔

لیکن اس کام نے مختلف ملکوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں ۔ انگلستان میں یہ مداخلت سب سے کم رہی ۔ امریکہ میں اس سے زیادہ ، جرمنی اور اٹلی میں بہت زیادہ ۔ لیکن روس میں پرانے نظام کا تختہ الٹ کر بالکل نئے سرے سے معاشی تنظیم کو ترقی دینے کی کوشش کی جارہی ہے ان ملکوں میں جو تجربے ہو رہے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ علیحدہ مضمونوں کی شکل میں اسی رسالہ میں آئندہ درج کیا جائے گا لیکن یہاں ان نتائج کو بیان کرنے کا ارادہ ہے جو ان تجربوں کو دیکھنے سے اخذ کئے جا سکتے ہیں ۔ (باقی)

معاشی نظم

از جناب محمد احمد صاحب سبزواری، ایم اے (عثمانیہ)

معاشی نظم یا اکنامک پلاننگ آج کل فیشن کی چیز بن گئی ہے۔ جو چیز فیشن میں داخل ہوجاتی ہے عوام اس کی حقیقی اور بنیادی حیثیت پر غور کرنے کے بجائے جذبات و احساسات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ جتنا کہ سمجھا جاتا ہے اس سے بہت زیادہ اثر نفسیات کا انسانی اعمال پر پڑتا ہے۔ ایک معقول اور مدلل اپیل عوام کو اس قدر متاثر نہیں کرتی جتنا کہ زوربیان یا حب وطن کے جذبات عوام پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی چیز کے نام میں کیا اثر ہے لیکن حقیقتاً نام میں بڑی اہمیت ہوتی ہے تاریخ اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کرتی ہے جبکہ انسان نے غلط تصورات اور تخیلات کے تحت قربانیاں کی ہیں معاشی نظم، تجدید، تعقیل اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اس زمانہ میں عام ہوگئے ہیں اور خصوصیت سے ہرجگہ معاشی نظم پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ پلاننگ کی جامع تعریف کرنا بہت دشوار ہے مختلف لوگوں نے اپنے مطلب کے لئے مختلف تعریفیں وضع کرلی ہیں۔ دراصل حکومت کے سخت ترین قوانین اور کلی اقتدار کا نام پلاننگ ہے۔ اس کا آغاز روس کے پنجسالہ پروگرام سے ہوتا ہے۔ جس کا مقصد پیدائش، تعلیم، مبادلہ اور حتیٰ کہ صرف تک پر اقتدار حاصل کرکے انفرادی آزادی کا خاتمہ کرنا ہے۔ مقتدر اعلیٰ ملک کی رہنمائی کرتا ہے اور قوم کو اس کے فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کرنا ہوتا ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ایک شخص گیہوں کی روٹی کھانے کا عادی ہے مگر پلاننگ بورڈ کا خیال ہے کہ ملک کے لئے مفید ہے کہ اس کا گیہوں زیادہ سے زیادہ مقدار میں باہر جائے اور ملک میں گیہوں استعمال کم ہو اور جوار یا دوسرے معمولی غلوں کا استعمال بڑھے۔ چنانچہ یہی ہوتا ہے کہ ملکی گیہوں باہر جاتا ہے اور ملک کے باشندوں کو جوار اور معمولی غلوں پر قناعت کرنا پڑتی ہے خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ خیر یہ تو پلاننگ کی ایک انتہائی صورت تھی لیکن ایسا ہی ہوتا ہے کہ حکومت پیدائش

کے چند شعبوں پر اقتدار حاصل کرلیتی ہے اور بقیہ عوام کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔

آج کل ہندوستان ایک نئے دور سے گذر رہا ہے۔ نئے دستور کے بعد سے ہندوستان کے صوبجاتی رہنماؤں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ دستور میں کتنی ہی خامیاں اور نقائص کیوں نہ ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے صوبہ داری خود مختاری بڑی حد تک مقامی افراد کے سپرد کردی ہے۔ ملک اس وقت ایک نازک اور تغیر پذیر دور سے گذر رہا ہے۔ صوبجاتی حکومتوں کے علاوہ مرکزی حکومت کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان مزید ذمہ داریوں کے لئے غیر معمولی دوراندیشی دوربینی، اور صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ مفوضہ فرائض کو عمدگی سے انجام نہیں دیا سکتا۔ پرانے خیالات اور تصورات نئے دور میں تبدیل ہو رہے ہیں، خود حکومت اور اس کے معنی میں تبدیلی ہو رہی ہے پہلے حکومت ایک غیر ملکی ادارہ تھا، جو گو اس ملک پر حکومت کرتا تھا مگر اپنے اعمال کا جوابدہ ملکی باشندوں کے بجائے "کسی اور کو" تھا۔ مگر اب صوبوں میں نظم ونسق کی باگ ڈور منتخبہ اراکین کے ہاتھ میں ہے اور وہ اہل ملک یا اپنے منتخب کرنے والوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ایسی صورت میں پرانی روایات کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ ہر چیز میں تغیرات ہو رہے ہیں، اور ملک کا معاشی نظام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس نے ہندوستان کے معاشی نظام پر غور وفکر کرنے کے لئے پنڈت جواہرلال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جس کا مقصد خود اس کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

> "جماعت کی عام مرفہ الحالی میں اضافہ کرنا، بالخصوص نظم اور قاعدہ طریقہ کے ساتھ ملک کی ہر جہتی معاشی ترقی کی کوشش کرنا، پیدائش دولت کے نئے نئے ذرائع معلوم کرنا اور ان کو اس طور پر جماعت کے افراد میں تقسیم کرنا کہ پیدا کنندوں اور صارفین افراد اور جماعت کے مفاد میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے، اور موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے مابین مختلف مفادات میں یکسانیت قائم ہوسکے۔"

کمیٹی میں سیاسی لیڈروں کے علاوہ ملک کے مشہور معاشین بھی شامل ہیں، کمیٹی نے اپنا سوال نامہ

جو ۱۶۷ سوالات پر مشتمل ہے تیار کرکے شائع کر دیا ہے۔ گو یہ سوال نامہ صوبجاتی حکومتوں کے لیے تیار کیا گیا تھا مگر ہندوستانی ریاستوں، تجارتی، زرعی، صنعتی اداروں، مزدوروں کی جماعتوں اور معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے افراد سے بھی یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ متعلقہ مواد بہم پہنچانے میں کمیٹی کی امداد کریں مختلف قسم کا مطلوبہ مواد فراہم ہو جانے کے بعد کمیٹی غور کرے گی کہ ملک کے لیے کوئی ایسا موزوں اور مناسب معاشی لائحہ عمل تیار کیا جائے جس سے ملک کی مرفہ الحالی اور خوش حالی میں اضافہ ہو سکے۔

اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ ہم کو اکنامک پلاننگ کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ اس نظم کا ذمہ دار کون ہوگا، کیا حکومت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تجارتی کاروبار اور اداروں کو اسی کامیابی سے چلا سکے جس طرح کہ خانگی افراد چلاتے ہیں۔ معاشی معاملات میں حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوتے ہیں، مختلف ملکوں میں حکومت نے جو معاشی معاملات میں مداخلتیں کی ہیں۔ اس کے کیا نتائج رہے ہیں اور ان سے کیا سبق سیکھا جا سکتا ہے، کیا حکومت کو کسی معاشی شعبہ میں دخل نہیں دینا چاہیئے، اور اگر مداخلت کی جائے تو کن شعبوں میں اور کس حد تک، یہ اور اسی قسم کی دوسری باتوں پر اس مضمون میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو پلاننگ کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے، اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام اس رفتار سے کام نہیں کر رہا ہے جتنا کہ منظم معاشی نظام کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیوں معاشی نظام اس رفتار سے کام نہیں کر رہا جتنا کہ قبل از جنگ کر رہا تھا؟ پلاننگ کے حامی کہتے ہیں کہ موجودہ مسابقتی طریق میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ لیکن مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالات میں تبدیلی کس طرح ہوئی اور اس تبدیلی کا ذمہ دار کون ہے؟ موجودہ کساد بازاری دو چیزوں کا نتیجہ ہے، پہلے یہ کہ جنگ کے بعد سے سیاسی مداخلتیں معاشی نظام میں رخنہ اندازیاں کرنے لگیں، دوسرے یہ رجحانات اگر بالکلیہ نہیں تو کم از کم بڑی حد تک حکومت کی پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ پروفیسر رابنس لکھتا ہے کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے دوران میں معاشی نظام کی یہ صلاحیت کہ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں توازن

قائم کر سکے کمزور ہو گئی، جنگ سے قبل سرمایہ دارانہ دور کا خلاصہ یہ تھا کہ بازار آزاد تھا، اس کا یہ مطلب تھا کہ اشیا کی خرید و فروخت اور عاملین پیدائش حکومت کی من مانی مداخلت، یا متحکم اجارہ داری یا اقتدار کے قبضے میں نہ تھے۔ لیکن اس کے بعد ان میں سخت سے سخت رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں، صنعتی اتحادات، مزدور سبھاؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت، اور حکومت کے اقتداری اثرات نے ایک ایسا معاشی نظام پیدا کر دیا جس میں قدیم سابقتی نظام کے مقابلہ میں تبدیل شدہ حالات کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کی صلاحیتیں کم تھیں۔" سرمایہ داری طریق اس لئے ناکام نہیں ہوا کہ اس میں بنیادی کمزوریاں تھیں، بلکہ اس کی ناکامی کا باعث وہ طریقے تھے جو توازن قائم کرنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ دوران جنگ کے معاشی رجحانات نے اس نظام میں گڑبڑ پیدا کی، اجرتوں میں بست وکشاد باقی نہیں رہی اجارہ اور اتحادوں نے آزاد بازاروں کا خاتمہ کر دیا۔ مال واسباب اور خدمات کے تبادلہ پر حکومت کی جانب سے پابندیاں عائد ہونے لگیں، انفرادی طور پر ملکوں نے صنعتی اقتدار، اور صنعتی امداد کے طریقوں کو اختیار کرنا شروع کیا، درحقیقت ان ہی رجحانات اور پالیسی کی بدولت عارضی طور پر مروجہ معاشی نظم میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

جو لوگ معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کے قائل ہیں ان کو یہ بات نظرانداز نہ کرنا چاہیئے کہ حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر کساد بازاری ہوتی رہی ہے مگر حالیہ کساد بازاری کے مقابلہ میں کوئی اتنی طویل اور شدید نہ تھی، یہ طوالت اور شدت دراصل حکومت کی مداخلت کا نتیجہ تھی پہلے کی کساد بازاریاں جو اس قدر طویل اور شدید نہ ہوتی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادانہ معاشی قوتیں خود بخود توازن پیدا کر لیا کرتی تھیں، مگر اس مرتبہ حکومت کی پالیسی کی بدولت مختلف قوتوں میں توازن قائم نہ ہو سکا۔ اجرتوں میں استقامت کی حالت باقی نہیں رہی۔ صنعت وحرفت اور زراعت کے اتحادوں نے معاشی نظام میں گوناگوں خرابیاں پیدا کر دیں، یورپین ممالک کے صنعتی اتحادوں کی وجہ سے امتناعی محاصل اور دوسرے اخلاقی اصولوں کا آغاز ہوا۔ دنیا کی حالت بہتر ہو جاتی اگر حکومت کی پالیسی ان باتوں کی شدت میں اضافہ کرنے کے بجائے ان میں تخفیف کی کوشش کرتی، پروفیسر

رابنس نے صحیح کہا ہے کہ "حکومت کی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ صنعت کے لئے ایک ایسا میدان پیدا کیا جائے جہاں کاروبار اور ذرائع میں پھر ایک مرتبہ بازار کے حالات سے تطابق پیدا ہو جائے۔

اب ہم تفصیلی طور پر ان کوششوں کا مقابلہ کریں گے جو معاشی نظم کے سلسلہ میں مختلف ممالک میں اختیار کی گئیں تاکہ ان کی روشنی میں صحیح نتائج پر پہنچنے میں مدد مل سکے۔

<u>نیو ڈیل کا تجربہ</u> | سنہ ۱۹۳۳ء میں جب مسٹر روز ولٹ امریکہ کے صدر ہوئے تو اس وقت امریکہ انتہائی شدید کساد بازاری کی آفت میں تھا، ملک تاریخ کے سیاہ ترین ایام سے گذر رہا تھا، اس سے پہلے کی کوئی کساد بازاری اس قدر شدید اور طویل نہ تھی، معاشی زندگی کے ہر شعبہ پر اس کا اثر پڑا، بے روزگاروں کی تعداد ۱۲ ملین تک پہنچ گئی۔ قومی آمدنی میں گرم بازی کے دور کے لحاظ سے ۵۰ فی صدی کمی ہوگئی محاصل میں کمی ہونے لگی، سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں محاصل کی تعداد ۱۱۴۲ ملین ڈالر تھی تو سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں وہ صرف ۶۴۷ ملین ڈالر رہ گئی۔ کاشتکاروں کی حالت (جو خوش حالی کے زمانہ میں بھی شکوے شکایات کے عادی تھے) اور تباہ ہوگئی۔ ان کی خام آمدنی سنہ ۱۹۳۰ء میں ۴۵۴، ۹ ملین ڈالر تھی تو سنہ ۱۹۳۲ء میں ۱۳۳، ۵ ملین ڈالر رہ گئی۔ زمینوں کی قیمت میں تخفیف ہوئی، اس سے کاشتکاروں کی ساکھ گھٹنے لگی، اور ان کے قرضوں کے بار میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کے علاوہ زرعی پیداواروں اور مصنوعات کی قیمتوں میں عدم توازن کی صورت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے کاشتکاروں کی قوت خرید گھٹ گئی۔ ۱۹۲۹ء کے بعد سونے کی مسلسل برآمد سے زر کی تفریط ہو کر اعتبار میں کمی اور قرضے کے بار میں اضافہ ہونے لگا۔

بنکوں کی ناکامیوں نے تباہی کی آگ میں تیل کا کام کیا، محاصل کر وڑگیری میں اضافہ ہو کر ان کی سطح تقریباً امتناعی محاصل کے برابر ہوگئی۔ جس کی وجہ سے تجارت کو زبردست نقصان پہنچا، درآمد کرنے والے ممالک نے جب یہ دیکھا کہ ان کا مال امریکہ میں فروخت نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے یہاں کی درآمد کو روکنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں اس سے امریکہ کی برآمد کو نقصان پہنچا مختصراً یہ کہا

جا سکتا ہے کہ جب ریز ولٹ نے کرسی صدارت سنبھالی اس وقت بے روزگاری اپنے انتہائی عروج پر تھی، قیمتوں کی سطح ادنیٰ تر ہو چکی تھی، زر کی تفریط تھی، بنک ناکام ہو رہے تھے، تجارت خارجہ گھٹ گئی تھی، اور نئے صدر کو اس صورت حال کا مقابلہ کرنا تھا، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مشکلات آسانی سے رفع نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے غیر معمولی طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کساد بازاری کو دور کرنے، اور حالات کو بحال کرنے کے لئے جو مختلف تدابیر اختیار کی گئیں اور قوانین بنائے گئے ان کو "نیو ڈیل" کہا جاتا ہے یہ قوانین مختلف چیزوں مثلاً بینکاری، طلا، نقرہ، زر کاغذی وغیرہ کے لئے بنائے گئے۔ مگر اس سلسلہ کے دو قانون اہم ہیں، پہلا "قانون بحالی قومی صنعت ۱۹۳۳ء" (نیشنل انڈسٹریل ریکوری ایکٹ) اور دوسرا "قانون توازن زراعت ۱۹۳۳ء"

پہلا قانون مارچ ۱۹۳۳ء میں نافذ ہوا، اس کا مقصد بے روزگاری کو دور کرنا تھا، اس وقت لاکھوں خاندان بے روزگاری کی وجہ سے مصیبتوں میں گرفتار تھے، ۱۹۳۲ء سے پہلے امریکہ میں بے روزگاری کا بیمہ یا اور کسی قسم کے امدادی طریقوں کا رواج نہ تھا، صرف چند شرقی ریاستوں میں جہاں برطانوی اثر تھا، ملکہ الزبیتھ کے زمانہ کے قوانین مفلسی رائج تھے، یا چار ریاستوں میں حکومت افراد کی بعض معاملات میں امداد کیا کرتی تھیں، اس وقت امداد کا عام طریقہ خانگی خیرات تھا، خانگی اداری مخیر اور فیاض افراد عام حالات میں مفلسوں کی قابل لحاظ امداد کیا کرتے تھے مگر کساد بازاری کے دور میں ایک طرف مفلسوں کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا اور دوسری طرف مال دار لوگوں کے حالات خراب ہونے لگے، تو خانگی اداروں یا افراد کے بس کی بات نہیں رہی کہ وہ ان کی امداد کریں۔ چنانچہ اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے حکومت نے مرکزی خزانے کو مجاز گردانا کہ وہ ۳۰۰ ملین ڈالر سے امدادی کام شروع کرے، (یہ رقم حالات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت قلیل تھی) چونکہ مرکزی حکومت اپنے دستور کے لحاظ سے براہ راست ان کی مدد نہیں کر سکتی تھی اس لئے یہ رقم ریاستوں کے سپرد کی گئی تاکہ وہ اس سے امدادی کام شروع کریں، جن لوگوں کی امداد کی جاتی تھی ان سے کام بھی لیا جاتا تھا مگر یہ کام محض اوقات گذاری تھا، کیونکہ ان کے لئے مختلف کام فراہم کرنا دشوار تھے، اگر ان سے پیداوار کا کام لیا جاتا تھا تو ان

افراد کو شکایت پیدا ہوتی تھی۔ جو اس کام کے معاوضے میں اعلیٰ اجرتیں ادا کر رہے ہوتے تھے، کیونکہ غیر مساوی مقابلہ کی بنا پر خانگی افراد کو نقصان ہوتا تھا۔ غیر پیداوار کام محض تضیع اوقات تھا، پھر یہ دشواری بھی تھی کہ بے روزگار مختلف پیشوں کے لوگ تھے اور ان کے لئے موزوں کام فراہم کرنا آسان بات نہ تھی، کیونکہ یہ لوگ وہی کام آسانی سے کر سکتے تھے جس کو پہلے سے کر رہے ہوں نیا کام کرنا ان کے لئے مشکل تھا، ان مختلف دشواریوں کی بنا پر ۳۵ء کے اختتام تک اس پالیسی میں تبدیلی ہوگئی، اور حکومت نے مختلف تعمیری کام مثلاً سڑکوں، پلوں، اور عمارات کی تعمیر وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔

دوسرا قانون بہت ہی جامع تھا، یہ صنعت کے ہر شعبہ پر حاوی تھا، اس نے مصنوعات کی قیمت بڑھانے اور غیر مساوی مقابلوں کے بجائے مساوی مقابلوں کو رائج کرنے کی کوشش کی، مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ اور اوقات کار میں تخفیف کی گئی۔ اوقات کار میں کمی اس لئے کی گئی تاکہ زائد مزدوروں کو کام مل سکے، بچوں سے کام لینے کی مخالفت کرنے کی بھی یہی وجہ تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصارف پیدائش بڑھ گئے۔ اور مصارف پیدائش کے اضافہ کی وجہ سے عام صنعتی ترقی میں مشکلات پیدا ہونے لگیں۔

اس قانون کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا یہ قانون خود ہی پیچیدہ تھا مگر کمیٹی نے اس کو اور پیچیدہ کر دیا دو سال کے عرصہ میں اس قانون کے تحت ۴۶۵ قواعد اور ۱۰۵ ذیلی قواعد بنائے گئے، ہر صنعت کے قواعد الگ تھے، جو صنعتیں اس قانون کے تحت آچکی تھیں وہ "نیلے عقاب" کا نشان استعمال کرتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب تجدیدی دور میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان قواعد کے اطلاق کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی ان میں صرف آجروں کے نمایندے تھے، صارفین کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا گیا، بہرحال دو سال کے عرصہ میں پتہ چلا کہ قانون کے اکثر قواعد محض کاغذی حیثیت رکھتے ہیں اور جو مروج ہیں وہ بھی اطمینان بخش طریقہ پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قانون کا نفسیاتی اثر بڑا اچھا رہا۔ بیرون ملک اور اندرون ملک کا ہر شخص خیال کرنے لگا کہ کوئی نئی چیز وجود میں آگئی ہے، لیکن اس کے خالص معاشی فوائد توقعات سے بہت کم پورے ہوئے، اور

جب خوشحالی دنیا کے حالات میں تبدیلی شروع ہوئی تو امریکہ میں بھی تغیرات ہوئے۔ گویا جو چیز امریکہ نے نیوڈیل کی کوششوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی وہ دوسرے ملکوں میں بغیر کسی قسم کی تدابیر کے حاصل ہوگئی۔

ان قواعد کا فوری نتیجہ قیمتوں کے اضافہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ قیمتوں میں اضافہ سے طلب میں تخفیف ہوئی اور بعض صنعتیں خصوصیت سے اس سے متاثر ہوئیں مگر اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس قانون کا اطلاق ہر شعبہ پر نہ تھا اس لئے یہ گمان غلط نہیں ہے کہ اگر یہ چیز شدید اور عام ہوتی تو حالت اور زیادہ ابتر ہو جاتی۔ بہرحال یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بدولت ملک کی خوشحالی میں کس قدر اضافہ ہوا، کیونکہ دوسرے اسباب مثلاً بین الاقوامی صورت حال کی بتدریج اصلاح، امریکہ میں زر کی ارزانی، اعتبار کی وسعت، زر کی قدر میں کمی، زرعی تنظیم وغیرہ بھی حالات میں اصلاح کرنے میں مدد کر رہی تھیں۔

اس قانون کے اثرات کام کرنے والوں پر بہت کم ہوئے، گو ۳۲ء کے مقابلہ میں اجرتوں میں اضافہ ہوا مگر مجموعی اجرت ۲۹ء کے مقابلہ میں ۵۰ فی صدی رہ گئی امریکن مزدور کے اوقات کار میں کمی ہوئی مگر اس کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنا پڑی بہرحال حالات کے عود کرنے میں اس قانون نے امداد کی یا رکاوٹیں پیدا کیں اس کا تعین دشوار ہے، لیکن اس سے ایک بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کسی قوم کی خرابیوں کا علاج صرف جامع قانون سازی سے نہیں ہو سکتا، تجدید خود بخود اندرونی حالات کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسا کہ ایک مریض جس کو دواؤں کا عادی بنا دیا گیا ہو، جب تک دواؤں کا استعمال جاری رہے یا اس کا اثر باقی رہے مریض تندرست نظر آتا رہے مگر اثر ختم ہوتے ہی یا علاج چھوڑتے ہی اس کی حالت خراب ہو جائے۔ طویل بیماریوں میں عارضی دواؤں سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ یہی صورت امریکہ کی تھی، وہ باوجود ان قوانین کے برطانیہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ذیل کے ستقابلہ اعداد سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مختلف سالوں میں ان دونوں ملکوں میں صنعتی پیداوار کی مجموعی تعداد کیا رہی۔

صنعتی پیداواریں

	برطانیہ عظمیٰ	ریاست ہائے متحدہ امریکہ	
سنہ ۱۹۲۴	۱۰۰	۱۰۰	(سنہ ۲۳ تا سنہ ۲۵)
سنہ ۲۵	۹۷	۱۰۴	
سنہ ۲۶	۷۵	۱۰۸	
سنہ ۲۷	۱۰۸	۱۰۶	
سنہ ۲۸	۱۰۲	۱۱۰	
سنہ ۲۹	۱۱۱	۱۱۸	
سنہ ۳۰	۹۸	۹۶	
سنہ ۳۱	۸۴	۸۱	
سنہ ۳۲	۸۵	۶۴	
سنہ ۳۳	۹۰	۷۷	
سنہ ۳۴	۱۰۲	۷۹	
سنہ ۳۵	۱۰۸	۹۰	

جرمنی اگر پہلے بھی جرمن حکومت معاشی زندگی میں مداخلت کرتی رہی تھی، بالخصوص جنگ عظیم کے زمانہ میں غلوں، گوشت، اور دوسری چیزوں کی مقامی پیداوار بڑھانے کے لیے مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کی گئی مگر نازی نیشنل سوشلسٹ دور میں مداخلت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔

۳۲-۱۹۲۴ء کے درمیان زراعت کی تجدید کی کوشش شروع ہوئی اور زراعت کی امداد کے لئے متعدد قوانین بنائے گئے۔ پہلے درآمد کو روکنے کے لئے بھاری محصول لگائے گئے اور جب اس سے کام نہ چلا تو حکومت کی توجہ منڈیوں کی جانب منعطف ہوئی، اس زمانے میں زرعی قرضہ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ۲۵ء میں اس کی تعداد ۳۰۰۰، ملین ریش مارک تھی تو ۳۲ء ۶۵، ۱۱ ملین ریش مارک ہو گئی۔ سود کے بار میں الگ اضافہ ہوا، یہ سب حکومت کی مداخلت کے باوجود ہوا، گو ۳۲-۲۴ء کے درمیان ۲۰ سے زائد قانون پاس ہوئے کہ قیمتوں میں توازن قائم رہ سکے، مگر کاشتکاروں کی حالت میں اصلاح نہ ہو سکی۔

نازی پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے دوسری پارٹیوں نے کاشتکاروں اور مزدوروں کی جانب کوئی توجہ نہیں کی، کاشتکار اگرچہ نازی فلسفہ کے حامی نہ تھے مگر محض اس احتجاج کی خاطر کہ کوئی ان کی نہیں سنتا نازیوں کے ہوا خواہ بن گئے۔ نازی لیڈروں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا، وہ کاشتکاروں کا اعتماد حاصل کرنے اور اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسا پروگرام بنانا ضروری سمجھنے لگے جن سے کاشتکار خوش ہوں، انھوں نے اپنے ایک مشہور لیڈر کو کسانوں میں قومی اشتراک کی تبلیغ کے لئے مقرر کیا، اور خاص پروگرام مرتب کیا، اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ یہودیوں کی برائیوں کو اچھی طرح واضح کیا جائے تاکہ کاشتکاروں کو یقین ہو جائے کہ ان کی ساری مصیبتوں کا باعث یہودی ہی ہیں پروگرام کی چند اہم باتیں یہ تھیں

۱۔ مروجہ طریق محصول کی وجہ سے زراعت پر صنعت کے مقابلہ میں محصول کا بار زیادہ ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جرمن حکومت یہودیوں کی مالی امداد پر چل رہی ہے، اور اس طرح یہودی جرمن قوم کو تباہ کر رہے ہیں۔

۲۔ اس وقت زراعت کی جانب سے جو لاپروائی اختیار کی جارہی ہے وہ ملک کے لئے مضر ہے۔
۳۔ زرعی پیداواروں میں منافع کی کثیر رقمیں درمیانی آدمی وصول کر رہے ہیں، درمیانی آدمی زیادہ تر یہودی ہیں۔
۴۔ کاشتکاروں کو ان تجارتی اشیا کی جن سے زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے اور بجلی کی قیمت گراں دینا پڑتی ہے، اور یہ دونوں کاروبار کلیتہً یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

نازی پروگرام معلوم کرنے سے پہلے نازی تصوریت کو سمجھنا ضروری ہے، اس کے دو اہم اصول یہ ہیں کہ نسلی وحدت جو ایک زبان، ایک خون اور ایک تمدن سے بنی ہو، معاشری، معاشی اور سیاسی ارتقائے انسانی میں ایک بنیادی عنصر ہے، غیر تمدن اور غیر خون کی آمیزش، اور ملک میں باہمی مخاصمت رکھنے والے طبقوں کے وجود سے آپس میں تفریق کی خلیج پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے جرمنی قوم کی تفریق کا بڑا سبب مروجہ سرمایہ دارانہ طریق ہے جن میں افراد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور قوم میں مختلف طبقے پیدا ہو گئے ہیں جن کے مابین کوئی باہمی سمجھوتہ نہیں ہے۔ محل داروں اور سود خواروں نے قوم کے اخلاق پر ذہنی معاشی اور سیاسی اقتدار حاصل کر لیا ہے۔

نازی پروگرام (۱) جرمنی کی زمینیں جرمنی قوم کے قبضے میں رہیں گی

(۲) وہ زمین جو قانوناً جرمنوں کے قبضہ میں ہے ان کی موروثی جائداد سمجھی جائے گی

(۳) جرمنی کی زمین تخمین کا باعث نہ ہو سکے گی، اور نہ یہ بغیر محنت کے آمدنی کا ذریعہ ہوگی، آئندہ سے صرف ان ہی افراد کو زمین دی جائے گی جو خود کاشت کر سکتے ہیں، اس وجہ سے حکومت کو زمین کی بیع کا حق حاصل ہو گیا، زمین کی کفالت پر آئندہ سے خانگی ساہوکاروں کو قرض دینے کی مخالفت کر دی گئی۔

(۴) حکومت جرمن زمین کے استعمال کا ایک محصول وصول کرے گی، اس کے علاوہ زراعت سے اور کوئی محصول وصول نہیں کیا جائے گا۔

(۵) وراثت میں زمین کے حصے بخرے نہ ہوں گے۔

(۶) حکومت ان مالکان زمین کو بے دخل کرنے کا حق رکھتی ہے جو اس کی دانست میں ناموزوں

ہوں، اور جرمن قوم کے لئے اشیائے خوراک مہیا نہ کرتے ہوں۔

(۷) زمین ان افراد کو دی جائے گی جن کے پاس زمین نہیں ہے، اور جو قوم کے مفاد کی خاطر کام کرنے پر تیار ہوں۔

نازی پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی یہ پروگرام مستقل پالیسی بن گیا، کاشتکاروں کی امداد کے لئے فوری تدابیر اختیار کی گئیں۔ مثلاً زرعی محاصل میں اضافہ ممنوع قرار دیا گیا، شرح سود میں تخفیف کی گئی ربا کے متعلق سخت قانون بنائے گئے، حکومت نے اپنے معاشی پالیسی میں زراعت کو اہمیت دی اور برآمدی محاصل لگا کر اندرونی پیداواروں کی حفاظت کی گئی۔ عام مزدوروں کے مفادات کی ضمانت کی گئی، کسانوں کی عام سطح زندگی کو بڑھانے کے لئے تعلیم، نوجوانوں کے کلب، اور اسی قسم کے دوسرے طریقے اختیار کئے گئے۔

نازی پالیسی کے سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے جماعتی مفاد کو دوسرے تمام مفادات سے اعلیٰ قرار دیا۔ ہر قسم کے خانگی، تجارتی اور معاشی مفاد حکومت کے مفاد کے تحت ہوں گے نازی لیڈروں نے علی الاعلان کہا "قانون کے ذریعہ سے ہر قسم کی جدوجہد پر اقتدار حاصل کیا جائے گا کیونکہ قوم معاشی طریق کے فوائد کی خاطر زندہ نہیں رہتی اور نہ معاشی طریق اصل سے فوائد حاصل کرنے کی خاطر ہے، بلکہ اصل سے معاشی طریق کو تقویت ہوتی ہے اور معاشی طریق حکومت کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔" وہ جرمنی کو ایک خودکفیل اکائی بنانا چاہتے ہیں اور اس کی خاطر ملک کے تمام معاشی ذرائع کو اس طرح منظم کرنا چاہتے ہیں کہ ملک ہر حال میں دوسروں کا دست نگر نہ رہے، یہ خیال تھا کہ کاشتکار کی تباہی جرمن معیشت اور جرمن قوم کو نقصان پہنچائے گی، اسی کی خاطر نازی نصب العین میں کاشتکار کو اہم مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

نازی پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے زمینوں کی فروخت ممنوع قرار دی گئی۔ اس کے یہ معنی تھے کہ طویل قرضوں کی کفالت کے لئے کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ اس کی وجہ سے کاشتکاروں کو ان ساہوکاروں سے نجات دلائی گئی

جو جرمن قوم کا خون چوستے ہیں۔ کاشتکاروں کو موروثی زمین بغیر کسی موروثی ذمہ داری یا بار کے ملنے لگیں، ان پر چند پابندیاں بھی عائد کی گئیں مثلاً وہ غیر آرین نسل سے شادی نہیں کر سکتے، گویا شادی اب ایک شخصی اور خانگی معاملہ نہ رہا۔ جرمن قوم کے مجموعی حیثیت سے کاشتکار کو یہ پابندی تسلیم کرنا چاہیئے۔ متعدد افراد کو محض اس وجہ سے جیل بھیجا گیا کہ انھوں نے ممنوعہ طبقوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ نازی پارٹی گذشتہ صدی کی "زمیندار شرفا" کی جماعت کے برخلاف "کسانوں کی ایک نئی جماعت" پیدا کرنا چاہتی تھی، جس طرح قدیم زمیندار بادشاہ کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے تھے اسی طرح کسانوں کی یہ جماعت قومی اور سیاسی جماعت کی ریڑھ کی ہڈی ہوگی۔ وراثت میں قانون کا ملائیت رائج کیا گیا، اور اگر وارث بیٹا برا کسان ثابت ہو تو زمین دوسرے وارثوں کو دے دی جاتی تھی۔ اب چونکہ قرض ملنے میں دشواریاں پیدا ہونے لگیں تھیں، اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ زراعت کی ترقی، منڈیوں کی تنظیم اور قیمتوں میں توازن قائم کرنے کی خاطر قانون بنائے جائیں چنانچہ ستمبر ۳۳ء میں یہ قانون نافذ ہوا اس کی رو سے حکومت نے زرعی پیداواروں کی میں قیمتوں کی ذمہ داری لی، اور کارخانہ داروں کو خام پیداوار خریدنے کے لیے ایک مقررہ قیمت ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۳۳ء کے "غلہ کی تجارت کے قواعد" سے پیداواروں کی قیمتیں بالکل حکومت کے ہاتھ میں آگئیں، گو کاشتکاروں کو اس سے نقصان پہنچنے لگا مگر ان کو یہ باور کرایا گیا کہ قوم کے مفاد کی خاطر ان کو یہ نقصانات برداشت کرنا چاہییں۔

جرمنی میں معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کی وجہ سے ۳۴ء میں ۲۰۲ قوانین اور ۳۷۶ ڈگریاں جاری ہوئیں، ۳۵ء میں ان میں ۱۵۰ قوانین، اور ۷۰۰ ڈگریوں کا مزید اضافہ ہوا، اور ۳۶ء کا اضافہ الگ ہے۔ مزدوروں کے متعلق مختلف قانون بنائے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ ہر کارخانہ کے تاجر مالک، تنخواہ دار ملازم، اور مزدور قوم اور حکومت کے مفاد کی خاطر اشتراک سے کام کریں گے ہڑتال اور دربندیاں ممنوع قرار دی گئی۔ مزدوروں کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح قوم کے لئے قربانیاں کرنے پر تیار ہونا پڑا۔ خود کفالت کی پالیسی کی وجہ سے جرمنی کے معیار رہائش میں اضافہ ہوا، مگر مزدوروں کی اجرتوں میں تخفیف ہونے لگی، مگر مزدوروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی قسمت پر قانع رہیں۔

۱۹۳۵ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام لوگ جو مختلف صنعتوں میں کام کرتے ہیں یہ ثابت کریں کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں ہیں، اس کا مقصد غیر موزوں اور نا اہل لوگوں کو پیشوں سے خارج کرنا تھا، تاکہ صنعتیں ترقی کر سکیں، نیز تجارتی تبلیغ، اشتہار بازی، نمائشوں، میلوں، بجلی، ریل، سڑکوں، موٹروں، دوسرے ذرائع نقل و حمل اور بنکوں کے لئے متعدد قوانین بنا کر ان سب کو حکومت کے زیر اقتدار لے آیا گیا۔

معاشی زندگی میں حکومت کی مداخلت کے کیا اثرات ہوئے، اور وہ اچھے تھے یا برے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ جرمن لیڈروں کے پیش نظر صرف معاشی امور نہ تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "صرف" میں تخفیف کی، نہ صرف تمدنی اور تعیشاتی اشیا میں بلکہ قومی استحکام کی خاطر اشد ضروریات میں بھی کمی کی جانے لگی۔ اجرتوں میں تخفیف اور قیمتوں کے اضافہ پر جب قوم نے ناک بھوں چڑھائی تو ان سے کہا گیا کہ اس مصیبت کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنا چاہیئے کیونکہ یہ جرمن قوم کو بیرونی خطروں اور بالخصوص اشتمالیت کے ڈر سے آزاد کر دے گی۔

ہر روڈلف ہیس نے جو ہٹلر کے نائب تھے ایک موقعہ پر کہا "اگر موجودہ معاشی لڑائی ناکام رہے تب بھی کسی کو کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے کیونکہ جرمنی اپنے اسلحہ کی بدولت دشمنوں (روس) پر غالب آنے کی قوت حاصل کرے گی۔ ہم کو آئندہ کم چربی، کم گوشت، اور کم انڈے صرف کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، کیونکہ یہ چھوٹی قربانیاں در اصل قومی آزادی کی قربان گاہ پر قربانی ہے۔" ایک دوسرے موقعہ پر جرمن عورتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ہر نئی توپ، نئی تباہ کن مشین اور نیا جہاز جرمن ماؤں کی حفاظت میں اضافہ کرتا ہے، اور ضمانت لیتا ہے کہ ان کے بچے آئندہ لڑائیوں میں قتل نہ کئے جائیں اور بالشویک ان کے گلے نہ کاٹ سکیں ـــــ ایک اچھی گھر کی مالکہ اس بات پر ہرگز ملال نہ کرنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف کے لئے ایک پونڈ گوشت زیادہ حاصل نہیں کر سکتی۔"

سب سے زیادہ تعجب خیز چیز یہ ہے کہ جرمن عورت ہر طرح سے اس قربانی کے لئے تیار ہو گئی ایسی صورت میں معاشیات دان کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ صورت حال اس کے قابو سے باہر ہے، مگر

جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس پالیسی کے معاشی فوائد بڑے عمدہ ہیں تو معاشیات داں حیرانی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جرمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ راز میں ہے اس قسم کے اعداد و شمار موجود نہیں جن سے نتائج نکالے جائیں۔ حتیٰ کہ دو سال سے موازنوں کے تفصیلی حسابات بھی شائع نہیں ہوئے سرکاری اداروں کی جانب سے شائع کردہ اعداد کو علمی تحقیقات کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ اس کی خامیوں کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پھر ملک میں زر کے مختلف درجے ہوگئے ہیں۔ گو اصولاً جرمنی معیار طلا پر قائم ہے مگر عملاً ملک میں ۱۳ قسم کے ریش مارک جاری ہیں۔ جن کی قیمتیں مختلف ہیں اس کی وجہ سے اعداد و شمار کے باوجود مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جرمنی کی پالیسی زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہی مگر اس سے چھوٹے کاشتکاروں کو اس لئے فائدہ نہیں پہنچا کہ وہ اپنی پیداواروں کا بڑا حصہ خود ہی صرف کر لیتے ہیں البتہ بڑے کاشتکاروں کو قیمتوں کی زیادتی سے فائدہ ہوا۔ بہرحال جرمنی نے مختلف چیزوں میں خود کفالت کا درجہ حاصل کیا اور اس تخیل کے تحت مصارف پیدائش کے اضافہ کی قطعاً پرواہ نہ کی گئی۔ اب ملک میں کوئلہ، روٹی کے غلے، ترکاریاں، گوشت، آلو، شکر، جو، جئی، سوفی صدی گرمی، انڈے، پھل، دودھ کی اشیا، شراب، مصنوعی، پنیر، برش وغیرہ کے بال ۹۰ سے ۱۰۰ فی صد تک ملک میں پیدا ہو رہے ہیں۔ البتہ پارچہ بافی کا خام مال، اون، روغنی تخم، نباتی تیل، روئی، ربڑ گوند کی پیداوار کم ہے مگر ان میں بھی ترقی کی کوشش ہو رہی ہے۔ موٹر کے تیلوں کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے ربڑ چمڑے اور کھالوں میں بھی ملک کو خودکفیل بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

جرمنی میں آزادانہ معاشی قوتیں کارفرما نہیں ہیں۔ درآمد پر سختی سے حکومت کا قبضہ ہے، ملک میں ۲۷ مرکزی بورڈ قائم ہیں جو اپنی مفید اشیا کی درآمد پر قابو رکھتے ہیں،

ہر چیز کی درآمد کے لئے بورڈ سے "درآمدی سرٹیفکٹ" حاصل کرنا پڑتا ہے، جو صرف اسی صورت میں دیا جاتا ہے کہ اس کی درآمد ملک کے لئے مفید ہے۔ اس کی وجہ سے درآمد کم ہوتی جارہی ہے، جرمنی کی برآمد میں ۳۵ء میں ۳۲ء کے مقابلہ میں اضافہ ہوا مگر برآمد کرنے والوں

کو مجموعی قیمتیں کم لیں۔ ذیل کے اعداد سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے

	قیمت ملین ریش مارک	مقدار میٹرک ٹنوں میں
۱۹۲۳ء	۴۸،۷۱،۴۰۵	۴،۱۸،۳۱،۶۲۴
۱۹۲۴ء	۴۱،۶۶،۸۷۸	۴،۵۲،۱۷،۷۵۹
۱۹۲۵ء	۴۲،۶۹،۶۶۷	۵،۰۱،۲۷،۳۱۰

اس غیر معمولی صورت حال کی توجیہ وہ مختلف اسباب ہیں جو اختیار کئے گئے، مگر ان میں اہم حکومت کا امدادی طریق، دوسرے نئے بازارت حاصل کرنے کی خواہش اور تیسرے سیاسی امور تھے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حکومت کی مداخلت کی وجہ سے مصارف پیدائش میں زیادتی ہوگئی تھی اس وجہ سے جرمنی کو بیرونی بازاروں میں ممالک غیر کے مال سے مقابلہ کرنے میں دشواریاں پیش آنے لگی تھیں، اس کا لازمی نتیجہ جرمنی کی برآمد میں تخفیف کی صورت میں ہونا چاہیئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا، اس کی وجہ وہ گراں قدر رقومات تھیں جو حکومت نے بطور امداد عطا کیں، اندازہ ہے کہ صرف ۳۵ء میں ۱۰ اکرو ڈر ریش مارک امداد پر صرف کئے گئے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس امداد کرنے کے لئے اتنی کثیر رقم کہاں سے آئی، اس کے لئے حکومت نے مختلف طریقے اختیار کئے۔ مثلاً ۳۲-۱۹۳۳ء سے یہ رقم اس طرح حاصل کی گئی کہ تمام غیر ملکیوں کی جو رقومات جرمنی کے بنکوں میں جمع تھیں ان کو ملک سے باہر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کی وجہ سے ان کی مالیت گھٹ گئی۔ اور بیرونی لوگ اس بات کے لئے تیار ہو گئے کہ اس کے معاوضہ میں جو چیزیں بھی ان کو آسانی سے مل جائیں وہ لے لیں، چنانچہ مختلف اشیا باہر روانہ کی گئیں اور ان رقومات پر حکومت کا قبضہ ہو گیا اسی قسم کی ترکیب جرمنی کے تمسکات رکھنے والے غیر ملکی افراد کے ساتھ کی گئی۔ اور حکومت کو اس کاروبار سے بھی منافع ہوا۔ ۳۳ء میں ایک قانون کے ذریعہ جرمن باشندوں کو پابند کیا گیا کہ وہ بیرونی لوگوں کو جو رقمیں ادا کرنے والے ہیں وہ ریش مارک میں ادا کریں، غیر ملکیوں کو یہ رقم کچھ نقد اور کچھ جرمنی کے تمسکات کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں، ان

تمسکات کی مانگ بیرونی بازاروں میں بہت کم تھی، یہ پھر جرمنی میں آکر فروخت ہوتے تھے اور ان پر کافی بٹہ کاٹ کر نفع کمایا جاتا تھا۔ جب یہ ذرائع بھی کم ہونے لگے تو "خود امداد" کے نام سے تمام مصنوعات پر ٹیکس لگایا گیا، اور اسی طرح جو رقم جمع ہوئی اس کو امدادی کاموں پر صرف کیا گیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرون ملک چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا، اور حکومت کی امداد کا اثر جرمنی مصارف پر پڑ رہا ہے واقعی جرمنی مصارف کی حالت قابل رحم ہے۔

اس زمانہ میں دوسرے ممالک میں صرف کا اوسط بڑھ رہا ہے مگر جرمنی میں تعیشاتی اور تمدنی چیزوں کے علاوہ ضروری چیزوں کا صرف بھی گھٹ رہا ہے۔ یا عام معیار زندگی میں تخفیف ہو رہی ہے۔ چنانچہ ذیل کے برطانیہ کے متقابلہ اعداد سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

	انگلستان			جرمنی		
	گھی تیل، چربی وغیرہ	انڈے	گوشت وغیرہ	گھی تیل، چربی	انڈے	گوشت وغیرہ
۱۹۲۹ء	۳۹۱۳ پونڈ فی کس	۰	۱۳۸ پونڈ	۴۱۱۳ پونڈ	۰	۱۱۲۱۸ پونڈ
۱۹۳۲ء	۳۹،۲ "	۱۵۰	۱۴۴ "	۴۲،۰ "	۱۲۰	۱۰۷،۹ "
۱۹۳۳ء	۴۱،۰ "	۱۴۹	۱۴۵ "	۳۸،۳ "	۱۰۱	۱۰۹،۰ "
۱۹۳۴ء	۴۲،۰ "	۱۵۲	۰	۳۴،۳ "	۹۹	۱۲۰،۷ "

انگلستان: چند سالوں سے انگلستان میں بھی زرعی پلاننگ کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے لیبر حکومت نے ۱۹۳۱ء میں قانون بازارت نافذ کیا جس کے تحت بازاری بورڈ قائم کئے۔ مگر اس سے زیادہ فائدہ اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں جبر کا پہلو شامل نہ تھا ۱۹۳۲ء میں جب نیشنل گورنمنٹ برسر اقتدار آئی تو اس میں ترمیمات کی گئیں۔ پہلے زرعی پیداواروں کی درآمد پر مقداری پابندیاں عائد کی گئیں، دوسرے اندرون ملک زرعی پیداواروں کی محدود کر دیا گیا۔ قانون میں ان لوگوں کے لئے معاوضہ کی رعایات بھی رکھی گئیں جن کو مارکٹنگ اسکیم سے نقصان ہوتا تھا۔ مختلف چیزیں مثلاً دودھ، اور اس کی مصنوعات، سور اور اس کا گوشت، آلو وغیرہ اس اسکیم کے تحت لائی گئیں۔ ہم اس وقت چند اہم چیزوں کا تفصیلی حال معلوم کریں گے۔

دودھ | دودھ انگلستان کی ایک اہم پیداوار تھی۔ ۱۹۳۳ء میں اس پیشہ میں ۲½ لاکھ آدمی مصروف۔
اور ہر سال تقریباً ۵۰ ملین پونڈ دودھ پیدا ہوتا تھا۔ چونکہ سیال دودھ بڑی سریع الزوال شے ہے۔
اس لئے پیداکنندوں کو مقامی بازار کا اجارہ حاصل تھا۔ مگر وہ دودھ جو پینے کے لئے استعمال کیا جاتا
اور جو دوسری چیزیں بنانے کے لئے فروخت ہوتا تھا ان کی قیمتوں میں اختلاف تھا۔ اسی زمانہ
میں بیرونی دودھ والی اشیا کا مقابلہ بڑھ گیا اکثر یورپین ممالک نے اپنے غیر ممالک کی درآمد کو کم کرنے
کی کوشش شروع کر دی، اس کا اثر برطانوی کاشتکار پر جو مکھن اور پنیر بناتا تھا پڑا۔ پھر سیال دود
کی رسد میں اضافہ اور طلب قائم رہی۔ بہرحال دودھ کے متعلق جو اسکیم بنائی گئی اس سے بجائے
فائدہ کے نقصانات ہوئے، چنانچہ صارفین کی کمیٹی جس کو دودھ کی تحقیقات پر مامور کیا گیا اس نے
بتایا کہ دودھ کی قیمت مقرر کرنے سے اس کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر غیر لائسنس یافتہ چلے
دودھ فروخت کرنے والوں پر پابندیاں عائد کرنے سے دیہی علاقوں میں غرباء کا دودھ استعما
کرانے لگے ہیں جس کا صحت پر خراب اثر پڑنے کے علاوہ سیال دودھ کی رسد میں بھی اضافہ کا باعث
ہو رہا ہے۔ اچھا دودھ پیدا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی ہے، کیونکہ ان کو عمدہ دودھ
کی اچھی قیمتیں نہیں ملتی ہیں۔ دودھ کی رسد میں اضافہ کی وجہ سے اس کی مصنوعات تیار ہونے لگیں
مگر دودھ کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ بیرونی پیداواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اور حکومت کو
دودھ پیدا کرنے والوں کو امداد دینا پڑی۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی امور بھی اس اسکیم پر اثر انداز ہو رہے تھے، برطانوی کاشتکار حکومت
پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ دودھ کی مصنوعات کی درآمد پر پابندیاں عائد کرے مگر حکومت معاہد
اٹاوہ کی وجہ سے مجبور تھی، اس لئے اس نے برطانوی نوآبادیوں سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی خوشی
سے برآمد میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔ مگر نوآبادیات اس طرز عمل سے خوش نہیں ہوئیں، بالخصوص
وہ ممالک جن کا گذر ہی دودھ کی مصنوعات پر تھا جیسے نیوزی لینڈ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ آسٹریلیا
نے کہا کہ اگر اس کی دودھ کی پیداواروں کے لئے برطانیہ میں بازار نہیں ہے تو وہ اپنا قرضہ ادا کرنے

کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ ان دھمکیوں نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ اس مسئلہ پر سیاسی اور معاشی حیثیت سے غور کرے، چنانچہ اس کے پیش نظر تین امور تھے، پہلے یہ کہ برطانوی نو آبادیات برطانوی مصنوعات کا بڑا اچھا بازار ہیں۔ اور ان بازاروں کو ہاتھ سے کھو دینا عقلمندی نہیں ہے۔ دوسرے ان نو آبادیوں میں برطانوی اصل کام کر رہا ہے۔ اور برطانوی افراد کو اس سے کافی آمدنی ہوتی ہے۔ تیسرے برطانیہ میں صنعت کے مقابلہ میں زراعت بہت ہی غیر اہم ہے۔ اس لئے صنعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زراعت کو تامین دی گئی تو مصارف پیدائش میں اضافہ ہو جائے گا اور برطانوی مصنوعات کو بیرونی بازاروں میں دوسرے ممالک سے مقابلہ کرنے میں دشواریاں ہوں گی۔

سور اور اس کے گوشت کے لئے بھی بورڈ قائم کئے گئے۔ سور کے گوشت کی درآمد کو منیہ (Quota) کے تحت لایا گیا۔ تو اس کی وجہ سے درآمد میں کمی ہوئی مگر مجموعی قیمت پہلے کے مقابلہ میں کم نہیں ہوئی، اس کی وجہ ہالینڈ کے گوشت کی قیمت میں اضافہ تھا۔ برطانیہ کے گوشت کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوا اگرچہ وہ خراب قسم کا ہوتا تھا اس لئے لوگ ہالینڈ کے گوشت کو ترجیح دیتے تھے پلاننگ کا مقتدر اعلیٰ صارفین کے ترجیحی استعمال پر پابندی نہیں لگا سکتا۔

مارکٹنگ بورڈ پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے صارفین کے مفادات کو نظر انداز کر دیا اور ان کے لئے قیمتوں میں اضافہ عام مشکلات کا باعث ہوا، اس کے علاوہ ان اشیا کی قیمتوں میں عدم استقامت کی حالت پیدا ہو گئی جو اقتدار سے آزاد تھیں۔ پھر دوسری مشکل یہ ہوئی کہ جب کسی خاص شے کے لئے کوئی رقبہ معین کر دیا جاتا ہے تو طاقتور کھاد یا کاشت عمیق کے دوسرے طریقوں کی بدولت معین رقبوں سے زائد پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب مصر میں روئی کی کاشت کی تحدید کے لئے قانون بنایا گیا کہ کاشتکار اپنی آراضی کے ⅓ حصہ پر کاشت کریں تو وہاں کاشت عمیق شروع ہو گئی۔

بہرحال پیداواروں کی تعداد پر پابندیاں لگانے سے صرف اسی صورت میں فائدہ ہو سکتا ہے جہاں کہ کوئی ایک فصل اہم ہوتی ہو، یا پیداوار کا بڑا رقبہ برآمد کیا جاتا ہو، لیکن ان ملکوں میں جہاں مختلف

قسم کی فصلیں ہوتی ہوں، کاشتکار چھوٹے رقبوں کے مالک ہوں ان کی تعداد زیادہ ہو، وہاں اس میں کامیابی کے قرائن موجود نہیں۔

پلاننگ اور اشتراکیت | چونکہ پلاننگ کے لئے پیداوار پر قابو پانا ضروری ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ پلاننگ سرمایہ داری طریق سے زیادہ اشتراکی طریق میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مگر اس میں بھی خامیاں ہیں ذرائع پیدائش کے لئے، خانگی ملکیت کے بغیر کوئی بازار پیدا نہیں ہوتا۔ قیمتوں کا تعین دشوار ہو جاتا ہے اس کے علاوہ پلاننگ کرنے کی طاقت خواہ کتنی ہی ذہین اور سمجھ دار کیوں نہ ہو اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی کہ کون سے ذرائع بیش ترین فوائد کا باعث ہوں گے، اشتراکی پلاننگ میں خانگی طور پر حضرات بر داخست کرنے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور یہ کام حکومت کی جانب سے اسٹیٹ کارپوریشن کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں روس کا تجربہ بہت زیادہ قیمتی ہے، مگر اجتماعی زراعت کے سلسلہ میں وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مرکزی اقتدار کا نظریہ عملی صورت میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا، اور اب وہ انفرادی طریق کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ خود صنعت میں بھی وہ نتائج حاصل نہیں ہوئے جن کی توقعات وابستہ کی گئیں تھیں۔ اس طریقہ کی بدولت تضیع بہت زیادہ ہوتی ہے۔

لوئیس فشر روس کے متعلق کہتا ہے کہ "شہروں اور دیہات میں پیدائش کے مسئلہ نے تقریباً بڑی عمدہ صورت اختیار کر لی ہے مگر تقسیم کا مسئلہ بالکل ناقص ہے۔ اس میں ذرائع نقل وحمل کی خرابیوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ سامان مال گوداموں میں پڑا سڑتا رہتا ہے اور صارفین اس کی تلاش میں مختلف شہروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کی بداعمالیاں بھی قابل لحاظ ہیں، گو ملک کے اخباروں میں برابر ذخائر کے منیجروں اور امداد باہمی کے ملازموں کی بداعمالیوں کی تفصیلات شائع ہوتی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود خرابی بدستور باقی ہے"

ہندوستانی حکومت کی مداخلت کے بڑے حامی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے حکومت کی ملکیت کے جو مختلف ادارے مثلاً پنجاب کی نہریں، ریلیں، تار ڈاک خانہ، جل بجلی وغیرہ ہیں

ان سے کثیر منافع حاصل ہو رہا ہے۔ مگر غیر ممالک میں یہ حال نہیں ہے وہاں اکثر سرکاری کاروبار اور
ادارے نقصان پر چلتے ہیں، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی حکومت اپنی رعایا کے سامنے جواب
دہ نہیں ہے اور یہاں کے لوگ مفاد عامہ کی اختیار شدہ پالیسی میں دخل نہیں دے سکتے، لیکن جن حصوں
میں ملکی حکومت ہے جیسے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ وہاں رائے دہندے حکومت کی مقررہ
پالیسی میں تغیر و تبدل کرا سکتے ہیں، اور اپنے نمائندوں سے باز پرس کر سکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ کام تجارتی اصولوں کے بجائے عوام کی رائیں اور ان میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں
ہندوستان میں بھی خود مختار صوبوں میں اسی قسم کے رجحانات پیدا ہونے لگے۔ اچھے خاصے قرائن موجود
ہیں۔ اس کے بعد زائد نفع کا اصل سبب بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔

حکومت کی مداخلت کے معاشی اثرات کا دائرہ جب وسیع تر ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات کو کم کرنا بہت مشکل
ہوتا ہے اس کی بڑی اچھی مثال آسٹریلیا سے ملتی ہے جس کی مصنوعات اور اشیاء لندن کے بازاروں میں ارزاں نرخ پر
فروخت ہوتی ہیں مگر اندرون ملک ان کی قیمتیں لندن سے زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسٹریلیا میں اجرتیں زیادہ ہیں
اجرتیں اس لئے زیادہ ہیں کہ وہاں معیار رہائش اعلیٰ ہے معیار رہائش کیوں اعلیٰ ہے کیونکہ چیزیں گراں ہیں چیزیں اعلیٰ محاصل
کروڑ گیری کی وجہ سے گراں ہیں محاصل کیوں زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ مصارف پیدائش اعلیٰ ہیں۔ مصارف پیدائش کیوں
اعلیٰ ہیں اس لئے کہ اجرتیں اور محاصل زیادہ ہیں۔ بہرحال یہ ایک عجیب چکر ہے جو ملک کی ساری معاشی زندگی کو
متاثر کرتا ہے۔ اسی قسم کی صورتیں کنیڈا اور آسٹریلیا میں نظر آتی ہیں۔

ایک دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ موجودہ طریق سرمایہ داری کو پیچیدہ اور غیر منظم کہا جاتا ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ طریقہ غیر منظم ہے، کیا ہم کو اس سے کسی قسم کے فوائد حاصل نہیں ہوئے
یا اس میں فائدے پہنچانے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ ان سوالوں کے جوابات یہی ہیں کہ گذشتہ سو سال
میں ہم نے اس طریق میں بڑی کامیابی حاصل کی، اور یہ کامیابی ایسی تھی جس کی دنیا کی تاریخ کوئی نظیر
پیش نہیں کر سکتی، معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے، جو چیزیں آج اشد ضروریات میں داخل ہیں وہ سو
سال پہلے تعیشات سمجھی جاتی تھیں بعض چیزیں ایسی ہیں جو پہلے بادشاہوں کو بھی میسر نہ تھیں مگر آج ادنیٰ

اور غریب لوگ بھی ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تقسیم دولت کا مسئلہ اس زمانے میں شدید ہو گیا ہے اور اس کی وجہ وہ عدم توازن ہے جو تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس طریق کی برائی کی جاتی ہے۔ لیکن ہم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ رجحانات ایک بالکل حالیہ چیز ہیں ۱۰۰ سال قبل تک تقسیم سے زیادہ پیدائش کو اہمیت حاصل تھی، اور چونکہ اس وقت پیدائش ہی ٹھیک نہیں تھی اس لئے تقسیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اور طریق پیدائش کو بڑھانے کی کوششوں میں تقسیم کے مسئلہ پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ مگر اب جب کہ پیدائش کا مسئلہ صاف ہو گیا، لازمی ہے کہ تقسیم کی طرف توجہ کی جائے کسی ایک طریق کے نقائص گنانا بہت آسان ہے مگر اس کی جگہ کوئی دوسرا طریقہ رائج کرنا بہت مشکل ہے، اس میں شک نہیں کہ اس وقت طلب و رسد کے حالات اور قیمتوں کا طریق صحیح اور متوازن اصولوں پر کام نہیں کر رہے ہیں، مگر تصور کس کا ہے یقینی طور پر یہ طریقہ کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ان مدبرین پر عائد ہوتی ہے جو قومی خود کفالت کے حامی ہیں یا ان ملکوں پر جو پلاننگ کے خواہش مند ہیں۔

"کثرت میں قلت" ایک عام ضرب المثل بن گئی ہے، اور اس کو سرمایہ داری طریق کا نتیجہ تبلایا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ چیز معاشی زندگی میں حکومتوں کی بڑھتی ہوئی مداخلتوں اور معاشی خود کفالت کے تخیلات کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی ملک میں گیہوں کی طلب موجود نہیں اور وہ وہاں پڑا سڑ رہا ہے تو دوسرے ایسے ممالک بھی ہیں جہاں گیہوں کی قلت ہے، اور وہ اپنی آب و ہوا، زمین اور ماحول کے لحاظ سے نہ گیہوں پیدا کرنے کے قابل ہیں اور نہ مسابقتی قیمت پر گیہوں پیدا کر سکتے ہیں، لیکن وہ برابر اپنی پیداوار کو بڑھانے میں مصروف ہیں۔ بیرونی درآمد کو روک کر اپنے گیہوں کی قیمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ اور کثرت میں قلت کون پیدا کر رہا ہے۔ اگر پلاننگ کا یہی معیار ہے تو پھر دنیا سے پلاننگ کا خدا حافظ۔

ہندوستان کے لئے یہ سوال بہت ہی اہم ہے کہ حکومت کی مداخلت ملک کی آئندہ زندگی پر کیا اثر ڈالے گی، اس کا مطالعہ الگ معاشی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے، جذبات احساسات سے کام

نہ لینا چاہیئے کیا حکومت کی معاشی مداخلت ہماری معاشی مشکلات کو رفع کرسکتی ہے کیا اس سے ہماری مرفہ الحالی میں اضافہ ہوسکتا ہے کیا حکومت کے پاس کوئی ایسی جادو کی چھڑی ہے جس کے ذریعہ سے وہ آن واحد میں ملک کے کایا پلٹ کرسکتی ہے۔ اس کے لیے ہم کو ان ملکوں پر نظر ڈالنا ہے جنھوں نے اس طریق کو اختیار کیا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح معاملات سلجھنے کے بجائے اور الجھ گئے۔ ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کی بنا پر دنیا کا دائرہ چھوٹا ہوگیا تھا لیکن بدقسمتی سے معاشی قومیت کے رجحانات نے دنیا کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔ مختلف ملکوں کے آپس کے معاشی تعلقات خراب ہوتے جارہے ہیں، تجارت بین الاقوام جو قوموں کی روح ہے مردہ ہوتی جارہی ہے۔ اور پلاننگ مشکلات کو حل کرنے کے بجائے ان میں پیچیدگیاں پیدا کرتی جارہی ہے۔ کسی ایک انفرادی ملک میں پلاننگ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک وہ کلیتہً معاشی اور معاشرتی طور پر دنیا سے قطع تعلق نہ کرے، خودکفیل وحدتیں بغیر تھوڑی بہت تجارت اقوام کے زندہ نہیں رہ سکتیں، یا اپنے موجودہ اعلیٰ معیار کو برقرار نہیں رکھ سکتیں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسا ملک جو بڑی حد تک خودکفالت کا درجہ حاصل کرسکتا ہے کیونکہ وہ اپنی پیداواروں کا صرف ۱۰ فی صدی حصہ برآمد کرتا ہے مگر اس نے بھی تجارتی پابندیوں کا بار ہر طرح محسوس کیا تھا۔ انفرادی طور پر ایک ملک کے لیے خودکفالت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں کرنا پڑیں گی، اس کو ابتدائی تہذیبی منازل کی طرف لوٹنا پڑے گا، ہمسایہ ممالک سے تعلقات خراب کرنا پڑیں گے، آپس میں رقابتیں پیدا ہوں گی اور جنگ کے امکانات زیادہ قوی ہوجائیں گے ہندوستان میں اس امر پر زور دیا جارہا ہے کہ حکومت ایک مکمل معاشی لائحہ عمل تیار کرکے میدان میں آئے اور ملک کی تمام معاشی کمزوریوں کا خاتمہ کردے، پلاننگ کی کامیابی کے لیے حکومت کی مداخلت کی شدید ضرورت ہے، مگر حکومت کی شدید مداخلت جمہوری اصولوں کے خلاف ہے، اور جس چیز کو حاصل کرنے کے لئے ہم برسوں سے کوشش کررہے ہیں اس کو غالباً اتنی آسانی سے کھو دینے پر آمادہ نہ ہوں گے، دوسری چیز جس کو یا تو نظرانداز کردیا جاتا ہے یا اس پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا یہ ہے کہ پلاننگ کو کامیاب بنانے

گے لئے سرمایہ داری طریق کا خاتمہ ضروری ہے۔ مگر فی الحال ایسے آثار موجود نہیں ہیں، ہم اس طریقہ کے عادی ہو گئے ہیں اور مروجہ طریقہ کے خلاف نیا طریق قبول ہونا ذرا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ "ہندوستان کا بے تاج بادشاہ" بھی اپنے پیروؤں کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتا اگر وہ موجودہ طریق کو بدل دینے کے لئے کوشش شروع کر دے۔ ایسی صورتوں میں پلاننگ کی کامیابی کے قرائن اور زیادہ کمزور ہو جاتے ہیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت معاشی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت ہی نہ کرے بعض کام ایسے ہیں جن میں اس کی مداخلت ضروری ہے۔ مثلاً کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے پنجے سے نجات دلانا، کارخانوں میں کم عمر بچوں اور عورتوں سے زائد کام لینا مزدوروں سے طویل اوقات تک کام لینا، اتفاقی حادثات کی صورت میں ان کو مناسب معاوضے دینا، ملک کے عام باشندوں کی معیار صحت میں اضافہ، ان کی تعلیم وغیرہ کے انتظامات کرنا لیکن ان کے علاوہ ایک اور چیز جس میں حکومت حصہ لے کر ملک کی معاشی زندگی میں انقلاب کر سکتی ہے وہ شعبہ بنکاری ہے۔ اور ہندوستان کی حکومت نے اب تک جو اس جانب غفلت کی وہ ایک مجرمانہ فعل ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ چند وہ چیزیں ہیں جن میں مداخلت ضروری ہے اور ان میں مداخلت ہی سے ملک کی عام معاشی زندگی اور معیار زندگی، اور مرفہ الحالی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہوائی جہاز کی کہانی

آپ نے کبھی صبح کے وقت بیل گاڑیوں یا اونٹ کی شکرموں کو دیکھا ہے جو بھوسہ گیہوں، روئی، راب، لکڑی، کنکر، مٹی وغیرہ سے لدی ہوئی ہندوستان کی سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ ان کے بیلوں کے گلے کے گھونگرو ان کے پہیوں کی روں راں اتنی خواب آور ہوتی ہے کہ گاڑی ہانکنے والا اپنی گڑگڑی کے کش لگاتے لگاتے بے خبر سو جاتا ہے اسے پھر اس کی فکر نہیں ہوتی کہ گاڑی سڑک کے کنارے چل رہی ہے یا بیچ سڑک پر موٹر والے اس پر بہت ناراض ہوتے ہیں گالیاں سناتے ہیں لیکن اس پر کوئی مستقل اثر نہیں ہوتا۔ وہ چونک کر اپنی گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے کر لیتا ہے اور پھر دوبارہ نیند کے سمندر میں غوطے کھانے لگتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب آپ اس گاڑی والے کو دیکھتے ہوتے ہیں عین اسی وقت آپ کو ہوا میں غایئں غایئں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک ہوائی جہاز چیل کی طرح تیرتا ہوا آپ کے سر پر سے گذر جاتا ہے۔ آپ کی نگاہ تھوڑی دیر حیرت تعریف اور رشک کے مشترک جذبات کے ساتھ اس کا تعاقب کرتی ہے اور پھر وہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

پھر دوبارہ آپ بیل گاڑی کی روں راں کو سننے لگتے ہیں جسے پیچھے چھوڑ کر آپ کچھ آگے نکل آتے ہیں۔ ایک طرف بیل گاڑی کی سست رفتاری ہوتی ہے اور دوسری طرف ہوائی جہاز کی سبک خرامی۔ آپ سفر کے طریقوں کے اس فرق اور تضاد کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک طرف آپ کو ایک شخص نظر آتا ہے جو ہزاروں سال پیچھے ہے۔ دنیا

نے جس چیز کو ہزار ہا سال گذرے ایجاد کیا تھا اسی پر قائم ہے اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی اور حرکت پیدا کرنا نہیں چاہتا اور دوسرا شخص ہے کہ لحہ بہ لحہ اپنی رفتار کو تیز کرنے اپنی سواری کو مکمل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ایک شخص ہے کہ سست اور کمزور جانوروں کی مدد سے جو نقل و حمل کا ابتدائی ذریعہ تھے زمین کے سفر کی تمام صعوبتیں اور پریشانیاں، غفلت اور مدہوشی کے ساتھ گوارا کر رہا ہے۔ اپنے دماغ کو بالکل معطل رکھ کر کبھی کبھی صرف ٹخ ٹخ، دو چار گالیوں اور ڈنڈی میں لگی ہوئی لوہے کی نوک یا چمڑے کے تسمہ سے بیلوں کی خبر لیتا رہتا ہے۔ دوسرا ہے کہ بلا روک ٹوک ہوا پر شہ سواری کر رہا ہے۔ اس کا دماغ فعال، بیدار اور ہوشیار ہے۔ اسے اپنی برتری اور عظمت کا احساس ہے۔ وہ قوائے فطرت پر قادر ہے عناصر پر حکمراں ہے۔ صحیح معنی میں انسان یعنی خلیفتہ اللہ فی الارض ہے۔

ہوائی تیز رفتاری نے سڑکوں اور ریلوں اور سمندر کے سفر کی تیزی کو آج بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ کوئی جہاز، کوئی ریل اور کوئی موٹر ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کرسکتا کراچی سے لندن تک کا سفر آج کل چند گھنٹوں میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہوائی سفر کی اس ترقی کی تاریخ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

پرانے زمانہ کے جو قصے ہم تک پہنچے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڑنے کے امکانات کے بارے میں لوگ ہمیشہ غور کرتے رہے ہیں۔ مثلاً پرانے زمانے کے ایک شخص کے بارے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ اس نے موم کے ذریعہ پروں کو اپنے جسم سے چپکا کر اڑنے کی کوشش کی۔ یہ شخص اڑا لیکن بدقسمتی سے سورج کے بہت نزدیک پہنچ گیا جس سے موم پگھل گیا اور اس کے پر زمین پر گر پڑے۔

عہد وسطےٰ میں اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کا ایک طبیب تھا اس نے بھی پروں کی مدد سے اڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کام کے لئے عقاب کے پروں کو منتخب کیا کیونکہ سب پرندوں میں عقاب سب سے اونچا اڑتا ہے۔ لیکن جب اس نے پروں کا

لباس پہنا اور قلعہ کی دیوار سے کودا تو بجائے عقاب کی طرح ہوا میں اڑنے کے زمین پر آ گرا جس سے اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ کے باوجود اس کا اعتقاد پروں کے بارے میں قائم رہا اور اپنے اس گرنے کا سبب اس نے یہ بتایا کہ اس کے لباس میں عقاب کے پروں کی جگہ مرغی کے پر لگا دیئے گئے تھے اور مرغی چونکہ آسمان میں اڑنے کی جگہ زمین کی طرف گرتی ہے اس لئے وہ بھی زمین پر گر پڑا۔

پرواز کے متعلق ان افسانوں کے علاوہ ابتدائی عالموں نے اڑنے کے طریقوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مثلاً لیونارڈ ڈی ونسی (۱۴۵۲ تا ۱۵۱۹) نے جو اٹلی کا مشہور سائنس داں اور مصور تھا پرواز کے متعلق کچھ باتیں لکھی تھیں۔ اپنے نظریوں کو سمجھانے کے لئے اس نے نقشے وغیرہ اور نمونہ کی اڑنے والی مشینیں بھی بنائی تھیں۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے مشہور مفکر فرانسس بیکن نے بھی اپنے اس اعتقاد کا اظہار کیا تھا کہ انسان ہوا کو ضرور تسخیر کرے گا۔

غرضکہ صدیوں تک انسان پرواز کے خواب دیکھتے رہے اور ان کے بارے میں نظریے بناتے رہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے کوئی شخص فی الواقعی تھوڑے فاصلہ تک بھی اڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکا جب تک کہ آدمیوں نے علمی طریقوں پر کاموں کو کرنا نہیں سیکھا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں عین اس وقت جب کہ واٹ اور ہارگریوز اور دوسرے لوگ انجنوں اور مشینوں کی ایجاد کر رہے تھے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ایسے ہوائی جہاز بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو انھیں زمین سے بلند کر کے ہوا میں لے جا سکیں۔

۱۔ ہوا سے ہلکے ہوائی جہازوں کی ایجاد
(الف) پہلا قدم: آگ کے غبارے

سنہ ۱۷۸۳ء میں دو بھائیوں نے جن کا نام جوزف مانٹ گالفر اور اٹینی مانٹ گالفر تھا اور جو ایک فرانسیسی کاغذ ساز کے بیٹے تھے غباروں کا تجربہ کرنا شروع کیا۔ اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر ان کے دل میں خیال پیدا

ہوا تھا کہ ایک تھیلہ کو بھی اڑایا جا سکتا ہے اگر اس میں ہوا جیسی کوئی ہلکی چیز بھر دی جائے۔ بادلوں
کو دیکھ کر غبارے میں دھوئیں کو بھرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے باپ کے
کاغذوں سے ایک بڑا تھیلہ بنایا جس کا منہ پیندے میں کھلا رکھا اور اس کے نیچے پھونس کو جلا کر
انھوں نے دھواں پیدا کیا۔ جب دھواں بلند ہوا اور تھیلا اس سے بھر گیا تو تھیلا بھی اس
کے ساتھ بلند ہو گیا۔ اس سے دونوں بھائیوں کے اندر بہت جوش پیدا ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے کاغذ کا اور بڑا غبارہ بنایا جس کا گھیر ۱۱۰ فٹ کا تھا اور پہلے کی طرح
اسے دوبارہ گرم ہوا سے بھرا۔ اپنے ان تجربوں سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے
مقابلہ میں ہلکی ہوتی ہے۔ غبارہ دھوئیں کی وجہ سے جیسا ان کا پہلے خیال تھا بلند نہیں ہوتا بلکہ
گرم ہوا کی وجہ سے بلند ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ جب پبلک کے سامنے انھوں نے اس بات کی
نمائش کی تو ان کا غبارہ ۶ ہزار فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا اور جب اندر کی ہوا ٹھنڈی ہونا شروع
ہوئی تو آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ اس کامیابی کی وجہ سے لوگوں میں بہت جوش پیدا ہوا اور
ان بھائیوں کا حوصلہ بڑھا کہ اس سے بھی بڑا غبارہ بنائیں تاکہ اس میں مسافروں کو لے جایا
جا سکے۔ اپنے دوسرے غبارہ میں انھوں نے ایک چبوترہ سا بنایا اور اس پہ ایک بھیڑ، ایک
بطخ اور ایک مرغ کو بٹھا دیا۔ غبارہ بلند ہوا اور ہوا کے ساتھ ساتھ ایک میل تک بہتا رہا اور پھر
ایک جنگل میں جا کر اترا۔ سوائے مرغ کے باقی کسی جانور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اس کو
نقصان اس لئے پہنچا کہ بھیڑ نے اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد ترقی کی طرف دوسرا قدم غبارہ پر آدمیوں کو بٹھا کر اٹھایا گیا۔ شاہ لوئی چہار
دہم اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ آدمیوں کی زندگیوں کو اس تجربہ میں ضائع کیا جائے لیکن بعد
میں اس نے فیصلہ کیا کہ ان آدمیوں کو جنھیں جیل میں موت کی سزا سنائی جا چکی ہے، غبارہ میں
بٹھا کر اڑایا جائے۔ اس بات کو سن کر ایک نوجوان پلاترے ڈی روزیر نے غصہ سے کہا
اس کا کیا مطلب [illegible]

بخشا جائے۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد بادشاہ نے اپنا فیصلہ واپس لیا اور روزیر کو پہلی پرواز کی اجازت دے دی۔ ایک رسی غبارہ سے باندھ دی گئی تاکہ وہ بہ کر دور نہ نکل جائے۔ روزی ار چبوترہ پر بیٹھ گیا اور ۸۰ فٹ کی بلندی تک یعنی جتنی لانبی رسی تھی وہاں تک پہنچ گیا۔ امریکہ کے موجد اور مدبر بنجامن فرینکلن نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد روزی ار اور ایک دوسرے آدمی نے ایک آزاد غبارہ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ زاید ایندھن اس غرض کے لیے لے گئے تاکہ ضرورت کے وقت غبارہ کے نیچے جو آگ رکھی گئی تھی اس میں اضافہ کیا جا سکے۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اب وہ اتر رہے ہیں انھوں نے آگ میں ایندھن رکھ دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بلند ہو گئے ہیں تو انھوں نے ایک ڈوری کو کھینچ دیا جس سے تھیلہ میں ایک سوراخ کھل جاتا تھا اور گرم ہوا باہر نکل جاتی تھی اور اس طرح پر خاصے فاصلے تک انھوں نے سفر کیا۔

دوسرا قدم: گیس کے غبارے | چونکہ مشتعل پھونس سے غبارہ میں آگ لگ جانے کا خطرہ رہتا تھا اس لیے موجدوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ گرم ہوا کے علاوہ کسی اور دوسری ہلکی چیز کو غبارہ میں بھرا جائے۔ اس غرض کے لئے ہائیڈروجن گیس کو جو معمولی ہوا سے بڑی ہلکی ہوتی ہے آزمایا گیا اور اس سے خوب کام چلا۔ تھیلے وارنش کئے ہوئے پتلے ریشم کے بنائے گئے تاکہ کپڑے میں سے گیس نکل نہ سکے۔ پہلا مشاہدہ بارش کے طوفان میں کیا گیا۔ بارش کے باوجود غبارہ تین ہزار فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا اور پون گھنٹہ تک ہوا میں رہا اور پھر پندرہ میل دور ایک کھیت میں جا کر اترا۔ کھیت میں جو جاہل کسان کام کر رہے تھے انھیں آسمان سے گری ہوئی اس عجیب وغریب چیز کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور انھوں نے پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ آئندہ کے تجربوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بادشاہ نے بذات خود اس بات کا حکم جاری کیا کہ بادلوں سے جو چیزیں گریں انھیں ہرگز ہاتھ نہ لگایا جائے۔

گیس کے غباروں میں تیزی کے ساتھ اصلاح ہوتی رہی اور ۱۸۳۵ء میں ایک غبارہ نے انگلستان سے اڑکر بحر انگلستان کو عبور کیا اور فرانس میں پہنچ گیا۔ یہ سفر ایک فرانسیسی ہواباز بلانچارڈ اور ایک امریکی ڈاکٹر جیفریز نے کیا جس نے گیارہ سال قبل بھی ہوا اور موسم کے حالات معلوم کرنے کے لئے لندن کے اوپر پرواز کی تھی۔ ان کا غبارہ کامیابی کے ساتھ اپنے وزن کے ساتھ ہوا میں اٹھا لیکن بحر انگلستان کے بیچ میں پہنچنے کے بعد وہ اتنا نیچے اتر گیا کہ ان دونوں کو اندیشہ ہوا کہ اب وہ سمندر میں گر پڑیں گے۔ اس لئے انھوں نے تمام وزنی چیزوں یعنی اپنی غذا، رسیوں اور بہت سے کپڑوں کو نیچے پھینک دیا۔ اس کی وجہ سے غبارہ کا بوجھ اتنا ہلکا ہوگیا کہ وہ پھر بلند ہوگیا اور آخرکار وہ فرانس کے ساحل پر پہنچ گئے یہاں انھوں نے ایک گرہ کھول کر ہوا کو تھیلہ میں سے آہستہ آہستہ نکلنے کا موقع دیا اور زمین پر اتر گئے جہاں ایک بڑے مجمع نے ان کا بہت پرجوش خیر مقدم کیا۔

جیسے جیسے غباروں میں اصلاح ہوتی رہی لوگ طویل سفر کرنے کے لئے باہم مقابلہ کرتے رہے ۱۸۳۶ء میں "ناسو کا بڑا غبارہ" جس میں بارہ مسافر تھے انگلستان سے جرمنی کی طرف بہایا گیا اور اس نے تقریباً پانسو میل کی مسافت طے کی۔ سفر کا کچھ حصہ رات میں طے کیا گیا۔ لوگوں کے پاس کوئی روشنی نہیں تھی اور جہاز کی رہنمائی کے کسی اور طریقہ کا بھی انھیں علم حاصل نہیں تھا۔ وہ اس بات کا محض اندازہ کرسکتے تھے کہ ان کے نیچے زمین ہے یا پانی، کھیت ہیں یا شہر۔

ان پروازوں کی کامیابی سے لوگوں کے اس اعتقاد کو تقویت حاصل ہوئی کہ سمندروں کو غباروں کے ذریعہ عبور کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں ایک امریکی ہواباز جان وائز نے بحر اوقیانوس کو عبور کرنے کی تیاری کے سلسلہ میں زمین پر ایک ہزار ایک سو بیس میل تک پرواز کی۔ لیکن اس زمانہ میں بحر اوقیانوس کو واقعی عبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد سے غباروں کی پرواز بہت سے پبلک تہواروں اور نمائشوں کے

موقعوں پر کی جانے لگی۔ سرکس والے لوگ آدمیوں کو ایسے غباروں پر چڑھانے لگے جنھیں رسیوں کے ذریعہ زمین سے باندھ دیا جاتا تھا۔ ورزشی جھولا جھولنے والے لوگ آزاد غباروں پر سوار ہو کر جاتے تھے اور جب تک مجمع کی نگاہ کے سامنے رہتے تھے اپنے کرتب دکھاتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے ایک کرتب دکھانے والے شخص نے ۱۶۰ دفعہ پرواز کی لیکن آخری دفعہ جھیل مشی گن کے ایک طوفان میں گھر جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اگرچہ غباروں کو قابو میں رکھنا مشکل تھا لیکن پھر بھی انھیں آہستہ آہستہ جنگ کے کاموں کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ ریاست متحدہ امریکہ میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں دشمنوں کے مورچوں کا پتہ چلانے کے لئے ہراول غباروں میں بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔

تیسرا قدم: انجن سے چلنے والے ہوائی جہاز اس تمام مدت میں یعنی ۱۷۸۳ء سے انیسویں صدی کے وسط تک گول شکل کے غبارے ہوا کے بالکل رحم و کرم پر رہتے تھے اور ان کے رخ کو کسی خاص سمت میں پھیرنا یا چلانا ناممکن تھا لوگوں نے بادبان، پتوار اور پیڈل والے پہیے لگا کر پرواز کی سمت کو قابو میں رکھنے کی کوششیں کیں لیکن اس میں انھیں بہت کم کامیابی ہوئی۔

لیکن اسی زمانے میں سڑکوں پر گاڑیوں کو پٹڑیوں پر ریلوں کو اور پانی پر کشتیوں کو چلانے کے لئے دخانی انجنوں کا استعمال شروع کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہوابازوں نے سوچا کہ غباروں کو بھی کیوں نہ انجنوں سے چلایا جائے، بہت سے موجدوں نے انجن سے چلنے والے ہوائی جہازوں کے بنانے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۲ء میں ایک فرانسیسی انجنیر ہنری گفارڈ نے قوت متحرکہ سے چلنے والا ایک طاقتور انجن کا نقشہ سوچا اور اسے بنایا۔ اس کی شکل ہمارے موجودہ ہوائی جہازوں سے ملتی جلتی تھی یہ پہلا ہوائی جہاز تھا جس کی پرواز کی سمت کو قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ غبارہ کے نیچے جو لانبی گاڑی لٹکائی جاتی تھی اس میں گفارڈ نے ایک ایسا چھوٹا دخانی انجن رکھ دیا جو خاص کر ہوائی جہاز کے لئے ہی بنایا گیا تھا۔ اس تجربہ کو کامیاب سمجھا گیا کیونکہ غبارہ کی رفتار ساکت ہوا میں چار میل فی گھنٹہ تک ہو گئی۔

اس کے بعد ہوا انجن سے چلنے والے ہوائی جہازوں یعنی (" DIRIGIBLES ")
کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔ ان ہوائی جہازوں کو جہاز راں جہاز کے اندر سے بالکل اسی طرح چلا سکتا
تھا جیسے کہ ایک موٹر والا اپنی موٹر کو چلاتا ہے۔ لیکن ان میں کسی ہلکے اور طاقتور انجن کے
نہ ہونے کی وجہ سے اصلاح بہت آہستہ آہستہ ہو سکی۔ مگر گیس انجن کے بن جانے کے
بعد یہ وقت بھی رفع ہو گئی۔ جیسے ہی گیس انجن کو لایق استعمال بنایا گیا اور انھیں موٹروں کے
چلانے کے لئے استعمال کیا گیا موجدوں نے اسے ہوائی جہازوں میں بھی استعمال کرنا شروع
کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک برازیل کے رہنے والے شخص البرٹو سانٹوس ڈومانٹ نے جس
کا باپ فرانسیسی تھا ایک ہوائی جہاز کو گیس موٹر سے چلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

دخانی انجن کے مقابلہ میں گیس انجن نہ صرف یہ کہ ہلکا تھا بلکہ اس کے مقابلہ میں زیادہ
محفوظ بھی تھا۔ اس کی ایجاد کے بعد غبارہ میں جو ہائیڈروجن رہتی تھی اس کے دھماکے کے ساتھ
چلنے کا امکان بھی کم ہو گیا۔ غبارے کے تھیلوں میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اصلاح ہوتی
رہی۔ اب تھیلے میں کئی خانے رکھے جانے لگے اور ہر خانے کو دوسرے سے الگ رکھا
جانے لگا تاکہ اگر ایک میں سے ہوا رسنا شروع ہو جائے تو دوسرے تھیلوں کی ہوا غبارہ
کو بلند رکھ سکے۔ پھر جداگانہ تھیلوں اور بڑے تھیلے کے درمیان جس میں سب تھیلے رکھے
جاتے تھے ہوا کے لئے بھی جگہ چھوڑی جانے لگی۔ اس کی وجہ سے مختلف اونچائیوں پر ہوا
کے ٹمپریچر کو یکساں رکھا جانے لگا۔ اس سے گیس کا نقصان بند اور مسافروں کی حفاظت
میں اضافہ ہو گیا۔

اسی زمانہ یعنی (تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء) میں جرمنی میں کاؤنٹ فرڈیننڈ واں زپیلین کی طرف
سے اور زیادہ اصلاحیں کی گئیں۔ کپڑے کے پچک جانے والے تھیلے کی جگہ ایک سخت
المونیم کا فریم بنایا گیا جس میں گیس کے جداگانہ تھیلوں کو رکھا جا سکتا تھا۔ اس دھات کے
فریم سے جو ہوائی جہاز بنائے جاتے تھے وہ زیادہ مضبوط ہوتے تھے اور آسانی سے

چلائے جا سکتے تھے۔ آج مسافروں کے لئے جن جہازوں کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے وہ اسی قسم کے جہاز ہیں۔

کاؤنٹ زیپلین نے جن ہوائی جہازوں (DARIGIBLES) کو بنایا تھا ان سب کی پروازیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ لیکن بعد میں یکے بعد دیگرے یہ سب طوفان میں تباہ ہوگئے۔ لیکن جرمن لوگوں کو ان تجربوں پر اعتقاد تھا اور انھوں نے نئے جہاز بنانے کے لئے ۱۵ لاکھ ڈالر چندہ اکٹھا کیا۔

جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنی نے مختلف قسم کے سو ہوائی جہاز بنائے۔ جنگ کے بعد اس نے دوسرے ملکوں کے لئے ہوائی جہاز بنانا شروع کر دئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ بحر کے لئے جو جہاز جرمنی میں بنایا گیا تھا اس کا نام لاس انجلیز تھا۔ یہ جرمنی سے روانہ ہوکر نیو جرسی کی جھیل ہرسٹ تک جو ۵ ہزار میل سے زاید کی مسافت ہے ۸۰ گھنٹہ میں پہنچ گیا یعنی اس کی رفتار کا اوسط ۶۰ میل فی گھنٹہ رہا۔

حال میں ایک دوسری گیس یعنی ہیلیم کا پتہ چلا ہے کہ یہ ہوائی جہازوں کے لئے ہائیڈروجن سے زیادہ بہتر ہے اس گیس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ہائیڈروجن کی طرح آگ نہیں لگ سکتی۔ مگر یہ گیس بہت زیادہ لاگت کے بعد تیار ہوتی ہے اور صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں استعمال کے لئے کافی مقدار میں یہ گیس دستیاب ہو سکتی ہے۔

۲۔ ہوا سے زیادہ وزنی ایرپلینوں کی ایجاد۔ جن ہوائی جہازوں کا اب تک ذکر کیا گیا ان کا نام ان کی نوعیت کے عین مطابق ہے کیونکہ یہ ہوائی جہاز ہوا میں اسی طرح تیرتے ہیں جیسے کشتیاں پانی میں تیرتی ہیں حتیٰ کہ موجودہ ہوائی جہازوں کے لئے بھی جن میں ٹھوس فریم لگا ہوتا ہے ہوا سے ہلکا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہوا میں بلند رہنے کے لئے ہوا سے ہلکا ہونا ضروری ہے۔ مگر ایرپلینوں کو جو ہوا سے بھاری ہوتے ہیں اپنی تیز رفتاری پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اگر کسی چیز کو ہوا میں تیزی کے ساتھ چلایا جائے گا تو اسے بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اس چیز کا مشاہدہ گتے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو ہوا میں تیرا کر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوا سے زیادہ وزنی مشینوں کے لئے تیز رفتاری نہایت لازمی چیز ہے۔ اس سے پہلے ہوا سے زیادہ بھاری مشینوں میں آدمی جو نہیں اڑ سکے اس کی وجہ یہی تھی کہ ایسے انجن موجود نہیں تھے جو ضروری تیز رفتاری پیدا کر سکیں۔

ہوا سے زیادہ وزنی بغیر انجن کی مشینیں یعنی گلائیڈرز

ابتدائی ایرپلین محض گلائیڈرز[۱] ہوا کرتے تھے۔ ان میں انجن بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ان کی شکلیں بہت مختلف قسم کی ہوتی تھیں بعض کے بازو چمگادڑوں جیسے ہوتے تھے بعض کے بازو ہوا کو پکڑنے کے لئے مختلف زاویوں پر جھکے ہوئے ہوتے تھے۔ اڑنے والے کے جسم سے تسمہ کے ذریعہ گلائیڈروں کو باندھ دیا جاتا تھا اور گلائیڈروں میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی لیکن جب ہوا تیز چلتی تھی تو گلائیڈروں کی حرکت جلد ختم ہو جاتی تھی اور لوگ سو فٹ سے زیادہ بلند نہ ہو سکتے تھے۔

مگر غباروں کی طرح گلائیڈروں کا بھی لوگوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہوا میں بلند رہنے کے مسئلہ کی علمی تحقیقات کی۔ مثلاً انھوں نے اس بات کا نہایت ہشیاری سے مطالعہ کیا کہ چڑیاں کس طرح اڑتی ہیں اور انھوں نے اپنے گلائیڈروں کو اسی اصول کے مطابق پھر بنانا شروع کر دیا۔ ایک فرانسیسی ملاح نے جسے گلائیڈروں کے استعمال میں خاصی کامیابی ہوئی تھی اپنے گلائیڈروں کو قادوس (ایک بڑا دریائی پرندہ) کے بازوؤں کے نمونہ پر بنایا تھا۔

ابتدائی تجربہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ شہرت ایک جرمن آٹو لی لینتھل کو حاصل ہوئی۔ اس نے چڑیوں کے اڑنے کے بارے میں جو مشاہدے کئے تھے ان کے نتائج

---

[۱] گلائیڈرز کے لفظی معنی ہیں سبک رفتاری سے گذرنے والا۔ اصطلاح میں بغیر انجن کے تھوڑی دور تک آہستہ آہستہ از خود اڑنے والی مشینوں کے لئے یہ نام استعمال کیا جاتا ہے۔

کو ایک کتاب میں جس کا نام "چڑیوں کی پرواز کو کس طرح ہوا بازی کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے" شائع کئے ہیں چڑیوں کی پرواز کے بارے میں جو علم اسے حاصل تھا اس سے اس نے گلائیڈروں کے تجربوں میں کام لیا اور ۱۸۹۱ء میں کامیابی کے ساتھ کئی دفعہ اڑا۔ لی لینتھل نے یہ معلوم کر کے کہ ہوا میں بازو والی مشینوں کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے انسانی علم میں بڑا زبردست اضافہ کیا۔ گلائیڈروں کو خاص سمتوں میں چلانا اور ان کو ایک سطح پر اس وقت رکھنا جب کہ ہوا ایک طرف کے مقابلہ میں دوسری طرف نہایت تیزی سے چل رہی ہو بہت مشکل تھا۔ لی لینتھل نے اپنے وزن کے بوجھ سے توازن کو قائم رکھنے میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی۔ جب ہوا گلائیڈر کی سطح سے ٹکراتی تھی تو وہ مڑ کر اور بل کھا کر اپنے وزن کا بوجھ ہوا کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ڈالتا رہتا تھا۔ لی لینتھل بہت سے سالوں تک لگا تار کام کرتا رہا اور ہوا کے بارے میں نئے نئے واقعات معلوم کرتا اور اپنے گلائیڈروں کی اصلاح کرتا رہا اور ہر دفعہ اس کی پرواز پہلے کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتی رہی۔ مگر ایک دن جب وہ گھمانے کی ایک ایجاد کی آزمائش کر رہا تھا گلائیڈر پر اس کا قابو نہیں رہا وہ گر پڑا اور مر گیا یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اگر وہ زیادہ زندہ رہتا تو وہ موٹروں کی آزمائش کرتا اور انجن سے چلنے والے پہلے ایرپلین کے بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن لی لینتھل نے ایک ابتدائی مشکل کام انجام تک پہنچا دیا تھا یعنی اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ ایرپلین کو جب ہوا زور سے چل رہی ہو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔

گلائیڈروں کو انجن سے چلانے کی ایجاد

لی لینتھل کے تجربوں سے پچاس سال پہلے موجدوں نے چھوٹے دخانی انجنوں سے اڑنے والی مشینوں کو چلانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً ۱۸۴۲ء میں ہنسن نامی ایک انگریز نے دخانی ایرپلین کا ایک نمونہ تیار کیا۔ اس کی شکل آج کل کے ایک بازو والے ایرپلین سے ملتی جلتی تھی۔ پبلک کی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے ہنسن کو چندہ کے ذریعہ روپیہ نہیں ملا اور وہ اپنے تجربوں کو جاری نہیں رکھ سکا۔ ۱۸۴۸ء میں ایک اور انگریز نے ایک انجن سے چلنے والا نمونہ تیار کیا۔ اس نمونہ کو جو زمین سے تھوڑے فاصلہ تک

بلند ہونے میں واقعی کامیاب ہوا تھا مصور لیونارڈو ڈاونسی کے نقشہ کے مطابق بنایا گیا تھا سی رلے۔ پارسنس نے بھی جو دخانی ٹربائن کا موجد ہے ایک بازو والا ایک ایرپلین بنایا تھا جس کے بازو اس سرے سے اس سرے تک گیارہ فٹ لانبے تھے۔ اس کے چلانے کے لئے اس نے بائلر اور دخانی انجن کا استعمال کیا تھا۔ اگرچہ یہ دخانی انجن ہوائی جہاز کے لئے بہت وزنی تھا لیکن پھر بھی پارسن کے نمونہ کا جہاز ہوا میں سو گز تک ٹھیرا رہا۔

اسی دوران میں گیس انجن کی بھی ایجاد ہوگئی۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں موٹروں میں گیس انجن کا استعمال کیا جانے لگا اور سنہ ۱۹۰۱ء میں ایرپلین میں اس کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ سیموئل پی لینگ لے، آرول برائٹ اور ولبر برائٹ ان تجربوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ جنگ نے ہوائی جہازوں کو جنگ میں استعمال کرنے کے امکانات دیکھ کر لینگ لے کی امداد کی۔ محکمہ جنگ کی طرف سے لینگ لے اور اس کے مددگار کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں آدمیوں کے لے جانے والے اور انجن سے چلنے والے مضبوط ہوائی جہاز بنانے کے لئے روپیہ دیا گیا۔ ان دونوں نے اپنے مطلب کے مطابق خاص قسم کا ایک چھوٹا اور ہلکا گیس انجن بنایا۔ انھوں نے اپنی ایرپلین میں اسٹیرنگ ویل لگایا جس سے اس کو قابو میں رکھنا آسان ہوگیا۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے موسم خزاں تک ہر چیز آزمائش کے لئے تیار ہوگئی۔ دو آزمائشیں کی گئیں اور لینگ لے کے مددگار نے مشینوں کو چلایا لیکن دونوں مرتبہ کوئی نہ کوئی چیز بگڑ گئی اور مشین بلند ہونے سے قاصر رہی اپنی ناکامی سے مایوس ہو کر لینگ لے نے اپنے تجربوں کو ترک کر دیا اور اس کے چند روز بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ باوجود اس کے کہ اس کی مشین کام نہ کرسکی لیکن پھر بھی اسے "ہوابازی کے باپ" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

آخر کار ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء کو کامیابی بھی حاصل ہوگئی! لینگ لے کی مشین کی ناکامی کے کچھ عرصہ بعد آرول اور ولبر رائٹ نے آدمیوں کے لے جانے والے جہاز میں پہلی دفعہ مسلسل پرواز کی

۵۹ سکنڈ تک (اور یہ مدت ایسی تھی جس کا لوگ خواب میں بھی حوصلہ نہیں کر سکتے تھے) ان کی ہوا سے بھاری مشین زمین سے اٹھی رہی اور ۲۶۰ گز کی مسافت اس نے طے کی۔

برائٹ برادران کے اس کارنامے سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ عملی کامیابی کے لئے ابتداءً علمی مطالعہ اور ہوشیاری کے ساتھ تجربہ کرنا بہت ضروری ہے۔ کچھ عرصہ تک برائٹ برادران اپنی کامیاب پرواز کے لئے تیاریاں کرتے رہے۔ انھوں نے گلائیڈروں کے ذریعہ تجربے کیے اور ایرپلینوں پر ہوا کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اپنے آپ کو عادی بنایا۔ ہوا اور موسم کے جو مطالعے شائع کئے جا چکے تھے صرف ان سے ہی انھوں نے نہیں سیکھا بلکہ ایرپلین کے نمونوں پر ہوا کا جو اثر ہوتا تھا اس کے بھی انھوں نے ذاتی طور پر تجربے کئے مثلاً انھوں نے ایک چھوٹی "ہوائی سرنگ" بنائی جو چھ فٹ لانبی اور سولہ اِنچ گول لکڑی کی نالی تھی۔ اس سرنگ میں انھوں نے ہوا کو ایک گھومنے والے پنکھے کے ذریعہ سے چلایا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جہازوں پر جن کے بازو مختلف چیزوں سے اور مختلف وضع کے بنے ہوئے تھے ہوا کے دباؤ کا مطالعہ کیا۔ آج بھی اگرچہ ایرپلینوں کی تعمیر کے بارے میں بہت کچھ دریافت کیا جا چکا ہے لیکن پھر بھی تجربہ کی ہوائی سرنگیں ایرپلینوں کو آزمانے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ رائٹ برادران ہماری عزت کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ پہلے اشخاص تھے جنھوں نے ہوائی جہازوں کے کاموں کا مطالعہ ظن و تخمین پر بھروسہ کرنے کی جگہ علمی طریقہ پر کیا۔

رائٹ برادران نے نہ صرف گلائیڈروں پر تجربہ کرنے اور ہوا کی لہروں میں بازوؤں پر قابو رکھنے میں کئی سال صرف کئے بلکہ انھوں نے مناسب سائز اور قوت کے گیس انجن کو بھی ایجاد کیا۔ ایرپلین کے موٹر بنانا انھوں نے اس خوبی کے ساتھ سیکھ لیا تھا کہ آج بھی رائٹ موٹروں کا استعمال بہت عام ہے۔ جس ایرپلین میں کرنل چارلس۔ اے۔ لنڈ برگ ۱۹۲۷ء میں امریکہ سے پیرس اڑ کر گئے تھے اس میں بھی رائٹ کا موٹر لگا ہوا تھا۔

۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کی پہلی کامیابی کے بعد رائٹ برادران نے اپنے تجربوں کو جاری رکھا اور اپنے موٹروں اور مشین کے مختلف حصوں میں برابر اصلاح کرتے رہے ۱۹۰۵ء تک رائٹ کے ایرپلین ایسے ہو گئے کہ انھیں ایک گھنٹے سے زیادہ تک ہوا میں بلند رکھا جا سکتا تھا۔ یورپ کے ملکوں نے رائٹ برادران کی قدر و عظمت کو فوراً تسلیم کرلیا۔ وہ یورپ کے بہت سے ملکوں میں اپنے ایرپلینوں کا تعارف کراتے اور ان کی نمائش کرتے رہے۔ فرانس میں خاص طور پر ہوا بازی میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور فرانس کے کئی شہروں میں رائٹ برادران کے ورود سے دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

۱۹۰۶ء میں سانٹوس ڈومنٹ نے جو ۱۹۱۰ء تک DIRIGIBLES کا کامیاب ترین بنانے والا سمجھا جاتا تھا انجن والے ایرپلین پر سب سے پہلا سرکاری طور پر مستند یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ایک دوسرے فرانسیسی لوئی بلیریو نے انجن سے چلنے والے ایرپلین پر رود بار انگلستان کو عبور کیا۔ اس کو ایک بہت بڑا واقعہ سمجھا گیا۔ بہت سے لوگوں کو اس بات میں شبہ تھا کہ ایرپلین کے ذریعہ انگلستان کے رود بار کو عبور بھی کیا جا سکتا ہے حالانکہ ایک غبارہ کے ذریعہ یہ کام کیا جا چکا تھا۔

ریاست ہائے امریکہ کے لوگوں نے بھی آہستہ آہستہ ہوا بازی کو قبول کر لیا۔ ۱۹۱۰ء میں گلین کرٹس نے سب سے پہلا پانی اور خشکی دونوں میں اترنے اور چڑھنے والا ایرپلین ایجاد کیا۔ اس کے جہاز میں پہیوں کی جگہ کشتی کی طرح پھسلنے والے بیلن (RUNNERS) لگائے گئے تھے۔ کرٹس کی اس کامیابی کو دیکھ کر موجدوں نے ایسے ایرپلین ایجاد کئے جو ہوا اور پانی دونوں پر اتر سکتے تھے۔ ایسے ہوائی جہازوں کو "جل بھومی" جہازوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پھر بھی بہت سے آدمی ہوائی جہازوں کی طرف سے کچھ بدظن سے ہی رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۱ء تک امریکہ میں صرف ۲۵ لائسنس دار ہوا باز موجود تھے۔ فرانس میں اسی زمانہ

میں ۴۸۳ لائسنس دار ہوا ران تھے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوا رانوں کی تعداد امریکہ سے زیادہ تھی۔ امریکہ میں ایرپلینوں کو ابھی تک ایک عجوبہ چیز سمجھا جاتا تھا اور ان کو غبارو کی طرح صرف سرکسوں اور دیہات کی نمائشوں میں دکھایا جایا کرتا تھا۔

جنگ عظیم میں ہوائی جہازوں کی ترقی | اس کے بعد ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ہوا کا سفر چار بڑے ذرائع نقل وحمل میں سے ایک ہوگیا۔ جنگ کی ابتدا میں بڑے ملکوں میں سے کسی کے پاس بھی بہت سے ہوائی جہاز نہیں تھے۔ لیکن جنگ کے اختتام کے وقت ہزاروں مکمل جہاز اور تربیت یافتہ جہاز راں موجود تھے۔ کم دام کے ایرپلینوں کو کثیر تعداد میں پیدا کرنے کی جب مانگ ہوئی تو اس کے جواب میں انجنیروں اور سائنس والوں نے ان کو بہت بہتر بنا دیا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ کثیر مقدار میں ایرپلینوں کو اسی صورت میں بنایا جا سکتا ہے کہ ان کی مشینیں سادہ ہوں اور ان کے مختلف حصے معیاری وضع پر ڈھالے جائیں۔ دوسری مشین کی صنعتوں میں جو بات پہلے ہو چکی تھی وہی بات ہوا بازی میں بھی ہوئی یعنی کام کی تخصیص اور مشین کے معیاری وضع کے ہونے کو یہاں بھی رواج دیا گیا۔ ترقی جس طرح ہوئی اس کی وضاحت ذیل کے مثال سے ہو سکے گی:

جب امریکہ ۱۹۱۷ء میں جنگ میں شریک ہوا تو محکمہ فوج نے ۴ ہزار ایرپلین کے تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس منصوبہ میں فوراً تبدیلی کرنا پڑی اور اٹھارہ مہینہ کے اندر اندر ۱۵ ہزار ایرپلین تیار ہو گئے جن کے چلانے کے لئے موٹر لگے ہوئے تھے۔ اس بڑے پیمانہ پر ایرپلینوں کے تیار کرنے میں جس چیز سے سب سے زیادہ مدد ملی وہ معیاری موٹر تھے یعنی ایسے موٹر جن کے حصے معیاری شکل اور وضع کے تھے۔ اس کا نام لبرٹی موٹر رکھا گیا تھا۔ ان کی تکمیل بہت سے ہوائی انجنیروں نے مل کر کی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اتحادیوں کے جتنے ایرپلین دشمنوں سے یورپ میں لڑ رہے تھے سب میں یہی موٹر لگا دیا گیا۔

جنگ عظیم کا ہوا رانی پر ایک اور دوسرا اہم اثر بھی ہوا۔ اس کی وجہ سے بہت سے

نوجوان اور ذہین آدمیوں نے تربیت حاصل کر لی اور جب جنگ ختم ہوئی تو ایرپلینوں کے چلانے والے ہزاروں ماہر موجود تھے ان میں سے بہت سے تو ہوائی ڈاک کے محکمہ میں ملازم ہو گئے لیکن باقی لوگوں کو تجارتی فضائی نقل و حمل کے کام میں لگنا پڑا۔ اس کے علاوہ بہت سے فوجی ہوائی جہاز نجی طور پر لوگوں نے تفریح یا تجارت کرنے کے لئے خرید لئے۔

غرضکہ اس طرح ہوا رانی سے لوگوں کو عام طور پر دلچسپی پیدا ہو گئی۔ محکمہ جنگلات نے اپنے رینجروں کے لئے انھیں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ محکمہ زراعت نے ان علاقوں میں جہاں فصلیں اور درخت وبائی امراض میں مبتلا ہو جاتے تھے ان کے ذریعہ دواؤں کو چھڑکنا شروع کر دیا۔ ساحل کے محافظوں نے انھیں پٹرول کے لئے اور انجنیروں نے انھیں پیمائش اور ملک کی نقشہ کشی کے لئے استعمال کیا۔ مٹری الی آلوجی کے محکمہ والوں نے ان کے ذریعہ موسم اور ہواؤں کی رپورٹیں حاصل کرنا شروع کیں۔ سرکاری ملازموں نے ان سے فاقہ زدہ چڑیوں کو غذا پہنچائی اور منطقہ بارده کے رین ڈیروں کو گھیرا۔ ہیرے کی جونئی کانیں دریافت ہوئی تھیں ان سے فائدہ کی امید رکھنے والے حریفوں نے اس تیز رفتار ذریعہ نقل و حمل کا استعمال کر کے اس علاقہ میں جلد پہنچ جانے کے لئے مقابلہ کی دوڑ کی۔ لوگوں کو دریاؤں کے سیلاب اور پہاڑوں کی برف سے اس کی معرفت نجات دلائی گئی۔ جو سائنس داں دبے ہوئے شہروں کو ڈھونڈھ رہے تھے انھوں نے ان کو محل وقوع کو ایرپلین کے ذریعہ زمین کی سطح کی غیر معمولی شکل و شباہت کو بڑی اونچائی سے مشاہدہ کر کے معلوم کیا۔

ہوائی راستے اور ہوائی جہازوں کے اسٹیشن | ہوائی جہازوں کے لئے اچھے نشان کئے ہوئے راستوں اور آسان اترنے کی جگہوں کی ضرورت ہے اور جب رات کو پرواز کی جائے تو ان راستوں کو روشن رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے ایسی روشنیاں ایجاد کی گئی ہیں جو کہرے اور طوفان کے درمیان بھی چمکتی رہتی ہیں اور ایرپلینوں اور ہوائی جہازوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہیں۔

آیئے ایک ہوائی ڈاک گاڑی کے سفر کا رات کے وقت مشاہدہ کریں۔ جہاں سے ایرپلین روانہ ہوتا ہے وہ میدان بہت روشن ہوتا ہے۔ دوڑنے کے لئے جو راستہ بنا ہوتا ہے وہ بھی بہت روشن رکھا جاتا ہے تاکہ ایرپلین چلانے والا آسانی سے اپنی گاڑی کو دوڑا کر پرواز کر سکے۔ دوسری منزل کا راستہ بتانے کے لئے روشنیاں لگی رہتی ہیں جس کی وجہ سے ایرپلین جب تک خشکی پر اڑتا رہتا ہے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر کوئی خرابی واقع ہوگی تو ہنگامی ضرورتوں کے لئے ایسے میدان موجود ہیں جہاں وہ اتر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے راستہ کے بیشتر حصہ کا انتخاب نہایت ہوشیاری اور خبرداری کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کے باقاعدہ نقشے بنا دئے گئے ہیں۔ یہ راستہ خاصی ہموار زمین پر رکھا جاتا ہے جہاں اترنا مشکل نہیں ہوتا۔ جب آدمی پہاڑ پر پہنچتا ہے تو وہاں اور زیادہ اترنے کی جگہیں بنائی جاتی ہیں اور رہنمائی کرنے والی روشنیاں اور زیادہ قریب قریب نظر آنے لگتی ہیں۔ بعض بڑی روشنیوں میں پچاس کروڑ موم بتیوں کی قوت ہوتی ہے۔ یہ روشنیاں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ ان کی شعاعوں کو ایک سو پچاس میل کے فاصلہ تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی روشنیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے دس میل دور ہوتی ہیں۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک کا پورا راستہ روشن ہوتا ہے تاکہ رات کو ہوائی ڈاک حفاظت کے ساتھ لے جائی جا سکے۔ اگر موٹر کی سڑکوں کا مقابلہ ہوائی راستوں سے کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک حد تک متوازی چلتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بڑے شہروں کو جس طرح اور دوسرے وسائل آمد و رفت کے ذریعہ ایک دوسرے سے متحد کیا جاتا ہے اسی طرح ہوائی راستہ کے ذریعہ بھی متحد کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں ایرپلینوں کے اترنے کی جگہوں کو بڑے شہروں سے دور بنایا جاتا تھا کیونکہ اس کو زیادہ محفوظ سمجھا جاتا تھا لیکن اب نئے ہوائی اسٹیشن شہروں سے قریب بنائے جانے لگے ہیں۔ جو کاروباری آدمی ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرنے کے لئے

ایرپلین کا استعمال کرتے ہیں وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اپنی منزل مقصود پر جس قدر جلد ممکن ہو سکے پہنچ جائیں۔ بہت سے بڑے شہروں میں جس طرح کئی ریلوے اسٹیشن ہوتے ہیں ایسے ہی ہوائی جہازوں کے اترنے کی بھی کئی جگہیں ہوتی ہیں۔ ان میدانوں میں نہ صرف ایرپلینوں کے اترنے کی سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ مسافروں کے آرام کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

یہ ہوائی اسٹیشن راستہ کو صرف روشن ہی نہیں رکھتے بلکہ ریڈیو کے ذریعہ ہوابازوں کو ہدایت بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہر ایک ایرپلین میں ایک ریڈیو کا ریسیور لگا ہوتا ہے۔ یہ ایک نازک اوزار ہوتا ہے جس میں وہ اشارے درج ہو جاتے ہیں جو ہوائی اسٹیشن سے ریڈیو کے ذریعہ روانہ کئے جاتے ہیں۔ ان اشاروں سے ہوا باز کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے یا اس نے دائیں یا بائیں طرف اپنے ایرپلین کو زیادہ موڑ دیا ہے۔

یہ ہوائی اسٹیشن موسم کے بارے میں بھی جدید ترین اطلاعیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کو معلوم کر کے ہوا باز اکثر صورتوں میں جس سمت میں اس کا ایرپلین جا رہا ہے اسے بدل کر طوفانوں سے بچ سکتا ہے۔ بہت سے اسٹیشنوں میں روشنی کے تیر لگے ہوتے ہیں جن سے ہوا کی سمت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایرپلین اور ہوائی جہاز ہوا اور موسم کے اتنے ہی پابند ہوتے ہیں جیسے سمندر کے بادبانی جہاز اور ہوا بازی کے لئے مہارت اور مناسب اوزاروں کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی سمندر میں جہاز رانی کے لئے ہوتی ہے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ تک تیزی کے ساتھ سفر کرنے کے لئے ایرپلینوں کو آج اسی طرح کرایہ پر لیا جا سکتا ہے جیسے کہ موٹر گاڑی کو لیا جاتا ہے لیکن مسافروں کے واسطے مقررہ اوقات پر چلنے والی ہوا گاڑیاں بھی ہوائی ڈاک گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں امریکہ میں جن راستوں پر باقاعدہ ہوا بازی کی جاتی تھی ان کا فاصلہ ۱۲ ہزار میل تھا اور اسی سال ہوائی اسٹیشنوں کی مجموعی تعداد تین ہزار آٹھ سو چھ تھی۔

امریکہ کے موجودہ ہوائی راستوں کی پیمائش کرنے کے لئے کرنل چارلس اے لنڈبرگ نے ۲۲ ہزار ۲۵۰ میل اور ۸۲ شہروں کا ہوائی سفر کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پڑوس میں جو اور ملک آباد ہیں ان کا سفر اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس نے واشنگٹن سے شہر میکسیکو تک جو ۲ ہزار میل کا فاصلہ ہے بغیر رکے ہوئے سفر کیا۔ اس کے بعد پھر وہ گوآتی مالا، برطانوی ہونڈراس، ال سالوادور ہونڈراس، نکاراگوآ، کوسٹاریکا، پناما، کولمبیا اور دینی زویلا گیا اور جزائر ورجن، پیورٹوریکو، سانٹو ڈومنگو، ہیتی اور کیوبا کے راستے سے ہوتا ہوا واپس آیا۔ یورپ کے جنوبی امریکہ کے ساتھ ہوائی تعلقات قائم ہو گئے ہیں اور امریکہ بھی اس براعظم کے ساتھ ہوائی ڈاک اور تجارت کے تعلقات شروع کر چکا ہے۔

مشہور پروازیں | پرواز کے ریکارڈ نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے اس سے ہوا رانی کی ترقی کی تیزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک بغیر کہیں رکے ہوئے خشکی کے سیدھے راستے سے ہوائی سفر کرنے میں ۴۹ دن لگتے تھے جس ہوائی گاڑی میں سفر کیا گیا تھا اس کا انجن بہت مختصر تھا۔ کئی جگہ انجن ٹوٹا اور ایندھن اور مرمت کے لئے بھی کئی جگہ اترنا پڑا۔ لیکن اس سے تیرہ سال بعد ہوائی گاڑی سے براعظم کو عبور کرنے کے لئے صرف ۲۱ گھنٹہ اور ۴۸ منٹ صرف ہوئے۔ اس چھوٹی سی مدت میں انجنوں کا سائز اور ان کی اہلیت کارکردگی دس گنا بڑھ گئی۔ اس کے بعد بھی ہر سال پرواز کے اس ریکارڈ میں اور زیادہ ترقی ہوتی رہی ہے۔

اس کے علاوہ اسی زمانہ میں کچھ لوگ بحر اٹلانٹک کو عبور کرنے کی جرأت آزما کوششیں بھی کر رہے تھے۔ مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں امریکہ کے محکمہ بحری کی ایک ہوائی کشتی نے جس کا نام این۔ سی۔ ۴ تھا پانچ آدمیوں کے ساتھ کئی جگہ رک کر بحر اٹلانٹک کو عبور کر لیا۔ پہلی پرواز شہر نیویارک سے ہیلی فیکس تک کی گئی دوسری ہیلی فیکس سے جزائر ازورس تک اور پھر جزائر ازورس

سے لسن (پرتگال) تک۔ اور یوں دخانی جہاز کے اٹلانٹک کو عبور کرنے کے ٹھیک ایک صدی بعد ایرپلین سے بھی بحر اٹلانٹک کو عبور کر لیا گیا۔ اس کے صرف ایک مہینہ بعد ۱۴ر جون ۱۹۱۹ء کو دو انگریزوں نے بحر اٹلانٹک کو پہلی مرتبہ بغیر کہیں رکے ہوئے عبور کر لیا۔ ان کا سفر نیوفاؤنڈلینڈ سے آئرلینڈ تک جو ۲۰۰۰ میل کا فاصلہ ہے سولہ گھنٹے کے اندر پورا ہوا۔

یہ تمام پروازیں ہوا سے بھاری مشینوں میں کی گئی تھیں۔ اسی اثنا میں ہمت والے لوگ ہوا سے ہلکی مشینوں میں بھی لانبی پروازیں کر رہے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے ایک DIRIGIBLE نے اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) سے شہر نیویارک تک بغیر کہیں رکے سفر کیا اور تھوڑے عرصہ بعد حفاظت کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ ۱۹۲۸ء کی خزاں میں گراف زیپلین نے جس میں بیس مسافر سوار تھے بغیر رکے ہوئے مسلسل سفر جرمنی سے شہر نیویارک تک کیا۔ اس نے طویل جنوبی راستہ کو اختیار کیا جو اسپین، ازورس اور جزائر بہاما سے گذرتا ہے اور جس کا فاصلہ ۶ ہزار میل ہے یہ سفر ۱۱۲ گھنٹہ میں پورا ہوا۔

اس کے بعد اور دوسرے مہم پسند ہوا راں ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ قائم کرتے رہے ۱۹۲۴ء میں تمام دنیا کے گرد یعنی ۲۶ ہزار میل کی پرواز ریاست ہائے متحدہ کے محکمہ فوج کے کچھ ہوا راوں نے ۱۵ دن میں کی ۱۹۲۶ء میں ایرپلین اور ہوائی جہاز دونوں کے بارے میں یہ بات ثابت کر دی گئی کہ انھیں منطقات بارد میں بھی چلایا جا سکتا ہے کمانڈر رچرڈ برڈ اور اس کے مددگار فلائیڈ بنٹ نے اسپٹس برگن سے قطب شمالی تک اور وہاں سے واپس ایک ایرپلین میں سفر کیا اس کو ایک مہینہ بعد ایمنڈسین۔ ایلس ورتھ۔ نوبائل کی مہم والوں نے غبارہ جہاز نورگے (NORGE) کے ذریعہ اسپٹس برگن سے چل کر قطب شمالی سے ہوتے ہوئے الاسکا تک پرواز کی۔ اس کے دو سال بعد کمانڈر برڈ نے بہت مکمل تیاری کے بعد اور علمی حساب اور نقشہ کے مطابق جنوبی قطب کے گرد جو لا معلوم زمین ہے اس کے دریافت کرنے کے لئے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم میں ایرپلین سے بہت

زیادہ کام لیا گیا۔

لیکن جس پرواز کا سب سے زیادہ چرچا ہوا وہ ۲۰ اور ۲۱ مئی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ نوجوان چارلس اے۔ لنڈبرگ نے جو پہلے ایک ڈاک کے ہوائی جہاز میں ہوا باز کی حیثیت سے کام کرتا تھا تن تنہا نیویارک سے پیرس تک جو ۳ ہزار ۶۱۰ میل کا فاصلہ ہے ۳۳½ گھنٹوں میں سفر کیا۔ لنڈبرگ کو یہ نمایاں کامیابی محض اپنی ذاتی جرأت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ پرواز میں اپنی غیر معمولی مہارت اور اپنی پرواز کی پوری تفصیلات کو پہلے سے سوچنے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ کمانڈر برڈ اور دوسرے ریکارڈ قائم کرنے والوں کی کامیابی کی طرح لنڈبرگ کی کامیابی سے بھی لیونارڈو ڈاونسی کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوئی کہ "پرواز میں کامیابی صرف ریاضی کے ذریعہ حاصل ہو سکے گی" ریاضی سے لیونارڈو کا مفہوم یہ تھا کہ ہوشیاری کے ساتھ عملی طور پر تمام باتوں پر پہلے سے غور و فکر کرنے کے بعد۔

اس کے بعد سے ہر سال برداشت، اونچائی تک پہنچنے اور تیز رفتاری کو حاصل کرنے کے ریکارڈ برابر ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک فرانسیسی افسر لفٹننٹ چیمپین نے سمندر کی سطح سے سات میل کی بلندی تک یعنی ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی سے جو دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے ۹ ہزار فٹ زیادہ اونچے تک پرواز کی جس طرح بلندی تک چڑھنے کا ریکارڈ قائم کیا گیا تھا اسی طرح برداشت کا ریکارڈ بھی قائم کیا گیا۔ یکم جنوری سے ۷ جنوری ۱۹۲۹ء تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ فوج کا ایک ایرپلین جس کا نام "سوالیہ نشان" تھا ہوا میں ہی دوبارہ ایندھن بھر بھر کر ۱۵۰ گھنٹہ ۴۰ منٹ اور ۱۴ سکنڈ تک مسلسل ہوا میں بلند رہا۔ اس کا مقابلہ جب آرول اور ولبر رائٹ کی پرواز سے کیا جاتا ہے جو ۱۹۰۳ء میں صرف ۵۹ سکنڈ تک کی گئی تھی تو اس وقت ترقی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے! تیز رفتاری میں ایرپلینوں نے اور بھی زبردست ریکارڈ قائم کر دئے ہیں ۱۹۲۷ء میں ۲۸۰٫۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار کا ریکارڈ قائم کیا گیا تھا اس کے بعد رفتار سوا تین سو میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔

ہم آج کل تیز رفتاری کے دور میں زندگی گذار رہے ہیں۔ زمین، پانی اور ہوا ہر جگہ
تیز رفتاری کو حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ذیل میں تیز رفتاری کے چند ریکارڈ
جو ۱۹۲۷ء تک قائم کئے گئے تھے درج کیا جاتا ہے:-

آدمی کی دوڑ	۲۱ میل فی گھنٹہ
گھوڑے کی دوڑ	۳۹ "
بائیسکل کی دوڑ	۵۷ "
غبارہ والے ہوائی جہاز کی دوڑ	۸۱ "
موٹر کشتی کی دوڑ	۹۳ "
موٹر سائیکل کی دوڑ	۱۱۲ "
ریلوے ٹرین کی دوڑ	۱۲۰ "
موٹر کار کی دوڑ	۲۳۱ "
ایرپلین کی دوڑ	۲۸۲ "

اس فہرست میں جو ریکارڈ درج کیا گیا ہے اس کے بعد بھی اور زیادہ ترقیاں ہوچکی
اور آئندہ ہوتی رہیں گی۔ لیکن ہمارے ملک ہندوستان کی ۹۰ فی صدی آبادی اب بھی ان
بیل گاڑیوں پر بہت کچھ انحصار کرتی ہے جن کی اوسط رفتار فی گھنٹہ غالباً دو تین میل سے زیادہ
نہیں ہے!

دُنیا کی رفتار

ممالک غیر

ہر ہٹلر اپنی تقریروں میں اکثر پارلیمنٹوں میں بیٹھنے والے نکموں کا بڑی حقارت سے ذکر کرتے ہیں اور ان کے اور سنور مسولینی کے پیرو بڑے فخر کے ساتھ اپنے حاکموں کا جو ہر معاملے کا کھٹ سے فیصلہ کر دیتے ہیں اس جمہوری طریقے سے مقابلہ کرتے ہیں کہ جس میں ہر معاملہ شیطان کی آنت بن جاتا ہے، کبھی کوئی بات طے نہیں ہوتی اور فیصلہ کرنے کی ذمے داری ایک خوب صورت مگر بہت ہی بھاری تاج پر ہوتی ہو کہ جسے کسی کو اپنے سر پر رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی جمہوریت کے قدر دان اس کے جواب میں ہر ہٹلر پر تہمت لگاتے ہیں کہ انھیں خود فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں وہ صرف دوسروں کے فیصلہ کو اپنا لیتے ہیں اور جمہوری حکومتوں کی سستی کا جب ذکر آتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ سستی نہیں سوچ سمجھ کر کام کرنے کی کوشش ہے جو ان لوگوں کو جو شخصی آزادی اور جمہوریت کے آداب کی قدر نہیں پہچانتے انتہا پسند اور جلد باز ہیں سستی اور ٹال مٹول معلوم ہوتی ہے۔

شخصی اور جمہوری حکومتوں کے عیبوں اور خوبیوں کی بحث تو سینکڑوں برس سے جاری ہے اور ہم شاید کبھی اس کا فیصلہ نہ کر پائیں گے کہ ان دونوں میں سے کس میں عیب کم ہیں یا خوبیاں زیادہ ہیں اتنی بات ضرور ہے کہ بادشاہ یا ڈکٹیٹر کسی بڑے معاملے میں فیصلہ نہ کر پائیں تو سب اس کے کفنانے دفنانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور جمہوری حکومت فیصلہ کرنے میں جتنی دیر لگائے اتنی ہی اس کی شان بڑھ جاتی ہے، ہر ہٹلر کی فلسطین پر حکومت ہوتی تو ناممکن تھا کہ عرب اپنی جگہ پر بغاوت اور ہر ہٹلر حکومت کرتے رہتے۔ برطانیہ کی جمہوری حکومت تین برس

تک فلسطین کے مسئلے پر غور کرتی رہی ہے اور اگر فلسطین میں امن نہیں ہے تو اس سے برطانیہ کی شان میں کوئی فرق بھی نہیں آیا ہے بلکہ کہنے والا اس مثال کو سامنے رکھ کر یہاں تک کہہ سکتا ہے کہ جمہوری طریقے میں وہ برکت ہے کہ حکومت اور بغاوت بھی دودھ اور شکر کی طرح مل جاتے ہیں بادشاہ یا ڈکٹیٹر کو آخری اور قطعی فیصلہ کرنے کا جو اختیار ہے وہ سمجھئے ایک ننگی تلوار ہے کہ جس سے کام نہ لیا جائے تو اس میں زنگ لگ جاتا ہے۔ جمہوریت ایسے خطرناک ہتھیار رکھتی ہی نہیں اور پیسنا اور چھاننا ایسے کام ہیں کہ جو ہر چیز کے ہوا ہو جانے تک جاری رہ سکتے ہیں پھر ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ پیسنے اور چھاننے والے جتنی مستعدی دکھائیں اتنے ہی وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف ایک ہلکا سا غبار چھا جاتا ہے اور اگر کوئی اعتراض کرنے والا ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے تو وہ آنکھیں ملتے ملتے اور چھینکتے چھینکتے حیران ہو جاتا ہے کہ منھ سے بات بھی نہیں نکلتی۔ فلسطین کے معاملے نے جمہوریت کی حکومتوں کی چکیوں میں پسنے اور چھلنوں میں چھننے کے بعد جو صورت پائی ہے وہ آپ جانتے ہیں شروع میں عربوں اور یہودیوں کے مطالبے اور برطانوی سیاست کی مصلحتیں یہ ڈلے تھے، اتنے بڑے کہ فلسطین کی برطانوی حکومت کے ہاتھوں سے گر گر جاتے تھے، اور اتنے سخت کہ ان کا ٹوٹنا مشکل تھا اس لئے یہ طے پایا کہ کمیشن کی چکی انھیں پیسے، اور یہ دیکھا جائے کہ وہ اس طرح بھی حل ہو سکتے ہیں یا نہیں کمیشن اس میں کامیاب نہ ہوئی تو گول میز کانفرنس کی زیادہ بڑی چکی تجویز کی گئی لیکن یہ ڈلے کچھ ایسے تھے کہ پاٹوں کے بیچ میں آکر بار بار نکل جاتے تھے آخر میں اس اصول پر عمل کیا گیا کہ جو چبایا نہ جا سکے اسے اللہ کا نام لے کر نگل جاؤ اور قدرت کی صلاحیتوں پر بھروسہ کرو اس کا نتیجہ وہ تجویز ہے جو ۱۸ مئی کو شائع ہوئی اور جس پر ایک ہفتہ بعد پارلیمنٹ میں بحث ہوئی۔

فلسطین کی گول میز کانفرنس نے چکی کا کام تو نہیں کیا اس پر جو وقت اور محنت صرف ہوئی وہ بے کار نہیں گئی کانفرنس نہ ہوتی تو یہ بات بھی نہ ثابت ہو سکتی کہ عرب اور یہودی آپس میں کچھ طے نہیں کر سکتے۔ بقیہ جمہوری اصول کے مطابق وزیر نو آبادیات مسٹر میکڈانلڈ کو اس

بات کا حق پہنچتا کہ وہ برطانوی حکومت کی طرف سے کوئی فیصلہ کریں اور عربوں اور یہودیوں کو یہ
شکایت رہتی کہ ان سے مشورہ کئے بغیر ۔ فیصلہ کیا گیا ہے کانفرنس سے ایک فائدہ
یہ بھی ہوا کہ عربوں اور یہودیوں سے جو الگ الگ وعدے کئے گئے تھے انھیں پورا کرنے کی
ذمہ داری برطانیہ کے سر سے ٹل گئی مسٹر میکڈ نلڈ نے اپنی تقریر میں کہا کہ برطانیہ نے کسی فریق
سے وعدہ خلافی نہیں کی ہے یہودیوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین اس کا قومی گھر بنایا
جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ برطانیہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرے گا
ایسا ہوتا تو مسٹر بیلفر اور مسٹر موج جنھوں نے وعدہ کیا تھا، ہوم یعنی گھر کی جگہ اسٹیٹ یعنی ریاست
کا لفظ استعمال کرتے۔ مسٹر میکڈ نلڈ کا خیال ہے کہ ان کے بزرگوں نے خاص اس مصلحت
سے کہ آگے چل کر نہ جانے کیا صورت پیدا ہو جان بوجھ کر ایسی گول بات کہی کہ ان کی گرفت
نہ کی جا سکے، لیکن ایسی بات کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء سے اس وقت تک
یہودیوں کو دھوکے میں رکھا گیا جس سے ظاہر ہے یہودی خوش نہ ہوں گے دوسری طرف
عربوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی تفصیل بیان کرتے وقت مسٹر میکڈ نلڈ اصل بات ٹال گئے
جنرل میکموں اور عرب سرداروں میں جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ بحث اس
وقت سے شروع کی جبکہ عربوں کو خبر ملی تھی، کہ فلسطین یہودیوں کو دے دیا جائے گا اور وہ اس
سبب سے بہت بے چین اور بددل ہو رہے تھے، عربوں سے جو پہلا اور اصل وعدہ کیا گیا تھا، اس
میں یہودیوں کا کہیں ذکر نہ تھا اور اس سے منہ پھیر کر اگرچہ مسٹر میکڈ نلڈ نے بڑی مشکل آسان کر لی،
لیکن عرب ایسے بھولے نہیں ہیں کہ اس طرح قائل کئے جا سکیں اس سے بہت زیادہ بہتر
ہوتا اگر مسٹر میکڈ نلڈ کہہ دیتے کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانوی سیاست مجبور تھی کہ جس طرح بن
پڑے عربوں اور یہودیوں کو اپنے ساتھ ملائے، اور اپنا کام چلائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
عربوں اور یہودیوں سے الگ الگ ایسے وعدے کر لیے گئے ہیں جن میں سے ایک دوسرے
کے خلاف پڑتا تھا۔ اب شکوہ شکایت کرنا بیچ کی بحث چھیڑنا بے کار ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا

نتے ہیں کہ مسٹر بلو کا یہ کہنا کہ عرب یہودیوں کو فلسطین کا چھوٹا سا علاقہ دے دیں تو ان کا کیا بگڑ
ے گا یا اس طرح کے فقرے چست کرنا کہ یہودیوں کے لئے قومی گھر بنانے میں ہم ایسے لوگوں
ن کا کوئی وطن نہیں ہے۔ ایسا ملک دے رہے ہیں کہ جہاں کوئی آبادی نہیں ظاہر کرتا ہے
فیں فلسطین کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اور انھیں اس کی پروا بھی نہ تھی۔ لیکن وہ اب
سے سدھار چکے ہیں اور اب ان پر الزام لگانے میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے اور برطانوی
سیاست ان کی بات رکھنے کی جو تدبیریں کر سکتی تھی کر چکی۔ رہا عربوں کا مطالبہ وہ ہمیں اپنی
حت اور ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے منظور ہے، ہم نے گول میز کانفرنس اس
نت سے کی تھی، کہ ممکن ہو تو عرب اور یہودی ہمارے مشورے سے آپس میں کوئی فیصلہ کرلیں
ولوں کو مناسب معلوم ہو، مگر کانفرنس کچھ طے نہ کر سکی اس لئے ہم نے موجودہ حالت
سامنے رکھ کر اپنی طرف سے ایک تجویز پیش کی ہے، مسٹر میکڈونلڈ نے پارلیمنٹ میں
ریر کی اس کا منشا یہی کہنا تھا۔ لیکن انھوں نے بات خواہ مخواہ پیچیدہ کر دی اور جو تجویز
انے پارلیمنٹ سے منظور کرائی ہے اس میں بھی بڑے پیچ ہیں فلسطین میں عربوں
ثریت رہے گی اور پچھتر ہزار سے زیادہ یہودی وہاں جا کر آباد نہ ہو سکیں گے یہودیوں کو
ن خریدنے کی بھی وہ آزادی نہ ہوگی جو اب تک انھیں حاصل تھی عربوں اور یہودیوں کو ان
دی کی نسبت سے حکومت کے کاموں میں اور ہائی کمشنر صاحب کے کونسل ہاؤس میں
یک کیا جائے گا اور دس برس بعد اس پر غور کیا جائے گا کہ فلسطین کی آبادی کس حد تک
تار جمہوری حکومت کرنے کے لائق ہے۔ لیکن اس دعوے کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی
لہ عرب اور یہودی دونوں برطانیہ کو ستانا چھوڑ دیں گے اور اگلے پانچ سال کے لئے طے
ہے کہ موجودہ حکومت بدستور رہے گی اور فساد اور بغاوت کا سر کچلنے کی جو تدبیریں اس
ت اختیار کی گئیں ہیں ان پر جب تک ضرورت ہوئی عمل کیا جاتا رہے گا۔
اس تجویز کا یہودیوں پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اندھا دھند مار پیٹ شروع کر دی اور

برطانیہ کی سرپرستی اور مدد سے مایوس ہوکر ان کے ایک فرقے نے طے کرلیا ہے کہ عربوں سے لڑکر اپنا حق حاصل کرے گا عربوں کی اس موڈریٹ پارٹی نے جو گول میز کانفرنس کی خبر پھیلنے پر نہ جانے کہاں سے پیدا ہوگئی تھی پارلیمنٹ کی اس تجویز کو منظور کرلیا ہے اور اس کا بہت ممتاز آدمی اس منظوری کا اعلان کرنے کی سزا میں مارا بھی جاچکا ہے انتہا پسند عرب جو پوری آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہیں سنا ہے کہ برطانوی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور دوسرے تیسرے دن ان کے چھوٹے اور بڑے جتھے پکڑے جاتے ہیں اور انتہا پسند عربوں کی طبیعت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے اب دیکھنا ہے کہ برطانوی فوج عربوں کی طبیعت کو سدھار سکتی ہے یا نہیں برطانوی فوج نے توفی الحال مناسب نہیں سمجھا کہ انتہا پسند عربوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے جو عرب گرفتار ہوئے ان کو چھوڑنے کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب کو فلسطین آنے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ اور اس کی امید بھی نہیں دلائی گئی ہے کہ ہائی کمشنر کو مشورہ دینے کا حق ایسے لوگوں کو بھی ہوگا جو دہشت انگریزی کے خلاف ہوں مگر فلسطین کو جلد سے جلد آزاد کردینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

مسٹر میکڈ نلڈ نے جو تجویز پارلیمنٹ سے پاس کرائی ہے وہ بذات خود ایسی نہیں ہے کہ فلسطین والے اسے بالکل رد کردیں۔ لیکن عربوں سے آزادی دلانے کا وعدہ کئے ہوئے کتنی برس ہوگئے ہیں اور جنرل میکموہن کے وعدے اور مسٹر میکڈ نلڈ کی تجویز میں کون کہے گا کہ زمین آسمان کا فرق نہیں ہے۔ پھر اگر وعدے کے ساتھ وعدے کی تشریح کرنے کا حق محفوظ رکھا جائے تو کیا تعجب ہے کہ اب سے دس برس بعد ان وعدوں کی جو اس تجویز میں کئے گئے ہیں کوئی اور تشریح کی جائے اور عربوں کی دس برس انتظار کرنے کی محنت بے کار ہوجائے یہودیوں کا معاملہ اور بھی نازک ہے، خدا نے ان پر اور انھوں نے خدا پر نہ جانے کب سے اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مدتوں سے دونوں میں بول چال بند ہے خدا نے ان کو فلسطین سے

نکال دیا۔ وہ برسوں دنیا میں لاوارث گھومتے رہے ہیں اب وہ برطانیہ کا سہارا لے کر اور اپنی دولت کے بھروسہ پر اپنے وطن کو پہنچے تھے خدا سے تو بعض شاید امید نہ تھی کہ ان کا ساتھ دے گا لیکن اب جو برطانیہ نے طے کر لیا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور آثار اس کے ہیں کہ ان کی دولت بھی کچھ بہت کام نہ آئے گی تو وہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں ان کے اعمال اور ان کا غصہ کہ جس نے پیغمبروں کا بھی لحاظ نہ کیا یہ دو بلائیں ہیں جو ان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں عربوں کو ان کے اعمال نے بیزار کر دیا۔ اور اب ممکن ہے کہ ان کا غصہ عربوں اور انگریزوں کو ان کی مخالفت میں متحد کر دے یہ بات ایسی ہے کہ جس سے یہودیوں کی بہت سی پرانی داستانیں یاد آجاتی ہیں اور اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کا کیا حشر ہو گا۔

تنقید و تبصرہ

اندھی دنیا اور دوسرے افسانے از جناب اختر احمد صاحب انصاری بی۔اے (آنرس)، کتابت طباعت دیدہ زیب جلد خوب صورت مع گرد پوش۔ متوسط تقطیع۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ

ناشر:۔ مکتبہ جہاں نما، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

یہ اختر صاحب کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانہ کا جو عام مفہوم ہے یعنی "عشق و محبت اور ہجر و وصل کی ایک کیف انگیز داستان" یا "تفنن و تفریح اور وقت گذاری کا ایک دلچسپ مشغلہ" — اس اعتبار سے تو اختر صاحب کے یہ افسانے 'افسانوں' کے زمرہ میں شامل کیے جانے کے لائق نہیں ہیں کیونکہ ان کے پڑھنے سے تفریح نہیں ہوتی کوفت ہوتی ہے۔ دلبستگی نہیں ہوتی انتشار اور پریشاں خاطری پیدا ہوتی ہے۔ سکون و راحت نہیں ملتی، درد و اذیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا بلکہ اتنا بوجھل ہو جاتا ہے کہ اٹھائے نہیں اٹھتا زخم پر مرہم نہیں رکھا جاتا بلکہ زخم کو کرید کر تازہ کیا جاتا ہے۔ خود مصنف نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ افسانے سماج کے پکے ہوئے پھوڑے اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضا پر ایک بے درد نشتر کے کچوکے ہیں"۔

ذیل کی چند مثالوں سے مصنف کے موضوع اور انداز بیان کا ایک تصور قائم کیا جا سکے گا۔

(۱) "گرمیوں کی ایک دوپہر":۔ اس افسانے میں ایک بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان کی ستم ظریفانہ زندگی کو پیش کیا گیا ہے یہ نوجوان گرمیوں کی ایک دوپہر میں ذرا اچھے اور صاف کپڑے پہن کر گھر سے نکلتا ہے یعنی سُرمئی رنگ کی دھاری دار اچکن، سفید کنوس کا شو، سفید موزوں کی جوڑی اور ایک پڑھا لکھا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی جیب خالی ہے

اس لئے یہ شہر تک پیدل جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن تانگے اور یکے والے ابتدا میں امید وارانہ کیفیت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بعد میں کھلے طور پر اپنی سواری پر بیٹھنے کے لئے اصرار اور مول تول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ غریب عاجز آکر ان سے بہانہ کرتا ہے کہ مجھے شہر نہیں جانا ہے یہیں نزدیک جانا ہے جس کے لئے تانگہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بعد میں تانگہ والا دوسری سواری کو بٹھا کر شہر کے قریب ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کی طرف ہنستی ہوئی اور مذاق اڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ پہلے جیسی امید وارانہ کیفیت نہیں تھی۔ معلوم نہیں اس نے ان کو نادار خیال کیا یا خسیس یا محض جھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ فسانہ ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوتا ہے :۔

"بہرحال میرا خیال ہے اگر اس دن میں اپنا پھٹا ہوا اڑکش کوٹ، پیوند لگا ہوا پاجامہ اور گھسا ہوا جوتہ پہنے ہوتا تو شاید اس ذلت اور پریشانی سے بچ جاتا"

وہ "میں نے ایسا کیوں کیا"؟۔ اس افسانہ میں تعلیم کے خواہش مند غریب بچوں کو جن حوصلہ شکن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں بیان کیا گیا ہے۔ لوگ خیرات اور احسان کی شہرت حاصل کرنے کے لئے یا درخواست گذاروں کے اصرار سے عاجز آکر ایسی ذمہ داریاں قبول کر لیتے ہیں جن کو بعد میں وہ پورا نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ سے خیرات قبول کرنے والے لوگوں کو ایسی ایسی ذلتوں اور خواریوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے جو ان کی قوت برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ عزت نفس کے تحفظ اور تعلیم کے شوق میں ایک مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم عزت نفس کی قربانی کو جہالت سے زیادہ برا سمجھ کر اپنی تعلیم کو ترک کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ اسی قسم کی ایک تکلیف دہ نفسیاتی کشمکش کا مرقع ہے جس میں آخر عزت نفس کے قیام کو تعلیم سے زیادہ بہتر سمجھ کر غریب طالب علم اپنی تعلیم کو خیرباد کہتا ہے۔

(۳) "اسپتال" میں مصنف بیماری کے ہولناک مناظر پیش کرتا ہے۔ "خدا کی پناہ! دکھی انسانیت کا یہ ہجوم مرد عورتیں اور بچے، بیمار، پریشان اور نڈھال، تھکے ہوئے، کراہتے ہوئے، چہرے

زرد ہونٹوں پر خشکی، آنکھوں میں حلقے، لبوں پر ہائے ہائے، کوئی نقاہت سے گرا جاتا ہے، کوئی کوئی کے سہارے کھڑا ہے، کوئی لنگڑا ہے، کوئی اپاہج ہے۔ کسی کے ماتھے پر دواگی کا زخم ہے، کسی کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی ہے، کسی کی آنکھ میں ناسور ہے۔ کہیں دق ہے، کہیں سل، کہیں ہیضہ، کہیں سرسام، تکلیف، تکلیف، تکلیف۔ زرد زرد شکلوں والے بیمار سفید سفید بستروں پر پڑے ہیں۔ سفید سفید چادریں اوڑھے ہوئے ہیں۔ زندگی ہے لیکن گھناؤنی ہوئی۔ موت سروں پر سایہ کئے ہوئے ہے اور اپنا سرد ہاتھ آگے بڑھا رہی ہے۔ سب خاموش ہیں حسرت سے ایک دوسرے کو تکتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں زبانیں بند ہیں۔ ہنگامے، شورشیں، ولولے، امیدیں، آرزوئیں، ارمان، یہ چیزیں ان کی دنیا سے کوسوں دور ہیں۔ ایک مقام پر عمل جراحی ہو رہا ہے۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ اسپتال میں، بیماروں کی اس دنیا میں، کہیں حسرتناک خاموشی ہے، کہیں آہیں ہیں اور کہیں چیخیں ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یا پھر دواؤں کی بو ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے جس سے یہاں کی ہوا کثیف ہے، فضا مسموم ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کیوں؟ کیوں؟

شام کو ناظم صاحب آئے۔ میں نے جو کچھ اسپتال میں دیکھا تھا بیان کیا۔ کہنے لگے "کوئی نئی بات نہیں ہے! دیکھو ظہیر! آدمی کو نظر وسیع رکھنا چاہیے۔ محدود نظر ہونا اچھا نہیں۔ آپ ایک چھوٹے سے، معمولی سے، اسپتال میں جاتے ہیں۔ وہاں چند بیماروں کو دیکھتے ہیں اور سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں لیکن ایک اسپتال ہے جو اس اسپتال سے بہت بڑا ہے جہاں کروڑوں مریض پڑے سسکتے ہیں۔ اس اسپتال کی طرف سے آپ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ اس کا درد آپ کے دل میں نہیں ہے۔ وہ اسپتال یہی سرزمین ہے جس پر آپ رہتے ہیں۔ آپ اور آپ جیسے بہت سے مریض ——— افلاس، احتیاج، جہالت، پستی، اور تعصب کے مریض۔"

اب میں کبھی سول اسپتال میں جاکر وہاں کے بدحال مریضوں کو دیکھتا ہوں تو اس بڑے اسپتال کا تصور کرتا ہوں جس میں لاتعداد مریض ہیں۔ وہ مریض جن پر زیادہ مہیب بیماریاں مسلط ہیں جن کے زخم زیادہ گہرے ہیں، جن کے ناسور زیادہ پرانے ہیں جن کے خون میں زیادہ مہلک جرثیم سرایت کئے ہوئے ہیں، جن پر موت کے آہنی پنجے کی گرفت زیادہ مضبوط ہے ــــ بہت زیادہ!!!

غرضکہ اختر صاحب کی پوری کتاب اسی قسم کی دلدوز حسرتوں، محرومیوں، جسمانی اور روحانی بیماریوں کی دسری نفرت انگیز پکاروں سے معمور ہے جس میں درد اور ہمت رکھنے والے کے لئے دعوت عمل ہے اور بزدل اور کمزور کے لئے پیغام مایوسی۔

محبت کا افسانہ | از جناب لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی۔ کتابت طباعت خوشنما جلد خوبصورت مع گردپوش۔ متوسط تقطیع۔ ضخامت ۲۸۲ صفحے۔ قیمت دو روپے، ناشر عظیم اطہر صاحب۔ محلہ منٹولہ۔ آگرہ۔

ہم نے اس کتاب کے تبصرہ کو قصداً اختر صاحب کی "اندھی دنیا اور دیگر افسانے" کے بعد رکھا ہے، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ اختر صاحب کے پیش کئے ہوئے پس منظر میں اس کتاب کے موضوع اور فنی کمالات کا جائزہ لیں۔ ہم اس بات کا اظہار شروع میں ہی کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ل۔ احمد صاحب کی یہ کتاب حقیقۃً ایک شاہکار ہے جس پر اردو زبان بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ یہ خالص رومان ہے۔ یہ پریوں کی کہانی ہے۔ دنیا کی کثافتوں اور آلائشوں، تکلیفوں اور مصیبتوں، مجبوریوں اور محرومیوں، بے کسیوں اور نامرادیوں، افلاس اور تباہ حالیوں سے دور بہت بہت دور، فطرت کی رنگین اور پربہار آغوش میں، کشمیر کے پہاڑوں کی بلندیوں اور دنیائے جہل کی پرعظمت دلفریبیوں کے درمیان اس کہانی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اسی پرکیف فضا میں پاک اور بے لوث محبت کے افسانے کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس کا ہیرو ایک تندرست اور جفاکش نوجوان ہے جو اپنی فطری کاوش سے زندگی کی ابتدائی کشمکشوں پر قابو پاکر اب دولت مند

انجینئر صاحب افسر بن گیا ہے ۔ وہ اپنی نامکمل زندگی کی تکمیل ازدواج کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے۔ خوش قسمتی سے اسے اپنی مرضی کے مطابق ایک تندرست، حسین، مہذب اور شائستہ، بورژوا طبقہ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی بھی مل گئی ہے ۔ مرد کشمیر کے دلکش مناظر کا لالچ دے کر اسے یہاں کھینچ لانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہے ۔ لڑکی شہری زندگی اور اپنے معاشری حلقہ کی جدائی کو محسوس کرتی معلوم ہوتی ہے لیکن مرد فطری مناظر کی ان تنہائیوں کو اپنے رشتہ ازدواج کی استواری کے لئے نہایت موزوں سمجھتا ہے ۔ انجینئر صاحب کے شباب کا ابتدائی زمانہ چونکہ حصول کامیابی کے نذر ہو چکا ہے اور ان کے شباب میں ابتدائی بھولاپن اور بے اختیاری باقی نہیں رہی ہے اس لئے لڑکی کے اندر ان کے لئے وہ گرویدگی اور فدائیت موجود نہیں ہے جو ایک نوجوان جوڑے میں ہونا چاہیئے ۔ ان موقعوں پر جہاں اس کے جذبات میں دہکتی ہوئی آگ کی گرمی ہونا چاہیئے تھی انجینئر صاحب اس کی طرف سے برف جیسی سردی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی کمی کی تلافی اپنے ہنی مون کی فضا میں رومان پیدا کر کے کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو جو کوششیں کی ہیں ان میں واقعی شعریت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اولمپیا کا کوئی دیوتا اپنی منظور نظر دیوی کو معرفت کائنات اور رموز حیات سمجھانے کے لئے فطرت کے مختلف مناظر دکھا رہا ہے۔ لیکن اس کی کائنات صرف اولمپیا کی بلندیوں تک محدود ہے۔ ادھیڑ عمر میں شادی کرنے والے بورژوا طبقہ کے لوگوں کے لئے یہ کتاب ازدواجی زندگی کے صحیفہ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ چنانچہ مصنف نے خود بھی انہی لوگوں کے نام اس کتاب کو معنون کیا ہے جو اپنے کمال فن سے مسرت ازدواج کو تابہ آخر برقرار رکھ سکے ہیں۔

لیکن اگر کتاب کو اس افادی نقطہ نگاہ سے نہ دیکھا جائے جس کی طرف مصنف نے "قدر خلوص" کی عبارت لکھ کر اپنے قارئین کو خاص طور پر متوجہ کرنا چاہا ہے تو اس کتاب میں خالص رومان کی اور بھی بے شمار جھلکیاں نظر آئیں گی جن میں کھو جانے کے بعد پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اختر صاحب کی "اندھی دنیا اور دیگر افسانوں" کے مناظر کو بالکل بھول جاتا

اس قسم کے نشہ کی ضرورت کبھی کبھی ہر شخص کو پیش آتی ہے اور یہ نہ ہو تو زندگی دوبھر ہو جائے خشک طبیعت رکھنے والے لوگوں کے لئے بھی ان۔ احمد صاحب کی اس تصنیف میں خاصی جاذبیت ہے۔ البتہ جن لوگوں کی طبیعت میں جوانی کا جوش اور سرمستی ہے ان کے لئے ہنی مون کے زمانہ میں فلسفہ کی یہ موشگافیاں چاہے انھیں کتنا ہی رنگین کیوں نہ بنایا گیا ہو شاید ناقابل برداشت معلوم ہوں گی۔ وہ اس موقع کے لئے غالباً بے وقوفوں اور بدمستوں کی یاوہ گوئی اور ہل سرائی کو زیادہ موزوں خیال کریں گے لیکن ادھیڑ عمر کے ایک کامیاب اور صاحب اقتدار شخص سے ان باتوں کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے ؟ دردانہ کو اگر اس قسم کی گفتگو کی خواہش تھی تو اسے انجنیر صاحب کی جگہ کسی دوسرے بے فکرے نوجوان سے شادی کرنا چاہیے تھی لیکن ایک دفعہ انتخاب کر لینے کے بعد اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرے اور نوجوانی کی بے ساختگی کی تلافی دولت اور اقتدار کی فراوانی سے کرتی رہے اور وجود باری کی ان دلیلوں کو تسلیم کر کے جنھیں اس کے شوہر نے نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے مذہبی عبادات کی طرف بھی مائل ہو جائے۔

بہرحال جہاں تک خالص رومان کا تعلق ہے جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے لطیف صاحب کا یہ افسانہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کی تکمیل پر کیا بلحاظ موضوع اور کیا بلحاظ طرز ادا، انتخاب الفاظ اور فنی کاریگری کے ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

۱- لکڑی کا باریک کام
۲- دہلی کی دست کاری | مؤلفہ سید رضا احمد صاحب جعفری، غیر مجلد، ناشر عصمت بک ڈپو دہلی ہر رسالہ کی علیحدہ قیمت ۸؍ یہ رسالے سلسلہ کتب دستکاری کی دو کڑیاں ہیں اور انھیں ماہرین کے مشوروں اور مؤلف کے ذاتی تجربوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ بہت مفید ثابت ہوں گے جو ان میں سے کسی دست کاری کو بطور شوقیہ مشغلہ، چھوٹی سی کمائی یا مالی فائدہ کے لئے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ طرز بیان نہایت سلیس

اور مختصر ہے۔ جابجا ضروری تصویریں بنا کر مطالب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ہر فن میں
محنت اور مشق کامیابی کی لازمی شرط ہے لیکن اگر مبتدی پہلے کسی عملی کتاب سے مشورہ کرے
تو بعض دقتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئے بغیر جلد کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

بنیادی تعلیم کو کانگریسی صوبوں میں خوب ترقی ہو رہی ہے اور اب اس قسم کی کتابوں کی مانگ
بڑھ رہی ہے لکڑی کے کام اور گتے کے کام دونوں کو بنیادی تعلیم کے نصاب میں رکھا گیا ہے
اور جامعہ کے ابتدائی مدرسہ اور استادوں کے مدرسہ میں یہ کام کرائے جا رہے ہیں ہمیں یقین
ہے کہ جامعہ کے علاوہ اور دوسری جگہوں پر بھی جہاں ان کاموں کو نصاب میں داخل کیا جا چکا
ہے یہ رسالے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

من کی بیپتا | از لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے چھوٹی تقطیع۔ مجلد ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۸؍ ناشر ادارۂ
ادبیات اردو۔ حیدر آباد دکن

اس چھوٹی سی کتاب میں طبقہ متوسط کی مالی پریشانیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اور مصنفہ
اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ "ہماری گذشتہ برکتیں بڑا حصہ ہمارے بزرگوں کی سادہ زندگی کا تھا اور موجودہ نحوست
میں بہت بڑا حصہ ہماری غلط معاشرت کا ہے"۔

عام طور پر ایک متوسط گھر کے جو خرچ ہوتے ہیں ان کی مدوں کو حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔
گھر، سواری، خورد و نوش، نوکر چاکر، کپڑا لتہ، بچوں کی ضروریات، تعلیم، اخبار رسالے، عید تہوار،
نذر نیاز، مختلف چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، انعام اکرام، سیر تفریح، سینما،
فیشن۔

اور پھر ان مختلف مدوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ ان میں کہاں کہاں کس قسم
اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے۔

مصنفہ نے سماجی زندگی کو دو ناگزیر پہلوؤں یعنی تدبیر ملک اور تدبیر منزل میں تقسیم کرنے کے بعد
بتایا ہے کہ کس طرح عورت تدبیر منزل یا گھر کی زندگی میں تمام و کمال خود مختار اور ذمہ دار ہے ہر گھر کی

کی سب سے اہم منزل ہے۔ اسی منزل میں کردار بنتے ہیں۔ یہی وہ کارگاہ حیات ہے جہاں قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اسی نے اس محترم منزل کی تنظیم کے لئے قدرت نے ایک ایسی ہستی بنائی جو ذات باری کی صفات کا ایک ہلکا سا مظہر ہے عورت کا یا ہر گھر کی بی بی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی معاشرت کا ایک صحیح نصب العین بنائے جس میں بے جا ظاہر داریوں کا دخل نہ ہو بلکہ ضرورت اور فرائض کا خیال رکھا جائے گھر والوں کا باقاعدہ تنظیم کے لئے چاہیے کہ آمدنی کو خرچ کی ضروری مدوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان میں بھی نہ صرف آمد و خرچ کا توازن باقی رہے بلکہ اپنے گرد و پیش کی دنیا، اس کی ضروریات اور اس کی حیثیت کا بھی لحاظ رہے۔

کتاب کا انداز تحریر نہایت سلجھا ہوا موثر اور دلنشین ہے۔ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے اور اگر گھر کی عورتیں ان کی نصیحتوں پر عمل بھی شروع کر دیں تو ہمیں یقین ہے کہ متوسط طبقہ کی موجودہ مالی پریشانیاں بہت کم ہو جائیں گی اور وہ قرض کے بوجھ سے دبے رہنے کے لئے مجبور نہیں رہیں گے۔

رسالہ دینیات | از جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ قیمت ۱۲؍ مع محصول ڈاک۔ ناشر دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

اس رسالہ میں مودودی صاحب نے "اسلام" "ایمان اور اطاعت" "نبوت" "ایمان مفصل" "عبادات" "دین اور شریعت" اور "شریعت کے احکام" کے ابواب قائم کر کے دین اسلام کے بارے میں مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ رسالہ ہائی اسکولوں کی آخری جماعت کے لئے لکھا گیا ہے اس میں طالب علم کو بتایا گیا ہے کہ اسلام کیا ہے، کیا چاہتا ہے، کیوں چاہتا ہے۔ اس کے عقائد کا انسان کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ وہ اگر تسلیم کئے جائیں تو ان کا فائدہ کیا ہے اور نہ تسلیم کئے جائیں تو نقصان کیا ہے۔ اسلام محض تحکم کے طور پر ان عقائد کو منوا لینا چاہتا ہے یا اس کے پاس حقانیت و صداقت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے ——— یہ سوالات ایسے ہیں جو اس حقیقت کے دور میں نوجوانوں کے ذہن میں عام طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور معقول جوابات

[illegible] کی بنا پر گمراہی اور بے دینی کا باعث ہوتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کتاب کو لکھ کر وقت کی ضرورت کو صحیح طور پر سمجھا ہے اور ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایمان کے بغیر احکام کی اطاعت ممکن نہیں اور ایمان صرف عقائد ہی کے ٹھیک ٹھیک سمجھنے سے مستحکم ہو سکتا ہے مصنف نے عبادات اور احکام شریعت کی حکمتیں بھی سمجھائی ہیں۔ کتاب بہت اچھی ہے اور اس لائق ہے کہ ہائی اسکولوں کی اونچی جماعتوں کے دینیات کے نصاب میں داخل کی جائے۔ اور عام لوگ بھی اس کا فائدہ کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

پرچم | ایڈیٹر جناب سبط حسن صاحب۔ قیمت فی پرچہ ۱ر سالانہ ۳ر پتہ:- نظیر آباد۔ لکھنؤ۔
اس نئے ہفتہ وار اخبار کے ۱۱ نمبر اب تک نکل چکے ہیں۔ اپنے خیالات کے لحاظ سے ترقی پسند ہے۔ عام دلچسپی کے مضامین کے علاوہ اس میں مسلمانوں کے مفاد اور حقوق اور ان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی پر خاص طور سے بحث کی جاتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہوتی ہے اور مشکل مضامین کو نہایت سلجھا کر سادہ زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ مسائل حاضرہ کے بارے میں بہت پر معلومات مضامین پیش کئے جاتے ہیں اور فکر میں گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے۔ اردو کے ہفتہ وار اخباروں میں اس کا شمار بلند پایہ اخبارات میں کیا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کو خوش قسمتی سے ہم خیال مضمون نگاروں کا ایک بہت اچھا حلقہ مل گیا ہے جس سے امید ہے کہ اس کا معیار گرنے نہیں پائے گا۔

من کی دنیا | از جناب رشید قریشی صاحب قیمت عمر ناشر ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن۔ یہ قریشی صاحب کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانے میں زندگی اور جذبات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

میری کہانی؛ سنئے گا؟ | از جناب مولوی سید علی صاحب شاکر ایم۔ اے۔ حیدرآباد دکن قیمت ۳ر شاکر صاحب کا بالکل نئے طرز کا افسانہ ہے۔ اس میں زندگی کے چند نہایت المیہ مناظر دکھائے گئے ہیں [illegible] خوش مزاجی اور ظرافت کا پردہ ڈال کر تکلیف کی گہرائی کو اور تیز کر دیا گیا ہے۔

محبت کے افسانے | از جناب الطاف حسین صاحب رشدی بی اے ملنے کا پتہ: محمد سعید خاں [illegible] جامعہ [illegible] قیمت ۳ر۔ اس میں رشدی صاحب کے ۱۴ افسانوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر (دہلی)

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ
قرولباغ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ
جامع مسجد۔ دہلی

مکتبہ جامعہ
لوہاری دروازہ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ
امین آباد۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ
پرنسس بلڈنگ۔ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

مکتبۂ جامعہ دہلی

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے

سیاست کی پہلی کتاب قیمت ۱۲؍

اجتماعی زندگی کی ابتداء ۔ ۔ ۔ ۔ " ۔ ۔ ۸؍

ہندوستان کا دیہی قرض ۔ ۔ ۔ " ۔ ۔ ۱۲؍

مسئلہ آبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ۔ ۔ ۱۲؍

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۲	اگست ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

۱. قوت محرکہ کی کہانی		۷۱۹
۲. رہنے سہنے کے نئے اور پرانے طریقے		۷۳۶
۳. ہمارے ذرائع نقل و حمل نے کس طرح ترقی کی؟		۷۴۵
۴. بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟	از جناب سید احمد علی صاحب	۷۵۲
۵. ملکیت ذاتی		۷۶۳
۶. مقابلہ		۷۶۸
۷. معاشی آزادی		۷۹۶

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں گے۔

قوت محرکہ کی کہانی

دنیا میں انسان کے سب سے اول ظاہر ہونے کی تاریخ پانچ لاکھ سال پہلے تبلائی جاتی ہے اس پانچ لاکھ سال پہلے کی مدت سے دس ہزار سال کی مدت تک یعنی چار لاکھ ۹۰ ہزار سال کے دوران میں انسان صرف چیزوں کو پکڑنا اور اپنے رگ پٹھوں کی قوت سے کام لینا سیکھ سکا تھا۔ اور ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد اس نے ڈنڈے اور پتھر کے بھدے اوزار اور آگ کا بنانا بھی سیکھ لیا تھا۔ آج سے صرف دس ہزار سال پہلے اس نے جانوروں کو پالتو بنانا سیکھا اور غلاموں کی محنت سے بھی کام لینے لگا۔ اس کے علاوہ اس نے بیلن، ڈھلواں سطح، بیرم (لیور) اور آہنچہ (بوجھ اٹھانے والی چرخی) کو استعمال کرنا اور کشتیوں کو بادبانوں سے چلانا بھی سیکھ لیا۔ پھر اس کے بعد آج سے دو سو سال پہلے تک یعنی ۹ ہزار آٹھ سو سال کی طویل مدت کے دوران میں انسانوں نے کوئی اور غیر معمولی ایجاد نہیں کی۔ البتہ آج سے دو سو سال پہلے یورپ کے لوگوں نے لایق استعمال مشینوں کا بنانا، کوئلہ اور معدنی تیل کو ایندھن کے طور پر جلانا اور مشینوں کو پانی کی قوت سے چلانا سیکھا۔ غرضکہ اوپر کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہزاروں سال تک انسان جس قوت محرکہ سے کام لیتے رہے وہ صرف آدمیوں اور جانوروں کے رگ پٹھوں اور ہوا اور پانی کی قوت تک محدود تھی۔ اس پوری طویل مدت میں آدمی فطرت کا غلام بنا رہا البتہ پچھلے دو سو سال میں جو پانچ لاکھ سال کی طویل مدت کے مقابلہ میں بہت مختصر زمانہ معلوم ہوتا ہے آدمیوں نے انجنوں سے چلنے والی مشینوں سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

آج انجنوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر ہم امریکہ جیسے ملک کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس میں مشین کی قوت کا کس قدر استعمال ہو رہا ہے تو ہمارے لئے اس بات کا

پتہ چلانا ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس قوت محرکہ کا تخمینہ کرنے میں ہمیں لاکھوں موٹروں، ہزاروں ریل کے انجنوں، بے شمار فیکٹریوں اور بجلی، روشنی، گرمی اور قوت محرکہ کے کارخانوں، بجلی کی ریلوں اور ریڈیو اسٹیشنوں کی قوت محرکہ اور بے شمار دوسرے چھوٹے چھوٹے ذرائع کی قوت محرکہ کو شامل کرنا ہوگا۔ امریکہ میں کھانے، مکان، کپڑے اور تفریح کے سامان مہیا کرنے کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کام کیا جاتا ہے اس کا بہت بڑا حصہ قوت محرکہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے فارموں پر انجنوں سے مشینوں کو چلایا جاتا ہے۔ انجنوں ہی سے موٹر لاریوں اور ریلوں کو جو غذا کے سامانوں، کوئلہ اور دوسرے کچے اور مصنوعہ مال کو منتقل کرتی رہتی ہیں چلایا جاتا ہے۔ ان کے مکانوں اور گوداموں کو روشن کرنے کے لئے اور ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور وائرلیس سے پیغامات بھیجنے کے لئے انجن ہی قوت محرکہ فراہم کرتے ہیں۔

پرانے زمانے کے مقابلہ میں ہمارے زمانہ میں انجنوں کے استعمال کی وجہ سے کام کرنے میں جو سہولتیں پیدا ہوگئیں ہیں ان کا اندازہ ہم ایک مثال کے ذریعہ سے کرانا چاہتے ہیں۔ اہرام مصر پرانے زمانہ کا ایک ایسا کارنامہ ہیں جس پر دنیا آج بھی حیرت کرتی ہے۔ اہرام کئی ہیں جنہیں سب سے پہلے آج سے پانچ ہزار سال قبل بنانا شروع کیا گیا تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی اہرام آج سے چار ہزار سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس کی اونچائی پانسو فٹ ہے اور اس کی شکل مخروطی ہے یعنی سطح زمین پر اس کی شکل مربع جیسی ہے اور اوپر ایک نقطہ پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ موجودہ عمارتوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو امریکہ میں ریڈیو سٹی کی جو ستر منزلہ عمارت ہے یہ اہرام اس کی بیالیسویں منزل کے برابر اونچی ہے۔ اس اہرام کی تعمیر میں بیس لاکھ سے زائد چونے کے ٹھوس پتھر لگائے گئے تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن ۲ ½ ٹن کا تھا اور اونچائی تقریباً ۲ فٹ تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس عمارت کو کس طرح بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر وزن اٹھانے اور منتقل کرنے والی مشینوں کے ذریعہ سے نہیں کی گئی تھی جن کا مصریوں کو بالکل علم نہیں تھا بلکہ انسانی بازوؤں اور ان کی کمر کی قوت سے کی گئی تھی۔ اس کے بنانے میں ایک لاکھ آدمیوں کو سال میں تین مہینہ بیس سال تک مسلسل کام کرنا پڑا تھا یعنی ۱۰ کروڑ دنوں کی انسانی محنت سے یہ اہرام تعمیر کیا جا سکی تھی۔ چونے کے بڑے بڑے

پتھر دریائے نیل کے ذریعہ کشتی پر لاد کر لائے جاتے تھے۔ پھر دریا کے کنارے سے بہت سی آدمی مل کر انھیں کھینچتے تھے اور بڑی بڑی اونچائیوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ لوگ پسینہ میں شرابور اور تھک کر چور ہو جاتے تھے اور دھکیل دھکیل کر ان پتھروں کو ان کی مناسب جگہ پر پہنچاتے تھے۔ لیکن ۱۰ کروڑ دنوں کی انسانی محنت سے بھی یہ کام انجام کو نہ پہنچ سکتا تھا اگر مصریوں نے چند سادہ اوزار اور کام کرنے کے طریقوں کو دریافت نہ کر لیا ہوتا۔

سب سے پہلی چیز جس سے مصریوں نے مدد لی وہ بیلن تھے۔ جب بیلن یا پہیے کو کسی بھاری وزن کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے تو اس کا ہلانا سہل ہو جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ جس سے وزنی چیزوں کی منتقل کرنے میں سہولت ہوئی وہ سطح کا ڈھلوان بنا دینا ہے۔ جب سطح مستقیم ہوتی ہے تو نیچے کی سطح سے بلند سطح تک وزنی چیزوں کا پہنچانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن جب سطح ڈھلوان رکھی جاتی ہے اور اونچائی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے تو وزنی چیزوں کو اوپر پہنچانے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسری چیز جس سے چیزوں کے منتقل کرنے میں سہولت پیدا ہوئی وہ بیرم یا لیور یعنی ایسے لانبے ڈنڈے کا استعمال تھا جس کو ٹیک (فلکرم) پر اس طرح قائم کیا جاتا ہے کہ اس کا بھاری اور چھوٹا سرا وزن اٹھانے والے کی طرف رہتا ہے اور لانبا اور ہلکا سرا وزن کی طرف رہتا ہے۔ اس کے ذریعہ بڑا وزن کم قوت صرف کرنے کے بعد اٹھایا جا سکتا ہے۔ چوتھی چیز جس سے وزن اٹھانے میں سہولت ہوئی وہ آنجہ کا استعمال ہے اس میں وزن کو رسی سے باندھ کر رسی کو چرخی پر لپیٹا جاتا ہے جس سے بھاری وزن سہولت کے ساتھ نیچے سے اوپر پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کے چلنے اور پانی کے بہنے کی قوت سے بھی آدمیوں نے کام لینا شروع کر دیا تھا۔

ان ایجادوں کی موجودگی میں مصر کے ایک لاکھ آدمیوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ ۱۰ کروڑ دنوں کی محنت کر کے ایک پانسو فٹ اونچی یادگار قائم کر سکیں۔ یہ واقعی ان کا بڑا زبردست کارنامہ تھا اور آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اگر اسی قسم کے اہرام کے بنانے کی کوشش کی جاتی۔ . . تو جتنے دن کی محنت مصریوں کو لگانا پڑی تھی ہمیں بھی اتنی ہی محنت صرف کرنا پڑتی۔ کیونکہ اس تمام دوران میں ہمارے

کام کرنے کے طریقوں میں کوئی بہت غیر معمولی فرق پیدا نہیں ہوا تھا لیکن آج اسی مدت میں اور اتنی ہی محنت کے ساتھ ہم اہرام جیسی اسّی عمارتیں بنا سکتے ہیں اور اگر ان کی تعمیر میں فولاد اور کنکریٹ کے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم ایسے دوسو چالیس اہرام بنا سکتے ہیں۔ فولاد اور کنکریٹ کی عمارت اس قدر دیرپا نہیں ہوگی لیکن اگر فولاد کے ڈھانچے میں اسفالٹ (ڈامر اور ریت کا مرکب) بھر دیا جائے تو عمارت کو شاید اتنا ہی دیرپا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پھر ہمارے زمانہ کے مزدوروں کو ایسی تھکا دینے والی سخت محنت نہیں کرنا پڑے گی جیسی مصر کے غلاموں کو برداشت کرنا پڑتی تھی ہمارے بہت سے مزدوروں کا کام اپنے رگ پٹھوں پر زور ڈالنے کی جگہ صرف مشین کے بٹن دبانے اور کلیں گھمانے تک محدود رہے گا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہمارے کام کرنے کے طریقوں میں جسمانی محنت اور قوت کی جگہ علم و حکمت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دو ہزار سال گذرے یورپ کے لوگوں نے دنیا کی چیزوں کی ماہیت کے بارے میں اپنے خیالات کو لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے پاس چیزوں کو ٹھیک ناپنے اور اپنی اردگرد کی دنیا کا صحیح مشاہدہ کرنے کے لئے اوزار موجود نہیں تھے گو یہ صحیح ہے کہ ان سے پیشتر کے زمانہ میں لوگوں کو کچھ اوزاروں کا علم حاصل تھا۔ بہرحال یورپ کے لوگوں کے پاس گھڑی، گز، سمت نما، دوربین، خوردبین جیسے معمولی اوزار بھی نہیں تھے۔ ان اوزاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ تاروں، سورج اور زمین کی حرکت اور خشکی و تری میں جانوروں کی زندگی کا بارے میں محض اندازے اور تک بندی سے کام لے سکتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ایک ہی چیز کو بار بار دیکھنا شروع کیا تو ان کے علم میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا اور ایسی رائیں قائم ہونے لگیں جنھیں محض ظن و تخمین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غرضکہ اس طرح انھیں آہستہ آہستہ اس بات کا پتہ چلا کہ واقعات و مظاہر کے اسباب کیا ہیں۔ سنہ ۱۶۰۰ء کے بعد سے سائنس والوں نے ناپنے کے زیادہ صحیح اوزاروں کو بھی بنانا شروع کر دیا اور سنہ ۱۷۰۰ء کے بعد ایجاد کرنے والوں نے لائق استعمال مشینوں اور انجنوں کا بھی پتہ چلالیا۔ جب ناپنے کے اوزار انجن اور مشینیں ایجاد ہوگئیں تو

تو پھر لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں میں تیزی کے ساتھ تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ اور لوگوں کے غذا حاصل کرنے، کپڑا بنانے، سڑکیں تعمیر کرنے، چیزوں کو منتقل کرنے اور شہروں کے بنانے کے طریقے بالکل بدل گئے۔

لہٰذا قوت محرکہ کی کہانی سنتے وقت اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ہماری تہذیب کی تعمیر میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ سائنس کی معلومات ہیں۔ دوسری چیز جس کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں یہ ترقیاں ہوئیں ان کے پاس کوئلہ، معدنی تیل اور پانی کے بڑے ذخیرے موجود تھے اور یہی تین وہ ذریعے تھے جن سے انجنوں نے قوت محرکہ پیدا کی۔

اس تمہیدی بیان کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ قوت محرکہ کے ذریعہ مشینوں کو چلانا کس طرح شروع کیا گیا۔ ابتدا میں انجن بنانے کے بہت سے تجربے کئے گئے جن میں سے کچھ ناکام رہے اور کچھ کامیاب ہوئے۔ مثلاً سورج کی گرمی، سمندر کے مدوجزر اور جمے ہوئے پانی وغیرہ سے چلنے والے بہت سے انجن بنائے گئے لیکن ان میں ۳ انجن ایسے تھے جو قابل استعمال ثابت ہوئے اور جن کی بنیاد پر آج ہماری تہذیب کی پوری عمارت قائم ہے یعنی بھاپ، بجلی اور گیس کے انجن۔ اب ہم ان تینوں انجنوں کی ایجاد کے بارے میں الگ الگ کچھ حالات پیش کریں گے۔

۱۔ بھاپ کا انجن اس بات کو تو لوگ سینکڑوں سالوں سے جانتے تھے کہ بھاپ کے اندر قوت موجود ہے لیکن لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا ہوئے اور مر گئے مگر اس بات کو معلوم نہیں کیا جا سکا کہ اس قوت سے کام کس طرح لیا جا سکتا ہے جب پانی کا ایک قطرہ بھاپ بنتا ہے تو رقیق حالت کے مقابلہ میں وہ سترہ سو گنی زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ جب قطرہ بھاپ بننے کے لئے پھیلنا چاہتا ہے اگر اس وقت اس کو تنگ جگہ میں بند کر دیا جائے تو اس سے بہت بڑی مقدار میں قوت پیدا ہو جاتی ہے ایک طویل زمانہ تک لوگ اس بات پر قیاس آرائی کرتے رہے کہ اس قوت کو چیزوں کو حرکت دینے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن سنہ ۱۷۰۰ء سے پہلے ایجاد کرنے والے بھاپ کی قوت سے کام

سیتے ہیں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور جب وہ کامیاب ہو گئے تو ہمارا بھاپ کا انجن بن گیا جس سے جدید صنعتی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔

بھاپ کے انجن کی کہانی تو دراصل دو ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس قدیم زمانے میں بھی لوگ بھاپ کی قوت پر حیرت کرتے تھے اور منصوبے بنایا کرتے تھے کہ بھاپ سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں۔

سنہ ۵۰ء میں یا شاید اس سے بھی پہلے ان سائنس دانوں میں سے ایک نے جس کا نام ہیرو تھا اور جو اسکندریہ میں رہتا تھا بھاپ کی ایک گیند ایجاد کی تھی۔ اس میں یہ کاریگری رکھی گئی کہ بھاپ کی قوت سے گیند گھوما کرتی تھی۔ نیچے کی گیند میں پانی گرم کیا جاتا تھا اور بھاپ بنائی جاتی تھی اور یہ بھاپ سیدھی سیاہ نلکی سے ہو کر تیزی کے ساتھ اوپر آتی تھی اور اوپر کی گیند میں جو چار مڑی ہوئی نلکیاں لگی رہتی تھیں ان سے باہر نکلتی تھی۔ جب بھاپ قوت کے ساتھ ان چاروں نلکیوں سے نکلنا چاہتی تھی تو گیند گھومنے لگتی تھی۔ ہیرو اور اس کے دوست اس منظر سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ اگرچہ ان لوگوں کے لئے یہ چیز صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن فی الحقیقت اسے ایک ادھورا نا تمام انجن سمجھنا چاہیئے۔

اگر ہیرو یا کسی اور دوسرے سائنس داں نے اس بات کا پتہ لگا لیا ہوتا کہ اس بھاپ کو زیادہ مکمل انجن میں بند کر کے مفید کام لئے جا سکتے ہیں تو اندازہ کیجئے کہ اسی قدیم زمانہ میں کیا کچھ نہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن سینکڑوں صدیوں تک کسی سائنس داں نے اس کا پتہ نہیں لگایا۔ سنہ ۱۶۰۰ء تک آدمیوں نے کسی ایسی ترکیب کو نہیں سوچا جس سے بھاپ سے مفید کام لیا جا سکتا۔ جو ترکیبیں اور طریقے سوچے گئے وہ ایسے عجیب تھے کہ ان کو استعمال میں لانا ممکن نہیں تھا۔ مثلاً آج سے تین سو سال پہلے ایک اٹلی کے باشندے نے جس کا نام برانکا تھا ایک عجیب شکل کا انجن بنایا۔ اس میں بھاپ ایک مجسمہ کے منھ میں دبی ہوئی نلکی سے نکلتی تھی اور ایک دندانہ دار پہیئے سے ٹکراتی تھی جو اس کی وجہ سے حرکت میں آ جاتا تھا۔ اس پہیے سے ایک اور دندانہ دار پہیہ لگا رہتا تھا اور وہ آٹا کوٹنے

والی ہوگر لیوں کو ادکھلیوں کے اندر چلایا کرتا تھا۔

پسٹن کی ایجاد | ڈینس پیپن (۱۶۴۷ء تا ۱۷۱۲ء) پہلا شخص تھا جس نے ایک بند نلکی یعنی سلنڈر میں بھاپ کو استعمال کرنے اور سلنڈر کے اندر جہاں اس کی قوت ضائع نہ ہوسکتی تھی اس سے کام لینے کے طریقہ کو سوچا۔ سلنڈر میں اس نے ایک گول ٹکیہ جیسا ڈھکنا جسے پسٹن کہتے ہیں لگایا۔ اس کا محیط سلنڈر سے چھوٹا رکھا جس کی وجہ سے وہ سلنڈر کے اندر ذرا ڈھیلا رہتا تھا۔ سلنڈر کے پیندے میں پانی گرم کیا گیا اور اس کی بھاپ بنائی گئی جب پانی بھاپ بنا تو اس کو زیادہ جگہ کی ضرورت ہوئی اس لئے اس نے پسٹن کو اوپر دھکیلا۔ پھر جب بھاپ ٹھنڈی ہوئی تو اس کی قوت کم ہوگئی اور پسٹن دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔

پیپین کے انجن نے ٹھیک کام نہیں کیا لیکن لوگوں کو اس کی ایجاد سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ پسٹن کا یہ خیال ہے بہت اچھا۔ چنانچہ انھوں نے اب بھاپ کو نلکیوں یا فواروں کے سوراخوں سے نکلنا چھوڑ دیا اور اس کے بعد سے وہ سلنڈروں میں پھنسائے ہوئے پسٹنوں کو مکمل کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ لیکن جب تک یورپ کے لوگوں نے کوئلہ کو کثیر مقدار میں استعمال کرنا شروع نہیں کیا اس وقت تک قابل استعمال انجن ایجاد نہ ہوسکے۔

سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں انگلستان کی کوئلہ کی کانوں کو گہرا کھودنا شروع کردیا گیا تھا۔ جب کوئلہ نکالا جاتا تھا تو کانیں ہمیشہ پانی سے بھر جایا کرتی تھیں اور اس پانی کو ہاتھ کے پمپوں سے نکالنے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اس کام میں خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اس لئے کان کے مالکوں نے ایسا انجن ایجاد کرنے والے کو جو پانی کو پمپ کے ذریعہ کھینچ کر نکال سکے انعام دینے کا وعدہ کیا۔

سنہ ۱۷۰۰ء تک کئی موجدوں نے اس طرح کے انجن بنائے۔ لیکن ان کے انجن ادھورے اور نامکمل تھے۔ ان موجدوں میں سب سے زیادہ شہرت ٹامس نیوکومن کو حاصل ہوئی۔ اس کا پمپ کرنے والا انجن دستی پمپوں سے بہتر کام کرتا تھا لیکن عام طور پر یہ سب ناقابل اطمینان تھے کیونکہ یہ

سب اکثر بگڑ جاتے تھے۔ اسی حالت میں پچاس سال اور گذر گئے تب کہیں ایسا انجن ایجاد ہوا جو سہولت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

جیمس واٹ ۱۷۳۶ء تا ۱۸۱۹ء | ۱۷۶۳ء میں نیوکومن کا ایک پمپ کرنے والا انجن گلاسکو کی سکاٹش یونیورسٹی میں بگڑ گیا۔ لوگ اسے شہر میں جیمس واٹ کے پاس جو اوزار بنایا کرتا تھا مرمت کرانے کے لئے لے گئے۔ واٹ نے اس انجن کا مطالعہ بہت ہوشیاری کے ساتھ کیا اور مرمت کرتے وقت اس نے معلوم کیا کہ اس وقت تک جتنے انجن دریافت ہوئے تھے ان سب کے مقابلہ میں ایک اور زیادہ کارآمد انجن کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ جس انجن کی وہ مرمت کر رہا ہے اس میں بھاپ کی قوت سے پسٹن کو صرف ایک طرف دھکا دیا جاتا ہے۔ اس لئے بھاپ کی بہت زیادہ قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس نے جو انجن ایجاد کیا اس میں بھاپ کے پھیلنے کی قوت سے پسٹن کو دونوں طرف دھکا دیا جا سکتا تھا۔ انیس سال تک واٹ اپنے انجن کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۷۸۲ء میں اس نے انگلستان میں اپنے انجن کے لئے پیٹنٹ حاصل کر لیا۔

جیمس واٹ کو انجن کا باپ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی انجنوں کو استعمال کے لائق بنایا۔ جس انجن کو اس نے بنایا وہ اصول کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسے کہ انجن آج کل ہم استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ واٹ کے زمانہ سے لے کر اب تک انجنوں میں بہت سی اصلاحیں ہو چکی ہیں لیکن ہماری ریلوں اور بڑے بڑے کارخانوں کو چلانے والے انجنوں میں پسٹن والے ایسے ہی سلنڈر لگے ہیں جیسے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے واٹ کے انجن میں لگے ہوئے تھے۔

اگر ہمارے جدید بھاپ کے انجنوں کے بیچ سے کاٹا جائے تو اندر سے وہ ایسے نظر آئیں گے جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے (الف) سلنڈر ہے اس کے اندر (ب) پسٹن لگی ہوئی ہے جو (الف) کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس بھاپ کی وجہ سے ہٹتی ہے جو پہلے (ج) سے اور بعد میں (د) کے ذریعہ سلنڈر میں داخل ہوتی ہے وہ شکل کو ظاہر کرتا ہے

اور اس کے موقف سے اس بات کا فیصلہ ہوتا ہے کہ بھاپ (ج) سے داخل ہوگی یا (د) سے یہ ڈھکن بھاپ کے نکل جانے سے کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ جب ڈھکن اس موقف پر ہوتا ہے جس کا اظہار حاشیہ کی تصویر میں کیا گیا ہے تو بھاپ (ج) کے ذریعہ داخل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پسٹن سلنڈر کے دوسرے سرے پر پہنچ جاتا ہے بائلر سے (جسے تصویر میں دکھایا نہیں گیا ہے) بھاپ (و) نلکی کے ذریعہ (ز) مقام پر آتی ہے جسے بھاپ کا صندوق کہتے ہیں۔ اس بھاپ کے صندوق سے بھاپ (ج) اور (د) سوراخوں کے ذریعہ سلنڈر میں داخل ہوتی ہے جب پسٹن کو بھاپ سلنڈر کے دوسرے طرف دھکیل دیتی ہے تو پسٹن راڈ (ح) سلنڈر کے سامنے کے حصہ کو طے کرتا ہے۔ جو بھاپ پسٹن کو دھکا دیتی ہے اس کے نکلنے کے لئے کوئی راستہ ہونا چاہیئے چنانچہ یہ (د) سوراخ کے ذریعہ باہر نکلتی ہے اور خارج کرنے والی نلکی (ط) میں سے ہوکر ہوا میں مل جاتی ہے جس وقت یہ عمل پورا ہو رہا ہوتا ہے ڈھکنا (ہ) حرکت کرکے (ج) سوراخ کو ڈھک لیتا ہے اور (د) سوراخ کو کھول دیتا ہے۔ اب بھاپ کے صندوق سے بھاپ (د) سوراخ کے ذریعہ داخل ہوتی ہے اور پسٹن کو بائیں طرف دھکا دیتی ہے اور (ج) سوراخ سے ہوتی ہوئی (و) نلکی کے ذریعہ ہوا میں مل جاتی ہے اور یہ عمل اسی طرح جاری رہتا ہے۔

واٹ کا انجن جیسے ہی مکمل ہوا امریکہ والوں نے اس سے اور اس کے خیال سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ امریکہ میں جنگ انقلاب سے پہلے نامکمل انجنوں کو نیوجرسی کی تانبے کی کانوں سے پانی پمپ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۰۰ء کے کچھ عرصہ بعد آلیور ایونس نے انجنوں

کے استعمال کے بارے میں تجربے کرنا شروع کیے۔ اسی لیے اُسے امریکہ کے جیمس واٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس کے فوراً بعد دخانی انجن کو خشکی اور تری کی گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جن پٹریوں پر گاڑیوں کو چلانے کے لئے گھوڑوں کو جوتا جاتا تھا اب ان گاڑیوں کو دخانی انجن سے چلایا جانے لگا۔ دخانی انجن کو ان پتواروں کے ساتھ لگا کر جو کشتی کو چلاتے تھے دخانی کشتی بنائی گئی۔ اسی طرح گاڑی کے پہیوں سے دخانی انجن کو وابستہ کر کے سڑک پر چلنے والی پہلی دخانی گاڑی بنائی گئی۔ حال کے زمانہ میں ایک نئے قسم کا دخانی انجن بنایا گیا ہے جسے ٹربائن کہتے ہیں۔ "ٹربائن" لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بگولہ کے ہیں۔ اسے ایک انگریز سی۔ اے۔ پارسنس نے ایجاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے ان انجنوں میں خصوصیت کے ساتھ بڑی زبردست تبدیلی ہوگئی جو جہازوں اور پاور اسٹیشنوں میں لگائے جاتے ہیں جو ٹربائن انجن جہازوں میں لگائے جاتے ہیں ان میں بھاپ کی قوت سے ایک فولادی نل میں بند کئے ہوئے پہیے کی تھاپیوں کو گھمانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پہیے کو جہاز کے اس دھکیلو PROPELLER کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے جو پانی کے نیچے جہاز کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ پہیے کی تھاپیاں بھاپ کی قوت سے تیزی کے ساتھ گردش کرتی ہیں جس سے دھکیلو پانی کے اندر چکر کھانے لگتا ہے اور اس کی وجہ سے جہاز آگے کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔

۱۸۹۷ء میں یہ نئے قسم کا انجن ٹربینیا نامی ایک چھوٹی کشتی میں لگایا گیا تھا جس نے اپنی رفتار کی تیزی سے اس وقت کی تمام دوسری کشتیوں کے ریکارڈوں کو مات کر دیا۔ آج یہ دخانی ٹربائن ہی تمام پیچ دار دھکیلوؤں کو گردش میں لاتے ہیں جن سے ہمارے تمام مال اور مسافروں کے تیز رفتار جہاز حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح جتنے بڑے پاور اسٹیشن ہیں ان میں بھی دوسرے دخانی انجنوں کی جگہ ٹربائنوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا گیا ہے۔

گیس انجن | پانی جب بھاپ بن کر پھیلتا ہے اور اس سے جو قوت پیدا ہوتی ہے دخانی انجن اس کو

ہی چلائے جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کو اس بات کا ایک عرصہ سے علم تھا کہ پانی کے علاوہ جب اور دوسری چیزوں کو گرم کر کے ہوا کی شکل دی جاتی ہے تو ان میں بھی پھیلنے کی زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے جب لوگوں نے نلکی کے اندر بند کئے ہوئے پسٹن کو چلانے کا اصول معلوم کر لیا تو ان کو اس بات کی جستجو ہوئی کہ پانی کے مقابلہ میں کسی اور دوسری چیز کو آزمایا جائے جس کے ہوا میں منتقل ہونے کی قوت پانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو۔ اس قسم کی ایک چیز جس کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا گیسولین ہے۔

پانی کو جب گرم کیا جاتا ہے تو وہ بھاپ بن جاتا ہے لیکن جلتا نہیں ہے۔ مگر گیسولین کی صورت اس سے مختلف ہے۔ جب اسے گرم کیا جاتا ہے تو یہ بھی تیزی کے ساتھ پھیلتی ہے اور ہوا بن جاتی ہے لیکن جب یہ ہوا ذرا سی چنگاری کے پاس پہنچتی ہے تو یہ دھماکے کے ساتھ پھیلتی ہے تجربے سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ جب اس گیس کو نلکی کے اندر بجلی کے شرارے کے ذریعہ بھک سے اڑایا جاتا ہے تو بہت زیادہ قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔

گیس کے انجنوں میں دخانی انجنوں کے مقابلہ میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا وزن اور حجم زیادہ نہیں ہوتا۔ دخانی انجن میں ایک بڑے بائلر (پانی کے ابالنے والا برتن) پانی کے ذخیرہ اور پانی کو گرم کرنے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس انجن کو لازمی طور پر بڑا بنانا پڑتا ہے لیکن ایک گیس کے انجن کے لئے محض ایندھن (مثلاً گیسولین، نفتہ یا جس چیز کو بھی ہوا بنانے کے لئے یہ استعمال کیا جائے) کے ذخیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے اس کو چھوٹا بنایا جا سکتا ہے چنانچہ چھوٹی کشتیوں، موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں کے لئے گیس کا انجن بہت موزوں ثابت ہوا ٹریکٹر، پمپوں اور فصل کاٹنے کی مشینوں میں بھی گیس کا انجن لگایا جاتا ہے اور آج کل عام طور پر تمام چھوٹی مشینوں میں گیس کے انجنوں ہی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ بجلی کا انجن: اس کے علاوہ ایک تیسری قسم کی قوت بھی پائی جاتی ہے یعنی بجلی اور اس کے استعمال کرنے کے لئے ایک تیسرے قسم کا انجن بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کو الکٹرک جنریٹر یا بجلی پیدا کرنے والے

انجن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

آج کل جب ہم ایک بٹن دباتے ہیں اور اس سے اندھیرے کمرے میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے تو اس روشن قمقمے کی پیچھے جو بجلی کی کہانی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا یا جب بجلی کی مسافر گاڑی کو بمبئی سے پونا تک خاموشی اور تیزی کے ساتھ بہتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیتے کہ بمبئی سے ایک دور دراز مقام پر کچھ بڑی بڑی مشینیں بھی موجود ہیں جو دن رات کام کرتی رہتی ہیں اور بجلی کو برابر پیدا اور روانہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ابر کی بجلی اور اس پیدا کی ہوئی بجلی میں کوئی فرق نہیں ہوتا دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ بجلی کی طاقت سے بھی آپ واقف ہیں کیونکہ بجلی سے مکانوں کے گرنے اور آدمیوں کے تلف ہو جانے کے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اگر ایسی طاقتور چیز کو پکڑ کر اس کی طاقت سے کام لیا جائے تو ظاہر ہے اس سے ریل گاڑیوں اور زبردست لحیم وشحیم مشینوں کو چلایا جا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان آسمان کی اس بجلی کی قوت کو تو کام میں نہیں لا سکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے لئے خود بجلی پیدا کرنا اور اس کی قوت سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ بجلی کے قابل استعمال طریقے کے دریافت ہونے سے پہلے سینکڑوں سائنس دانوں کو اس کے بارے میں تجربے کرنے پڑے۔ اس طرف سب سے پہلا قدم مقناطیس کو ایجاد کر کے اٹھایا گیا۔

مقناطیس کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہت سال گذرے ایک انگریز سائنس داں میکائیل فراڈے نے اس بات کو (۱۸۳۱ء) معلوم کیا کہ جب تار کو مقناطیس کے اوپر آگے پیچھے حرکت دی جاتی ہے تو اس سے تار میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اور اس کے بعد پھر دوسرے موجدوں نے مقناطیسوں اور تانبے کے ہلتے ہوئے تاروں پر اپنے تجربوں کو جاری رکھا۔ انھوں نے معلوم کیا کہ اگر ایک تار کو ایک نلکی کے اوپر کئی دفعہ لپیٹ دیا جائے اور اس نلکی کو ایک مقناطیس کے اندر تیزی سے گھمایا جائے تو تار کے اندر ایک مسلسل برقی رو جاری ہو جائے گی۔ اس کے بعد انھوں نے معلوم کیا کہ جب ایک نلکی کے گرد بہت سے تار لپیٹ دئے جائیں تو برقی رو

کی زیادہ مقدار کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے تجربوں کے بعد بجلی پیدا کرنے والی مشینیں جنھیں جنریٹر کہتے ہیں بنائی گئیں اور وہ بڑی مقدار میں قوت کو پیدا کرنے لگیں۔

موجدوں نے ایک دوسری اور اہم بات یہ معلوم کی کہ اگر تانبے کے ان تاروں کو جنریٹر کے باہر پھیلا دیا جائے تو یہ بجلی کی قوت کو سینکڑوں میلوں تک لے جا سکتے ہیں اور ان دور دراز مقامات پر لیمپوں کو روشن کر سکتے ہیں۔ موٹروں کو چلا سکتے ہیں اور ایسے ہی اور بہت سے کام کر سکتے ہیں۔

سائنس میں ان معلومات کی وجہ سے بہت اہم اضافہ ہوا۔ ایک شہر میں بجلی پیدا کرنا اور دوسرے شہر میں اس کو استعمال کرنا بلکہ دوسرے صوبہ اور ملک میں استعمال کرنا یہ ایک ایسا خواب تھا جو کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا لیکن یہ خواب مسٹر ایڈیسن اور دوسرے موجدوں کی کوششوں سے سچ ثابت ہو گیا ہے۔

ان کی ایجادوں کی وجہ سے ملک کے ہر حصہ میں پاور اسٹیشن بنا دئے گئے ہیں۔ امریکہ میں ۱۹۲۷ء میں ایک بڑی کمپنی تاروں کے ذریعہ قوت محرکہ کو چھ سو میل کے فاصلہ تک بھیج رہی تھی بعض سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ عنقریب ایسے طریقے بھی معلوم ہو جائیں گے جن سے بجلی کی قوت محرکہ کو بغیر تاروں کے بھی منتقل کیا جا سکے گا۔

اب بجلی کے ذریعہ ہر طرح پر انسانی مشقت کو کم کرنے کے لئے کام لیا جا رہا ہے۔ اس سے آدمیوں اور مال کو تیزی سے منتقل کیا جا سکتا ہے اس سے گھروں اور سڑکوں کو روشن کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مکانوں کی صفائی کرائی جا سکتی ہے اور گرمیوں میں مکانوں کو ٹھنڈا رکھا جا سکتا ہے اس سے فیکٹریوں کی بہت سی مشینوں اور چھاپہ خانوں کو چلایا جا سکتا ہے۔ اس سے سینما کی تصویروں کو تھیٹر کے اسٹیجوں کو روشن کیا جاتا ہے اور ریڈیو سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اسی کی رہین منت ہے۔

امریکہ میں آج صفائی انجنوں گیس کے انجنوں اور بجلی کے انجنوں سے بے انتہا قوت

محرکہ پیدا کی جاتی ہے۔ اس قوت محرکہ کا صحیح پتہ چلانا تو ممکن نہیں ہے البتہ اس کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک تخمینہ کیا گیا تھا جس میں اس قوت کا اندازہ ۴۳ کروڑ ۵۰ لاکھ گھوڑوں کی قوت کیا گیا تھا۔ اس میں آدھی سے زیادہ قوت محرکہ موٹر گاڑیوں کے چلانے میں صرف ہوتی تھی ¼ ریل گاڑیوں کے چلانے میں ¼ تجارتی جہازوں کے چلانے میں اور دوسرے بڑے عنوانات جن میں قوت محرکہ سے کام لیا جاتا تھا حسب ذیل تھے:۔
صنعت، بجلی کی روشنی اور قوت محرکہ کے پاور اسٹیشن، محکمہ بحر کے جہاز، سڑکوں کی ٹریمیں وغیرہ۔

زراعت و صنعت میں انجنوں کے استعمال کرنے کی وجہ سے ایک آدمی کے کام کرنے کی قوت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کسان کے کام کرنے کی اہلیت میں ایسی مشینوں کے ایجاد ہو جانے کی وجہ سے جو جوتتی بوتی اور فصل کاٹتی ہیں کم سے کم سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی قسم کی تبدیلی اور دوسری صنعتوں میں بھی ہو گئی ہے۔ ہاتھ کے اوزار استعمال کرنے والے کاریگر کے مقابلہ میں فیکٹری کا ایک مزدور کئی گناہ زیادہ کام کر سکتا ہے۔ مثلاً دخانی انجنوں کی ایجاد سے پہلے ایک پارچہ باف دستی کرگے پر صرف چند گز کپڑا یومیہ بن سکتا تھا۔ اب ایک پارچہ باف جو بیس کرگوں کی بیک وقت نگرانی کرتا ہے ایک دن میں سینکڑوں گز کپڑا بن سکتا ہے۔ جوتے کا ایک جوڑا آج کل قوت محرکہ سے چلنے والی مشین کے ذریعہ سے تیس چالیس منٹ کے اندر بنایا جا سکتا ہے۔ ہاتھ سے جوتے کا جوڑا بنانے کے لیے منٹوں کی جگہ اتنے ہی گھنٹے صرف کرنا پڑتے تھے۔

اسی طرح فولاد کی صنعت کی مثال کو لیجیے۔ امریکہ کی صنعتوں میں فولاد کی صنعت کا شمار بڑی صنعتوں میں کیا جا سکتا ہے اس کی ترقی میں بھی انجنوں اور مشینوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ فولاد کے ان بڑے بڑے کھمبوں اور بلیوں کو بنانے کے لیے جن سے ہمارے پلوں اور فلک بوس عمارتوں کو تعمیر کیا جاتا ہے دیو صفت مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے جو فولاد کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو اٹھا کر ان کو خوب ٹھوک پیٹ سکیں اور جب فولاد کے یہ کھمبے اور بلیاں بن جاتی ہیں تو مشینوں کے ذریعہ ہی انھیں ایک دوسرے سے ملایا جاتا ہے۔ بھاپ کے ہتوڑے

نہ صرف بے انتہا قوت کے ساتھ ضرب لگا سکتے ہیں بلکہ وہ ایک مختصر رقبہ پر اپنی پوری قوت کو مرکوز بھی کر سکتے ہیں۔ فولاد کے ایک ٹکڑے پر ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں ایک ہزار آدمیوں کے لئے ہاتھ سے ضرب لگانا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن بھاپ کا ہتوڑا ایک ہزار آدمیوں کی قوت کو اس طرح مرکوز کر سکتا ہے۔

ایک اور دوسری مثال کو لیجیے۔ نیویارک کی ریاست میں ابھی دنیا کا سب سے بڑا پاور اسٹیشن مکمل کیا گیا ہے یہ ایک اسٹیشن اکیلا دس لاکھ گھوڑوں کی قوت پیدا کر سکتا ہے۔ پھر یہ کارخانہ چوبیس گھنٹہ برابر چلتا رہے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ اوسطاً آدمی جتنے وقت تک کام کرتے ہیں اس سے تین گنے وقت میں یہ اپنا کام جاری رکھے گا۔

دنیا میں تو یہ پاور اسٹیشن سب سے بڑا ہے لیکن امریکہ میں ایسے اور سینکڑوں پاور اسٹیشن ہیں۔ ہر شہر میں اور اکثر بڑے قصبوں میں ایسے پاور اسٹیشن موجود ہیں جہاں بجلی پیدا اور تقسیم کی جاتی ہے۔

پرانے زمانہ میں جب بادشاہ اپنے دشمنوں پر حملہ کرتے تھے تو پانی نکالنے اور گاڑیاں کھینچنے کے لئے لوگوں کو گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہمارے انجن کائنات کے رازہائے سربستہ کا کھوج لگاتے اور اپنے لئے بجلی کے غلام بناتے ہیں اور ان کے یہ غلام سرنگوں میں ریلیں چلاتے، پانی کے پمپوں کو کھینچتے اور ہماری سڑکوں کو روشن رکھتے ہیں۔

پرانے زمانہ میں انسانوں کے ہم جنس غلام کام کا بیشتر حصہ انجام دیا کرتے تھے۔ آج میکانکی غلام انجنوں اور مشینوں کی شکل میں کام کے بیشتر حصہ کو پورا کرتے ہیں۔ امریکہ کے انجنیروں کا یہ کہنا ہے کہ ان کے ملک کے ہر خاندان میں افراد خاندان کے علاوہ سو میکانکی غلام ایسے ہیں جو برابر کام کرتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک کو یہ بات اس مقدار میں حاصل نہیں ہے۔ امریکہ کے مزدور کے اختیار میں دنیا کے دوسرے مزدوروں کے مقابلہ میں زیادہ قوت محرکہ پائی جاتی ہے اسی لئے اس کی اہلیت کارگذاری دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ صرف ایک بٹن کو دبا کر

وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ وہ فولاد کی چادر میں ایک وقت میں سو سوراخ کر سکتا ہے۔ وہ ایک لانبی ریل گاڑی کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ وہ رات کو دن کر سکتا ہے وہ سینکڑوں من لوہا اٹھا سکتا ہے اور اپنی سینکڑوں منزلوں کی عمارتوں پر پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو اٹھوا سکتا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزدور کی قوت کس طرح انجنوں کی وجہ سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آئندہ کسی صحبت میں ہم دیکھیں گے کہ انجنوں سے چلنے والی مشینوں کی وجہ سے معیار زندگی کے بلند ہونے کے امکانات کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے عہد کے ہر آدمی کی قوت دیوؤں جیسی ہے اور ہم دیوؤں کی قوت کے عہد میں زندگی گذار رہے ہیں۔

خلاصہ اوپر کے بیان میں ہم نے مختصراً یہ بات بیان کی کہ کس طرح انسانوں نے اپنے رگ و پٹھے کی قوت کی جگہ اور قوتوں کو استعمال کرنے کے لئے اپنی طویل جد و جہد کو جاری رکھا فطرت کو تسخیر کرنے اور اس کی مدد سے اپنے تمام کام کرانے کی کوشش میں انسانوں کو لاکھوں سال صرف کرنا پڑے اخیر میں مندرجہ ذیل منازل کو اختیار کر کے انسان مشین کی قوت سے فائدہ اٹھا سکا۔

(۱) اس نے ایسے اوزار بنائے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے استعمال کر سکتا تھا۔

(۲) اس نے جانوروں کو سدھایا اور اپنا کام کرانے کے لئے انھیں جوتا۔

(۳) دوسرے قبیلوں اور قوموں کے آدمیوں کو اس نے پکڑا اور ان کو غلام بنا کر ان سے اپنا کام کرایا۔

(۴) اس نے ہوا اور دریاؤں سے اپنے پہیوں کے چلانے کا کام لیا

(۵) سائنس کے عہد کی ابتدا میں اس نے انجنوں کی بھاپ کے ذریعہ اپنے پہیوں کو تیزی سے گھمایا۔

(۶) اس نے انجنوں میں گیس کو استعمال کرنا شروع کیا اور اپنی قوت محرکہ کو اور زیادہ بڑھا لیا

(۷) اس نے بجلی کو قبضہ میں کیا اور قوت محرکہ کو بڑے بڑے فاصلوں پر پہنچایا۔

آج امریکہ جیسے ملک میں جس قدر قوت محرکہ بھی استعمال کی جا رہی ہے وہ تقریباً سب کی سب مشینوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ رگ و پٹھے کی کوئی قوت بھی اب اس قوت کی جگہ نہیں لے سکتی جس کی مدد سے امریکہ کے آدمی اپنا کام چلا رہے ہیں۔ مشین کی قوت سے لوگوں کو آرام مل رہا ہے۔ ان کا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے۔ ان کو کھانے کو زیادہ ملتا ہے فرصت زیادہ ملتی ہے کپڑے اچھے ملتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ آج کل جس قدر آرام اور چین سے زندگی بسر کرتے ہیں دنیا کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی زندگی بسر نہیں کی۔ وہاں کے بہت سے لوگ اس طرح کی عیش و عشرت کی زندگی گذارتے ہیں جیسی کہ آج سے چند صدی پہلے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ یہ سب عیش و آرام صرف انجنوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ ان بے شمار مشینوں کی ایجاد کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے جو انجن کی قوت سے چلتی ہیں۔ ان انجنوں کے بغیر وہ تمدن و تہذیب جو مغرب کا طرۂ امتیاز ہے کبھی پیدا نہ ہو سکتی۔

رہنے سہنے کے نئے اور پرانے طریقے

موجودہ زمانہ میں بجلی کے ایسے آدمی ایجاد کئے گئے ہیں جنھیں جب مناسب طریقہ پر مخاطب کیا جاتا ہے تو وہ سوالوں کے جواب دیتے ہیں، احکام قبول کرتے ہیں اور جو کچھ ان سے کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اسے پورا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک آدمی سے دربان کا کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے "کھل جا سم سم" تو دروازہ خاموشی کے ساتھ تیزی سے کھل جاتا ہے لیکن اس سے دروازہ کھلوانے کے لئے ٹھیک انھیں لفظوں کو استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ ذرا لفظوں میں فرق ہوا تو پھر دروازہ نہیں کھلے گا۔ انھیں بنایا ہی اس طرح گیا ہے کہ یہ صرف مقررہ الفاظ کی تعمیل کرتے ہیں اور جن سوالوں کے جواب دینے کے لئے انھیں بنایا گیا ہے ان کے ہی جواب دے سکتے ہیں۔ اس قسم کے آدمی نما مشین سے حکم کی تعمیل کرانے کے لئے آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ یہ کیا کام کرسکتی ہے اور اس کے مخاطب کرنے کا مناسب طریقہ کیا ہے۔

لیکن اس مشین کے قریب ہونا ضروری نہیں ہے۔ فرض کیجیئے آپ اپنے گھر سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اگر آپ کے گھر پر ایک بجلی کا آدمی موجود ہے تو آپ ٹیلیفون پر اسے بلا سکتے ہیں اور جب وہ جواب دے تو آپ اس سے دریافت کرسکتے ہیں کہ "کیوں بھئی انگیٹھی کی آگ کس قدر گرم ہے۔" وہ فوراً اس کی حرارت کے بارے میں آپ کو ٹھیک ٹھیک جواب دے گا۔ اب اگر اس کے بعد آپ اس سے کہیں گے کہ "آنچ کو اور تیز کر دو اور ٹیلیفون کو رکھ دو" تو وہ آپ کے حکم کی بجنسہٖ تعمیل کرے گا۔

شہر نیویارک کے تالاب میں تین بجلی کے آدمی آج کل فی الواقعی کام کر رہے ہیں۔

ٹیلیفون پر جب کبھی انھیں بلایا جاتا ہے تو وہ رات دن جواب دیتے رہتے ہیں اور پانی کی رَد کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اطلاعیں دیتے ہیں۔ یہ ایمان دار اور لائق اعتماد ملازم ہیں اور یہ احکام کی تعمیل بجلی جیسی تیزی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے اور آدمیوں کو بھی کام پر لگایا جائے گا اور یہ لوگوں کے لئے کون کون سے اور دوسرے کام بہت جلد کرنے لگیں گے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بجلی کے آدمی کا نام سن کر ہم حیرت کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہماری موجودہ دنیا کی حیرت ناک ایجادیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ ہم نے خشکی بلکہ سمندر کے پار کے دور دراز لوگوں سے بغیر دو بدو ہوئے دوستیاں قائم کر لی ہیں۔ آوازیں ہوا میں تیرتی ہوئی براعظموں کو عبور کر سکتی ہیں اور لاکھوں آدمی انھیں ایک ہی وقت میں سن سکتے ہیں۔ ہندوستان سے لندن اور نیویارک تک تیز رفتار ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کیا جا سکتا ہے جس وقت ہم اپنی تعطیلیں گذارنے کے لئے دوسرے ملکوں کو جائیں گے ہمارے کچھ کام بجلی کے ایسے آدمی کرتے رہیں گے جو ٹیلیفون کا جواب دے سکتے ہیں اور ہمارے احکام کی بغیر غلطی کئے ہوئے تعمیل کر سکتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں سچ مچ بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

ہمارے لئے اس بات کا احساس کرنا اب مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال تک لوگ کیسے بغیر ان ایجادوں کے گذر کر سکتے۔ وہ فطرت کی قوتوں کے غلام تھے۔ جانور ان کا شکار کرتے رہتے تھے اور طوفان انھیں زیر و زبر کرتے رہتے تھے۔ صرف چند ہزار سال ہوئے انسانوں نے ہوا، پانی اور زمین کی چیزوں سے فائدہ حاصل کرنا سیکھا۔ اور اپنی ضرورتوں اور تفریحوں کو پورا کرنے کے لئے قوائے فطرت کو نئے طریقوں پر استعمال کرنے کے کام کو شروع کیے ہوئے تو ابھی دو سو سال بھی پورے نہیں ہوئے ہیں۔ ان ایجادوں کے بعد مشینوں میں تبدیلیاں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہوتی رہی ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں لوگوں نے اپنے طرز زندگی اور طرز خیال کو جتنی تیزی سے بدلا ہے اس سے پہلے کئی ہزاروں سال میں بھی نہیں بدل

سکے تھے۔

مثال کے طور پہ امریکہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کیجیے کہ ۱۸۰۰ء میں کون سے طریقے رائج تھے اور آج ان کی جگہ کون سے نئے طریقے رائج ہو گئے ہیں۔

امریکہ کے گھروں میں تبدیلی | ایک شخص ہنری اسمتھ کی مثال کو سامنے رکھیے جو ۱۸۰۰ء میں اوہیو کی سرزمین میں رہتا تھا۔ اس کا مکان لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں سے جنھیں امریکہ کے جنگلوں سے کاٹ لیا جاتا تھا بنایا جاتا تھا۔ اس کے اندر صرف ایک کمرہ ہوتا تھا جو زیادہ بڑا نہ ہوتا تھا اور جس پر پلاسٹر وغیرہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی پوری زندگی اسی کمرہ میں گذاری جاتی تھی یہیں بیگم اسمتھ کھانا پکاتی تھیں یہیں سیتی تھیں اور یہیں چرخہ کاتتی تھیں۔ پتھر کی انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر جسم کو گرم کیا جاتا تھا، کھانا پکایا جاتا تھا اور پڑھنے کے لیے روشنی حاصل کی جایا کرتی تھی۔ ہنری اور اس کے لڑکے خود ہی اپنے لیے اس لکڑی سے جسے گھر کے اردگرد کے درختوں کو کاٹ کر حاصل کیا جاتا تھا بھدی میزیں، کرسیاں اور اسی قسم کا فرنیچر کا دوسرا سامان بنا لیتے تھے۔ ان کی بیٹی جولی دیا سے نہانے اور کھانا پکانے کے لئے پانی لایا کرتی تھی اور آگ پر ایک برتن میں اسے گرم کیا کرتی تھی پورا دن کام کرتے کرتے گذر جاتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں کو اتنا کام کرنا پڑتا تھا کہ ان کی کمر ٹوٹ جاتی تھی۔

اب اس کے مقابلہ میں آج کل جس طرح امریکہ کے لوگ اپنی زندگی گذارتے ہیں اسے ملاحظہ کیجیے۔ آج کل ہر خاندان کے لوگوں کے استعمال کے لئے کئی کئی کمرے ہوتے ہیں جنھیں سردی میں آتش دان سے گرم کیا جاتا ہے اور گرمیوں میں بجلی کے پنکھوں سے ٹھنڈا رکھا جاتا ہے آپ گیس کھول دیتے ہیں یا بٹن دبا دیتے ہیں اور آپ کو پکانے کے لئے گرمی اور پڑھنے کے لئے روشنی مل جاتی ہے۔ آپ نل کی ٹونٹی گھماتے ہیں اور پانی گرم یا ٹھنڈا آپ کے نہانے کے ٹب یا برتن دھونے کے حوض میں گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ کپڑا دھونے کی مشینیں، کپڑا سینے کی مشینیں، بجلی کی استریاں، خلا کے ذریعہ کمرے کے اندر جھاڑوں اور اس کی صفائی —— یہ تمام طریقے

ہیں جن سے آدمی اپنے آپ کو گھر کے کام کی سخت محنت سے بچا سکتا ہے۔ ایسی کون سی مفید چیز ہے جسے آپ دوکان سے جا کر یا قریب کے شہر کو فرمایش بھیج کر اپنے گھر کے لئے حاصل نہیں کر سکتے؟ جب کبھی آپ کو ضرورت ہوتی ہے کتابیں اور رسالے آپ کو نہایت کثیر تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں؟

امریکہ کے غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں تبدیلی

۱۸۰۰ء میں اسمتھ کے گھر کے لوگوں کی غذا بہت سادہ ہوا کرتی تھی سردیوں میں صرف نمک لگا ہوا سور کا گوشت، مکہ کی روٹی اور آلو ملا کرتے تھے۔ اکثر غذا کی قلت رہتی تھی اور اس میں تنوع بہت کم ہوتا تھا۔ ربیع کی فصل میں ترکاری اپنی زمین میں بوئی جاتی تھی۔ کھانے کو بس یہی چیزیں ملتی تھیں۔

لیکن آج کتنا فرق ہو گیا ہے۔ اب گھر کے کونہ کی ایک الماری کے اندر پرچون کا سارا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا بلکہ ہر چیز ضرورت کے وقت پڑوس کی پرچون کی دوکان سے حاصل کی جاتی ہے جس میں ٹیلیفون لگا ہوتا ہے "ہیلو۔ کیا آپ پروننگ کی پرچون کی دوکان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ دیکھئے میں مسز وارن، ۷۸ سیڈر اسٹریٹ سے بول رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے چھوٹے لڑکے کے لئے لفافہ میں بند کی ہوئی ایک ڈبل روٹی، ایک پونڈ دانہ دار شکر، ہڈی دار چوزہ کا ایک ڈبہ اور پانچ پونڈ آلو دے دیجئے۔ آپ کے یہاں فلورڈا کی عمدہ نارنگیاں ہیں؟ اچھا تو آدھی درجن نارنگیاں بھی دے دیجئے۔ اور چین کی ایک پونڈ سبز چائے اور سمرنا کے انجیروں کا ایک پیکٹ بھی بھیج دیجئے۔ اچھا بس۔ خدا حافظ"

ہر روز ہزاروں گوشت مارکٹوں، ڈیریوں، بیکریوں، اور پرچون کے اسٹوروں میں ٹیلیفون کے ذریعہ اس قسم کے کھانے کی فرمائشیں آتی ہیں جنھیں ۱۸۰۰ء میں ہرگز نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں امریکہ میں اس قسم کے کھانوں کو پیدا ہی نہیں کیا جاتا تھا آج امریکہ کی اکثر آبادیوں میں لوگ، اسٹورز کو ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی غذا کی روزانہ رسد کے لئے فرمائش بھیج سکتے ہیں۔

لیکن امریکہ کی غذا کے تنوع میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے اس کی اہمیت اور چیزوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نہیں ہے اس میں جو چیز دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں کو اکثر غذائیں تیار شدہ فوری استعمال کے لایق مل سکتی ہیں۔ گوشت، ترکاری اور پھلوں کو ٹین کے ڈبوں میں بند خریدا جا سکتا ہے جس کھانے کو تیار کرنے میں ۱۸۰۰ء میں پورا دن لگ جاتا اب وہ پرچون کے اسٹور سے خریدنے کے بعد صرف چند منٹوں کے اندر دسترخوان پر چنا جا سکتا ہے اس تیار شدہ غذا کی وجہ سے محنت اور وقت کی بہت زبردست کفایت ہو گئی ہے۔

کپڑوں کے بنانے میں تبدیلیاں | ہنری اسمتھ کا چچازاد بھائی ولیم ۱۸۰۱ء میں اوہیو کی نئی زمینوں میں جا کر آباد نہیں ہوا بلکہ وہ نیویارک کے گاؤں میں ہی مقیم رہا اور اپنی روزی حاصل کرنے کے لئے جوتے بنانے لگا۔ وہ لکڑی کی بنچ کے ایک سرے پر بیٹھ کر جس کی نشست چمڑے سے منڈھی ہوا کرتی تھی کام کیا کرتا تھا اور بنچ کے دوسرے سرے پر اس کے تمام اوزار رکھے رہتے تھے منہ میں کیلیں بھری رہتی تھیں اور وہ نہایت سخت محنت کے ساتھ جوتے کو کاٹتا، کھینچتا، ٹانکتا، ٹھوکتا، کھرچتا اور ملا کرتا تھا۔ بہت تیزی سے کام کرنے کی صورت میں دو تین دن کی محنت کے بعد ایک جوڑا جوتا تیار ہوتا تھا۔ یہ جوتے مضبوط اور دیرپا تو ضرور ہوتے تھے لیکن وضع میں بھدے ہوتے تھے۔

آج ہمارے لئے فیکٹریوں میں سینکڑوں آدمی مل کر جوتے بناتے ہیں۔ ایک جوڑ جوتا بنانے کے لئے ایک سو پچاس سے زیادہ مختلف مشینوں کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں مشینیں خوب ترقی یافتہ ہیں وہاں اگر سوکھنے کے وقت کو شمار نہ کیا جائے تو ایک جوڑا تیس چالیس منٹ کے اندر تیار ہو جاتا ہے اور ہر روز ہزاروں خوبصورت جوتے بنا کر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

کپڑے بنانے میں بھی اس فرق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں جن لوگوں نے نو آبادیاں بسائیں ان کے گھروں پر ہی عورتیں سوت کاتا اور کپڑا بنا کرتی تھیں۔ جب کپڑا بن کر تیار ہو جاتا

تو اسے ہاتھ سے ہی کاٹا اور سیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سنہ ۱۸۰۰ء میں سلے ہوئے کپڑوں کو ایک بیش قیمت چیز سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج کل مشین کی دنیا میں کام بالکل مختلف طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ پرانے چرخے ختم ہوگئے ہیں۔ ہاتھ کے کرگے صرف عجائب خانوں میں نظر آتے ہیں اور ان کی جگہ آج کل ہزاروں ملیں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے لئے قائم کردی گئی ہیں اور کپڑے کاٹ کر سینے کے لئے بھی بڑی بڑی فیکٹریاں کھڑی کردی گئی ہیں۔

ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی میں حیرت انگیز تبدیلی

لیکن سنہ ۱۸۰۰ء کی زندگی اور آج کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق سفر کرنے کے طریقوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً آج کل امریکہ کے بڑے شہروں کے بہت سے آدمی اپنے کام کی جگہ سے چالیس یا پچاس میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں لیکن روزانہ صبح شام اپنے گھر آجا سکتے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے دو تین دن صرف ہوتے تھے اور بجائے کسی عمدہ سڑک پر آرام دہ ٹرین یا تیز رفتار موٹر میں سفر کرنے کے اس زمانہ کے لوگوں کو یا تو پیدل سفر کرنا پڑتا تھا یا گھوڑے کی پیٹھ پر یا ڈاک کی شکرموں وغیرہ میں خاص خاص سڑکیں تو اچھے موسم میں غنیمت ہوتی تھیں لیکن جب بارش کا سلسلہ طول پکڑ جاتا تھا تو ان پر سفر کرنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ نوآباد علاقوں کی سڑکیں بس لیکیں ہوتی تھیں جن پر پیدل یا گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کیا جا سکتا تھا۔ اکثر سڑکوں پر بیس میل کا فاصلہ دن بھر میں طے کیا جا سکتا تھا اور حالات اگر بہت اچھے ہوتے تب چالیس میل کے سفر کو انتہا سمجھا جاتا تھا۔

آج کل دن میں ہوائی جہاز اور رات میں اکسپرس ریل گاڑی کو استعمال کرکے امریکہ کے پورے براعظم کا سفر دو دن میں کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے بعید ترین گوشوں کو بھی پکی اور عمدہ سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔

خبر رسانی میں بھی خوب ترقی ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس کا انحصار تیز ترین سواری پر

ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج امریکہ کے لوگ اپنے ملک کے کسی شہر میں بلکہ لندن تک میں اپنے دوستوں سے ٹیلیفون کے ذریعہ چند منٹ کے اندر بات کر سکتے ہیں ریڈیو کے ذریعہ الفاظ تیزی کے ساتھ روانہ کیے جا سکتے ہیں۔ قطب جنوبی کے حالات دریافت کرنے کے لئے جو لوگ جاتے ہیں وہ اپنے امریکہ کے دوستوں سے برابر گفتگو کر سکتے ہیں۔

غرضکہ ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی میں ایسی ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔

قوت متحرکہ میں تبدیلیاں | لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں میں جو یہ تبدیلیاں ہوئیں ہیں ان کے کئی اسباب ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم سبب وہ ایجادیں ہیں جن کے ذریعہ سے مشینوں کو قوت متحرکہ سے چلایا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں کام زیادہ تر انسان اور جانوروں کے رگ پٹھوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ اور صرف ہوا اور پانی کی قوت کو ابتدائی طریقوں پر استعمال کرنا ممکن تھا۔ ہنری اسمتھ کو اپنا اناج ہاتھ سے پیسنا پڑتا تھا اور چکی کے بھاری پاٹوں کو چلانا بڑا مشکل کام تھا۔ شہروں میں بھی جس تک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر پورے دن میں پہنچا جا سکتا تھا سست رفتار کے ساتھ چلنے والے پانی کے پہیوں یا ہوا چکیوں کے ذریعہ ضروری قوت متحرکہ پیدا کی جا سکتی تھی ہر جگہ کھیتوں کو گھوڑے یا بیلوں کی مدد سے لکڑی کے ہل سے جوتا جا سکتا تھا۔ فصل کی کٹائی ہنسیے کے ذریعہ کی جا سکتی تھی۔ ایری کی نہر کو ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۵ء کو سینکڑوں آدمیوں نے کدالوں اور پھاوڑوں سے کھود کھود کر بنایا تھا۔

لیکن آج کل زمین کی جتائی، فصل کی کٹائی اور غذا کی تیاری کے تمام کام تیزی اور آسانی کے ساتھ مشین کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ نہر ایری کے مکمل ہونے کے تقریباً ایک صدی بعد قوت متحرکہ سے چلنے والے دخانی پھاوڑوں اور دوسری بڑی بڑی مشینوں نے نہر پناما کو ایک ایسے پہاڑ کے درمیان سے کھود کر نکالا جو سات میل چوڑا تھا۔ اگر محض انسان کے رگ پٹھوں پر بھروسہ کیا جاتا تو منطقہ حارہ کے اس گرم اور بیماریوں اور وباؤں سے بھرے ہوئے علاقہ

میں نہر کھودنا اور بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملانا ناممکن ہو جاتا۔

آج کل قوت متحرکہ انسان کے دکھتے ہوئے رگ پٹھوں سے نہیں بلکہ بھاپ کے شور اور بجلی کی خاموشی سے فراہم کی جاتی ہے۔ بیسیوں دریاؤں کے پانی کو نہایت زور کے ساتھ پہیوں پر گرا کر ان کو تیزی سے متحرک کیا جاتا ہے اور ان کی اس حرکت سے بجلی پیدا کی جاتی ہے جسے تانبے کے تاروں کے ذریعہ میلوں دور لے جا کر سینکڑوں مشینوں کے پہیوں کو چلایا جاتا ہے۔ مشین کی مدد سے مزدور کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اوپر کے بیان کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ کے تمام لوگ ۱۸۰۰ء میں ایسی ہی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی کہ ہنری اسمتھ کی بیان کی گئی۔ ہنری اسمتھ نوآباد علاقہ میں زندگی گذار رہا تھا۔ لیکن جو لوگ بحر اٹلانٹک کے ترقی پذیر شہروں مثلاً بوسٹن، نیویارک، فلاڈلفیا میں زندگی گذار رہے تھے ان میں بہت سے دولت مند تاجر، وکیل اور بادبانی جہازوں کے مالک تھے۔ ورجینیا اور دوسری جنوبی ریاستوں میں بڑے بڑے فارموں کے مالک ایسے دولت مند لوگ تھے جن کے پاس بہت سے ملازم ہوا کرتے تھے اور جو نہایت باریک ریشم اور ساٹن لندن کے تاجروں سے خریدا کرتے تھے۔ شہر کے موچیوں اور دوسرے کام کرنے والوں کے مکان بھی نوآبادیوں میں بسنے والے لوگوں کے مقابلہ میں بہتر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بصورت مجموعی امریکہ کے لوگوں کی اکثر تعداد غریب تھی اور انھیں بہت سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ بہت کم سفر کرتے تھے۔ ان کی تعلیم تقریباً بالکل نہیں ہوتی تھی اور بہت کم کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ بہت بڑی حد تک گاؤں یا قصبہ کے لوگوں کو اپنے علاقہ اور اپنی ذاتی محنت کی پیداوار پر ہی دارومدار کرنا پڑتا تھا اور باہر کے ملکوں کی مختلف پیداواروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

لیکن اگر توجہ کو صرف نوآبادیوں تک ہی محدود رکھ کر دیکھا جائے کہ ۱۸۰۰ء میں ان کی زندگی کیسی تھی اور آج ان کی زندگی کیا ہے تو اس فرق کو ذیل کے نقشہ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے:۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں	آج
۱۔ چھوٹے بھدی وضع کے لکڑی کے مکان، جن میں کمرے بہت کم ہوتے تھے اور سردی گرمی کے بچاؤ کا بندوبست بھی خراب ہوتا تھا۔ خانہ داری کی سہولتیں بھی بہت کم تھیں۔	۱۔ بہت سے کمروں کے، موسم کے اثرات سے محفوظ مکانات جنھیں اینٹوں، سیمنٹ، کنکریٹ، فولاد اور لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور جن کے اندر بہت سی اور دوسری آسانیاں اور سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔
۲۔ چند سادہ قسم کے کھانے، جنھیں بھدے اوزاروں کے ذریعہ گھر کے کھیتوں سے حاصل کر کے گھر کے اندر ہی تیار کیا جاتا تھا۔ غذا میں تنوع بہت کم ہوتا تھا اور اکثر غذا کی قلت رہتی تھی۔ غذا کا حاصل کرنا بہت کچھ موسموں کا پابند تھا۔	۲۔ کھانے میں کثیر تنوع جن میں سے بہت سی چیزیں اکثر ان ریاستوں اور ملکوں میں حاصل کی جاتی ہیں جو گھر اور وطن سے بہت دور واقع ہیں۔ انھیں مشینوں سے بڑی تعداد میں تیار کیا جاتا ہے اور عالمگیر ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی کے ذریعہ انھیں اپنی آبادی میں لایا جاتا ہے۔
۳۔ سادہ اور سپاٹ قسم کے کپڑے اور کھالیں، جن کو گھر کے لوگوں کی محنت سے ہی تیار کیا جاتا تھا۔ ان گھر کے بنے ہوئے کپڑوں کی وضع میں تنوع بہت کم ہوتا تھا۔	۳۔ مختلف قسم کے دلکش اور دیدہ زیب کپڑے جنھیں بڑی مقدار میں خاص خاص مشینوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ان کے تیار کرنے میں تمام دنیا سے سامان حاصل کر کے لگایا جاتا ہے اور انھیں مقامی اسٹوروں سے خریدا جاتا ہے۔
۴۔ صرف ضروری سفر کیا جاتا تھا۔ لیکیں اور سڑکیں کم اور خراب تھیں۔ سفر یا تو پیدل کیا جاتا تھا یا گھوڑے کی پیٹھ یا بھدی گاڑیوں اور کشتیوں میں۔ پیغامات اور خبروں کا پہنچانا بھی اتنا ہی مشکل اور آہستہ ہوتا تھا۔	۴۔ کاروبار اور تفریح کے لئے بہت زیادہ سفر کیا جاتا ہے جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی سڑکوں، ریلوں، آبی راہوں کی وجہ سے بہت سہل ہو گیا ہے۔ پیغامات اور خبریں ڈاک خانوں، ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعہ بہت تیزی سے روانہ کی جا سکتی ہیں۔
۵۔ آدمیوں اور جانوروں کے رگ پٹھوں اور ہوا اور پانی کی قوت سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ "قدرتی" قوت پر بھروسہ کرتے تھے اس لئے کام میں محنت زیادہ تھی اور کارگزاری کم	۵۔ مشین کے لئے قوت محرکہ کی بہت بڑی مقدار بھاپ، گیس اور بجلی کے انجنوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ان سے مشینیں چلتی ہیں جو کام کو کفایت اور زیادہ کارگزاری کے ساتھ کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے ذرائع نقل وحمل نے کس طرح ترقی کی؟

موجودہ زمانے میں، ریلوں، موٹروں اور دخانی جہازوں نے کرۂ زمین کے کروڑوں آدمیوں کو جو سینکڑوں ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب کر دیا ہے۔ ہم اپنی ضرورت کی معمولی معمولی چیزوں کے لئے ان مقامات پر دارومدار کرنے لگے ہیں جو ہم سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ہمارے عزیز و قریب ہم سے جدا ہو کر ہزاروں میل دور چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی خبر ہمیں فوراً کے فوراً مل سکتی ہے اور ضرورت کے وقت چند دن کے اندر اندر ہم ان سے دوبارہ مل سکتے ہیں۔

لیکن انسانوں کو یہ آرام و اطمینان بہت حال ہی میں حاصل ہوا ہے۔ چند سیاح اور تاجر تو پرانے زمانہ میں بھی قیمتی مال لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کیا کرتے تھے لیکن یہ سفر بہت خطرناک ہوتے تھے۔ ان کو پورا کرنے میں بہت مدت صرف ہوتی تھی اور اس عرصہ میں انھیں اپنے عزیز و احباب سے بالکل بے خبر رہنا پڑتا تھا۔ پرانی دنیا کے آدمی نہ تو اس قدر کثیر تعداد میں سفر کرتے تھے جیسے آج کرتے ہیں اور نہ دنیا کا مال اس قدر کثیر مقدار میں مختلف ملکوں کو اس قدر جلد اور کم صرف کے ساتھ روانہ کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستان کی پرانی تہذیب مصر اور چین کی پرانی تہذیبیں غرض کہ کرۂ زمین کے کسی مقام کے رہنے والوں کو تاریخ کے کسی زمانہ میں ایسے ذرائع نقل وحمل اور رسل و رسائل کا علم نہیں تھا جیسا کہ آج ہمیں حاصل ہے۔

ذرائع نقل وحمل میں یہ تمام ترقی صنعتی انقلاب یعنی ۱۸۰۰ء کے بعد ہوئی ہے۔

ذرائع نقل وحمل کی ترقی کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ نقل وحمل کا سب سے پہلا ذریعہ انسان کے اعصاب تھے۔ اس کی کمر، اس کے بازو، اس کے شانے، اس کا سر، ان ہی

پر انتہا ہیں چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ "نینڈرتھل انسان" یعنی انسانوں کے باوا آدم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا ظہور یورپ میں آج سے ۵ لاکھ سال پہلے ہوا تھا۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو ظاہر ہونے کے ہزاروں سال بعد تک یہ نینڈرتھل آدمی اور اس کی اولاد اپنی کمر اور بازوؤں کو ہی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے استعمال کرتی رہی۔ دنیا کے بہت سے پس ماندہ حصوں میں آج بھی وزن کو منتقل کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے مثلاً چین، افریقہ اور ہندوستان میں اشیا کی ایک کثیر مقدار کو انسانی اعصاب کی قوت کے ذریعہ سے ہی منتقل کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد آدمیوں نے آہستہ آہستہ جانوروں کو اپنے بوجھ اٹھانے اور اپنے وزن کھینچنے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ اپنے وزنی بوجھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان اس قدر بے تاب تھا کہ جس جانور کو بھی یہ اپنے قابو میں لا سکا اسی پر اس نے اپنا بوجھ لادنا شروع کر دیا۔ اگر ان تمام جانوروں کو ایک جگہ جمع کیا جا سکے جن کو انسانوں نے باربرداری کے لئے استعمال کیا ہے تو ایک دلچسپ سرکس اور اچھا خاصا جانوروں کا عجائب خانہ تیار ہو جائے۔ ہندوستان کے ہاتھی، عرب اور مصر کے اونٹ، فلسطین، سسلی اور دوسرے بحر روم کے ملکوں کے گدھے، جنوبی امریکہ کے پہاڑوں کے لاما، فلپین اور سیام کے دریائی بھینسے، سست رفتار بیل، منگولیا کے ٹٹو، مضبوط پہاڑی گھوڑے اور خچر وغیرہ وغیرہ سب ہی کو اس فہرست میں شامل کرنا ہوگا۔ ان جانوروں کی پیٹھ پر تاریخ کے ایک طویل زمانہ تک تجارت کا سامان منتقل کیا جاتا رہا اور اب بھی ایسی دور افتادہ اور پس ماندہ جگہوں میں جہاں عمدہ سڑکیں نہیں ہیں انہی کو سامان کے منتقل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد پہیوں کا رواج شروع ہوا۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس شخص کے نام کا تو پتہ نہیں چلتا جس نے سب سے پہلے پہیے کو ایجاد کیا۔ غالباً غار میں رہنے والا کوئی کاہل

اور احدی آدمی تھا جس نے اپنے سر پر بوجھ لادنے کی جگہ کمر پر زور ڈالنا زیادہ پسند کیا اور لکڑی کے موٹے موٹے لٹھوں کو لڑھکاتے لڑھکاتے اسے اس بات کا پتہ چلا کہ لکڑی کے لٹھوں کو لادنے کی جگہ ان کو لڑھکانا زیادہ سہل ہے۔ بہرحال اس بات کو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں موٹے گول لٹھوں کو بھاری چیزوں کو حرکت دینے کے لئے استعمال کیا جایا کرتا تھا۔ بعض ملکوں میں مثلاً چین اور ہندوستان میں آج بھی بعض گاڑیاں ایسی ملتی ہیں جن کے پہیے گول اور موٹے لٹھوں کے محض چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر بنا یے جاتے ہیں لیکن اس قسم کے ٹھوس پہیے جلد چٹخ جاتے ہیں اور سخت کھردری زمین پر جلد گھس جاتے ہیں ان کا وزن زیادہ ہوتا ہے اور ان کا کھینچنا یا ان کو دھکا دے کر آگے بڑھانا مشکل ہوتا ہے اس لئے آہستہ آہستہ انسانوں نے ان کی اصلاح کرنی شروع کی۔ لٹھوں کے بیچ کے حصہ کو کھوکھلا کیا جانے لگا اور پہیے کی مضبوطی کو قائم رکھنے کے لئے اس میں آر پار ڈنڈے یا تختے لگائے جانے لگے اور انھیں تختوں میں سے ایک کو دُھرے کو قائم اور پہیہ کو متحرک رکھنے کے لئے کچھ ابتدائی وضع کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے بعد پھر اور ہزاروں سال گذر گئے تب کہیں جا کر انسانوں نے پہیوں کی تعمیر میں اور زیادہ اصلاحیں کیں۔ مدار، دُھرا، ارا، گھیرا اور ہال استعمال کرنا شروع کیا گیا لیکن یہ سب لکڑی کے ہوتے تھے۔ ہمارے پاس اس بات کے لئے کافی ثبوت موجود ہے کہ پہیے کی اس اصلاح شدہ شکل کو انسانوں نے آج سے کئی ہزار سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ کیونکہ قدیم مصریوں، اسیریا والوں، چینیوں اور ہندوستانیوں کے پاس ایسی پہیے دار گاڑیاں تھیں جن میں پہیے کے موجودہ اصولوں سے بہت بڑی حد تک فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

پہیے کے رواج کے بعد انسان پہلے کے مقابلہ میں بڑی بڑی وزنی چیزوں کو زیادہ سہولت کے ساتھ اٹھانے لگا۔ مضبوط جانوروں کے مقابلہ میں چونکہ انسان جلد تھک جاتا ہے اس لئے انسانوں نے جانوروں کو اپنی پہیے دار گاڑیوں کے کھینچنے کے لئے استعمال

کرنا شروع کر دیا۔ بعض ملکوں میں گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے بیلوں کا استعمال کیا جانے لگا۔ بیل مضبوط تو ضرور تھا لیکن اس کی چال سست تھی۔ اس لئے آدمیوں نے گھوڑوں کو وزن کھینچنے کے لئے سدھانا شروع کیا۔ گھوڑے بیلوں کے برابر وزنی بوجھ تو نہیں کھینچ سکتے تھے لیکن وہ ہلکے وزن کو تیزی کے ساتھ کھینچنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس لئے بہت سے ملکوں میں گھوڑے کا رواج عام ہو گیا۔

گاڑیاں روز بروز بہتر قسم کی بنائی جانے لگیں۔ پہیوں کی بھی اصلاح کی گئی لیکن رفتار کی تیزی اور مال کی مقدار کا دارومدار جانوروں کی طاقت اور تیزی پر ہی رہا۔

اس کے بعد پھر ہزاروں سال گذر گئے اور لوگ اپنی بھدی اور سست رفتار گاڑیوں کو استعمال کرتے رہے۔ پھر ۱۷۵۰ء کے بعد صنعتی انقلاب ہوا اور سو سال کے اندر ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی میں مکمل تبدیلی پیدا ہو گئی۔ انجنوں کی طاقت کو صرف چیزوں کے بنانے کے لیے ہی نہیں بلکہ انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جس زمانہ میں آدمی مشینوں کو قوت متحرکہ کے ذریعہ سے چلانا سیکھ رہے تھے اسی زمانے میں ریل گاڑیوں، بحری جہازوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کو بھی قوت متحرکہ کے ذریعہ سے چلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

میکانکی قوت کی وجہ سے ذرائع نقل وحمل کی رفتار اور ان کی بوجھ لے جانے کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔

گھوڑوں کے ذریعہ سے گاڑیوں کو پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بہ مشکل چالیس میل تک کھینچا جا سکتا تھا۔ لیکن دخانی یا گیس انجن کے ذریعہ ریلوں اور موٹروں کو ساٹھ اور اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دن و رات کھینچا جا سکتا ہے۔ سال بہ سال میکانکی قوت کے ذریعہ گاڑیوں میں مال لے جانے کی اہلیت بڑھتی جا رہی ہے۔ آج ایک بڑی موٹر لاری میں جسے صرف ایک آدمی چلاتا ہے اتنا وزن لاد کر لے جایا جا سکتا ہے جسے آٹھ سو آدمی اپنی پیٹھ پر

اٹھا سکتے ہیں اور پھر وقت کے حساب سے مقابلہ کیا جائے تو اسی مدت میں کم سے کم پانچ گنا زیادہ دور لے جایا جا سکتا ہے۔ ایک مال گاڑی میں جسے صرف ۲ آدمی چلاتے ہیں جو بوجھ یہ چھ آدمی اٹھا سکتے تھے اس سے ۲۰ ہزار گنا زیادہ مال لادا جا سکتا ہے۔

ذرائع رسل و رسائل کی تیز رفتاری میں ذرائع نقل و حمل سے بھی بہت زیادہ ترقی ہوگئی ہے۔ آج سے پچھتر سال پہلے تک پیغام کی رفتار، پیغام بروں کی رفتار کی پابند ہوا کرتی تھی یہ لوگ پیدل یا گھوڑے یا گاڑی یا بادبانی کشتی ریل یا دخانی جہاز پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے لیکن اس کے بعد حیرت انگیز ایجادیں ہوئیں انھوں نے ہمارے لئے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ اپنے پیغامات کو ہوا کے ذریعہ چند لمحوں کے اندر بجلی کی کوندی کی طرح منتقل کر سکیں۔ ٹیلیفون کی ایجاد سے پہلے ایک آدمی کی آواز دو سو تین سو فٹ تک ہوا میں سنائی دے سکتی تھی لیکن ٹیلیفون کے ذریعہ تین ہزار میل تک آواز کو پہنچایا جا سکتا ہے ریڈیو اور وائرلیس کے ذریعہ آواز دس ہزار میل بلکہ اس سے زائد دور لے جائی جا سکتی ہے۔

ویران سمندروں میں کیبل کا جال بچھا ہوا ہے اور ہمارے پیغامات سمندر کی گہرائی کی اس مٹی اور گونگھوں میں سے ہو کر گذرتے ہیں جہاں تک سورج کی روشنی کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ ریڈیو کے پیغامات زمین سے ہزاروں میل دور سمندر میں جہازوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں اور جہاز اُن کا جواب دیتے رہتے ہیں جہاز کے سمندری راستوں میں اگر برف کی تیرتی ہوئی چٹانیں موجود ہوتی ہیں تو ان کی اطلاع ریڈیو کے پیغام کے ذریعہ تمام جہازوں کو نشر کی جا سکتی ہے اور وہ اپنا راستہ بدل سکتے ہیں۔ لندن اسٹاک اکسچینج میں حصوں وغیرہ کا جو بھاؤ سہ پہر کے وقت ہوتا ہے اس کا علم نیویارک والوں کو دوپہر کے کھانے سے پہلے ہو جاتا ہے[1]۔

---

[1] نیویارک میں لندن کے مقابلہ میں سورج تین چار گھنٹہ دیر میں طلوع وغروب ہوتا ہے۔

ایک اور مثال کے ذریعہ سے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کی اس ترقی کا اندازہ کیا جاسکے گا :-

"بمبئی کے ایک آڑھتیہ کو کلکتہ کی ایک دکان کا تار ملا جس میں لکھا تھا کہ اناس کا جہاز کلکتہ میں کل صبح پہنچنے والا ہے۔ اناس جلد خراب ہوتے ہیں اور ان کی خریداری میں بہت روپیہ لگایا گیا تھا دوسری طرف ایک ڈاکیہ نے دہلی کا ایک خط آڑھتیہ کی میز پر لاکر ڈالا۔ اس خط کو دہلی میں لیٹر بکس سے ڈاک خانہ کی لاری نے نکالا تھا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ اسے بمبئی روانہ کیا گیا تھا اس میں لکھا تھا کہ دہلی کی منڈی میں اناس بہت کم ہیں۔ آڑھتیہ نے اپنا ٹیلیفون اٹھایا اور کلکتہ اور دہلی دونوں سے گفتگو کی۔ کلکتہ سے اس نے قیمت اور مقدار کا پتہ چلایا اور دہلی سے فرمائش حاصل کی جب دوسری صبح کو سنگاپور سے کلکتہ کی بندرگاہ میں جہاز پہنچا تو جہاز کے تمام اناس ریل کے رفریجریٹر ڈبوں میں لاد دیے گئے اور یہ ایک دو دن بعد دہلی کے گوداموں میں پہنچ گئے اور اس کام کے کرنے میں جہاز کے مالک، آڑھتیہ اور خریدار کو ذراسی بھی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ دہلی سے بمبئی کو ایک چیک روانہ کر دیا گیا اور اس سے کم رقم کا ایک چیک بمبئی سے کلکتہ کو روانہ کر دیا گیا اور ان دونوں چیکوں کا جو فرق تھا وہ آڑھتیہ کے حساب میں بنک کی کتابوں میں درج کر دیا گیا۔ یہ چیک کلیرنگ ہاؤسوں کی معرفت ڈاک کے ذریعہ سے واپس کر دیے گئے اور سودا مکمل ہو گیا۔"

اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اناس جیسی غذا کی چیز کو ہمارے دسترخوان تک پہنچانے کے لیے دنیا کے تمام ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کو استعمال کیا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ ہماری غذا کی تمام چیزوں کے لیے اس قسم کے تمام وسائل کو استعمال نہیں کیا جاتا لیکن ان کی کہانی بھی اناس کی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ ہندوستان میں تو ابھی تک ہماری معیشت ایسی ہی

کہ ہم اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں یا تو خود پیدا کر لیتے ہیں یا اپنے قریب کے مقامات سے حاصل کر لیتے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ میں جہاں تجارت کو بہت ترقی ہوگئی ہے لوگوں کا انحصار ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی پر بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہترین اور مختلف ترین چیزیں روزمرہ ان کے صرف میں آتی رہتی ہیں اور ان کو زندگی کی آسائش اور سہولتیں، عیش اور آرام ہمارے مقابلہ میں بہت زیادہ حاصل ہیں۔

بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ دہلی)

(مضمون نگار صاحب جامعہ کے ابتدائی مدرسہ واقع قرول باغ میں نگراں مدرسہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ سال مدرسہ کی چوتھی جماعت میں بنیادی قومی تعلیم کے نصاب کے مطابق پڑھائی کا تجربہ کیا گیا تھا۔ یہ تجربہ احمد علی صاحب اور ان کے رفقا کی کوششوں سے بہت کامیاب رہا تھا۔ اس سال ابتدائی مدرسہ کی پہلی پانچ جماعتوں میں یہ تجربہ شروع کیا جائے گا۔ احمد علی صاحب کا یہ مضمون اس حیثیت سے خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کا مستحق ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی تجربہ اور عملی کوشش کے نتیجہ پر مبنی ہے ہم دوسرے اہل فکر و تجربہ حضرات کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں مدیر)

بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں حرفوں کے ذریعہ بچہ کی تعلیم اور تربیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لہذا اس اسکیم کے چلانے والوں کے سامنے چند ایسے خیالات اور اصولوں کا ہونا ضروری ہے جو تجربہ پر مبنی ہوں۔ تاکہ ان اصولوں اور خیالات کی روشنی میں کام کرنے والوں کے لئے ایک حد تک آسانی ہو جائے، لیکن جو کچھ میں نے اپنے تجربہ کے دوران میں محسوس کیا ہے اور جس کو میں چند تعلیمی اور نفسیاتی اصولوں کے ماتحت لانا چاہتا ہوں وہ چیز اٹل نہیں ہو سکتی۔ تجربہ کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی لیکن فی الحال جبکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں لوگ ایسے طریقہ سے تعلیم دینے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں چند اصولوں کا سامنے رکھنا ضرور مفید ہوگا۔

"ربط سے کیا مراد ہے؟" "یہ عمل قدرتی طور پر کس طرح واقع ہوتا ہے؟" "یعنی تمام مضامین کی تعلیم حرفہ کے ذریعہ کس طرح ہو سکتی ہے؟" "حرفہ میں کون کون سے ایسے عناصر موجود ہیں جن سے تمام مضامین کی پڑھائی وابستہ کی جا سکتی ہے؟" اس سوال کا جواب میں حرفوں اور دستکاریوں کی مختلف حیثیتوں اور بچہ کے فطری رجحانات اور صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر دوں گا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی بات

پیش کی جائے ہمیں بنیادی قومی تعلیم کی کمیٹی کی ہدایت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ رپورٹ ہماری اس قدر ہدایت کرتی ہے "جو حرفہ انتخاب کیا جائے وہ ماحول کے مطابق ہو" یا دوسری جگہ یہ بیان کیا گیا ہے "جو حرفہ چنا جائے وہ تعلیم کے لئے مناسب ہو، اسے انسان کے ضروری کاموں اور دلچسپیوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہو، اور وہ تعلیم کے پورے نصاب میں پھیلایا جا سکے"۔ اس مختصر سی عبارت سے اس معاملہ کی مکمل طور پر تشریح نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی چند باتیں بالکل صاف طور پر نظر آتی ہیں مثلاً :۔

(الف) حرفہ کا انتخاب ماحول کے مطابق ہو، یعنی مدرسہ اگر ایسی بستی میں ہو جہاں لوگ چمڑے کا کاروبار کرتے ہوں تو وہاں بنیادی حرفہ چمڑے کا کام ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس مدرسہ کے بچوں کو اس حرفہ سے قدرتی لگاؤ ہوگا۔ اور اس قدرتی لگاؤ کی وجہ سے تمام اس تعلیم کا جو اس حرفہ کے ذریعہ دی جائے گی بچہ پر خاطر خواہ اثر مرتب ہوگا اور بچہ بہت دلچسپی سے اس تعلیم میں حصہ لینے پر آمادہ نظر آئے گا، ماحول کے مطابق حرفہ کا انتخاب کرنے میں بچہ کے سماجی اور قدرتی ماحول کی تعلیم میں بھی براہ راست لگاؤ ہوگا۔

(ب) چنے ہوئے حرفہ میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ تعلیم کے پورے نصاب میں پھیلایا جا سکے یعنی اس میں اس قدر نئے اور حقیقی مواقع REAL LIFE SITUATIONS پیدا ہوتے رہنے چاہئیں کہ ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر نصاب کی ساری باتیں سکھائی جا سکیں اس طرح کہ بچوں کی دلچسپی ان میں برابر قائم رہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حرفوں کا جائزہ لیا جائے کہ آیا ان میں اتنی صلاحیت RICHNESS ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں جن حرفوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا جائزہ لینے سے ہمیں ذیل کی چند باتیں خاص طور پر نظر آتی ہیں۔

(۱) ہر حرفہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً لوگوں نے اپنی کس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس کو شروع کیا؟ کہاں شروع کیا؟ ابتدا میں اس کی کیا صورت تھی یعنی کس حالت میں انسانی

ضروریات کے لئے استعمال ہوتا تھا؟ دوسری جگہوں میں اس کا رواج کیسے ہوا؟ کیا دوسری جگہ کے لوگوں نے اس میں کچھ تبدیلی کی؟ یا ویسے ہی اختیار کرلیا۔ اس حرفہ کو بہتر طریقہ پر کرنے کے لئے کب کب کن کن لوگوں نے کیا کیا کوششیں کیں وغیرہ وغیرہ؟ کاغذ بنانا (کاغذ کی ترقی کی تاریخ) ریشم، اون اور روئی کے کپڑے تیار کرنے میں اس قسم کے تمام درجوں سے جن کا تعلق گذشتہ زمانہ کے واقعات اور سماجی اثرات سے ہے گزرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں تاریخی واقعات بیان کرنے میں بالکل قدرتی لگاؤ نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مختلف ممالک کے حالات جاننے کی ضرورت بھی اس حرفہ کا ایک جزلاینفک معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کے پیش نظر ٹریننگ اسکول کے نصاب میں اُن حرفوں کی تاریخی حیثیت پر مشتمل ایک نصاب ہونا چاہیئے جو بنیادی قومی تعلیم کے حرفے نصاب میں دئے ہوئے ہیں۔ حرفوں کے شروع ہونے کے زمانوں اور ان ملکوں کے حالات پر زور دینا چاہیئے جہاں انھوں نے نشو ونما پائی۔ اس نصاب میں ان تمام سماجی اثرات کو بھی شامل کرنا چاہیئے جن کی وجہ سے مختلف حرفے ترقی کرتے کرتے ہمارے سامنے موجودہ صورت میں آئے۔

(۲) مخصوص زمانوں میں بعض حرفوں کو خاص اہمیت رہی ہے لیکن لوگوں کے مذاق کے بدلنے سے اس کی وہ اہمیت نہ رہی۔ اس کے علاوہ کسی دوسری دستکاری نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح اس کا رواج کچھ کم ہوگیا مثلاً کسی زمانہ میں ریشم اور اون کے کپڑے کا رواج تھا۔ لیکن روئی اور بعدہٗ لینن کے کپڑے کے رواج سے ریشم اور اون کے کپڑوں کی وہ اہمیت نہ رہی یہاں بھی ان تاریخی اثرات اور ایجادات کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے جنھوں نے ان تبدیلیوں پر اثر ڈالا۔

(۳) گذشتہ زمانہ میں مختلف حرفوں کی ترقی انھیں مقامات پر ہوتی تھی جہاں ابنائے حکومت سکونت اختیار کرتے تھے۔ لہٰذا مختلف دستکاریوں کے ماہرین کی جماعت وہیں پیدا ہوجاتی تھی جہاں بادشاہ یا راجہ رہا کرتا تھا اور یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اکثر حرفوں کی نشو ونما انھیں شہروں یا

ہیں ہوئی جہاں بادشاہ یا راجہ کی راج دھانی تھی مختلف دستکاریوں نے بادشاہ یا راجہ کے شوق کے لئے کوئی چیز بنائی۔ اگر پسند ہوگئی تو رواج ہوگیا اور دوسرے لوگوں نے بھی برتنا شروع کردیا نہیں تو اس کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ اس قسم کے دستکار اور باہنر بادشاہوں اور امیروں کے لئے مختلف چیزیں تیار کرتے تھے جن میں ان کی تمام ہنرمندی اور قابلیت کا اظہار ہوتا تھا لیکن اب جب سے جمہوری نظام کا دور شروع ہوا ہے وہ تمام حالات بدل گئے ہیں۔ اب کسی حرفہ یا دستکاری کے شروع کرنے اور ترقی دینے کے لئے ابنائے حکومت کے سکونت اختیار کرنے سے زیادہ جغرافی حالات اور عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ایسی چیزوں کا چلن ہوگیا ہے جو عوام کے شوق کو پورا کرتی ہیں۔ ان چیزوں میں اپنے ملک اور پرائے ملکوں کی کتنی ہی چیزیں شامل ہیں۔

(۴) جو لوگ کسی حرفہ یا دستکاری کو اختیار کرچکے ہیں ان کی زندگیوں میں چند مخصوص باتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ان کے رہن سہن، رسم و رواج، زبان اور پہناوے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی شادی بیاہ کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ مخصوص قسم کی تفریحات اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ آپس کے جھگڑے ٹنٹے بھی ان کی اپنی پنچایتوں میں طے ہوجاتے ہیں شلاً دہلی کے کارخندار اور دیگر علیگڈھ کے قفل ساز، بنارس کے گرہست (جو لوگ ریشمی کپڑا بننے کا کام کرتے ہیں) اور بہار کے مومن بھائی اپنی مخصوص زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۵) حرفہ اور دستکاری میں استعمال ہونے والی چیزیں کچھ تو اپنے ملک میں دستیاب ہوتی ہیں اور کچھ باہر سے آتی ہیں۔ خام اشیار کے لئے خواہ وہ باہر سے آتی ہیں یا اپنے ملک میں دستیاب ہوتی ہیں مخصوص جغرافیائی حالات کے جاننے کی ضرورت ہے جن کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بنی بنائی چیزیں مثلاً اوزار اور دوسرے سامان وہاں کیوں تیار ہوتے ہیں؟ وہاں کیا کیا سہولتیں ہیں؟ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچایا جاتا ہے؟

(۶) حرفہ یا دستکاری کے لئے مختلف چیزیں خریدنے کے لئے بازار جانا، مختلف دکانوں

پرچیزیں دیکھنا قیمتیں معلوم کرنا قیمتوں کا موازنہ کرنا۔ نرخ کا نوٹ کرنا اور اپنے کام کے لئے چیزیں خریدنے سے لین دین کی مشق ہوتی ہے۔ پھر ان سے کوئی چیز تیار کرنا اور مقابلہ کا خیال کرتے ہوئے بازار میں ان کو فروخت کرنا یا خود اپنے مدرسہ میں دکان کھولنا اور وہاں یہ چیزیں فروخت کرنا حساب کے لئے پورا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔

(۱) مختلف حرفوں اور دستکاریوں میں خوشنمائی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے مصوری کا موقع آتا ہے چیزوں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے آرٹ سے خاطر خواہ مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے یہ ذوق عام دستکاروں میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ آرٹ اور ہنر نے ہندوستان میں مختلف حیثیتوں سے گزشتہ زمانہ میں خاصی ترقی کی۔ لیکن اب وہ تمام باتیں یادگار ماضی کے طور پر مختلف صحیفوں، عمارتوں اور عجائب خانوں میں تو موجود ہیں پر مختلف ہنرمندوں کے کام میں اس کا کوئی نقشہ نظر نہیں آتا۔ اور اگر کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نقشہ نظر بھی آتا ہے تو لوگوں کے مذاق نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور اس کی جگہ باہر کے آرٹ نے لے لی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے ملک کے صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہو کر باہر والوں کی نقل کرنا شروع کر دی ہے۔ جس کی شکل مسخ ہو کر اس قدر بھونڈی ہو گئی ہے کہ مذاق سلیم رکھنے والوں کو اپنے صناعوں اور کاریگروں میں کچھ دلچسپی نہیں رہی۔ اس تبدیلی کا مطالعہ تاریخی اعتبار سے بہت سی باتوں کو ہمارے سامنے پیش کرنے کا موقع دے سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کا آرٹ بہت پرانا ہے۔ یہاں کے آرٹ کو یہاں کی تاریخ سے خاصہ لگاؤ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس مطالعہ میں ہم اس زمانہ کی زندگی کا حال بھی پیش کرسکیں گے اس لئے کہ کسی زمانہ کا آرٹ اس زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

(۸) مختلف دستکاریوں اور حرفوں کو ترقی دینے کے لئے مختلف لوگوں، انجمنوں اور حکومت کی کوششوں کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ حرفہ میں اس قدر گوناگونی اور رنگینی ہے کہ وہ بنیادی قومی تعلیم کے پورے نصاب میں آسانی کے ساتھ پھیلایا جاسکتا ہے۔ اس میں زبان، مضمون نگاری، حساب، تاریخ، جغرافیہ، سماج کا علم اور ڈرائنگ کی بہت سی باتیں بتلائی جاسکتی ہیں اس میں ایسے عناصر اور ایسی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں کہ وہ ہر ایک مضمون کی تعلیم کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد اب ہمیں مضامین کے حرفوں سے ربط کو بچوں کی فطرتی صلاحیتوں اور ان کے رجحانات کو مدنظر رکھ کر بھی دیکھنا چاہیئے۔ ربط کے معنی ہیں تعلق یا لگاؤ، تعلق یا لگاؤ دور کا بھی ہوسکتا ہے اور قریب کا بھی۔ صاف اور صریح بھی ہوسکتا ہے، مبہم اور مشکوک بھی۔ لیکن کسی حرفہ میں جب ہم مربوط پڑھائی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ لگاؤ اور تعلق اس قدر فرق کے ساتھ نظر نہیں آتے اس لئے کہ بچوں کی عملی کام سے دلچسپی ان کے لئے ایسی ضرورت پیدا کر دیتی ہے کہ تمام قسم کے تعلقات میں اس قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بلکہ کام اس طرح انجام پاتا ہے کہ دور اور قریب، صاف اور مبہم تعلقات ایک سلسلہ کی کڑی بنتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچہ جب ایک کام ختم کر کے دوسرا کام شروع کرتا ہے یا جب ایک بات کے علم ہونے پر دوسری بات سیکھتا ہے تو اس کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ سیکھ رہا ہے یا پڑھ رہا ہے اس کا حرفہ سے دور کا یا قریب کا تعلق ہے، اس کے علاوہ کسی حرفہ پر کام کراتے وقت کام کی نوعیت اس طرح بدلتی رہتی ہے اور بچہ کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت ایسے مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہے کہ مربوط پڑھائی کو اس نظر سے دیکھنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، مثلاً بچے لیئی سے ابری بناتے ہیں تو استاد بچوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ابری میں کچھ بنانا بھی چاہیئے۔ بچے مختلف تجویزیں پیش کرتے ہیں جو لکھ لی جاتی ہیں اور ہر بچہ بھی انھیں نوٹ کر لیتا ہے، اس طرح جب بچے ابری بناتے ہیں تو اپنی سوچی ہوئی چیزیں ابری پر بناتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خوشنما ہو جائے۔ اس کام میں بچہ کی انفرادی کوشش، سوجھ بوجھ، اور اپنے سابقہ تجربہ کو استعمال کرنے کا کافی موقع مل جاتا ہے ہر بچہ اپنے طور پر سوچی ہوئی چیزیں لئی اور رنگ لگانے کے بعد اس پر بناتا ہے، کوئی بچہ پتے سے نقش بناتا ہے کوئی پھول سے اس میں کوئی چیز بناتا ہے۔ کوئی

انگلی سے کوئی تصویریں بنا دیتا ہے، کوئی برش سے سینری بناتا ہے۔ غرض کہ ہر ایک اپنی طبیعت کے مطابق کوئی نہ کوئی نئی چیز بناتا ہے اور انفرادیت کو نشو و نما ملنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ بچوں کی رنگ برنگ کی بنی ہوئی اس قسم کی چیزوں سے کئی ایک باتیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور پڑھائی کے مواد کے لیے بہترین مواقع مل سکتے ہیں ممکن ہے کہ بچہ استاد کا یا اپنے کسی ساتھی کا شروع شروع میں سہارا لے اور نقل سے کوئی چیز بنائے لیکن رفتہ رفتہ ہمت دلانے سے وہ ابری پر اپنی طبیعت سے بھی چیزیں بنائے گا۔

کام جب اس ڈھنگ سے کرایا جا رہا ہو تو تعلیم کا اثر بغیر اس حساب کے مرتب ہوتا ہے کہ اب فلاں مضمون پڑھایا جا رہا ہے اور اب فلاں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک بات دوسری بات سے اس طرح وابستہ ہوتی چلی جاتی ہے کہ یہ کہنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ فلاں مضمون کے مربوط کرنے میں کھینچا تانی کی گئی ہے اور بعض مرتبہ کام کراتے کراتے خود بخود ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً بچے تیل سے ابری تیار کر رہے تھے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر بچہ کی ابری بننے کے بعد پہچانی جا سکے۔ یہ مشکل اس طرح بھی حل ہو سکتی تھی کہ کاغذ کی پشت پر ہر بچہ کا نام پنسل یا روشنائی سے لکھ دیا جاتا لیکن اس طرح کرنے سے نہ کوئی نیا پن ہوتا اور نہ کوئی خوبی، لہٰذا استاد نے ہر بچہ کا نام بڑی احتیاط سے کاغذ پر کاٹ کر اس کاغذ پر لگایا جس پر ابری بننے والی تھی اب ہر بچہ اس بات کا بڑے غور سے مشاہدہ کر رہا تھا کہ جب رنگ پر کاغذ ڈالا جائے گا تو نام کیسے بنے گا؟ ہر بچہ کی توجہ اس کام کی طرف تھی، اگر ایک بچہ دوسرے بچہ کو ذرا بھی ہٹاتا تو وہ فوراً بھوں چڑھا کر اس کو گھورتا یا استاد سے شکایت کرتا۔ عملی کام میں بچوں کی دماغی یکسوئی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، یہاں ہر بچہ مشتاق تھا کہ یہ کام کیسے ہوتا ہے؟ پہلے استاد نے ایک کاغذ پانی پر ڈالا اور اٹھا لیا، بچے کے نام پر بھی رنگ آ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن جب استاد نے نام کا پرچہ کاغذ سے ہٹایا تو نام کی جگہ خالی رہ گئی اور چاروں طرف ابری کی رنگینی میں بچہ کا نام رنگ نہ لگنے کی وجہ سے صاف پڑھا جانے لگا جس بچہ کا وہ نام تھا وہ پڑھ بھی سکتا تھا۔ پڑھائی کی ابتدا کے لئے

اس لئے کہ ہر بچہ آرزومند تھا کہ
یہ پہلا قدم تھا جو بغیر اس احسان کے اٹھا کہ بچہ اب پڑھنا سیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر بچہ آرزومند تھا کہ
اس کی ابری پر اس کا نام ہو' لیکن جب تک وہ پڑھ نہ سکتا ہو وہ کیسے معلوم کرے گا کہ اس کی ابری پر کیا
نام لکھا ہوا ہے؟ اب وہ پڑھنا سیکھنا چاہتا ہے۔ جس میں اس کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے' آپ
کہیں گے کہ یہ تو دور کا لگاؤ ہے' لیکن استاد نے کام کی نوعیت ایسی بدل دی ہے کہ لگاؤ بالکل قریبی
اور بدیہی ہو گیا ہے۔ آپ اس کام میں جملے اور الفاظ کے پڑھانے کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں' ایک جملہ
کاغذ پر لکھ کر کاٹ لیجیے! "حامد کی ابری لال ہے" اس کو اس کاغذ پر لگا دیجیے جس پر ابری بننے
والی ہے' اب اس کو کشتی میں ڈال کر اٹھا لیجیے' اس جملہ کے الفاظ پر بھی رنگ آ جائے گا' لیکن آپ
پورا جملہ کاغذ پر سے علیحدہ کر لیجیے' جو جگہ خالی اور سادہ رہ جائے گی۔ وہاں یہ جملہ صاف پڑھا جائے گا
ہر بچہ سو فی صدی توجہ سے اس جملہ کو پڑھے گا' اگر آپ کام کی نوعیت کو بدلتے رہیں تو بچوں کی
دلچسپی بہت عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے' مثلاً آپ اس قسم کی ابری جس پر کوئی جملہ لکھا ہوا ہو ان کو
گھر پہنچا دیں بچے بڑی خوشی سے لے جائیں گے' اور اپنے والدین کو اور دوسرے لوگوں کو
دکھائیں گے' ایک تو اس خیال سے کہ انھوں نے اس کو خود بنایا ہے' دوسرے اس لئے کہ
اس پر جو جملہ لکھا ہوا ہے اس کو پڑھ بھی سکتے ہیں' اگر آپ بچہ کی اس میں صحیح طریقہ پر رہنمائی کریں
تو بچے اس خیال سے کہ اگر کوئی گھر پر پوچھے کہ یہ کیا لکھا ہے؟ بڑی توجہ اور دھیان سے جملہ کو پڑھنے
کی طرف مائل رہیں گے' وہ اس کام کو ایک بڑے مقصد کے ماتحت کریں گے اور وہ یہ نہ چاہیں گے
کہ جملہ نہ پڑھنے سے ان کی سبکی ہو۔ کیا یہ اس تعلیم کا بہترین اثر نہیں ہے کہ اس تعلیم کا اثر بچے اپنے
گھروں تک لے جاتے ہیں اور اس سے والدین اور سرپرستوں کو بھی باخبر رکھتے ہیں؟
عملی کام میں جب آپ بچوں کی اپج اور سوجھ بوجھ کو پنپنے کا خاطر خواہ موقع دیں گے تو ان کی
نئی نئی تجویزیں مضامین کو مربوط کرنے کے لئے نئی نئی راہیں پیدا کر دیں گی لیکن اگر آپ منطقی ترتیب
کے ساتھ ایک بات کے بعد دوسری بات کے پیش کرنے کا اہتمام کریں گے تو بہت جلد آپ کی
گاڑی رک جائے گی۔ ایک دفعہ چوتھی جماعت کے بچے لفافہ بنانے کے لئے لیئی تیار کر رہے تھے

ایک بچہ نے پوچھا کہ لیپئی میں نیلا تھوتھا کیوں ملاتے ہیں؟ بچوں نے مختلف جوابات دئے۔ استاد نے کہا کہ دونوں قسم کی لیپئی بنائیں اور تجربہ کریں، بچوں نے دونوں قسم کی لیپئی بنائی، استاد نے تھوڑی تھوڑی لیپئی ہر ایک قسم میں سے لے کر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر رکھ دی، جس لیپئی میں نیلا تھوتھا نہیں ملا ہوا تھا اس پر بے شمار مکھیاں آکر جمع ہو گئی تھیں لیکن جس لیپئی میں نیلا تھوتھا ملا ہوا تھا اس کے قریب بہت کم مکھیاں آتی تھیں، استاد نے بچوں کو اس تجربہ کے بعد بتلایا کہ نیلا تھوتھا زہر ہے اور اس کے ملانے سے کھیاں نہیں آتیں، اس کے علاوہ جس کتاب کی جلد ایسی لیپئی سے بنائی جاتی ہے اس کو چوہے نہیں کترتے، نیلے تھوتھے کی لیپئی سوکھ جائے گی لیکن خراب نہ ہوگی برخلاف اس کے بغیر نیلے تھوتھے کی لیپئی سڑ کر خراب ہو جائے گی۔ یہ بات اس قدر سادہ ہے لیکن پھر بھی اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔ جب یہ تجربہ ہو رہا تھا تو ایک لڑکے نے پوچھا کہ ماسٹر صاحب پیتل کی دیگچیوں میں بھی نیلے تھوتھے سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ استاد نے بتلایا کہ اس کو "کس" کہتے ہیں، جس برتن میں کس ہو اس میں نہ کھانا کھانا چاہیئے اور نہ کھانا پکانا چاہیئے، اس لئے کہ اس میں بھی نیلے تھوتھے کا سا زہر ہوتا ہے۔ جو صحت اور تندرستی کے لئے مضر ہے۔ ایسے تمام برتنوں کی قلعی کرا لینی چاہیئے۔ اس تفصیل میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اگر یہ کہوں کہ صحت اور صفائی کے اصولوں پر بہت اچھا سبق پڑھایا گیا تو لوگ اس کے متعلق بھی یہی کہیں گے کہ یہ تو بہت دور کا تعلق اور لگاؤ ہو گیا لیکن بچوں کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت کو آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اور جب وہ اپنی اس عادت کی وجہ سے آپ کو سکھانے کا موقع دیتے ہیں تو آپ محض اس خیال سے کہ وہ بیکار ربط ہوتا ہے کیا انھیں سیکھنے سے باز رکھیں گے؟

بچوں کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت اور اس کا اپنا سابقہ تجربہ کسی بڑے کام کے کرتے وقت کئی چھوٹے چھوٹے کاموں کے شروع کرنے کا موقع دیں گے۔ جیسا کہ اوپر کی مثال میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے بامقصد کاموں کو اس طرح چلانا چاہیئے کہ وہ اس بڑے کام پر حاوی نہ ہو جائیں، اس چھوٹے بامقصد کام کو اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے ہی استعمال کرنا چاہیئے۔

مثلاً بڑا کام کارڈ بورڈ اور کاغذ سے چیزیں بنانا ہے اور لیبل بنانا اس بڑے کام کے ضمن میں کرایا جاتا ہے یا کاغذ اور کارڈ بورڈ کے کارخانوں کا مشاہدہ بھی ضمنی کام ہے، اس قسم کے تمام ضمنی کام اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں لیکن اگر استاد نے ہوشیاری سے بچوں کی رہنمائی نہ کی تو اس قسم کے چھوٹے چھوٹے کام بذات خود مقصد بن جائیں گے اور کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کا کام پس پشت جا پڑے گا۔ اس قسم کے ضمنی کاموں میں ان مضامین کو مربوط کرکے پڑھانا چاہیئے جو بڑے کام MAJOR PROJECT میں شامل کئے جانے سے رہ گئے ہیں۔

کسی بڑے کام MAJOR PROJECT کرانے کے دوران میں مندرجہ ذیل چھوٹے چھوٹے کام یا ضمنی کام MINOR PROJECTS نکل سکتے ہیں جن میں مختلف مضامین شامل کرنے کا اتنا ہی موقع ہو سکتا ہے جتنا اصل پراجیکٹ پر اور ان کاموں کے کرنے کے لئے بچے کھلے دل سے آمادگی ظاہر کریں گے بلکہ اکثر صورتوں میں ان کاموں کے کرنے کے لئے بچوں ہی کی طرف سے تجویزیں آئیں گی۔

(۱) جو کام ہم کرنے والے ہیں اس کام کے کرنے والوں کا مشاہدہ کرنا کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور کیا کیا چیزیں بناتے ہیں۔

(۲) مختلف چیزیں خریدنے کے سلسلہ میں مختلف دکانوں پر جا کر لین دین نرخ اور چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا

(۳) دکان اور بینک چلانا، (۵) نمائش کرنا

(۴) کوئی ڈرامہ کرنا (۶) کسی تہوار یا میلے کے موقع پر اپنی چیزیں بیچنے کے لئے لے جانا

(۷) مختلف پیداواروں کا مشاہدہ کرنے کے لئے گاؤں میں جانا۔

(۸) گاؤں کا مشاہدہ کرنا اور گاؤں کے لئے مفید کام کرنا۔

ان کاموں کو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے جاری رکھنا چاہیئے، بچوں کی رہنمائی اس طرح کرنی چاہیئے کہ وہ خوشی سے ان کاموں کا انتخاب کرلیں، ان کاموں کا مشاہدہ کرنے کے لئے

انھیں کی طرف سے تجویزیں آنی چاہیئیں۔ اس لئے کہ ان تجویزوں کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کریں گے اور ان کی تجویزوں کی تکمیل کے لئے جو کچھ کام ہوگا وہ بہت سے مضامین کے پڑھانے کے لئے خود بخود دروازے کھول دے گا۔

ملکیت ذاتی

ملکیت ذاتی کی ابتدا | عہد جدید کی معاشی زندگی کی بنیاد ملکیت ذاتی پر قائم ہے۔ ملکیت ذاتی کا تخیل ہمارے ذہنوں میں اس قدر پیوست ہوگیا ہے کہ ہم ملکیت ذاتی کے حق کو ایک طبعی حق سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن ملکیت ذاتی کا ارتقا اور تمام دوسرے معاشی اداروں کی طرح آہستہ آہستہ ایک طویل مدت کے گذرنے کے بعد ہوا ہے۔ یہ ایک اضافی چیز ہے مجرد اور قطعی نہیں ہے۔

معاشرت کی ابتدائی منزلوں میں ملکیت ذاتی کا تخیل نہیں پایا جاتا۔ ابتدائی انسان بندروں کی طرح اپنی غذا کو چھین جھپٹ کر حاصل کرتا تھا اور جن چیزوں کو اس طرح حاصل کرتا تھا ان کو فوراً ہی صرف کر ڈالتا تھا۔ جب اس نے مستقبل کا خیال کرنا شروع کیا اور دوسرے جانوروں کی طرح غذا کے ذخیرے کو اکٹھا کرنے لگا تب بھی یہ اشیا اس کے قبضہ میں اس وقت تک رہ سکتی تھیں جب تک کسی دوسرے زیادہ طاقتور وحشی انسان سے اس کو سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے عارضی قبضہ تو ہوتا تھا لیکن ملکیت کا کوئی مسلمہ حق موجود نہیں تھا۔ جب ملکیت کا نہایت ابتدائی تخیل پیدا ہوا تو وہ جماعتی تھا ذاتی اور انفرادی نہیں تھا۔ انسانی گروہ غذا کی تلاش میں جگہ بہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے اور اپنی اس آوارہ گردی میں بعض علاقوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھ لگتے تھے اور ان میں دوسرے وحشی انسانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے اس طرح جماعتی ملکیت پیدا ہو جاتی تھی۔ قبضہ اور استعمال نے ملکیت کا بیج بویا۔ لیکن یہ استعمال جماعتی تھا۔ انفرادی نہیں تھا۔ غذا حاصل کرنے کے لئے عام طور پر متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی تھی اور گروہ کے نمائندے بعض مقررہ اصولوں کے مطابق غذا کو افراد کے مابین تقسیم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ مذہبی اشیا بھی مثلاً مقدس پتھروں اور چڑیوں کے پروں کی حفاظت بھی کل جماعت کی طرف سے ہنا کی جاتی تھی۔

سب سے پہلے ملکیت ذاتی زیوروں اور لباس کی مختصر اشیا میں پیدا ہوئی۔ انھیں بالکل ابتدا سے ایک فرد کی شخصیت کا لازمی جزو سمجھا گیا ملکیت ذاتی کی طرف دوسرا قدم اس وقت اٹھایا گیا۔ جب تمام ذخیرہ سے کچھ ہتھیار الگ کر لیے گئے اور انھیں گروہ کے کسی غیر معمولی بہادر رکن کے ساتھ وابستہ کیا جانے لگا زیوروں کی طرح ان ہتھیاروں میں بھی ایک فرد کی شخصیت کا عکس دیکھا جانے لگا اور جب وہ مرتا تھا تو اس لاش کے ساتھ اس کے یہ ہتھیار بھی دفن کر دیے جاتے تھے۔ جب تہذیب اور زیادہ اونچی منزل پر پہنچی تو نقل پذیر جھونپڑے یا خیمے اور اوزاروں اور برتنوں کے مختصر ذخیرے بھی افراد کی ملکیت میں شامل ہونے لگے۔ لیکن ابھی تک ذاتی ملکیت کی تفریق بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ اس کی معاشیاتی اہمیت بہت کم تھی اور ملکیت کے اجتماع کی خواہش مفقود تھی۔ ایک محدود حد کے بعد زیادہ زیورات کو ایک بوجھ اور زیادہ اوزاروں اور ہتھیاروں کو بے کار سمجھا جاتا تھا۔ معاشی زندگی میں افراد کے مقابلہ میں جماعتی کوششوں کو ابھی تک بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

جب جانوروں کو پالنا شروع کیا گیا تو اس کے ساتھ ملکیت ذاتی نے بھی نمایاں طور پر ترقی کرنا شروع کر دی۔ جب گلوں کو محفوظ رکھنے کا علم لوگوں کو حاصل ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ ان کے لئے یہ بھی ممکن ہوا کہ اپنی زندگی کو کم از کم ایک مختصر حد تک جماعت سے جدا سمجھ سکیں اور انھوں نے جماعت سے آزاد ہو کر اپنی ذات اور اپنے متعلقین کے واسطے فراغت اور خوش حالی حاصل کرنے کے لئے آزادی کے ساتھ اپنی قوتوں کو کام میں لانا شروع کر دیا۔ ملکیت ذاتی کو اب روز بروز زیادہ اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے ابوی خاندان پیدا ہوا اور اس نے غریب اور امیر کے فرق کو پیدا کر دیا۔ دولت میں اب جانوروں کے گلے شامل ہونے لگے۔ زیورات اور خزانہ کی اب محض ان کے ذاتی افادہ کی وجہ سے ہی قدر نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ان کے معاوضہ میں زن و دھن حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ابتدائی دولت مویشی ہوا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اس بڑھتی ہوئی دولت کی حفاظت کے لئے انسانی متعلقین کی بھی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

چنانچہ ابوی خاندان کے مکھیا کے بچے اور بیویاں اس کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی تھیں اور جہاں ان کی تعداد ناکافی ہوتی تھی وہاں غلامی شروع کر دی گئی اور غلام بہت جلد خاندان کا ایک نہایت اہم عنصر بن گیا۔ لیکن ابھی تک زمین پر قبضہ شروع نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ گلہ بان موسمی حالات کے تغیر کے ساتھ چراگاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوما کرتے تھے اور قبائلی رواجوں کا اثر ابھی تک اتنا مضبوط تھا کہ عام علاقہ کے زیادہ پسندیدہ علاقوں پر انفرادی قبضہ کا سدباب کیا جا سکتا تھا۔

اس بیان سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اول تو یہ کہ ایک عرصہ تک ملکیت ذاتی صرف انتقال پذیر اشیاء یعنی جانوروں، انسانوں اور ذاتی سامان پر مشتمل رہی۔ جو جماعت مسلسل گردش کرتی رہتی ہے اس کے درمیان ناقابل انتقال اشیاء کی ملکیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ ملکیت ذاتی کی ابتدا قبضہ مخالفانہ اور استعمال سے ہوئی اور دولت کے اجتماع کی شروعات اکثر صورتوں میں جبر اور ڈکیتی کے ذریعہ ہوئی ہے۔ لیکن کل جماعت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس قسم کا خودغرضانہ اجتماع بھی جماعتی مرفہ الحالی کے لئے ضروری معلوم ہو گا۔ اس سے نہ صرف دولت کی پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ تہذیب کو بھی ترقی ہوتی ہے۔ شکاریوں کے گروہ کے مقابلہ میں گلہ بانی کرنے والے قبیلوں کی زندگی اخلاقی حیثیت سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔ ملکیت ذاتی کے پیدا ہو جانے سے جہاں انسانی فطرت میں بعض بہت سی ناپسندیدہ خصوصیات ترقی پا جاتی ہیں وہاں اس سے کفایت شعاری، عاقبت اندیشی، پس اندازی تیزی سنجیدگی اور سمجھ داری کی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں جن کے بغیر کوئی مستقل ترقی ہرگز ممکن نہیں ہے ملکیت انفرادی ہوتی جا رہی تھی لیکن چونکہ فرد پر ابھی تک گروہ کی بڑی حد تک نگرانی تھی اس لئے ملکیت ذاتی کو تسلیم کرانے والی طاقت ابھی تک جماعتی فائدہ کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرد کو ملکیت ذاتی سے فائدہ اٹھانے کا حق اس لئے ملا ہوا تھا کہ اس سے بصورت مجموعی جماعت کا مفاد پورا ہوتا تھا۔ اس لئے ابتدا سے ہی اس برائی کے ساتھ بھلائی لگی ہوئی تھی۔ ابتدا میں ملکیت ذاتی کے ساتھ جو تشدد لازمی طور پر موجود تھا اسی سے ایک پائدار معاشرت کا نظم و انتظام پیدا ہوا۔

زمین میں ملکیت ذاتی کا ارتقا دوسرا قدم اس وقت اٹھایا گیا جب زراعتی منزل پیدا ہوئی۔ اس کے دو اہم نتائج ہوئے اول تو اس کی وجہ سے غلامی کو بہت ترقی ہوئی کیونکہ زمین کو نفع بخش طریقہ پر جوتنے کے لئے محنت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جبری اور مفت محنت سے قدرتی طور پر مالک کے منافع میں اضافہ ہونے لگا اور خاص حالات میں زراعت کی ترقی کے معنی غلاموں کی ملکیت کی ترقی کے مترادف ہو گئے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر منقولہ اشیاء میں بھی ملکیت ذاتی پیدا ہونے لگی۔ جب ابتدائی عارضی رہنے کی جگہوں کی بجائے مستقل بستیاں آباد ہونے لگیں تو زیادہ پائدار مکانوں کی ضرورت اور ان کا فائدہ ظاہر ہونے لگا۔ گو مکانوں میں ملکیت ذاتی پیدا ہو جانے سے مکان کے اندر ذاتی سامان بھی بڑے پیمانہ پر اکٹھا کیا جانے لگا اور دولت کا یہ اجتماع زراعت کی آمدنی کی وجہ سے جو گلہ بانی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی تھی ممکن ہو سکا مگر مکانوں کے مقابلہ میں زراعتی زمین میں ملکیت آہستہ آہستہ پیدا ہوئی بعض صورتوں میں جہاں جغرافیائی اور موسمی حالات کی وجہ سے گلہ بانوں کے گروہ کے لئے زمین سے روزی حاصل کرنا مشکل تھا جیسے ناروے میں اور جہاں منظم ڈاکوؤں کے حملہ کا خوف بھی کم تھا افراد نے کسانوں کی حیثیت سے زندگی شروع کر دی اور ہر شخص تنہا رہنے اور جس قدر زمین کی ضرورت تھی اس پر قبضہ کرنے لگا۔ استعمال کا حق بہت جلد ملکیت میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح جب نئی نو آبادیوں میں ایسی جماعتوں کی شاخیں جا کر بسنے لگیں جنھیں زراعت سے خوب واقفیت تھی جیسے امریکہ میں تو وہ اپنے ہمراہ زمین کی ملکیت ذاتی اور جداگانہ رقبہ کاشت کے رواج کو بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن اکثر ایسی جگہوں میں جہاں مویشی چرانے والے لوگ ترقی پا کر کسان بنے جماعتی رواج نہایت آہستہ آہستہ ختم ہو سکے جس طرح خانہ بدوشوں کے گروہ اپنے خیمے ایک جگہ اکٹھے لگایا کرتے تھے اور اپنے مویشیوں کو ساتھ ساتھ چرنے دیا کرتے تھے اسی طرح گاؤں کے مکان بھی اکٹھے بنائے گئے اور ملحقہ رقبہ میں کاشت کے لئے جداگانہ ٹکڑے صرف عارضی طور پر کاشتکاروں کو دیئے جاتے تھے مختلف حیثیت کے

ان عارضی عطیوں نے جلد ہی مستقل قبضہ کی شکل اختیار کرلی اگرچہ ان کا استعمال کا طریقہ جماعتی ضرورتوں کا پابند ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جب آبادی بڑھی اور مقبوضہ زمین کو تقسیم کیا جانے لگا تو مختلف حیثیت کی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے گئے اور ایک ہی آدمی کے پاس بہت سے کھیت مزروعہ رقبہ کے مختلف حصوں میں پائے جانے لگے اور ان ملے جلے کھیت کے ٹکڑوں کو مناسب طریقہ پر کاشت کرنے کے لئے ضروری ہوگیا کہ بہت سے جماعتی قاعدے بنائے جائیں۔ یہ کھیت کے ٹکڑے اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ ان کے گرد باڑھ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ کاشت کے اس طریقہ کو کھلے کھیتوں کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی ایک آدمی کے لئے یہ انتظام رکھنا بہت مشکل تھا کہ اس کی مویشی چرتے چرتے دوسروں کے کھیت میں نہ پہنچ جائیں گے اس لئے بڑے رقبہ کی ایک ہی طرح پر کاشت کی جاتی تھی۔ پھر اس سے نتائج بھی اچھے پیدا ہوتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطےٰ کی دیہی جماعت یعنی مارک کی بنیاد متحدہ کاشت پر قائم تھی اور ابتدائی زمانے کی جماعتی ملکیت نہ صرف جنگلوں میں باقی رہی جن کا کچھ پابندیوں کے ساتھ استعمال کرنے کا حق جماعت کے ہر رکن کو حاصل ہوتا تھا بلکہ چراگاہوں میں بھی جہاں ہر شخص کو اپنے مویشی کے چرانے کا حق حاصل ہوتا تھا باقی رہی اور مزروعہ زمین میں بھی باقی رہی جس کے استعمال کا حق فصل کی کٹائی کے بعد پوری جماعت کو مل جاتا تھا۔

جب زمین میں اس قسم کی ملکیت ذاتی کو ترقی ہو رہی تھی ایک دوسرا عنصر بھی کام کر رہا تھا اور یہ چیز اندرونی نہیں بلکہ خارجی تھی۔ جب فاتح قبائل نے علاقوں کو چھین لیتے تھے تو یہ بات ان کے لئے نہایت زیادہ اہمیت اختیار کرلیتی تھی کہ اپنے زراعتی مقبوضات کی حفاظت کریں اور یہ خدمت فوجی سرداروں کو سپرد کی جاتی تھی جو اکثر سب سے زیادہ مال دار گلوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ زراعت کے پیشہ کو اختیار کرلینے کے بعد ذاتی اور قبائلی تعلقات کی جگہ ملکی اور سیاسی تعلقات نے لے لی۔ بالفاظ دیگر ریاست پیدا ہوئی اور مقامی تقسیمیں اور اضلاع جاگیرداروں کی نگرانی میں دے دئے گئے۔ کاشتکار یا باجگزار چاہے وہ افراد ہوں یا گروہ اب اپنی زراعتی

آمدنیوں کا ایک حصہ تحفظ کی قیمت کے طور پر ادا کرنے لگے اور ضلع پر فوجی سردار کے عسکری قبضہ نے جلد ہی ملکیت ذاتی کی شکل اختیار کر لی۔ مارکوئیس ابتداءیں" مارچ" کے محافظ کو کہتے تھے کاشتکار کے حقوق مالکانہ کو جاگیردار کے حقوق کے ماتحت سمجھا جانے لگا اور اس طرح جاگیرداری نظام پیدا ہوا جس میں مینر کے مالک کو بہت زیادہ اقتدار حاصل ہوتا تھا اور اس کے ماتحت درجہ بدرجہ معاشری تعلقات کا ایک پورا نظام بن جاتا تھا۔

بعض صورتوں میں کاشتکاروں کے ابتدائی حقوق زائل ہو گئے اور ان کی حیثیت محض پٹہ داروں کی ہو گئی جنھیں کسی قسم کے حقوق مالکانہ ملے ہوئے نہیں تھے اور دوسری صورتوں میں انھوں نے رفتہ رفتہ لگان اور دوسرے جاگیردارانہ نذرانوں سے خود کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید طریقوں کے اثر سے مشترکہ کاشت کا سلسلہ بھی ختم ہونے لگا اور انفرادی کاشت کو شروع کیا گیا اور اس طرح یورپ کے ملکوں کی خود کاشت زمینداریاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ زمین یا تو زمیندار کی یا کاشتکار کی انفرادی ملکیت بن گئی یہاں تک کہ صنعتی سرمایہ کی ترقی کے زمانے میں جائداد غیر منقولہ کو وہی حیثیت دے دی گئی جو جائداد ذاتی کو حاصل تھی امریکہ اور یورپ کے بہت سے حصوں میں آج کل زمین اتنی ہی سہولت سے خریدی اور فروخت کی جاتی ہے جیسے اور تمام دوسرے سامان۔

یہاں بھی ہمیں ملکیت ذاتی کا انحصار جماعت کی اجازت پر منحصر معلوم ہوتا ہے مویشی کے گلوں کی طرح زمین پر ملکیت ذاتی کی ابتدا بھی جبر اور دھوکے سے ہوئی ہے لیکن پہلی صورت کی طرح اس صورت میں بھی جماعت کو بصورت مجموعی اس سے فائدہ پہنچا۔ جاگیردار کی ملکیت ذاتی سے امن و اطمینان پیدا ہوا جس کا موجود ہونا پیداوار کے اضافہ کے لیے لازمی شرط ہے ——

—— زمین میں ملکیت ذاتی کا پیدا ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ انفرادی عمل کے جماعتی فائدہ کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ جب تک مشترکہ کاشت سے کھیتوں کا بہترین استعمال کیا جاتا رہا اسی نظام کو اہمیت حاصل رہی لیکن جب جدید عہد میں زمین پر سرمایہ لگانے سے

عمیق کاشت کا امکان پیدا ہوا تو انفرادی طریقہ کے فواید نمایاں ہونے لگے۔ پرانے مشترکہ یا کھلے ہوئے کھیتوں کی حلقہ بندی کی گئی اور زمینداروں نے جو مشترکہ کاشت کی پابندیوں سے آزاد ہوگئے تھے اپنے قطع زمین کو بہترین طریقہ پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ زمین پر ملکیت ذاتی اس بنا پر انتہائی عروج کو پہنچ گئی کہ اس کے ساتھ استعمال کی انفرادی آزادی بھی وابستہ تھی۔

زراعت میں زیادہ منافع پیداوار کے اضافہ کی وجہ سے حاصل کیا جانے لگا۔ چنانچہ یہاں بھی ملکیت ذاتی سے آخر میں جماعت کو فائدہ پہنچا۔ جائداد غیر منقولہ جائداد منقولہ کی طرح اس لئے ملکیت ذاتی بن گئی کہ جماعت نے انفرادی ملکیت کے فوائد کو تسلیم کرلیا۔

ملکیت ذاتی کے متعلق نظریے | جو کچھ ابھی کہا گیا ہے اس سے دو نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں اول یہ کہ ملکیت ذاتی کی وجہ جواز اس کا جماعتی فائدہ ہے اور دوسرے یہ کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کو ہمیشہ جماعتی نتائج کا پابند ہونا چاہیئے۔

بعض رومی مصنفوں کے یہاں ملکیت ذاتی کا جو سب سے پہلا نظریہ ملتا ہے وہ قبضہ کا نظریہ ہے۔ مگر یہ اصول کہ ملکیت کا حقدار وہی شخص ہے جو سب سے پہلے اس پر قبضہ کرتا ہے ترقی کی ابتدائی منازل میں تو شاید ٹھیک ہو سکتا ہے چونکہ جہاں کسی شخص کو جائداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہاں ایک نو وارد کے اس قسم کے دعوے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جہاں مال کے مالک کا پتہ نہیں چلتا وہاں جس خوش نصیب کو مال پڑا ہوا ملتا ہے اسی کو وہ سپرد کردیا جاتا ہے لیکن جہاں جائداد سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں وہاں قبضہ اور تسلط کے حق کو پیش کرنے سے انصاف کے نظریہ کی نہیں بلکہ جبر و تشدد کے نظریہ کی حمایت ہوتی ہے۔ قبضہ کے نظریہ سے ممکن ہے یہ ثابت ہو جائے کہ جائداد کی بعض قسموں پر ملکیت کا قانونی حق کیسے پیدا ہوا لیکن اس سے ملکیت ذاتی کے لئے وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی سوائے اس نادر صورت کے کہ دولت پہلے کسی کے قبضہ میں نہ ہو اور کوئی شخص اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو۔ محض یہ

واقعہ کو کہ ایک شخص نے ایک چیز پر قبضہ کرلیا ہے اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ اس پر اس کا قبضہ جاری بھی رہنا چاہیئے۔

دوسرا نظریہ فطری حق کا ہے۔ قدیم عہد کے فلسفی اور عہد وسطےٰ کے آخری دور کے مصنفوں کا بیان ہے کہ ملکیت ذاتی ایک فطری حق ہے یعنی قانون فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ فطرت کا کیا مفہوم ہے؟ اگر فطرت کے معنی انسان کے باہر جو طبعی اور حیوانی دنیا ہے اس کے لئے جاتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ فطری قانون کا لفظ مظاہر کے صرف لازمی تعلقات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور فطری حق صرف اس حق کو کہا جاسکتا ہے جو طاقت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یا اس قوت کو کہا جاسکتا ہے جس سے ان مظاہر کی وضاحت ممکن ہے اور اس اعتبار سے تہذیب کی تمام ترقی گویا اس بات کی کوشش ہے کہ وحشیوں کے درمیان جو فطری قانون کی عمل داری پائی جاتی ہے اس سے نجات حاصل کی جائے۔ اس مفہوم کے مطابق فطرت اور انسانی ترقی دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں اور ملکیت ذاتی غیر فطری معلوم ہوتی ہے کیونکہ فطری حالت میں اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔ لیکن اگر اس کے بالمقابل ہم فطرت کا مفہوم تمام کائنات کی جس میں انسان بھی شامل ہے ساخت لیتے ہیں اور اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ملکیت ذاتی اس اعتبار سے فطری ہے کہ ملکیت ذاتی فرد کی جو تخیل کائنات کا حامل ہے تکمیل ذات کے لئے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم فطری حق کی اس ہمہ گیر اصطلاح کو اپنے جایز اور ناجایز کے ایک عارضی تخیل پر منطبق کر رہے ہیں جس کی بابت تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ ہمارے جایز و ناجایز کے تخیلات میں برابر تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ قدیم زمانے کے عظیم فلسفیوں نے غلاموں کی ملکیت ذاتی کی حمایت فطری حق کی دلیل پیش کرکے کی تھی۔ بہت سی ان چیزوں کو جنھیں آج ہم فطری سمجھتے ہیں ہمارے اخلاف اسے غیر فطری سمجھیں گے۔ اس لئے فطرت کا تخیل اس مفہوم کے ماتحت بہت غیر متقل اور تغیر پذیر ہوجاتا ہے۔

اس میدان سے ہارنے کے بعد فطری حق کے نظریہ کے حامیوں نے نظریۂ محنت
میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ ملکیت ذاتی کا حقیقی حق اس کے پیدا کرنے
میں جو محنت اور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے
کہ چیز کا مالک یقیناً اس شخص کو ہونا چاہیئے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے
کہ زمین کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم عہد کے فیلیاس (PHALEAS)
سے لے کر موجودہ عہد کے ہنری جارج کے شاگردوں تک تمام عہدوں کے فلسفی یہی کہتے
چلے آئے ہیں کہ اور چیزوں میں تو ملکیت ذاتی کی مدافعت کی جا سکتی ہے لیکن زمین میں ملکیت
ذاتی کا ہونا انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ مگر زمین کی ملکیت ذاتی کے یہ نقاد اس بات کو
بھول جاتے ہیں کہ زمین اور محنت کی مزعومہ پیداوار میں اس اعتبار سے فرق جو کچھ بھی ہے
وہ صرف مدارج کا ہے کیونکہ دنیا کی کوئی چیز بھی خالص افراد کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بڑھئی
کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جس میز کو وہ بناتا ہے اس پر ملکیت قائم کرنے کا اسے حق ہے لیکن
سوال یہ ہے کہ میز کے بنانے میں اس کا کس قدر ہاتھ ہے۔ جس درخت کی لکڑی سے اس نے میز
بنائی وہ اس کا بنایا ہوا نہیں تھا جس کلہاڑی سے اس نے لکڑی کو کاٹا وہ اس کے آبا و اجداد کی
صدیوں کی ایجادوں کا نتیجہ ہے۔ شہتیر جس دریا میں بہ کر اس کی کارگاہ تک آیا وہ بڑھئی کا بنایا ہوا
نہیں تھا۔ ان تمام درمیانی منزلوں سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ اگر قانون اور حکومت نے اس کی ذمہ داری نہ لی ہوتی تو اس کے وہ اوزار جنھیں میز کے بنانے
میں اس نے استعمال کیا اور اس کی مصنوعہ شے پر اس کا قبضہ کتنے عرصہ تک قائم رہ سکتا تھا
اور پھر سب سے آخری بات یہ ہے کہ اس کی میز کس کام کی ہوتی اگر جماعت کی طرف سے اس
کا طلب موجود نہ ہوتی۔ میز کی قدر انفرادی محنت کا اتنا ہی نتیجہ قرار دی جا سکتی ہے جتنی زمین
کی قدر۔ جتنی چیزیں بھی پیدا کی جاتی ہیں یا جن کا مبادلہ کیا جاتا ہے وہ سب جماعت کی رہین منت ہیں۔
جب بعض فلسفیوں نے دیکھا کہ قبضہ کے نظریہ، فطری حق کے نظریہ اور محنت کے نظریہ

سے ملکیت ذاتی کا ناقابل انکار حق ثابت نہیں ہوتا تو انھوں نے ملکیت ذاتی کا "قانونی نظریہ" پیش کیا جس کا مفہوم مختصراً یہ ہے کہ جس چیز کو قانون تسلیم کرے وہی جائز طور پر ملکیت ذاتی ہے لیکن اس چیز کو معاشیات کا نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اچھا قانون ہو سکتا ہے کہ معاشی حیثیت سے برا ہو۔ قانون معاشی حالات کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور آہستہ آہستہ معاشی حالات سے ہی مطابقت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ قانونی نظریہ سے ہمیں ملکیت کی موجودہ حقیقت کا علم ہو جاتا ہے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کیوں ہے اور اس کو کیسا ہونا چاہیئے۔

ہر طرف سے ہار کر ہم معاشرتی مفاد کے نظریہ کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں حقیقتاً یہ نظریہ جتنے نظریہ اوپر بیان کئے گئے ہیں ان سب میں مخفی طور پر موجود ہے اور یہی وہ کڑی ہے جس سے ان سب نظریوں کو باہم منسلک کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جمہوری نظام میں جماعت نے انفرادی آزادی کے حدود کو بہت وسیع کر دیا ہے لیکن پھر بھی جدید قوموں میں فرد جماعت کے مقابلہ میں بالکل اتنا ہی بے بس ہے جتنا قدیم قوموں میں ہوا کرتا تھا۔ اگر موجودہ عہد میں ہم غیر مقبوضہ دولت پر فرد کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، اگر ان چیزوں پر جنھیں محنت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے ہم بعض حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اگر ہم ملکیت ذاتی کے عناصر کے گرد قانون کی تباپیٹ دیتے ہیں تو ان تمام صورتوں میں جماعت کا مقصد متعین اور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے وہ ان سب باتوں کی اجازت اس لئے دیتی ہے کہ اسے اس حقیقت کا دھندلا سا احساس ہوتا ہے کہ ان سب باتوں سے جماعتی فلاح پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ملکیت ذاتی جماعتی ترقی کی نشانی ہے۔ اس کی ابتدا جماعتی وجوہ سے ہوئی اس کی نشو و نما جماعتی اجازت کی مسلسل محکومی میں ہوئی ہے۔ اس کو فطری حق صرف اس مفہوم کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تمام معاشری ترقی ایک فطری چیز ہے۔

ملکیت ذاتی کے حدود اب اگر جماعتی مفاد ہی ملکیت ذاتی کی حقیقی وجہ جواز ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کی حد بندی جماعتی مصالح کو پیش نظر رکھ کر ہونی چاہیئے۔ مثلاً موجودہ عہد

کا آبپاشی کے مسئلہ کو لیجئے۔ انگریزی کامن لا میں ملکیت ذاتی کا جو تخیل ہے جسے خوب صورت طریقہ پر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنت کی چیزوں سے لے کر دوزخ کی چیزوں تک پھیلی ہوئی ہے یعنی اس کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے یہ تخیل نتیجہ ہے انگلستان کی مرطوب آب وہوا کا یہاں پانی کی کثرت ہے اس لئے لوگوں کے ذاتی مفاد سے بہترین نتائج پیدا ہونے کی توقع قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن جہاں علاقہ خشک یا نیم خشک ہو جیسے ہندوستان میں ہے تو یہاں قبضہ کی بنا پر یا محنت کی بنیاد پر کسی ایک شخص واحد کا قبضہ دریا پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے یہاں ملکیت ذاتی کا قانون پیدا ہوا ہے وہاں انفرادی حقوق کو جماعت کا محکوم قرار دیا گیا ہے۔

جو بات نہری زمین کے لئے صحیح ہے وہی مدارج کے اختلاف کے ساتھ ملکیت کی اور بھی بہت سی شکلوں کے لئے صحیح سمجھی جاسکتی ہے۔ ملکیت ذاتی ایک تخیل کی حیثیت سے تو بلاشبہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ لیکن اس کے اجزائے ترکیبی میں برابر تبدیلی ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ میں غلاموں کی ملکیت کو معاشی اعتبار سے فائدہ بخش اور اخلاقی حیثیت سے جائز سمجھا جاتا تھا سڑکوں پر ذاتی ملکیت ایک بہت عام اور جائز چیز سمجھی جاتی تھی۔ نیویارک میں گودیوں کی ملکیت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس بجلی کا چرانا یا تار اور ٹیلیفون میں کنکشن لگانا مال کی چوری جیسا جرم سمجھا جاتا ہے اگر کارلائل کا یہ قول صحیح ہے کہ کسی شخص کا وہ اعتقاد نہیں ہوتا جو اس کے باپ دادا کا تھا تو یہ بھی صحیح ہے کہ کسی شخص کی ملکیت میں وہ چیزیں نہیں ہوتیں جو اس کے باپ دادا رکھا کرتے تھے۔

ملکیت ذاتی کا حق وہ امتیازی حق ہے جسے جماعت افراد کو عطا کرتی ہے۔ اسے عام طور پر فائدہ بخش اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفاد ذاتی کے اصول پر عمل کرنے سے بصورت مجموعی بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کے ارتقا کی موجودہ منزل میں ملکیت ذاتی پیدائش دولت کی کثرت اور بہتری کی محرک ہے۔ اس لئے فیصلہ ہمیشہ جماعتی نقطہ نظر سے ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں ملکیت ذاتی کے نتائج جماعتی مفاد کے مخالف نظر آئیں

تو جماعت کے لئے جایز ہے کہ وہ ملکیت کے حق کو محدود کردے۔ چنانچہ پیٹینٹ اور کاپی رائٹ کا حق ہر جگہ چند سالوں کی مدت کے لئے دیا جاتا ہے اس کے بعد مالک کا حق جماعت کو پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح زمین کی ملکیت ذاتی کو بصورت مجموعی جایز سمجھا جاتا ہے اسی طرح بعض وقت جب زمینوں پر قبضہ بڑھایا جانے لگتا ہے تو اس سے جماعتی ترقی رک جاتی ہے اور اس کا تدارک کرنے کے لئے ان کے رقبہ کو محدود کرنے کے لئے نیوزیلینڈ کی طرح باقاعدہ تحریکیں چلائی جاتی ہیں یا ملکیت کے حق کی شکل آئرلینڈ کی طرح بدل دی جاتی ہے جس سے پٹہ دار خود کاشت زمیندار بن جاتے ہیں۔

ملکیت ذاتی کے موجودہ حقوق میں مداخلت اس وقت کرنا چاہیے جب اس کی ضرورت قطعی اور قابل یقین شہادت سے ثابت ہوجائے کیونکہ عام طور پر ملکیت ذاتی اور انفرادی آزادی دونوں جدید تہذیب کی ترقی سے قریبی طور پر متعلق رہی ہیں معاشی آزادی اور معاشی مقابلہ کے حدود سے ملکیت ذاتی کے حدود پر بھی روشنی پڑتی ہے ——

—— ملکیت کے حقوق کے تحفظ کا انحصار مقابلہ کے وجود اور اس کی نفع بخش ہونے پر ہے۔ جہاں مقابلہ کی جگہ اجارہ لے لیتا ہے وہاں ملکیت کے حقوق کی داخلی نگرانی کی جگہ جماعت کی خارجی نگرانی کو لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ جہاں مساوات کی شرط جس پر مقابلہ کے نظریہ کی بنیاد قائم ہے مفقود ہوتی ہے مقابلہ کی فائدہ بخش قوت زائل ہوجاتی ہے اور جماعت کے معاشی مفاد کے تحفظ کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کے استعمال پر پابندی عاید کی جائے۔ کچھ لوگ کمیونزم اور سوشلزم کی تبلیغ کرنے لگتے ہیں۔ کمیونسٹ ملکیت ذاتی کی کمل تنسیخ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ سوشلسٹ پیدائش دولت کے ذرائع میں ملکیت ذاتی کی تنسیخ چاہتے ہیں لیکن اشیا صرف میں اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں دونوں اس قدر انتہا پسند ہیں کہ خرابیوں کے ازالہ کی کوشش میں وہ جدید تہذیب کے خاص فوائد اور اس کے متعلقات کو بھی خیرباد کہنے کے لئے آمادہ ہیں۔

ملکیت کے حقوق کے اجزائے ترکیبی | ملکیت کے حقوق کو پانچ عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے
ہبہ کا حق، معاہدہ کے ذریعہ بیع کا حق، استعمال کا حق، ترکہ کا حق اور غیر محدود اکتساب کا حق۔ اس
میں اول دوم کو ملکیت ذاتی کے تقریباً سب حامی تسلیم کرتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی جائداد کو نہ
صرف یہ کہ جس طرح چاہے دوسرے کو دے سکتا ہے بلکہ اسے فروخت بھی کر سکتا ہے پٹہ اور
ادھار پر بھی دے سکتا ہے اور انھیں گروی بھی دے سکتا ہے۔ صرف جن جگھوں پر جاگیردارانہ
قوانین کے کچھ آثار باقی ہیں وہاں ان حقوق پر کچھ پابندیاں ہیں۔ ورنہ باقی سب جگہ پر یہ حقوق
تسلیم کیے جاتے ہیں۔ تیسرا حق اس قدر قطعی نہیں ہے VESTED RIGHTS موجودہ حقوق کے
مقابلہ میں EMINENT DOMAIN حق بالادست کا نظریہ پیش کر کے جماعتی نگرانی کی ابتدا کی جاتی ہے
اور اس بحیر کو سرکاری پالیسی میں روز بروز زیادہ گھسا۔ کر جماعتی نگرانی کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک شخص
اپنی جائداد کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتا کہ اس کے
پڑوسیوں کو اس سے تکلیف پہنچے۔ انفرادی حق ہمیشہ جماعتی پابندیوں کا ماتحت ہوتا ہے۔

لیکن خاص اختلاف چوتھے اور پانچویں حق کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ ترکہ اور وراثت کا
حق بعد میں پیدا ہوا ہے۔ ملکیت ذاتی کے قائم ہونے کے بہت عرصہ بعد تک اصلی مالک کے مرنے
کے بعد جائداد جماعت کے قبضہ میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ سامان میں ترکہ کا حق پیدا ہو جانے کے بہت
عرصہ بعد تک جائداد منقولہ میں اس قسم کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا وصیت اور بلا وصیت کی وراثت
ہر جگہ خاندان کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور خاندان کا یہ قریبی رشتہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بذات خود
معاشی قوتوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب وصیت کرنے والے کی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد
بھی جائداد کو قائم و برقرار رکھنے کی ضمانت کی گئی تو اس کا دولت کے حصول اور اس کی پیدائش کی
معیشت پر بڑا زبردست اثر پڑا۔ جہاں خاندان کی معاشری اور معاشی حیثیت زیادہ ہے
وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ترکہ چھوڑنے کا حق ایک فریضہ بن جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ خاندان
کے پس ماندگان کا حق وراثت بھی چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ PORTION LEGITIME یعنی فرانس

اور جرمنی میں بچوں کا قانونی حق اور اینگلو سیکسن ملکوں میں بیوہ کا حق مہر DOWER RIGHT اسی نوعیت کے ہیں۔

موجودہ عہد میں خاندانی جذبہ کے کمزور ہو جانے اور مختصر حلقہ میں محدود ہو جانے کی وجہ سے ترکہ کے محدود کرنے کی تحریک بھی ترقی کرنے لگی ہے۔ ترکہ کے محاصل میں جو عہد جدید میں ترقی ہو رہی ہے خصوصاً دور کے رشتہ داروں کے ترکہ کے حق پر جو بہت زیادہ محصول لگائے جاتے ہیں انہیں اس رجحان کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب اس قسم کے محصول امریکہ میں ۱۵ فی صدی، انگلستان میں ۱۰ فی صدی اور سوئٹزر لینڈ اور آسٹریلیا کی بعض ریاستوں میں ۲۰ اور ۲۵ فی صدی ہوا اس وقت سے ترکہ کے حق پر بڑی پابندی شروع ہو گئی مگر اس کے تسلیم کرنے کے لئے معقول وجہ موجود ہے کہ جس طرح خاندان کے قریبی تعلقات کی گری خول سے جدا ہو جانے کے بعد باقی رہے گی اسی طرح ترکہ کے محاصل کی یہ تحریک بھی اس جگہ پر ختم ہو جائے گی جہاں اس کی وجہ سے اکتساب دولت کے رجحان میں کمی واقع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گا۔ اس کے برعکس دولت کو غیر محدود حد تک جمع کرنے کے حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کثیر دولت کے جمع ہو جانے سے جمہوری حکومت کے انتظام میں دشواری پیدا ہو جائے گی لیکن اس نقطہ کے مقرر کرنے میں جس کے آگے دولت کا جمع کرنا معاشی یا سیاسی حیثیت سے خطرناک ہے بہت مشکل ہے۔ ہمارا اشارہ یہاں عام دولت سے ہے جسے ایمان داری سے حاصل کیا گیا ہو بعض چیزوں میں ملکیت ذاتی کو ناجائز قرار دیا جاتا ہے چاہے اس کی رقم کم ہو یا زیادہ بے ایمانی چھوٹے کاروبار میں بھی اتنی ہی قابل ملامت ہے جیسے بڑے کاروبار میں۔

عام طور پر بڑی جائداد کو ایمان داری سے اس وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب جماعت کو اس کی وجہ سے بہت بڑا فائدہ پہنچے جو جماعت کی خدمت بہتر طریقہ پر کرے گا اسے نفع بھی بہت زیادہ ملے گا۔ کامیاب اور ایمان دار کاروباری آدمی اسی وقت منڈی پر قبضہ رکھ سکتا ہے جب وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں سستا مال بیچتا ہے اور جب وہ سستا مال بیچتا ہے تو وہ مصرفوں

کا فائدہ کرتا ہے۔ نفع کو روکنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کاروبار کی آزادی کو روکا جائے۔ کاروبار کی آزادی کو روکنے سے قیمتیں بڑھیں گی اور زیادہ قربانی کرنا پڑے گی دولت کو محدود کرنے کی پالیسی ناقابل عمل اور معاشی حیثیت سے خطرناک ہے۔ مگر اس عام جذبہ کی معقولیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ دولت کی عدم مساوات کی کثرت سے جمہوری صفات آخر کار خطرہ میں پڑ جائیں گی لیکن اس کا علاج ملکیت ذاتی کی مخالفت کرنے سے یا دولت کے اجتماع کو روکنے سے نہیں کیا جاسکتا ملکیت ذاتی کی بنیادی اہمیت سے جس پہ جدید عہد کی تمام تہذیب کی عمارت قائم ہے انکار کرنا یا اس کی اہمیت کو کم کرنا لغو اور فضول بات ہے۔ ارسطو کے الفاظ میں معاشی نصب العین کو خوبی کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ملکیت کو ذاتی رہنا چاہیئے لیکن اس کا استعمال مشترک ہونا چاہیئے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ جماعت کی طرف سے دولت کے متولی ہونے کے تخیل کی تعلیم دی جائے یعنی دولت حاصل کرنے والے پر ایک جماعتی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ معاشی ترقی ملکیت ذاتی سے قریبی طور پہ وابستہ ہے لیکن اس کے باوجود جماعت کی طرف سے اس کی نگرانی اور اسے صرف میں لانے کا مطالبہ ہے اور ہم دولت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض کو بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس اخلاقی پابندی کا انحصار بیک وقت جماعتی مفاد کے صحیح معاشی تخیل ملکیت ذاتی کے وجہ جواز اور اس کی تحدید پر ہے۔

مقابلہ

مقابلہ کی نوعیت | ایک اعتبار سے مقابلہ کو زندگی کا قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔ علم حیات سے ہمیں زندگی کی اس کشمکش کا علم حاصل ہوتا ہے جو حیوانوں میں جاری ہے اور جس کی وجہ سے فطری انتخاب کا کام چل رہا ہے اور وہی زندہ اور باقی رہتے ہیں جو اصلح ترین اور موزوں ترین ہوتے ہیں۔ اس کشاکش کی خاص شکل اس جد وجہد کو قرار دیا جا سکتا ہے جو فطرت کی قوتوں اور ذی حیات اجسام میں جاری ہے جس کی وجہ سے فرد ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو ان ذی حیات اجسام کا ارتقا ہوتا ہے جو اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر کے باقی رہنا سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن جہاں فطرت بخل سے کام لیتی ہے اور اس کے وسائل سب کے لئے کافی نہیں ہوتے تو فطرت کے ساتھ جو کشاکش جاری ہے اس میں ایک اور کشاکش کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے یعنی مختلف گروہ یا واحد سے اپنا ذاتی حصہ حاصل کرنے کے لئے باہم کشاکش شروع کر دیتے ہیں۔ مقابلہ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ مقابلہ فطرت کے خلاف جد وجہد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کشاکش کا نام ہے جو فطرت کی فیاضی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مختلف واحدوں میں جاری رہتی ہے۔

مقابلہ کی ابتدائی شکلوں میں مقابلہ افراد کے مابین نہیں ہوتا بلکہ جماعتوں کے درمیان ہوتا ہے اور زندگی کی شروعات سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اکثر جانوروں کی طرح انسان میں بھی غذا کے حصول کے لئے پہلا مقابلہ جو شروع ہوتا ہے وہ گروہوں کے درمیان ہوتا ہے افراد کے مابین نہیں۔ چنانچہ ابتدا ہی سے امداد باہمی کا اصول نمایاں ہونے لگتا ہے اور گروہوں کے درمیان مقابلہ صرف اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ خود گروہ کے اندر امداد باہمی موجود ہے اس قسم کی ابتدائی امداد باہمی کا مشاہدہ امریکہ کی سرحدی زندگی میں کیا جا سکتا ہے جہاں جنگل سے

شہتیروں کے ڈھونے، عمارتوں کے کھڑا کرنے اور اسی قسم کے دوسرے مشترکہ کاموں میں سب پڑوسی مل کر کام کرتے ہیں۔ جب گروہ کے اندر تقسیم عمل شروع ہو جاتی ہے تو فطری انتخاب یعنی مقابلہ کا اصول گروہ کے افراد میں بھی اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ لیکن یہ کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے کیونکہ فرد کی خوش حالی کو کل جماعت کی خوش حالی کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ جب گروہ زیادہ بڑے اور طاقتور ہو جاتے ہیں تو ہمیں امداد باہمی کی اعلیٰ تر شکلیں نظر آنے لگتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ افراد کے مابین جو جدوجہد یعنی مقابلہ جاری ہے اس میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد تاریخی عہد میں قوموں کے درمیان جو مقابلہ شروع ہوتا ہے اس میں کامیابی کا فیصلہ نہ صرف یہ کہ ریاست کی نوعیت سے ہوتا ہے جو انسانی اشتراک عمل کی اعلیٰ ترین شکل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم کے اندر مقابلہ کے لئے جدوجہد کا جو سلسلہ جاری ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے کس نوعیت کا ہے کیونکہ اس سے قوم کے جسم و دماغ کی وہ تمام اہلیتیں ترقی پاتی ہیں جس پر سیاسی قوت کا آخری دارومدار ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ مقابلہ کی حدیں اتنی ہی وسیع ہوتی ہیں جتنی کہ خود زندگی کی۔

اگر مقابلہ کو علم حیات میں ترقی کی بڑی جزئی تشریح کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے تو معاشی دنیا میں اس چیز کا منطبق کرنا اور بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ معاشیات کا موضوع دولت اور انسان کا باہمی تعلق ہے۔ انسان اور جانوروں میں فرق یہ نہیں ہے کہ انسان دولت کو عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری کے ساتھ استعمال میں لاتا ہے کیونکہ انسانوں کی طرح کچھ ایسے جانور بھی موجود ہیں جو دولت کے صرف کرنے میں عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری پر عمل کر رہے ہیں۔ انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ انسان دولت پیدا کرنا جانتا ہے جانور نہیں جانتے یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشیات میں مقابلہ کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ایک موجودہ ذخیرہ کو کس طرح عاقبت اندیشی کے ساتھ تقسیم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اضافہ پذیر ذخیرہ کو کیوں کر مناسب طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انسانوں میں زائد حصہ کو حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ زائد پیدا

کیا جائے۔ دولت کو صرف کرنے والی تمام جماعتوں میں اس زاید ماحصل کو تقسیم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ نفع انہی لوگوں کو حاصل ہو گی جو بہتر اور سستی اشیا پیدا کر سکیں گے۔ منڈی پر قبضہ کرنے کا یقینی طریقہ صرف یہ ہے کہ حریف کے مقابلہ میں مال سستا فروخت کیا جائے۔ چنانچہ کاروباری اصول کی حیثیت سے مقابلہ کے معنی یہ ہوں گے کہ لاگت کو کم کر کے دولت کو بڑھایا جائے علم حیات میں تو مقابلہ کی وجہ سے ترقی بالواسطہ ہوتی ہے لیکن معاشیات میں ترقی کا تمام راز مقابلہ ہی میں پوشیدہ ہے اور عام حالات میں مقابلہ کو تجارت کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مقابلہ کا ایک فریق ممکن ہے ضمنی طور پر دولت جمع کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے۔ لیکن اگر اس نے یہ دولت ایمان داری کے ساتھ جمع کی ہے (اور یہ ایمانی دولت کی صفت نہیں ہے بلکہ افراد کی صفت ہے چاہے وہ امیر ہوں یا غریب) تو یہ صرف اسی صورت میں جمع کی جا سکتی ہے جب اس سے جماعت کو بہت زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ فتح اس کی ہوتی ہے جو جماعت کی بہترین خدمت کرتا ہے۔

اس لئے معاشی ترقی میں مقابلہ کا حصہ بڑا زبردست ہے۔ ملکیت ذاتی کے اصول کے ساتھ ساتھ اسے بھی ترقی کا خاص محرک سمجھنا چاہیئے۔ اس کے ذریعہ افادہ کے حدود کو وسعت دی جا سکتی ہے اور انسانی احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے دولت کا جو زائد ذخیرہ موجود ہے اس کو اور زیادہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ دولت کے صرف کرنے والوں کو مقابلہ کے ذریعہ قیمتوں کے ان اضافوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے جنھیں زائد منافع کے لالچ میں خریداروں کو ادا کرنے کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مقابلہ میں وہ قوت ہے جس سے از خود ناا ہلوں کے منافع کم کئے جا سکتے ہیں اور نفع کو اعلیٰ قیمتوں کے مقابلہ میں ادنیٰ قیمتوں کا پابند بنایا جا سکتا ہے افراد میں مقابلہ کی وجہ سے مستعدی، کفایت شعاری اور طاقت کی بنیادی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح فرد اور جماعت کے مفاد میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ایک شخص کی کامیابی کا دارو مدار صرف اس بات پر ہونے لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی کتنی خدمت کر سکتا ہے۔

مقابلہ کی شکلیں | مقابلہ کی پانچ خاص شکلیں ہیں :- اشیاء کا مقابلہ، افراد کا مقابلہ، منڈیوں کا مقابلہ،
طبقوں کا مقابلہ، اور نسلوں کا مقابلہ،

(۱) اشیاء کے مقابلہ سے مراد وہ مقابلہ ہے جو معاشری پسندیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر فرد
برابر اس ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے کہ اس چیز کو خریدوں یا دوسری کو جب وہ کشش و پیچ کی انتہائی
حد پر ہوتا ہے تو قیمت کی ذرا سی تبدیلی سے وہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو پسند کر لیتا ہے۔ اس
کشمکش میں جو اصول پوشیدہ ہے اس کو اسی بنا پر قانون بدل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
فروشندہ کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیئے کہ کہیں قیمت کے بڑھنے سے اس کی بکری پر تو اثر نہیں
پڑے گا پھر عیوض اور بدل کا یہ سلسلہ صرف اشیاء ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عامل پیدائش
کی جگہ دوسرے عامل پیدائش کو بھی بدل کے طور پر قبول یا مسترد کیا جاتا ہے۔ معاشی احتیاجات کی
کسوٹی پر سب چیزوں کو اس اصول کے ماتحت پرکھا جاتا ہے کہ کس میں احتیاج رفع کرنے کی سب
سے زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے۔ صرف مصرف ہی کبھی ایک چیز کو اور کبھی دوسری کو پسند نہیں
کرتا بلکہ آجر بھی کبھی مزدوروں کی تعداد بڑھا دیتا ہے، کبھی مشینوں میں اضافہ کرتا ہے تاکہ نتائج
بہترین پیدا ہو سکیں۔ شرح اجرت یا شرح سود کی ذرا سی تبدیلی سے وہ ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال
شروع کر دیتا ہے۔ اور نااہل عامل کو اہل عامل سے بدلنے کے بعد ہی وہ مصرف کو آمادہ کر سکتا ہے
کہ ایک شے کی جگہ دوسری شے کو ترجیح دے۔ اس لئے عیوض اور بدل کے ذریعہ جو مقابلہ کیا جاتا ہے
وہ اس لئے اہم ہے کہ اس سے اس انتہائی حد کا تعین ہو جاتا ہے جس کے آگے قیمتیں نہیں بڑھ
سکتیں۔ معاشی اشیاء کی طرح ہر معاشی عامل بھی یا تو بالحقیقت یا بالقوۃ باہمی مقابلہ میں مصروف ہے
مقابلہ کے وجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ عاملین پیدائش میں ایک کاروبار سے دوسرے کاروبار
اور ایک شے سے دوسری کی طرف منتقل ہونے کی پوری آزادی یعنی انتقال پذیری موجود ہو۔ جب
سرمایہ اور محنت کی انتقال پذیری مکمل ہوتی ہے اسی وقت مقابلہ بھی بالکل آزاد ہوتا ہے جب
اس انتقال پذیری میں رکاوٹیں ہوتی ہیں تو معاشی تصادم نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے

کہ قانونی، معاشرتی اور معاشی اسباب کی بنا پر ایک شے کی جگہ دوسری شے کے استعمال کرنے میں رکاوٹ ہو۔ لیکن جب حالات اوسط درجہ کے ہوتے ہیں تو مقابلہ حقیقی اور موثر ہوتا ہے۔

(۲) افراد میں باہم جو مقابلہ پایا جاتا ہے اس کا مفہوم مختلف اشیاء کے پیدا کرنے والوں یا مختلف عاملین پیدائش کی باہمی رقابت اور چشمک نہیں ہے بلکہ وہ رقابت ہے جو ایک ہی شے کے پیدا کرنے والوں یا ایک ہی عامل پیدائش میں پائی جاتی ہے۔ اوسط حالات میں اس کی وجہ سے ہر شخص انتہائی کوشش کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے اور جماعتی ذخیرہ میں ہر شخص کی طرف سے جو حصہ جمع کیا جاتا ہے کامیابی اس کا ایک پیمانہ بن جاتی ہے۔ جتنا زیادہ ایک مزدور پیدا کرے گا اتنی ہی زیادہ اسے اجرت ملے گی۔ جتنا زیادہ ایک کپڑے کا کارخانہ اپنی پیداوار بڑھائے اور جتنی کم لاگت پر وہ اپنی اشیاء کو منڈی میں لائے گا اتنا ہی زیادہ اس سے دولت کے صرف کرنے والوں اور اس خاص پیدا کرنے والے کو فائدہ پہنچے گا۔ افراد کے درمیان مقابلہ کو نتائج کے لحاظ سے اس جدوجہد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو کارکردگی کے اضافہ، اہلیت کی ترقی، قوت پیدائش کی وسعت، ایجاد و اختراع کی کثرت غرضکہ معاشی شخصیت کی تکمیل کے لئے جاری ہے۔ جس قدر طاقتور یہ شخصیت ہوگی اتنی ہی زیادہ قوائے فطرت پر دسترس حاصل ہوگی اور اتنی ہی تیزی سے دولت کی ترقی ہوگی۔ ملکیت اس کی اگرچہ افراد کے ہاتھوں میں ہوگی لیکن اس سے ناگزیر طریقہ پر جماعت کو بھی فائدہ حاصل ہوگا۔

(۳) منڈیوں کے مقابلہ سے مراد ان افراد کا مقابلہ نہیں ہے جو منڈیوں میں موجود ہوتے ہیں بلکہ خود منڈیوں کا باہمی مقابلہ ہے۔ منڈیوں کے مقابلہ کی اصطلاح میں اشیاء اور افراد دونوں کا مقابلہ اس مفہوم کے ساتھ ضرور شامل ہے کہ منڈی میں افراد اور اشیاء دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ اصطلاح صرف انہیں چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ ہر بڑے شہر میں اس بات کے لئے برابر جدوجہد جاری رہتی ہے کہ وہ تقسیم اور مبادلہ کا مرکز بن جائے اور یہ خواہش اس امید پر قائم کی جاتی ہے کہ اس طرح جو دولت جمع ہوگی اس سے دوسرے کاروبار کی اہلیت کارکردگی

کو بڑھایا جاسکے گا۔ غلہ کی تجارت کے لئے نیویارک کا مقابلہ بالٹی مور سے ہے اور کپاس کی تجارت کے لئے نیو اورلینس گلیواسٹن سے مقابلہ کر رہا ہے۔ منڈیوں میں مقابلہ کے ذریعے فاصلہ کے عنصر پر قابو حاصل کرنے کی جستجو کی جاتی ہے چنانچہ ذرائع نقل وحمل کے جو وسائل ہیں ان کی اصل بنیاد مقابلہ کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی منڈیوں کے مقابلہ کی وجہ سے لاگت میں کمی واقع ہوتی ہے اور منڈی میں اقتدار حاصل کرنے کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ اسی وقت ختم کیا جاسکتا ہے جب کہ خدمت زیادہ موثر طریقہ پر کی جائے۔

(۴) طبقوں کا مقابلہ اس بنا پر پیدا ہوا ہے کہ جماعت دولت پیدا کرنے والوں کے مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ نہ صرف مزدوروں اور سرمایہ داروں کے بڑے بڑے طبقے پائے جاتے ہیں بلکہ سرمایہ داروں میں بھی زراعتی تجارتی اور صنعتی سرمایہ کے مالکوں کے طبقے یعنی زمیندار تاجر اور فیکٹری کے مالک پیدا ہو گئے ہیں اور پھر یہ بھی اور چھوٹے چھوٹے طبقوں میں منقسم ہوگئے ہیں بعض مصنفوں کو مثلاً سوشلسٹ کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ طبقوں کے تصادم کو معاشی تبدیلی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس سے نہ صرف مظلوم کی تمام جائداد اس سے چھین لی جاتی ہے بلکہ آخر میں جماعت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقوں کا مقابلہ گو دوسرے مقابلوں کی طرح ناگزیر ہے لیکن حدود کے اندر رہے تو نتائج کے اعتبار سے اتنا ہی مفید ہے جتنی کہ دوسرے مقابلے ہیں مفید ہے۔ آزاد مقابلہ کے نظام میں سرمایہ زراعت سے صنعت میں اسی وقت منتقل ہوگا جب صنعتی مشاغل زیادہ دولت آفریں ثابت ہو جائیں گے یعنی جب جماعت بصورت مجموعی صنعتی پیدا وار کو زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے گی۔ یہ سوال کہ کون زیادہ خوش حال ہے ساہوکار یا زمیندار تو اس کا دار و مدار بھی در اصل اس بات پر ہے کہ کون خریداروں کو اپنا طرف دار بنا سکتا ہے اور طرف دار وہی بنا سکے گا جو چیزیں سستی یا بہتر قسم کی مہیا کرسکے گا۔ اسی طرح مزدوروں اور سرمایہ داروں کے طبقوں میں بھی مفاد کا تصادم پایا جاتا ہے لیکن اجرت اور منافع کا جو حصہ ان میں سے ہر ایک کو ملے گا اس کا دار و مدار جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس بات پر

ہوگا کہ دونوں کا مشترکہ پیداوار کے پیدا کرنے میں نسبتی حصہ کس قدر ہے۔

(۵) نسلی یا قومی مقابلہ اپنے معاشی پہلو کے اعتبار سے موجودہ کشاکش کی آخری شکل ہے جدید ترقی کی بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہتھیاروں کی خونی آویزش کی جگہ تجارت کی پر امن رقابت نے لے لی ہے۔ جدید عہد کا ہتھیار تلوار یا بندوق نہیں ہیں بلکہ ملکی صناع اور برآمد کرنے والے کا کاروباری حوصلہ ہے۔ جو قوم بھی تجارتی اور صنعتی سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہے وہ اپنی زائد پیداوار کی نکاسی کے لیے بیرونی منڈی پر قبضہ کرنے کی تلاش کرتی ہے۔ منڈی حاصل کرنے کی اس خواہش سے کبھی کبھی جنگ بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر بصورت مجموعی آج کل کی جنگ مال کو سستا کرنے کے لیے کی جاتی ہے اور انجام کار بڑی فوج یا بحری بیڑہ سے غیر جانبدار منڈی کو قائم نہیں رکھا جاتا بلکہ دولت کے پیدا کرنے والوں کی اہلیت کارکردگی سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجارتی یا دوسرے قومی مفادوں کے تحفظ کے لئے ایک بڑی فوج اور بڑے بحری بیڑہ کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن موجودہ عہد میں فوجی طاقت کی بنیاد اصل میں معاشی ہی ہوتی ہے اور جب معاشی اہلیت غائب ہو جاتی ہے فوجی قوت میں بھی انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اب بڑی قوموں کے بارے میں فیصلہ ان کی فوجوں اور جنگی جہازوں کی تعداد کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی ملکی پیداوار اور بیرونی تجارت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ معاشی قوت سے ہی بالقوہ فوجی اہلیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر یہاں بھی مقابلہ کا اثر صحت بخش ہوتا ہے۔ قدیم تجاریین کے نظریہ کی بنیادی غلطی ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جب ایک قوم کو تجارت سے فائدہ ہوتا ہے تو دوسری کو لازماً اس سے نقصان ہوتا ہے۔ جدید نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اس کے پڑوسی کی مرفہ الحالی سے اس اصول کے ماتحت فائدہ پہنچتا ہے کہ جتنا مالدار گاہک بنے گا اتنا ہی مال زیادہ بکے گا۔ تجارت سے دونوں قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پہنچے۔ بیرونی منڈیوں پر قبضہ سستا مال بیچ کر ہی قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ایک ملک کے منافع دوسرے ملک کے خریداروں کو نفع پہنچا کر ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ذاتی اور طبقہ کے مقابلہ کی طرح قومی

مقابلہ ایک ملک کو نفع اسی وقت پہنچا سکتا ہے جب وہ ملکوں کے گروہ کو بھی فائدہ پہنچائے
اس سے ایک قوم کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن ضمناً دوسری قوموں کی بھی ترقی ہو جاتی ہے۔

مقابلہ کے خطرات | مقابلہ کے اس بنیادی فائدے کو جن مختلف شکلوں میں اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس میں کوئی خامی ہی نہیں پائی جاتی۔ جہاں جنگ ہوتی ہے اور ایک فاتح ہوتا ہے وہاں مفتوح اور شکار کا ہونا بھی ضروری ہے کوئی بھی کشاکش ایسی نہیں ہو سکتی جس سے مفتوح کے کرب و تکلیف کو علیحدہ کیا جا سکے۔ تکلیف ترقی کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے جس طرح ایثار کم سے کم سعی کی شکل میں تسکین اور فرحت کا پیش خیمہ ہے۔ حیوانی دنیا میں جہاں مقابلہ بے رحمی سے کیا جاتا ہے یہ برائی بہت نمایاں ہے۔ وہاں ترقی کو شکار کی موت کی قیمت دے کر خریدا جاتا ہے۔ جنگ حیوانی جبلتوں اور درندوں کی طاقتوں کے درمیان ہوتی رہتی ہے۔ فتح چاہے وہ نسل کے لئے کتنی ہی فائدہ بخش کیوں نہ ہو فرد کی زبردست قربانی کے بعد حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انسانی مقابلہ اپنی معاشی شکل میں کچھ تو درندوں کے مقابلہ سے مشابہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اس سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔ معاشی مقابلہ سے ناکام حریف کی معاشی موت بلا شبہ واقع ہوتی ہے جس صناع کا حریف اس کے مقابلہ میں مال سستا بیچتا ہے اسے آخر میں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابل کی کامیابی جس سے دولت کے استعمال کرنے والوں کی معاشی ترقی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ذاتی طور پر تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

مگر دو باتیں ہیں جو درندوں کے مقابلہ سے انسانی مقابلہ کو مختلف کرتی ہیں اول تو یہ کہ ہو سکتا ہے کہ یہ معاشی خرابی عارضی ہو صناع جو ایک کاروبار میں ناکام رہتا ہے وہ اکثر دوسرے کاروبار میں جس کے لئے وہ زیادہ موزوں ہوتا ہے کامیاب ہو جاتا ہے۔ اپنی ابتدائی ناکامی کی وجہ سے وہ دوسری جگہ دوہری کوشش کرتا ہے اور آخر میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے زوال کے معنی خاتمہ کے نہیں ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ زوال حقیقتاً اس کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت

ہو۔ دوسرے معاشی مقابلہ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاتمہ بالکل واقع نہ ہو بلکہ صرف ایک نسبتی شکست اس مفہوم کے اعتبار سے پیدا ہو جائے کہ دو حریفوں کی ترقی کی رفتار غیرمساوی ہوجائے مزدور سرمایہ داروں سے مقابلہ کرتے ہیں ایک ملک دوسرے ملک سے مقابلہ کرتا ہے ۔ دونوں مسلسل فائدہ حاصل کرسکتے ہیں گو اس فائدہ کے تناسب میں اختلاف پیدا ہو جائے ۔ درندوں کے مقابلہ میں کشاکش صرف چیزوں کے صرف کے لئے ہوتی ہے انسانی مقابلہ میں یہ کشاکش چیزوں کی پیدائش کی شکل اختیار کرلیتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ آخر میں دونوں کا مقصد احتیاجات کی تسکین ہوتا ہے لیکن مقصد تک پہنچنے کے وسائل مختلف ہوتے ہیں ۔ اس اختلاف سے دونوں حریفوں کو ان منافع میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے جو معاشی مقابلہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔

لیکن ان خوبیوں کے باوجود مقابلہ اکثر ایک تکلیف دہ کام ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ کشاکش جسمانی طاقت کے میدان سے ذہنی اہلیت کے میدان میں منتقل ہوگئی ہے مقابلہ کی اذیت اور تکلیف میں کمی واقع نہیں ہوتی ۔ اس کے علاوہ مقابلہ بعض وقت اس قدر خوفناک شکل اختیار کرلیتا ہے کہ اس سے دونوں حریفوں کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں ۔ اسے "CUT THROAT COMPETITION" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کا ذکر کچھ سالوں سے بہت سنا جانے لگا ہے ۔ اس میں منڈی پر قبضہ کرنے کے لئے قیمتوں کو اصل لاگت سے بھی کم کردیا جاتا ہے ۔ خریدار کو اپنے عارضی فائدے کی بجائے بہت مہنگے دام دینے پڑتے ہیں کیونکہ کچھ عرصے بعد دولت کے سب پیدا کرنے والے ختم ہو جاتے ہیں ۔ اس جگہ مقابلہ اپنی بدترین شکل میں نظر آتا ہے ۔ کیونکہ تمام مقابلہ کرنے والوں کو گر کر اپنے بدترین بے اصولے حریف کی سطح تک اتر آنا پڑتا ہے ۔ اسی طرح مزدوروں کے درمیان بھی سخت ترین مقابلہ شروع ہوسکتا ہے جب مزدوروں کی ضرورتیں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنا معیار بھی اتنا ہی پست کرلیں جتنا کہ ایک نہایت کم اجرت پانے والے اور سب سے زیادہ محنت کرنے والے

مزدور نے بنا رکھا ہے ۔ان دونوں صورتوں میں مقابلہ کی وجہ سے کامیاب کاروبار یا خوش حال مزدوروں کی جماعت کا دائمی قیام خطرہ میں پڑ جاتا ہے ۔اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مقابلہ کے خاص فائدوں کو قائم رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ناہموار شاخوں کو کاٹ کر برابر کر دیا جائے یعنی معاشرتی فایدہ کو قائم رکھا جائے اور انفرادی ایثار کو کم کیا جائے ۔ بالفاظ دیگر سوال یہ ہے کہ مقابلہ کے صحیح حدود کیا ہیں ؟

مقابلہ کے حدود | اس مسئلہ کا مطالعہ تین نقطہ ہائے نگاہ سے کیا جا سکتا ہے یعنی مقابلہ کی سطح کو نقطہ نگاہ سے، مساوات کو قائم رکھنے کے نقطہ نگاہ سے اور تیسرے سرکاری کاروبار سے مشابہت رکھنے والے کاروبار کو زندہ رکھنے کے نقطہ نگاہ سے ۔

(۱) درندوں اور انسانوں کے مقابلہ میں جو بنیادی فرق ہے اور جو درحقیقت اور تمام دوسرے اختلافات کی تہ میں بھی کام کرتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ حیوانات تو اپنے ماحول کے پابند ہوتے ہیں لیکن انسان کم سے کم ایک حد تک اپنے ماحول کو بدل سکتا ہے ۔ یہ بات صرف طبعی ماحول کے لئے ہی صحیح نہیں ہے بلکہ معاشرتی و معاشی ماحول کے لئے اس سے بھی زیادہ صحیح ہے ۔معاشرت کا کام یہ ہے کہ وہ مقابلہ کی عام سطح کو بلند کر دے ۔مقابلہ کی اس انتہائی شکل میں بھی جس کو جنگ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں بین الاقوامی سمجھوتوں کے ذریعے جنگ کی واقعی سختیوں میں کمی کئے بغیر ۔ بے کار نقصان اور غیر ضروری تکلیف کے روکنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہے اور اب یہ کہنا صحیح نہیں رہا ہے کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے ۔اسی طرح معاشی زندگی میں ہم اکثر یہ سنتے ہیں کہ ناجائز اور فریقین کو نقصان پہنچانے والا مقابلہ کیا جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذلیل اور قابل ملامت طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں ۔کاروباری زندگی کی ترقی سے درندوں جیسی کشاکش سے ہم بہت دور ہٹتے جا رہے ہیں اور جماعت آج کل اکثر "جائز" اور ناجائز "مقابلہ میں تفریق کرتی رہتی ہے ۔" جائز" مقابلہ کیا ہے اس کا جواب نہ صرف مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے بلکہ مختلف پیشوں کے لئے بھی اس کا جواب مختلف ہوتا ہے ۔ ہماری ریلوں کے

طریقے ایک نسل پہلے کے طریقوں سے بہت مختلف ہو گئے ہیں۔ ایک وکیل یا ایک ڈاکٹر کی غیو
میں مقابلہ ان پیشوں کے جن اخلاقی اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے وہ تجارت کے پیشہ کے اصولو
سے مختلف ہوتے ہیں۔ ورتھ اسٹریٹ میں جو کاروبار کے اصول ہیں ویسے وال اسٹریٹ میں
نہیں ہیں۔ کسانوں میں مقابلہ فیکٹری کے مالکوں کے مقابلہ سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔
ہر گروہ کا اپنا ایک خاص معیار ہوتا ہے اور ایک اوسط درجہ کا آدمی اگر اسے پورا کر دیتا ہے
تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اس معیار کو بلند کیا جائے اور معاشی حیثیت سے
جو چیز جائز ہے اس کے مفہوم کو برابر وسیع کرنا جاری رکھا جائے۔ لیکن معیار کی پیروی سے
انفرادی آزادی میں تھوڑی مداخلت ضرور ہوتی ہے۔ رائے عامہ کی قوت کے ذریعہ جس کا
عکس کاروبار کے قاعدوں اور رواج اور قانون کی دفعات میں نظر آتا ہے مقابلہ ایک اعلیٰ
شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بے ایمانی کو غصہ اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے فیکٹری
کے قوانین بنائے جاتے ہیں کمینہ اور اسٹرائک کو توڑنے والے لوگوں کی ملامت کی جاتی ہے
بے اصولی کے ساتھ کاروبار میں روپیہ لگانے پر سزا دی جاتی ہے مقابلہ ختم نہیں ہو رہا ہے
بلکہ اس کی سطح کو بلند کیا جا رہا ہے۔

(۲) دوسری چیز جو قابل لحاظ ہے وہ مساوات ہے۔ مکمل مساوات کا بلاشبہ کہیں وجود نہیں
ہے کیونکہ تنوع تو زندگی کا قانون ہے مقابلہ اپنا کام معاشی میدان میں بھی ایسا ہی کرتا رہتا ہے
جیسا کسی اور دوسرے میدان میں اور اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے پاس بہتر
قسم کا سامان ہوتا ہے۔ مگر جب مقابلہ کرنے والوں میں عدم مساوات بہت زیادہ ہوتی ہے
تو جماعت کو مقابلہ کے مخصوص فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ اگر ایک شخص ایک چیز کو دس آنے میں
پیدا کر سکتا ہے اور اس کا دوسرا واحد مد مقابل اس چیز کو پچاس آنے میں پیدا کرتا ہے تو وہ
آنے کی قیمت مقرر کرنے سے منڈی پر اس کا پورا قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر مقابلہ کرنے والے
لوگ زیادہ اہل ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی قیمت پندرہ آنے تک گھٹانا پڑتی۔ مقابلہ کی

والوں میں جتنی زیادہ مساوات ہوگی اتنا ہی زیادہ دولت کے صرف کرنے والوں کو فائدہ پہنچے گا اگر دولت پیدا کرنے والے لوگوں کی اہلیت کارگذاری کو کسی طرح اتنا بڑھایا جائے کہ اس قسم کی نسبتی عدم مساوات کم ہو جائے تو اس سے تمام جماعت کو بڑا فائدہ پہنچے گا جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے تامینی محاصل کے ذریعہ بین الاقوامی مقابلہ کی جو حد بندی کی جاتی ہے اس کی تائید میں بھی یہی دلیل خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح کمترین اجرت کے لئے جو مطالبہ کیا جاتا ہے یا مزدوروں کی انجمنیں جو جائز طریقے اختیار کرتی ہیں ان میں بھی یہی بات پیش نظر رہتی ہے کہ کمزور ترین افراد کو طاقتور ترین افراد کے معیار کے قریب لایا جائے۔ اپنی بہترین شکل میں اس کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ سب کو برابر کر کے نیچے کی سطح پر لے آیا جائے بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ جو لوگ پست ہیں ان کی سطح کو بلند کیا جائے۔

اس میں جس نکتہ پر خاص زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک کمزور حریف کو مضبوط کرنے سے نہ صرف اس حریف کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ کل گروہ کو فائدہ پہنچے اور آخر میں کل جماعت اس سے مستفید ہو۔ مقابلہ باقی رہتا ہے لیکن اس کی عدم مساوات کم ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی یہ خطرہ پایا جاتا ہے کہ ممکن ہے جماعت کو کمزوروں کے قوی ہو جانے سے جو فائدہ پہنچے وہ کم ہو اور مضبوطوں کی آزادی کو محدود کر دینے سے نقصان زیادہ پہنچے۔ لیکن یہ ایسا اندیشہ ہے جو جمہوریت کے تمام نظام میں پایا جاتا ہے اور اس کا تحفظ دوسری طریقوں پر کرنا چاہیئے۔

(۳) تیسری چیز جو خطرہ کا موجب بنتی ہے وہ نیم سرکاری کاروبار کی موجودگی ہے۔ سپریم کورٹ کے سنہ ۱۹۰۴ء کے نام نہاد "فیصلہ شمولیت" کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جس میں نارتھرن سیکوریٹیز کمپنی کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا ایک مشہور وکیل نے اس فیصلہ کے خلاف علی الاعلان تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اب کوئی بھی اس پرانے مقولہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ "مقابلہ تجارت کی روح ہے"۔ لیکن یہ تنقید غلط فہمی پر مبنی تھی۔ ریلوں میں ایک خاص قسم کے مقابلہ کو تو بلاشبہ تجارت کی روح قرار نہیں دیا جا سکتا

لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریلیں اور ویسے ہی اور دوسرے وسائل آمدورفت وخبر رسانی اور قوت متحرکہ معمولی تجارتی کاروبار سب اس اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کی حیثیت نیم سرکاری سی ہوتی ہے ۔ یہ کاروبار ایسے ہیں جن میں مفاد عامہ کی اہمیت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو ذاتی منافع کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی نجی کاروبار میں خریدار اور فروشندہ انفرادی طور پر سودا کرتے ہیں ؛ اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے مقابلہ کی وجہ سے قیمتوں میں یکسانیت پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود جو لوگ زیادہ طاقت یا زیادہ رسوخ رکھتے ہیں ان کے لئے خفیہ طور پر قیمتوں میں کردی جاتی ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ کاروباری آدمی کے منافع کا بیش تر حصہ چیزوں کو منافع کے ساتھ خریدنے کی مہارت میں مضمر ہوتا ہے ۔ کاروبار میں عام رواج ہے کہ مختلف گاہکوں سے مختلف قیمتیں لینے کا نظام جاری ہے ریلوے بھی چونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اسی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اس لئے "ریلوے کا مسئلہ" پیدا ہو گیا ہے ۔ اب اس بات کو تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ ڈاک خانہ کی طرح ریلوں کو بھی مختلف گاہکوں کے ساتھ ذاتی رعایت اور امتیاز کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ۔ایک دولت مند تاجر کو اپنے چھوٹے حریف کے مقابلہ میں ڈاک خانہ سے ٹکٹ سستے داموں پر نہیں ملتے اس لئے اسے مال کے کرایہ میں بھی ریلوں کی طرف سے کوئی رعایت نہ ملنا چاہیئے معمولی کاروبار میں مقابلہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مختلف افراد کے ساتھ مختلف قسم کا سلوک کیا جائے اور یہ چیز فائدہ بخش ہوتی ہے ۔ لیکن ریل کے کرایہ کے نرخوں میں مقابلہ کے معنی یہ ہیں کہ مال لادنے والوں میں ایک کے ساتھ رعایت کی جائے اور دوسرے کے ساتھ نہ کی جائے اور یہ قابل ملامت ہے ۔معمولی قیمتوں میں مقابلہ تجارت کی جان ہے لیکن ریلوے کے محاصل میں مقابلہ سے جائز تجارت فنا ہو جاتی ہے ۔

نیم سرکاری کاروبار میں جس مقابلہ کو پسندیدہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ وہ خدمت اور سہولتوں کا مقابلہ ہے۔ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ مقابلہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس کا غلط استعمال جائز نہیں ہے ۔ بعض کاروبار میں تو اس پر عمل ایک محدود حد تک ٹھیک ہے جب نسبتی مساوات موجود ہوتی

ہے اس وقت اس کا عمل بہت مفید ہوتا ہے لیکن اس کے عمل کے معیار کو برابر بلند کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ان حدود کے اندر اور ان شرائط کے ساتھ اسے ایک حیات بخش اور مفید قوت کہا جا سکتا ہے۔

مقابلہ کے بدل | مقابلہ کے جواب میں معاشی مظاہر کی نگرانی کی تین اور ممکن صورتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ (۱) رسم و رواج (۲) امداد باہمی اور (۳) اجارہ

(۱) رسم و رواج | ایک زمانہ میں رسم و رواج کی اہمیت موجودہ عہد کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی مشرق کی نسبتاً زیادہ جامد جماعتوں میں اور یورپ میں عہد وسطےٰ کے ابتدائی زمانہ میں جماعت کے کاروبار میں معاہدہ کی جگہ رواج کو پورا عمل دخل حاصل تھا۔ لوگ خاص حالات اور پیشوں کے اندر پیدا ہوا کرتے تھے اور ان سے باہر نکلنا یا تو بہت مشکل ہوتا تھا یا بالکل ناممکن۔ ہندوستان کے ذات پات کے نظام کی سختیوں میں ہمیں رسم و رواج اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں۔ قیمتیں بھی بیش تر رواج پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ عہد وسطےٰ میں منصفانہ قیمت کو جاری کرنے کی تمام کوششوں کے معنی یہ ہوتے تھے کہ جس چیز کی جو قیمت رواجاً چلی آرہی ہے وہ جاری رکھی جائے۔ سرمایہ بڑی حد تک زمین میں لگا ہوا تھا اور اس لئے غیر انتقال پذیر تھا۔ محنتیوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک تجارت سے دوسری تجارت میں منتقل ہو سکیں لیکن تاہم رواجی معیشت کی اس منزل میں بھی مقابلہ بالکل معدوم نہیں تھا۔ جتنا عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتیں مقابلہ کی مخفی اور پوشیدہ قوتوں کے اثرات قبول کیا کرتی تھیں۔ آج بھی بعض معاشی مظاہر کے معین کرنے میں رسم و رواج کا حصہ محسوس کیا جا سکتا ہے گو اب یہ تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے پس ماندہ اور ابتدائی علاقوں میں بھی مقابلہ اور مسابقت کی جدید زندگی تیزی کے ساتھ گھستی چلی جا رہی ہے۔ اس لئے صنعتی جماعت کے معاشی نظریوں کا انحصار آج کل رسم و رواج پر نہیں بلکہ مقابلہ اور مسابقت پر ہونے لگا ہے۔

(۷) امداد باہمی کو بعض اعتبارات سے مقابلہ کا بالکل برعکس اور بعض اعتبارات سے اس کا ضمنی نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے گروہ کے اندر امداد باہمی اس مقصد کے ساتھ پائی جاتی ہے "تاکہ گروہوں کے درمیان مسابقت کے کام کو بہتر طریقہ پر چلایا جا سکے" آج بھی خاندان کے افراد کے مابین کوئی مقابلہ نہیں پایا جاتا اگرچہ مختلف خاندانوں کے درمیان بڑے زور شور سے مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک کمپنی کے حصہ دار اس غرض سے اشتراک باہمی سے کام کرتے ہیں تاکہ زیادہ موثر طریقہ پر دوسری کمپنیوں سے مقابلہ کریں۔ حقیقتاً سینکڑوں قسم کی انجمنیں پائی جاتی ہیں کچھ اختیاری ہوتی ہیں کچھ جبری ان میں کلب بھی شامل ہے اور ریاست بھی جس سے جدید معاشری زندگی کی تکمیل ہوتی ہے اور جن کا کم و بیش معاشی زندگی پر اثر پڑتا ہے اور جو منڈی کی کشاکش کے ساتھ ساتھ ہم آہنگی سے کام کرتی رہتی ہے۔ اس قسم کی امداد باہمی اور مقابلہ میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

لیکن اگر امداد باہمی کو اس کو اصطلاحی مفہوم کے ساتھ لیا جائے تو اس میں پیدائش اور تقسیم دولت کے کام میں مقابلہ کا ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تقسیم دولت میں امداد باہمی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ گاہک جو اور خود کمپنی کی انجمنوں کے اراکین ہوتے ہیں اپنے میں سے کسی ایک ممبر کو اسٹور کا منیجر بنا لیتے ہیں اور جو نفع ہوتا ہے اس میں سب شریک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ چیزوں کو کہیں باہر سے نہ خریدیں اس لئے مقابلہ موجود نہیں ہوتا۔ اس قسم کے کوآپریٹو سٹور خصوصیت کے ساتھ انگلستان میں پائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈپارٹمنٹ اسٹورس کے برابر سستی چیزیں مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پیدائش دولت میں امداد باہمی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار تاجر سے نجات حاصل کی جائے اور مزدوروں کے درمیان مقابلہ ختم کیا جائے مزدور اپنے میں سے ایک یا زائد آدمی کو کاروبار کی نگرانی کے لئے چن لیتے ہیں اور منافع کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں امداد باہمی کے اصول پر دولت پیدا کرنے کے کام میں بعض نمایاں

کامیابی حاصل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کا میدان بہت محدود ہے اور مقابلہ کے بدل کی حیثیت سے اس کے اختیار کرنے میں بڑے موانع ہیں۔

(۳) جہاں امداد باہمی میں دولت کے استعمال کرنے والوں اور مزدوروں میں باہمی مقابلہ کا ترک کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں امداد باہمی کی ایک تیسری صورت اور بھی ہے جس میں سرمایہ داروں اور کاروبار کے منیجروں میں باہمی مقابلہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اس کو عام طور پر سرمایہ داروں کے اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں اگر یہ اتحاد نامکمل ہوتا ہے تو اس میں مقابلہ کا عمل داری باقی رہتی ہے اور اگر مکمل ہوتا ہے تو اجارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے کاروبار میں جب مقابلہ ختم ہوجاتا ہے تو اس کا آخری نتیجہ اجارہ ہی ہوتا ہے۔

اجارہ کئی شکلوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی اعتبار سے اسے مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم بھی کیا جاتا ہے۔ اجارے یا تو نجی ہوتے ہیں یا سرکاری ہوتے ہیں۔ پھر سرکاری اجارے بھی یا تو مالی ہوتے ہیں یا معاشرتی۔ مالی اجارے تو وہ ہوتے ہیں جنھیں حکومت مالی وجوہ سے چلاتی ہے مثلاً نمک یا تمباکو وغیرہ کے اجارے معاشرتی اجارے ایسے کاروبار ہوتے ہیں جنھیں حکومت زیادہ تر معاشرتی وجوہ سے چلاتی ہے مثلاً امریکہ میں فیڈرل ڈاک خانہ یا ساؤتھ کیرولینیا میں شفاخانہ کا نظام اس کے برعکس نجی اجارے تین قسم کے ہوتے ہیں:- ذاتی، مزدوروں کے اور سرمایہ کے۔ ذاتی اجاروں کا اظہار قدرتی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ ایک بڑے ایکٹر یا گویا بجائے خود ایک علیحدہ قسم ہے۔ مزدوروں کے اجاروں کا انحصار مزدوروں کی انجمنوں پر ہوتا ہے اور ان کا اثر خاص طور پر آجروں پر پڑتا ہے اگرچہ بالواسطہ ان سے پبلک بھی متاثر ہوتی ہے۔ سرمایہ کے اجارے ایسے ہیں جن سے عام طور پر دولت کے استعمال کرنے والوں کو براہ راست دوچار ہونا پڑتا ہے۔

پھر آخر میں سرمایہ کے اجارے بھی چار قسم کے ہوتے ہیں۔ قانونی، قدرتی، انتخابی FRANCHISE اور معمولی کاروباری اجارے (۱) قانونی اجارے ایک زمانہ میں بہت عام تھے اور بادشاہ جس پر ان کی نظر

عنایت ہوتی تھی انھیں دیا کرتے تھے۔ آج کل یہ صرف پیٹنٹس اور حق تصنیف کی شکل میں دے جاتے ہیں۔ (۲) قدرتی اجارے وہ ہیں جو قدرتی محل وقوع کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً بعض ایسی زمینیں یا معدنیں اور سمندر اور دریا جنھیں خاص قدرتی منافع حاصل ہوتے ہیں (۳) انتخابی جارے FRANCHIS نیم سرکاری کاروبار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مثلاً ریلیں، تار گھر، ٹیلیفون کمپنیوں، گیس، پانی، بجلی کی روشنی وغیرہ کی کمپنیاں کی جن کو نفع بخش طریقہ پر اس وقت چلایا جا سکتا ہے۔ جب زمین کے اوپر یا نیچے کے سرکاری شارع عام پر حق انتخاب FRANCHISE عطا کیا جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں تو انھیں قدرتی اجاروں کی ایک ضمنی تقسیم سمجھنا چاہیئے۔ یہاں تجربے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طویل زمانہ میں مقابلہ ناممکن اور ناپسندیدہ ہوتا ہے یا تو اس لئے کہ مقابلہ کی وجہ سے یا تو امتیازی سلوک روا رکھنا پڑتا ہے جیسے ریلوں کی مثال میں یا اس لئے کہ اس کی وجہ سے سڑکوں کا استعمال کرنے کے سلسلہ میں ناقابل برداشت مداخلت کی جاتی ہے یا غیر ضروری مشین اور کارخانے کھڑے کئے جاتے ہیں جیسے ان اجاروں کی مثال میں نظر آتا ہے جنھیں میونسپل اجارے کے نام سے غلط طور پر موسوم کیا جاتا ہے۔ (۴) اخیر میں معمولی کاروباری اجاروں میں موجودہ کاروبار کے بیشتر وہ کاروبار شامل ہیں جنھیں TRUSTS سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے فی الواقعی اجارہ ہونے کے بارے میں بھی جیسا کہ آگے وضاحت کی جائے گی شبہ کیا جا سکتا ہے

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوا کہ نجی اجارہ صرف ذاتی اجاروں کی شکل میں قیمتوں کی قابل اطمینان طریقہ پر نگرانی کر سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں دولت کا استعمال کرنے والا خوشی سے غیر معمولی قدرتی صلاحیت کی قدر کرنے اور اس کو ترقی دینے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نیز پیٹنٹس اور حق تصنیف میں بھی جہاں جماعت کچھ عرصہ کے لئے مقابلہ کے منافع کو ترک کرنے کے لئے اس لئے تیار ہو جاتی ہے کہ اس سے ایجاد و اختراع کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور آخر میں اور بہت زیادہ منافع حاصل ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے اجارہ کے ذریعہ قیمتوں کے تعین کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ بقیہ تمام دوسری صورتوں میں ذاتی اجارہ کی وجہ سے دولت کے صرف کرنے

والے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ جب مقابلہ کے ذریعہ خریداروں کو فائدہ پہنچانے کا امکان ختم ہو جاتا ہے تو مجبوراً قانون کو مداخلت کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے غیر محدود اجارہ کو صرف نہایت استثنائی صورتوں میں مقابلہ کا بدل سمجھا جا سکتا ہے۔

اوپر کی تمام بحث سے ظاہر ہوا کہ مقابلہ ایک ایسی قوت ہے جس سے جماعت کے معاشی مشاغل کی مستقل طور پر نگرانی کی جا سکتی ہے۔ لیکن مقابلہ ہر جگہ موجود نہیں ہوتا اور نہ ہمیشہ فائدہ بخش ہوتا ہے۔ اگر اس کی برائیوں کو اس سے جدا کر دیا جائے اور مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو جتنا یہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے اتنا ہی مفید بھی ہوتا ہے۔

معاشی آزادی

غلامی کی ابتدا اور ترقی | صنعتی آزادی نے ملکیت ذاتی کی طرح آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ وحشی کی آزادی کی جو تصویر کھینچی جاتی ہے اس کی حقیقت پریوں کے افسانوں سے زیادہ نہیں ہے ابتدائی آدمیوں میں تین طرح پر آزادی کا فقدان پایا جاتا تھا۔ اول تو فطرت کی طرف سے ان کے اندر ایک نہایت غلامانہ خوف پایا جاتا تھا دوسرے وہ اپنے زیادہ مضبوط ہمراہیوں سے خوف زدہ رہتے تھے اور تیسرے انھیں معاشرتی گروہ کا خوف رہتا تھا۔ فطری مظاہر سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ہر قسم کے خوف اور اوہام کا شکار رہتے تھے اور جادوگروں اور دوا دینے والوں کو انھیں اپنے پنجے میں پھانس لینے کا خوب موقع ملتا تھا چونکہ جس جماعت میں وہ رہتے تھے اس کا انحصار وندوں جیسی طاقت پر تھا اس لئے انھیں ہمیشہ زیادہ مضبوط وحشیوں کے رحم وکرم پر رہنا پڑتا تھا۔ پھر چونکہ دوسری طرف گروہ یا قبیلہ پر زندگی کے وسائل حاصل کرنے کے لئے انھیں انحصار کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ چاروں طرف سے ایسے معاشری رواج سے جکڑے ہوتے تھے جنھیں توڑنا ممکن نہیں تھا اور ایسی جماعتی ممنوعات کی پابندی کرنا پڑتی تھی جن سے بچنے کی کوشش حماقت تھی۔ ابتدائی فطرت نے نہیں بلکہ تہذیب نے آزادی کو پیدا کیا ہے۔ علم نے انسان کو اوہام سے نجات دی ہے۔ قانون اور انتظام نے اسے ظالموں سے محفوظ کرایا ہے اور معاشری ترقی نے زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی کی ایک ایسی فضا پیدا کی ہے جو روز بروز مطلق العانیت سے زیادہ محفوظ ہوتی چلی گئی ہے۔ سیاسی آزادی کی طرح معاشی آزادی' آزادی تقریر کی طرح خیال کی آزادی یہ سب معاشرت کی زیادہ ترقی یافتہ منازل کے نتیجے ہیں۔

جو آزادی معاشیات کے ماہروں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے وہ دو قسم کی

اول تو جسم کی آزادی جو تمام محنت کی بنیاد ہے اور دوسرے اپنی محنت پر اختیار کے علاوہ معاشی جدوجہد کی آزادی۔ اول الذکر میں (محدود مفہوم کے ساتھ) انفرادی آزادی شامل ہے اور اس سے غلامی کے مطالعہ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور دوسرے میں متعدد مظاہر شامل ہیں جن کا ذکر آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ پہلے ہم غلامی کے موضوع کو لیتے ہیں۔

غلامی کی ابتدا کے بارے میں حال کے زمانہ تک بڑی غلط فہمی پائی جاتی تھی۔ عام طور پر غلامی کے چار اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ فتح، قرض، جرم اور پیدائش۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے انھیں غلام بنایا جاتا تھا۔ یا جو لوگ خود کو فروخت کر ڈالتے تھے یا قرضہ ادا نہ کر سکتے تھے غلام بن جاتے تھے یا ایسے مجرموں کو غلام بنایا جاتا تھا جن کو قتل سے کچھ کم سزا دی جاتی تھی یا جو لوگ غلام ہوتے تھے ان کی اولاد بھی غلام رہا کرتی تھی۔ یہ بیان اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس سے غلامی کی ابتدا اس کی توسیع اور اس کے زوال پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

غلامی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعہ دوسروں سے جبراً خدمت لی جاتی ہے۔ یہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب خاصی بڑی تعداد میں مزدوروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ معاشرت کی نہایت ابتدائی منزلوں میں انسان جو کام کرتا تھا وہ شکار اور ماہی گیری تک محدود ہوتا تھا اور یہ دونوں شاغل بجائے خود دلچسپ ہوتے تھے۔ جماعت کا ہر فرد ایسے کام میں مصروف رہتا تھا اور لازمی محنت کی ضرورت نہ تھی نہ گنجایش تھی۔ جب ملکیت ذاتی پیدا ہوئی اس وقت البتہ غلامی کی ابتدا ہوئی۔ خاص خاص صورتوں میں ہمیں ملکیت ذاتی اور بار شرماہی گیروں کے گروہوں میں بھی نظر آتی ہے جیسے شمالی بحرالکاہل کے ساحل کے بعض انڈین قبائل میں۔ یہاں غلام سے ماہی گیری اور خانگی کام میں مدد لی جاتی ہے لیکن عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلامی صرف ابتدائی معاشی منزل میں جہاں غذا بغیر سرمایہ کی مدد کے سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے پائی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں یہ صورت نہیں ہوتی جیسے اسٹریلیا والوں یا امریکہ کے انڈینس اور اسکیمیں میں وہاں غلامی سے لوگ ناواقف رہتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ملکیت ذاتی کو گلہ بانی کی منزل میں اہمیت حاصل ہونا شروع ہوتی ہے

غلام سے اس دور میں گوالہ اور گڈریے کی حیثیت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ پھر ابوی خاندان ترقی پاتا ہے اور غلام خاندان کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے لیکن اس زمانہ میں بھی غلامی کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے گلوں کی نگرانی صرف چند آدمی کرسکتے ہیں اور چونکہ ایسے فلاکت زدہ آزاد آدمی کثرت سے موجود ہوتے ہیں جن سے حسب دل خواہ کام لیا جاسکتا ہے اس لئے غلاموں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ پھر اس کے علاوہ خانہ بدوشی کی غیر مقیم زندگی میں خانگی غلاموں کی بڑی تعداد کا اکٹھا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

لیکن جب ہم زراعتی منزل پر پہنچتے ہیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔ زمین کو جوتنے کا کام بہت سخت ہوتا ہے لیکن اگر مزدوروں کی کافی تعداد موجود ہو تو اس کام سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے ایک مقررہ قطع زمین پر ایک خاص حد تک محنتیوں کے ہر اضافہ کے ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور چونکہ ایک جگہ پر قیام ہوتا ہے اس لئے خانگی ملازموں کو مختلف حیثیتوں سے ملازم رکھا جاسکتا ہے غرضکہ جتنے زیادہ غلام ہوتے ہیں اتنی ہی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور غلاموں کے مالک کو آرام و آسایش کا موقع ملتا ہے۔

زراعتی عہد کے ابتدائی زمانہ میں غلامی کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ جب مالک اور اس کے خاندان کی فوری ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں تو اس کے بعد زائد مزدوروں کو ملازم رکھنے میں کوئی فائدہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب بارٹر کو ترقی ہوئی اور زائد پیداوار کے مبادلہ کے امکانات پیدا ہوئے تو زمین کے رقبہ اور غلاموں کی تعداد میں اضافہ نفع بخش نظر آنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ غلامی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ زراعتی پیداوار کے لئے منڈی ترقی پاجائے اور زمینداریوں کا انتظام کاروباری طریقہ پر کرنا شروع کردیا جائے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو غلامی سے مالکوں کو نفع حاصل ہونے لگتا ہے اور بڑی بڑی زمینداریوں میں اب کاروبار کی نوعیت اس قدر مختلف ہو جاتی ہے کہ غلاموں کی بڑی تعداد نہ صرف خانگی بلکہ صنعتی کاموں کے پورا کرنے کے لئے بھی استعمال کی جانے لگتی ہے۔ چنانچہ روم میں غلامی کی ترقی بڑے پیمانہ پر

جمہوریت کی آخری صدیوں میں ہی ہو سکی۔ اور اس زمانہ میں غلامی LATIFUNDIA کے اصول پہ بڑے بڑے کاروبار کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی۔ اسی طرح امریکہ میں غلامی نے اس وقت اہمیت حاصل کی جب ابتدا میں تمباکو اور بعد میں کپاس کو باہر کے ملکوں کو بڑے پیمانہ پر برآمد کیا جانے لگا اور ان کی کاشت کے لئے غلاموں کو رکھنا نفع بخش نظر آنے لگا۔

لیکن منڈی کے علاوہ ایک اور عنصر کا پایا جانا بھی ضروری ہے اور یہ چیز ہے خالی زمین کا موجود ہونا۔ جہاں غیر مزروعہ اور غیر مملوکہ زمین کے بڑے بڑے قطعات موجود ہوتے ہیں وہاں غلاموں کی محنت کو نفع بخش طریقہ پہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور زمیندار کے نقطۂ نگاہ سے غلامی ناگزیر چیز بن جاتی ہے۔ اگر ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہو کہ زمین کے جس قطعہ پہ چاہے قبضہ کر کے اپنے ٹکڑ پہ کاشت شروع کر دے تو پھر ظاہر ہے دوسروں کی زمین پہ کوئی شخص بھی اپنی مرضی سے کام کرنا پسند نہیں کرے گا سوائے اس صورت کے کہ دوسرے لوگ اس قدر معاوضہ دینے پر آمادہ ہوں جو اس آمدنی سے زیادہ ہو جو وہ شخص اپنی ذاتی زمین پہ محنت کر کے خود حاصل کر سکتا جب زمیندار یہ دیکھتا ہے کہ اسے خوشی سے کام کرنے والے نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اتنا معاوضہ مانگتے ہیں جو اس کے تباہ کرنے کے لئے کافی ہے تو وہ جبریہ محنت کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اور جب تک اچھی زمین غیر محدود وسعت کے ساتھ موجود رہتی ہے غلاموں کی محنت جسے ایک سطحی محنت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نفع بخش رہتی ہے۔ پرانی زمین کو بہتر طریقہ پر جوتنے کے مقابلہ میں نئی زمین کو کاشت میں لانا زیادہ فائدہ رساں ثابت ہوتا رہے گا اور محنت کو دوگنا کرنے سے زمین کے رقبہ کو بڑھانا معاشی اعتبار سے اچھا نظر آئے گا۔ جب زمین کی پیداوار ناعاقبت اندیشی سے کاشت کرنے کی وجہ سے گھٹنے لگے گی اس وقت بھی پرانے علاقوں میں غلامی نفع بخش معلوم ہوگی اور اس کا نفع زمین کے کام کی وجہ سے نہیں پیدا ہوگا بلکہ اس بنا پر پیدا ہوگا کہ پرانے علاقہ میں غلاموں کو پیدا کر کے نئے اور دور دراز کے علاقوں میں فروخت کیا جا سکے گا۔ زمیندار کے لئے یہ بات غیر اہم ہے کہ اس کی دولت زمین کی پیداوار سے حاصل ہو رہی ہے یا غلاموں کی پیدائش

سے جب تک نئی زمین کی رسد کی وجہ سے غلاموں کی قدر باقی رہے گی ان کی بڑھتی ہوئی تعداد سے زمین کی گھٹتی ہوئی زرخیزی کی تلافی ہوتی رہے گی ۔ اور اخیر میں جب پیدائش دولت میں غلامی اہمیت اختیار کر لیتی ہے تو پھر غلاموں کا استعمال صرف زراعت تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ صنعت میں بھی غلاموں سے ہی کام لیا جانے لگتا ہے۔

چنانچہ یونان کے عہد زریں میں جب میونسپلیٹوں کے درمیان باہمی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا غلامی نے بھی ترقی حاصل کرنا شروع کی اور جب یونانیوں نے بحر روم کے چاروں طرف اپنی آبادیاں بسانا شروع کیں تو غلامی کی جڑیں اور بھی مضبوط ہو گئیں ۔ یونان کی شہری ریاستیں نہ صرف غلاموں کی خاص منڈیاں بلکہ غلاموں کی نسل کشی کا مرکز بن گئیں اور آخر میں صنعت پر بھی غلامی چھا گئی۔ رومیوں کی حکومت کی آمد کے بعد غلامی کو ایک نئی زندگی حاصل ہوئی اور غلاموں کا رکھنا نہ صرف اٹلی کی سرزمین میں نفع بخش ہو گیا بلکہ اٹلی کی حکومت میں جتنے علاقے تھے ان سب میں غلاموں سے نفع بخش طریقہ پر کام لیا جانے لگا ۔ جب تک نئی فتوحات اور نئے الحاقات کا سلسلہ جاری رہا غلامی کو فروغ رہا ۔ اسی طرح جب یورپ کے مہاجر جن کے باپ دادا نے غلامی کے آخری نشان کو اپنے ملکوں سے خارج کر دیا تھا نئی دنیا میں جا کر بسے تو انھوں نے اس سرزمین میں پہنچتے ہی غلامی کو اس کی تمام پرانی سختیوں کے ساتھ دوبارہ جاری کر دیا ۔ یہ صحیح ہے کہ امریکہ میں غلامی کا نظام صرف زراعت میں ہی پھیل سکا صنعت اس سے محفوظ رہی ۔ صنعت میں اس کے نہ پھیلنے کا سبب یہ ہوا کہ ان وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا یورپ میں صنعتی تہذیب غلاموں کی منزل سے ترقی پا کر آزادی کی منزل پر پہنچ چکی تھی اسی طرح امریکہ کے جنوبی حصہ کے مقابلہ میں شمالی حصہ میں بھی صنعت میں آزاد مزدوروں کا استعمال شروع کیا جا چکا تھا اور چونکہ یورپ یا امریکہ کے شمالی حصہ سے مصنوعات کو سستی قیمت پر حاصل کیا جا سکتا تھا اس لئے صنعت میں غلامی کا رواج نفع بخش نہیں رہا تھا۔

غلامی کا زوال اور اس کا غائب ہو جانا | غلامی کے زوال اور بعد میں اس کے غائب ہو جانے کے اسباب کو جب ہم ڈھونڈتے ہیں تو اس سلسلہ میں نئی زمین کی رسد کی کمی ایک نہایت اہم سبب نظر آتی ہے

جب نئی زمین کی رسد گھٹتی ہے تو غلامی کے نقصانات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کیرنس CAIRNES کا قول ہے کہ غلامی کے کام میں تین قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ کام دل سے نہیں کیا جاتا۔ کام میں مہارت نہیں ہوتی اور کام کرنے والے میں ہمہ دانی کی کمی ہوتی ہے یعنی بہت سے کاموں کے کرنے کی اہلیت نہیں پائی جاتی۔ جب تک نہایت زرخیز زمین کثرت کے ساتھ دستیاب ہوتی رہتی ہے، سطحی کاشت فائدہ بخش رہتی ہے لیکن جب دس بیس سال تک زمین کے ایک ہی ٹکڑے کی کاشت کی جاتی ہے تو اس کی پیداآوری پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور مسلسل اور سخت محنت کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے جب ایسا ہونے لگتا ہے تو زمیندار اسی میں اپنا فائدہ دیکھنے لگتے ہیں کہ غلامی کی سختیوں میں کمی کریں اور کھیتی کے مزدوروں سے زیادہ محنت لینے کے لئے انھیں اس بات کی بھی اجازت دینے لگتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر بھی کچھ کام کرسکیں۔ روم میں غلام آہستہ آہستہ COLONUS کے نام سے موسوم کئے جانے لگے۔ جیسے کچھ صدیوں بعد انگلوسکسن تھین THEGN کی جگہ ولین VILLEIN پیدا ہوگیا تھا یعنی غلام کی جگہ رعیت پیدا ہوگئی رعیت اور غلام میں فرق یہ ہے کہ رعیت کے افراد کو کچھ ذاتی حقوق بھی مل جاتے ہیں اور وہ افراد کے ساتھ وابستہ ہونے کی جگہ زمین کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے یعنی وہ زمین کے ساتھ تو منتقل کیے جاسکتے ہیں لیکن زمین سے جدا نہیں کیے جاسکتے۔ رعیت کے افراد اپنے وقت کے ایک حصہ میں زمیندار کے لئے مفت کام کرنے کے لئے اس کے بعد بھی مجبور رہتے ہیں۔ لیکن جب زمین کی زرخیزی میں بہت زیادہ کمی واقع ہوجاتی ہے تو زمیندار یہ محسوس کرتا ہے کہ رعیت کو بالکل آزاد کرنے میں اور ایک مقررہ لگان جنس یا زر کی شکل میں لینے اور اس کو زمین پر قبضہ کرنے دینے میں اس کا نفع زیادہ ہے یہ کام آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے اور مختلف ملکوں کے مختلف حالات کے مطابق اس کی رفتار میں فرق ہوتا رہتا ہے مگر آخیر میں غلامی کا آخری نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے اور کاشتکار یا تو مزدور بن جاتا ہے یا آزاد پیشہ دار کسان۔

غلامی سے آزادی کی طرف منتقل ہونے میں عموماً پانچ منزلوں سے گذرنا ہوتا ہے (۱) آقا کی

طرف سے غلام کے بعض ذاتی حقوق کو تسلیم کرنا (۲) غلام کو ملکیت کے بعض حقوق کا عطا کیا جانا مثلاً روم کے غلاموں کو فرصت کے وقت میں ذاتی طور پر کام کر کے ایک PECULIUM یعنی انفرادی رقم کے حاصل کرنے کا حق حاصل تھا (۳) شادی کے حق کا عطیہ جس سے آقا غلاموں سے نسل کشی کرانے کے حق سے دست بردار ہو جاتا تھا (۴) غلاموں کو آزادی اس شرط کے ساتھ کہ کچھ خدمتوں کا حق محفوظ رکھا جاتا تھا (۵) غلاموں کی مکمل آزادی اور ان کی تمام خدمات کی جگہ ایک مقررہ لگان بہ شکل زر کا تعین۔

غلامی سے رعیت اور رعیت سے آزادی میں منتقل ہونے کی پوری مثال مغربی یورپ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ جہاں آبادی کے اضافہ اور نتیجہ کے طور پر اور نئی زمین کی کمی کی وجہ سے کاشت کے بہتر طریقے مجبوراً اختیار کرنا پڑے۔ اس کام میں شہروں کی آزاد صنعت و تجارت کی ترقی سے اور بھی تیزی پیدا ہو گئی اور اگرچہ داخل خارج کے عارضی جھگڑوں کی وجہ سے زمینداروں نے کہیں کہیں اس کی مخالفت کی مگر آخر میں ہر جگہ سے رعیت کا نظام ختم ہو گیا یا تو اس وجہ سے کہ رعیت نفع بخش نہیں رہی تھی یا اس وجہ سے کہ جماعت نے آزاد صنعتی کاریگری کی ضرورت اور قدر کو زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی صورت میں جیسے انگلستان میں رعیت نسبتاً خاموشی سے ختم ہو گئی دوسری صورت میں مثلاً فرانس میں جہاں زمیندار اپنے حقوق کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ رعیت کے آخری نام و نشان کو مٹانے کے لئے انقلاب کی ضرورت پیش آئی۔

امریکہ میں جہاں ابتدا میں مزروعہ رقبہ کے محض ایک حاشیہ پر قبضہ کیا گیا تھا جب آزاد مزدوروں اور امیدواروں اور قرض کے معاوضہ میں کام کرنے والوں کی تعداد کو ناکافی سمجھا گیا تو غلامی کے نظام کو اختیار کیا گیا اور پہلے انڈینس کو اور بعد میں حبشیوں کو غلام بنایا گیا۔ شمالی ریاستوں میں جہاں زمین کم زرخیز تھی اور کاشت کے اچھے طریقے اختیار کرنا ضروری تھے وہاں تو سوائے HUDSON VALLEY اور NARRAGANSETT BAY کے باغات کے اور کہیں غلامی نے گہری جڑیں نہیں پھیلائیں لیکن جنوبی ریاستوں میں آب و ہوا اور زمین دونوں کی وجہ سے غلامی زیادہ نفع

بخش ثابت ہوئی۔ جب ساحل کی زمینوں کی زرخیزی کم ہوئی تو غلامی کا رواج نئی زمینوں کو مسلسل حاصل کرتے رہنے کی وجہ سے جاری رہا۔ اس کی وجہ سے MEXICAN WAR لڑی گئی اور CUBA پر قبضہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جنوبی میسیسی کی وادی کے کھل جانے سے غلاموں کی قیمت اتنی بڑھی کہ نہ صرف ساحلی ریاستیں بلکہ اندرون ملک کے وہ پہاڑی علاقے بھی جہاں غلامی کبھی بذات خود ترقی نہیں پا سکتی تھی منڈی کے لئے غلاموں کی نسل کشی کرنے لگے اور اس وقت سے جنوب کا پورا علاقہ اس "نہل اور عجیب رواج" کا طرف دار بن گیا۔ جنوب نے جب یہ محسوس کیا کہ زمین کے غلاموں کی مزید رسد ختم ہونے والی ہے تو اسے جنگ کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا اگرچہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے جنگ کرنا پڑی تھی۔ لیکن اگر غلاموں کو اس طرح آزاد نہ بھی کیا جاتا تو بھی غلامی ضرور غائب ہو جاتی۔ جب رقبہ کی توسیع کا امکان باقی نہیں رہا اور آزاد اور تیز رفتار صنعتی نظام پیدا ہو گیا تو غلامی بذات خود نفع بخش باقی نہیں رہی یہ ضرور رعیت کی کسی شکل میں بدل جاتی اور اخیر میں آزادی کے زیادہ نفع بخش عام نظام میں مل جاتی LINCOLN کے اعلان کی وجہ سے قلم کی ایک جنبش نے وہ کام کر دیا جسے پورا کرنے کے لئے مغربی یورپ کو صدیاں صرف کرنا پڑی تھیں۔ اسی زمانہ میں زار روس نے بھی اسی قسم کا حکم جاری کیا تھا لیکن امریکہ میں اس تبدیلی کی شکل معاشی انقلاب جیسی تھی اور روس میں اس کی شکل اصلاح جیسی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روس میں تو جس چیز کو ختم کیا گیا وہ رعیت کا نظام تھا۔ لیکن امریکہ میں اس سے بھی زیادہ سخت چیز یعنی غلامی کو ختم کیا گیا۔ لیکن دونوں جگہ قانون کو بس تھوڑی سی ہی پیش قدمی سے کام لینا پڑا۔ کیونکہ معاشی حالات و واقعات کی بنا پر یہ تبدیلی تو تیزی سے واقع ہونے والی ہی تھی۔

اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ غلامی اخلاقی تعلیمات کی وجہ سے ختم ہوئی۔ یونان کے بزرگ ترین فلسفیوں نے غلامی کو جائز سمجھا تھا کیونکہ وہ کسی ایسے جماعتی نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے جس میں غلامی موجود نہ ہو۔ جنوب کے پادری ایمان داری کے ساتھ انجیل سے اسناد پیش

کرکے کہتے تھے کہ جماعتی استحکام کے لئے غلامی کا ہونا ضروری ہے ۔ بہت سے رومی مصنفوں نے غلامی کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کیا لیکن جب تک اس کی معاشی خرابیاں مصلحوں نے اور عام پبلک نے محسوس نہیں کیں اس وقت تک غلامی غائب نہیں ہوئی ۔ امریکہ کی خانہ جنگی میں اخلاقی بیداری کی ایک لہر دوڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن انسانی فطرت شمال میں بھی ویسی ہی تھی جیسی جنوب میں اور اگر شمال کی آب وہوا اور وہاں کے معاشی حالات جنوب سے مشابہ ہوتے تو اس قسم کی اخلاقی بیداری پیدا نہ ہوتی ۔ اس میں شک نہیں اعلیٰ اخلاقیات سے جماعتی زندگی کی اصلاح ہوتی رہتی ہے لیکن پائدار اثرات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو معاشی حقایق سے بھی قریبی وابستگی ہو ۔

غیر مقبوضہ زمین کی رسد جب پورے طور پر ختم ہوگئی تو غلامی بھی جماعت سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی ۔ صرف منطقہ حارہ کی بعض نو آبادیوں میں جہاں زمین کی کثرت ہے غلامی کے جاری رہنے کا کچھ امکان پایا جاتا ہے ۔ اگر نو آبادیاں جدید صنعتی ریاستوں کی محکوم یا زیر اثر نہ ہوتیں تو اس امکان کو اغلبیت کا درجہ حاصل ہوجاتا لیکن موجودہ صورت میں یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ برطانوی مقبوضات میں مزدوروں پر معاہدہ کے ذریعہ جو قانونی پابندیاں لگائی جاتی ہیں ان سے زیادہ کسی اور قسم کی سختی مزدوروں کو برداشت کرنا پڑے گی ۔ مگر یہاں بھی نیز جاوا کے "کاشت" کے نظام اور اسپینی امریکہ کے پابند ملازموں کے نظام میں بھی اس بات کی طرف سے خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ طریقے ہمیں دوبارہ رعیت کے نظام کی طرف واپس نہ لوٹا دیں ۔

غلامی اور رعیت کے نظام کی حمایت پانچ وجوہ سے کی گئی ہے ۔ (۱) غلامی مردم خوری سے بہر حال بہتر ہے ۔ شکار کو کھانے کی جگہ اس کو زندہ رہنے دینا ترقی کی طرف ایک بڑا قدم اٹھانا ہے ۔ مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھلا دیتے ہیں کہ جب غلامی نے بہت زیادہ ترقی پائی ، غلام بنانے والے لوگ مردم خواری کی منزل سے عرصہ ہوا دور ہوچکے تھے ۔

(۱) کہا جاتا ہے غلامی سے مزدوروں کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور حفاظت (مثلاً عہد وسطیٰ میں) آزادی سے زیادہ ضروری تھی مگر یہ بھی ایک ایسا مفروضہ ہے جو مزدور کے نقطۂ نگاہ سے ثبوت کا محتاج ہے۔ (۲) پھر کہا جاتا ہے کہ غلامی سے کام کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کچھ حبشیوں کو امریکہ کے جنوبی حصہ میں عاقبت اندیشی اور انتظام کی تعلیم بالکل اسی طرح دی گئی جیسے فوج کو قواعد کرائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے جو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دوسرے طریقہ سے یہی نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے تھے یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی تردید ان تمام ملکوں کی مثال سے ہوتی ہے جہاں آزاد مزدوروں نے آزاد رہ کر ترقی حاصل کی ہے۔ پھر اس کے علاوہ اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ بہت سے مزدور ان علاقوں سے آئے تھے جہاں کام سے لوگ پورے طور پر واقف تھے۔ (۴) پھر یہ کہا جاتا ہے کہ غلامی سے فرصت رکھنے والے طبقہ کی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ بھی طبقہ امرا کے مفروضات پر مبنی ہے۔ اس میں اس جمہوری امکان کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جہاں یہ توقع قائم کی جاتی ہے کہ فرصت اور تہذیب صرف چند خوش نصیب افراد تک محدود نہیں رہیں گے۔ (۵) آخر میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جہاں دیسی آبادی کام کرنا نہیں چاہتی وہاں معاشی ترقی کے لئے لازمی محنت نہایت ضروری ہے اس طریقہ استدلال میں بھی اس بات کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ معاشی ترقی کا آخری مقصد آدمی ہے دولت نہیں ہے اور نیز یہ کہ صنعتی اور فنی تعلیم کے جن ذرائع کو جدید تہذیب نے دریافت کیا ہے جب تک ان سے پوری طور پر مایوس نہ ہو جائیں اس وقت تک اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ معاشی ترقی کے لئے محنت بلاشبہ ضروری ہے لیکن جس نام نہاد ترقی کا انحصار مزدوروں کی دائمی انتفاع ناجائز پر ہو وہ کبھی پسندیدہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ غلامی چاہے وہ جزوی ہو چاہے مکمل اس کا مہلک اور تباہ کن اثر غلام اور غلام کے مالک دونوں پر پڑتا ہے۔ جدید عہد کا ضمیر اس کے جاری رہنے کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا اور خوش قسمتی

سے معاشی حقایق ہر جگہ جدید عہد کے ضمیر سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں۔ اور ان معاشی حقایق میں بنیادی مرتبہ اس حقیقت کو حاصل ہے کہ اب دنیا میں ایسی زمین باقی نہیں رہی ہے جو کسی کے قبضہ میں ہو۔

معاشی عمل کی آزادی | جس طرح جسمانی آزادی نے آہستہ آہستہ ترقی پائی ہے۔ اسی طرح معاشی اعمال و افعال کی آزادی بھی ابھی حال میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی معاشی آزادیوں کو اس لئے ترقی ہوئی ہے کہ موجودہ حالات میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آزادی کی وجہ سے دولت اور عام ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ موجودہ نظریہ قدیم اور عہد وسطے کے مطلق العنانی کے نظریہ سے جس میں فرد کی معاشی زندگی میں مداخلت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا بہت مختلف ہے۔ موجودہ نظریہ یہ ہے کہ افراد پر بھروسہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے مواقع سے فائدہ اٹھا سکیں گے اور اپنی قوتوں کو مناسب طریقہ پر استعمال کر سکیں گے ایک صحیح اور تندرست دماغ رکھنے والا بالغ آدمی عام طور پر جانتا ہے کہ اس کے لئے کون سی چیز مفید ہے اور کون سی مضر اور جب وہ اپنی اہلیتوں کا استعمال نہایت موثر طریقہ پر کرے گا تو اس سے عام طور پر جماعت کو بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ اس طریقہ استدلال میں یہ بات مضمر ہے کہ ذاتی مفاد اور عام بہبودی میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور آج کل مہذب دنیا میں ہر جگہ یا تو یہ نصب العین حاصل کیا جا چکا ہے یا اس کے حاصل کرنے کی تمنا کی جا رہی ہے۔

لیکن اگر ہم اس مسئلہ کا اور قریبی طور پر مطالعہ کریں گے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ آزادی کے معنی محض مداخلت یا نگرانی کے نقدان کے ہی نہیں ہیں۔ اسپنسر نے آزادی کا جو یہ منفی نظریہ پیش کیا ہے اور جسے اوسط درجہ کے آدمیوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے مقابلہ میں گرین نے اپنا ایک اور نظریہ پیش کیا ہے اور اس کو زیادہ مکمل شکل جدید مفکروں نے دی ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ تمام دوسری آزادیوں کی طرح معاشی آزادی بھی ابتدائی انسان کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صدیوں کی صبر آزما کوشش سے اس نے اپنی موجودہ شکل حاصل کی ہے۔ انفرادی آزادی جماعتی کوشش کا ماحصل ہے اگر اس کو تخریبی کی جگہ ایک تعمیری کوشش بنانا ہے اگر اس سے جماعتی انتشار کی جگہ جماعتی ترقی کے مقصد کو پورا کرانا ہے تو اسے دو شرطوں کو پورا کرنا چاہیئے۔

ان میں سے پہلی شرط مساوات کی ہے۔ مساوات سے ہمارا مطلب مکمل مساوات نہیں
ہے کیونکہ ایک حد تک تو عدم مساوات نظام فطرت میں داخل ہے۔ آدمی غیر مساوی جسمانی،
دماغی اور اخلاقی اہلیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور ان اختلافات کو کسی انسانی کوشش
اور احتیاط سے نہیں مٹایا جا سکتا اور جیسے ہی ملکیت ذاتی ترقی پاتی ہے ان قدرتی عدم مساواتوں
کا ناگزیر اثر مقبوضات کی عدم مساوات پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ حقیقی مساوات جو معاشی حیثیت
سے اہمیت رکھتی ہے وہ تین قسم کی ہے۔ اول قانونی مساوات یعنی اس بات کا یقین کہ قانون
کی نگاہ میں ایک آدمی کی وہی وقعت ہے جو دوسرے کی ہے اور نیز یہ کہ اس کے معاشی حقوق کا
تحفظ مساوی طریقہ پر کیا جائے گا۔ دوسرے مواقع کی مساوات اس مفہوم کے ساتھ کہ قانونی یا
معاشرتی انصاف کی بنا پر کسی شخص پر کسی پیشہ یا حرفہ کا دروازہ بند نہیں ہے۔ تیسرے سودوں کی
شرائط میں کم از کم ایسی نسبتی مساوات کہ جس سے سودے کا ایک فریق دوسرے فریق کے بالکل رحم
وکرم پر نہ رہے۔ جب تک ان تین قسموں کی مساوات نہیں ہوگی آزادی محض برائے نام رہ جائے گی
کیونکہ جس آزادی کا انحصار شدید عدم مساوات پر ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ طاقتور کو کمزور سے اپنی
بات منوانے کی آزادی حاصل ہے۔ بغیر مساوات کے آزادی دینے کے معنی ایک شخص کا اقتدار اور دوسرے
کی محکومی ہیں۔ اپنے سرمایہ کو غلاموں میں لگانے کی آزادی کی حمایت امریکہ کے جنوبی علاقہ کے
لوگوں نے نہایت زور شور کے ساتھ کی لیکن یہاں اس آزادی کے معنی ایک شخص کی آزادی اور
دوسرے کی غلامی ہوئے۔

مساوات کے علاوہ مقابلہ اور جدید معاشی زندگی کی ترقی سے آزادی کے لئے ایک اور شرط
بھی پیدا ہوگئی ہے انسانی ترقی کی موجودہ حالت میں سرمایہ کے اجتماع اور مزدوروں کے اتحاد سے
جو کثیر قوت حاصل ہونے لگی ہے۔ اس کو برے مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا
ہے۔ یہ برائیاں قانون کی زد سے باہر ہو سکتی ہیں مگر جماعتی حیثیت سے قابل ملامت ہیں۔ جب تک
بڑی طاقت میں ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے اعتدال نہ پیدا ہو اس میں درندگی پیدا ہو جانے

کا احتمال رہتا ہے۔ دولت کی ذمہ داریوں کا ذکر تو اب عام طور پر سنا جانے لگا ہے لیکن "جن کے رتبے بڑے ہیں ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں" ایسا مقولہ ہے جس کا اطلاق ہر قسم کی معاشی قوت پر کیا جا سکتا ہے چاہے وہ دولت کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو۔ جس چیز کی ضرورت ہے اور جو آہستہ آہستہ ترقی پا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت میں اتحاد اور یک جہتی کا احساس پیدا کیا جائے یعنی ہر شخص یہ سمجھے کہ وہ اپنے ہمسایوں کی بہبودی سے اپنی ذاتی بہبودی کو جدا نہیں کر سکتا اور نیز یہ کہ اس کے ہر فعل کا محاسبہ ان اثرات کی بنا پر کیا جائے گا جو اس کے فعل سے جماعت کے لئے بصورت مجموعی رونما ہوتے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کی "اخوت" والی اصطلاح میں اسی چیز کو مبہم طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور آج بھی دوسرے ناموں کے ذریعہ اسی خیال کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ معاشی شعبہ میں اس کا اطلاق ایسا ہی صحیح اور مناسب ہے جیسے زندگی کے اور دوسرے شعبوں میں۔ آزادی اگر بغیر ذمہ داری کے حاصل ہو تو یہ گمراہی پر ختم ہوتی ہے

لہٰذا صحیح معاشی آزادی کو اس اعتبار سے تعمیری سمجھا جا سکتا ہے کہ اس میں نگرانی مفقود نہیں ہوتی بلکہ نگرانی قانون کے ذریعہ سے ایسی مثبت پیچیدہ شرائط کے ساتھ کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی اہلیتوں کو آزادی کے ساتھ ترقی دینے کا موقع مل جاتا ہے۔ آزادی کا انحصار جب مساوات اور ذمہ داری پر ہوتا ہے تو اس سے افراد دولت مند اور جماعت ترقی پذیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آزادی بغیر مساوات اور ذمہ داری کے عطا کر دی جائے تو اس سے چند آدمی تو ترقی کر سکتے ہیں لیکن بہت سے زوال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ آزادی منفی مفہوم کے ساتھ اختلال اور انتشار کا موجب ہے لیکن آزادی مثبت مفہوم کے ساتھ افراد اور جماعت کے تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اول الذکر پائدار معاشی ترقی کے لئے ایک خطرہ ہے موخر الذکر اس کی معاون اور مددگار ہے۔

معاشی آزادی کی مختلف شکلیں | (۱) آزادی کی پہلی اور نہایت ظاہری شکل شادی اور طلاق کی آزادی ہے یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ شادی کا رواج محض معاشی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوا بلکہ اس کا

مقصد اس سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ مگر جب شادی کی تاریخی شکلوں کو دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس پر معاشی قوتوں کا اثر اس سے کہیں زیادہ پڑا ہے جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے شادی کی آزادی کو خصوصیت کے ساتھ موجودہ معاشی زندگی کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ شادی کے حق پر پابندیاں عاید کرنا عہد وسطیٰ میں ذاتی محکومی کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا اور زمیندار اس کو اپنی آمدنی کا ایک ذریعہ بنایا کرتا تھا۔ لیکن جسمانی آزادی کے نمودار ہو جانے کے بعد بھی شادی کا حق انھیں لوگوں کو ملتا تھا جن کے پاس کچھ جائداد ہوتی تھی۔ مثلاً انیسویں صدی کے شروع میں جنوبی جرمنی میں یہی صورت حال تھی۔ آج بھی یورپ کے بعض ملکوں میں فوجی افسر اسی وقت شادی کر سکتے ہیں جب ان کے پاس ایک مقررہ حد سے زیادہ جائداد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس طلاق کی آزادی کا وجود ابتدائی جماعت میں بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن ابتدا میں اس کا انحصار عدم مساوات پر ہوا کرتا تھا۔ جب ابوی خاندان بن گیا اور موجودہ خاندان کی ابتدا ہوئی تو شوہر کو بیوی کو طلاق دینے کا حق مل گیا۔ لیکن بیوی شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ طلاق کا نیا حق جس کا انحصار زیادہ تر مساوات پر ہے عورتوں کی معاشی آزادی کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے وسیع تر معاشی اور مذہبی پہلوؤں پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے اس لیے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

شادی اور طلاق کی آزادی کے بعد دوسرا نمبر نقل و حرکت کی آزادی کا ہے۔ عہد وسطیٰ میں اندرون ملک میں نقل و حرکت کرنے پر بھی پابندیاں لگائی جاتی تھیں۔ مثلاً انگلستان میں سکونت کے جو قوانین تھے ان کی بنا پر ایک مزدور کے لئے اپنی جائے پیدائش کو چھوڑنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا۔ موجودہ عہد میں آزادی کی ترقی سے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ مختلف ملکوں کے درمیان نقل سکونت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور جہاں کہیں ہجرت پر پابندیاں اب بھی موجود ہیں انھیں عہد وسطیٰ کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔ اس کے برعکس غیر ملکیوں کے داخلے کے خلاف جو قانون موجودہ ملکوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں ان پر تنقید آزادی کے مثبت پہلو کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ مثلاً چینیوں کے داخلے کو امریکہ نے ممنوع قرار دیا ہے۔ سستی چینی محنت سے بلاشبہ امریکہ کے بحرالکاہل کے

ساحل کے ڈھلوان علاقے کے وسائل دولت کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن چینی اور امریکی مزدور میں جو عدم مساوات پائی جاتی ہے اس کی بنا پر اس داخلہ پر سب سے زیادہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ امریکہ جیسے نئے ملک میں جہاں جتنی ضرورت ہے اس سے کم آبادی پائی جاتی ہے نئے آدمیوں کے داخلہ کی عام طور پر حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے کیوں کہ اگر نو وارد کی زندگی کا معیار اصلی باشندے کے مقابلہ میں کم ہے تو کچھ عرصہ بعد وہ خود یا اس کی اولاد امریکہ کے معیار تک اپنے آپ کو بلند کر سکے گی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ چینی امریکہ کی آبادی میں جذب ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اور امریکہ کے معاشرتی طریقوں کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے کم تر معیار کو قایم اور برقرار رکھتا ہے اور اگر خاصی تعداد میں موجود ہو تو امریکہ کے معیار کو بھی اپنی پست سطح تک گرا سکتا ہے۔ چنانچہ داخلہ کی اگر آزادی دے دی جائے تو پیش نظر مثالوں میں اس سے تاجروں کی مرفہ الحالی میں تو اضافہ ہوگا اور نو وارد کی آسائش میں بھی مقابلتاً ترقی ہو جائے گی۔ مگر امریکہ کے مزدور کی حالت مستقل طور پر سقیم ہو جانے گی آخر میں بصورت مجموعی معاشی زوال کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک جھوٹی آزادی ہوگی کیونکہ اس کا انحصار عدم مساوات پر ہوگا۔

مگر جہاں تیزی کے ساتھ مساوات پیدا ہونے کا امکان پایا جائے اور جہاں غیر ملکی حکومتیں یا منتقل کرنے والی کمپنیاں مصنوعی طریقہ پر لوگوں کا داخلہ نہ کرا رہی ہو وہاں داخلہ پر پابندیاں عاید کرنا معاشی حیثیت سے نقصان رسان ہے۔ امریکہ میں ۱۸۵۵ء کے آس پاس کے زمانہ میں جاہل لوگ اسی غلطی کا شکار تھے اور آج بھی امریکہ میں داخلہ پر پابندیاں عاید کرنے کے جو لوگ حامی ہیں وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ ادنیٰ طبقے کے نو وارد کی وجہ کم اجرت دینے والے کارخانوں کو ان کی مرضی کے مطابق مزدور مل جاتے ہیں اور اس سے مزدوروں کے مسئلہ میں پیچیدگی اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کا علاج داخلہ کو ختم کرنا یا اس پر سخت پابندیاں لگانا نہیں ہے بلکہ اجرتوں کو بڑھانا اور مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ یہ کام مزدوروں کی تنظیم کے ذریعہ قانون سازی، دولت کے اضافہ اور کلیتاً کاروبار کے اختیار کرنے سے کیا جا سکتا ہے کسی ایسے ملک

میں جہاں مزدوروں کی رسد پہلے ہی سے زیادہ ہو اوپر لکھی ہوئی دلیل کی اہمیت ضرور کم ہوجائے گی۔ لیکن امریکہ میں ابھی ایسی حالت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ نوواردوں کا داخلہ عام طور پر بالکل بند کردیا جائے یا اس پر سخت پابندیاں عاید کردی جائیں۔

(۳) نقل وحرکت کی آزادی کے بعد پیشے کی آزادی کا نمبر ہے۔ پچھلے زمانے میں پیشہ انتخاب کرنے کے حق پر متعدد قسم کی پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ سب سے خراب صورت تو وہ تھی جہاں ذات اور رواج کی بنا پر ترقی کو روکا جاتا تھا اور لوگوں کو ایسے پیشوں میں لگایا جاتا تھا جن کے لئے وہ موزوں نہیں ہوتے تھے۔ پیشے کی آزادی کی وجہ سے جہاں تک ممکن ہے صحیح آدمی صحیح کام پر لگ جاتا ہے اور اس سے دولت کی پیدائش میں اضافہ اور تقسیم میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔ جدید نظام معاشرت میں صرف ان پیشوں کیلئے جہاں نااہلیت سے غیر ذمہ داری کے پیدا ہونے اور دوسروں اور خود اپنی ذات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے اہلیت کی شہادت فراہم کرنے کے لئے لوگوں کو پابند کیا جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں، دانتوں کے ماہروں، انجنیروں، ہوابازوں وغیرہ سے جو سرٹیفکٹ مانگے جاتے ہیں وہ صحیح آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتے بلکہ اسے ہموار کرتے ہیں۔ ٹریڈ یونین میں جو امیدواروں کے قواعد موجود ہوتے ہیں وہ کبھی تو مفید ہوتے ہیں اور کبھی مضر۔ جہاں ان کا مقصد اچھے کام کی ضمانت کرنا ہوتا ہے یا جہاں اس کا مقصد کم والے مزدوروں کے یکبارگی داخلے سے اجرتوں اور مزدوروں کے معیار زندگی کے زوال کو روکنا منظور ہوتا ہے وہاں ان کی حمایت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں اہل مزدوروں کو باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ایک بند جماعتی اجارہ قائم کیا جاتا ہے۔ جیسے پنچایتی نظام کے آخری دور میں تھا تو اس قسم کی پابندی کے لئے کوئی وجہ مدافعت نہیں معلوم ہوتی۔

(۴) آزادی کی ایک اور قسم متحد ہونے کی آزادی ہے۔ معاشی اغراض کے لئے جو اتحاد کئے جاتے ہیں ان کی خاص شکل مزدوروں اور سرمایہ داروں کی انجمنیں ہیں۔ قدیم روم میں ابتدائی زمانے کے سوا ہمیں سیاسی اور معاشی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کو سختی کے ساتھ

تھا جس زمانے میں سیاسی اور مذہبی مقاصد کے لئے متحد ہونے کا حق لوگوں کو مل گیا تھا اس وقت بھی مزدوروں کے اتحاد کو ممنوع قرار دیا جاتا تھا۔ موجودہ فیکٹری کے نظام میں اس قسم کے اتحاد نے ٹریڈ یونین کی شکل اختیار کر لی ہے۔ انگلستان میں ۱۸۲۴ء تک اور امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں اس سے اور بعد تک مزدوروں کے اتحاد قائم کرنے کی مخالفت قائم رہی۔ اب اتحاد کو قانونی طور پر اس لئے جائز سمجھا جاتا ہے کہ اس سے مزدوروں کو صحیح معنی میں آزادی حاصل ہوتی ہے۔ مزدوروں کی انجمن چونکہ مشترکہ طور پر اجرتیں طے کرنے کا حق رکھتی ہے اس لئے اس کے ذریعے سے مزدور کی اہمیت سرمایہ دار کے مقابلے میں مساوی ہو جاتی ہے اسی طرح سرمایہ کو بھی کمپنی یا کسی دوسرے اشتراک کی شکل میں آزادی کے ساتھ متحد ہونے کا حق گذشتہ نصف صدی میں حاصل ہوا ہے۔ مگر یہاں بھی جب اتحاد کی برائے نام آزادی سے تجارت میں رکاوٹ یا عملاً ایسا اجارہ ہوتا ہے جو مفاد عام کے لئے مضر ہے تو جماعت اس بات کی مجاز ہے کہ جہاں کہیں اس مقابلے سے شدید عدم مساوات پیدا ہو یا جہاں مقابلہ بغیر جماعتی ذمہ داری کا احساس کئے ہوئے کیا جائے وہاں وہ اس قسم کی زیادتیوں کا تدارک کرے۔ مگر قبل اس کے کہ مداخلت کی اجازت دی جائے تجزیہ کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر آزادی کو عدم مساوات کے محض گمان یا اندیشہ پر ترک کر دیا گیا تو اس سے آزادی اور مساوات دونوں کا خون ہو جائے گا۔ قانونی کارروائی کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ محنت یا سرمایہ کے اتحاد کے خلاف معقول شہادتیں موجود ہوں۔

(۵) آزادی کی پانچویں قسم یعنی دولت کے استعمال یا صرف کی آزادی کے بارے میں یہاں صرف ایک بات کہنی ضروری ہے پرانے زمانے کے مفصل قوانین جس میں جزئی طور پر اس کا تعین کیا جاتا تھا کہ کن کن چیزوں کو کھانا اور پہننا چاہیئے نیک نیتی پر مبنی ہوتے تھے۔ لیکن ان سے نتیجہ ہمیشہ ٹھیک نہیں نکلتا تھا۔ احتیاجات کی توسیع کو چونکہ ان کے ذریعے محدود کیا جاتا تھا اسی لئے معاشی ترقی بھی رک جاتی تھی۔ موجودہ معاشرت نے اس نظام کو مکمل طور پر ترک کر دیا ہے سوائے اس صورت کے کہ جہاں اس قسم کی بندشیں صحت عامہ یا حفاظت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں مثلاً ضرردست سے

زیادہ پکے ہوئے پھلوں یا سڑے ہوئے گوشت یا افیون جیسی اشیاء کا استعمال۔

(۶) چھٹی آزادی اشیاء کی پیدائش کی آزادی ہے جس میں معاہدہ اور تنظیم (خطر انگیزی) کی آزادی بھی شامل ہے۔ یہاں بھی موجودہ عہد میں اہمیت دوسری ہی چیزوں کو دی جانے لگی ہے۔ دنیا کے آدمی اب حکومت کو ایک ہمہ دان، ہمہ فہم، رعایا پرور ادارہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اب یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ حکومتیں نہ رعایا کے لئے ہمیشہ مشفق ہوتی ہیں اور نہ ہمہ دان اور ہمہ فہم۔ مثلاً عہد وسطیٰ کی حکومتوں کے بنائے ہوئے قوانین اس قدر پیچیدہ اور متناقض ہوتے تھے کہ ان سے انفرادی آزادی عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور پیدائش دولت کے اضافے کی کوشش کرنے والوں کو ان کی مداخلت کی وجہ سے ترقی کا پورا موقعہ نہیں ملتا تھا ایسے قوانین کا منسوخ کرنا ہی فائدہ مند تھا۔ جب فرانسیسی صناعوں نے کولبرٹ سے کہا تھا (LAISSEZ NOUS FAIRE) یعنی حکومت کی طرف سے عدم مداخلت ہی اچھی پالیسی ہے لہذا ہمیں پوری آزادی عمل دی جائے تو ان کے پیش نظر اسی قسم کے نقصان رساں قوانین تھے (ان مواقع کو توڑنے کے لئے جو ترقی کے راہ میں حائل تھے اور جن کی وجہ سے لوگوں کو مساوی مواقع حاصل نہ تھے) اس قسم کی تخریبی کوشش نہایت ضروری تھی لیکن موجودہ زمانے میں جماعت کے متعلق طبقوں کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے فطری اور عملی دونوں حیثیتوں سے عدم مداخلت کی پالیسی میں ترمیم کرنا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ موجودہ زندگی میں پیچیدہ ضرورتوں کی وجہ سے حکومت کے واسطے لازمی ہوگیا ہے کہ دولت کے صرف کرنے والوں، کاروبار میں روپیہ لگانے والوں اور عام پبلک کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے صنعت وتجارت کی تنظیم کی نگرانی کرے۔ لیکن عہد وسطیٰ اور موجودہ عہد کی مداخلت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر مقابلے کو ختم کرنا چاہتی تھی اور آخر الذکر اس کی مملکت کو وسیع اور اس کی سطح کو بلند کرنا چاہتی ہے۔ البتہ اس قاعدے سے صرف اسی مداخلت کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے جہاں مقابلے پر یہ دیکھ کر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں کہ اس سے دولت ضائع ہو رہی اور نا اہلیت ترقی پا رہی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں مقصد ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ آزادی کو مساوی اور ذمہ داری کے حصول کا ایک ذریعہ بنا کر ترقی دی جائے۔ فیکٹری کے قوانین

سے مزدوروں کو مقابلہ کا بہتر موقع ملتا ہے۔ ریلوے کے قاعدوں سے سامان روانہ کرنے والوں کے ساتھ مساوی برتاؤ ہونے لگتا ہے۔ بنکوں، بیمہ کی کمپنیوں اور دوسری کمپنیوں کی نگرانی سے ساہوکارے کے کاروبار میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ ان سب صورتوں میں مداخلت جائز ہے کیونکہ اس سے یقینی اور زیادہ ہمہ گیر آزادی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں آزادی کے مثبت پہلو کو سامنے رکھنا چاہیئے نہ کہ منفی پہلو کو۔

(۷) سب سے آخر میں تجارتی آزادی کا نمبر ہے۔ یہ درحقیقت آخرالذکر عنوان میں شامل ہے اس لئے کہ تجارت بھی اشیاء کی پیدائش کا ہی دوسرا نام ہے مگر تجارت کی بحث پیدائش دولت کے موضوع کا اس قدر اہم حصہ ہے کہ عام طور پر اس کا بیان جداگانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں اندرون ملک کی تجارت پر سے تو عہد وسطیٰ کی تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ اس لئے آج کل اس سلسلہ میں جو بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے اس کا تعلق بین الاقوامی تجارت سے ہوتا ہے۔ یہاں بھی عام نظریہ آزاد تجارت کی موافقت میں ہے۔ مگر آزاد تجارت ہمیشہ اور لازمی طور پر مفید نہیں ہوتی۔ اگر ایک شئے کو پیدا کرنے میں دو ملکوں کی نسبتی عدم مساوات زیادہ ہوگی تو کمزور ملک میں ایسی صنعتوں کی ترقی رک جائے گی جو اس ملک کے لئے نفع بخش یا بہت زیادہ ضروری ہو سکتی ہیں۔ ان حالات میں اگر صنعت کا اس طرح تحفظ کیا جائے کہ ملک کے اندر مقابلہ کا سلسلہ جاری رہے تو اس سے ملکی اور غیر ملکی صناعوں میں نسبتی مساوات پیدا ہو جائے گی جس سے آخر میں دولت کے استعمال کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ مگر یہ پالیسی صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب تحفظ سے اہلیت کارکردگی کا واقعی اضافہ ہو اور جب درمیانی زمانہ کا لازمی معاشی نقصان، بعد کے زمانہ کے فائدہ سے زیادہ نہ ہو۔ صرف ایسی صورت میں بین الاقوامی تجارت کی آزادی میں مداخلت جائز ہے کیونکہ صرف اسی قسم کی مداخلت بعد کی زیادہ حقیقی اور مفید آزادی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

انفرادی آزادی کا معاشری پہلو اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ موجودہ زمانہ میں آزادی کو سبب نہیں بلکہ نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مفہوم صرف رکاوٹوں کا نہ ہونا نہیں ہے کیونکہ یہ صورت گمراہی اور بے راہ روی کی ہے آزادی کی نہیں۔ ہر قوم کی معاشری ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب انفرادی

آزادی پر سب لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کچھ پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں رواج کے ذریعہ یا اختیاری جماعتی قوانین یا جبری قوانین کے ذریعہ لگائی جاتی ہیں۔ اچھے آداب و اطوار اور معاشری رسومات جن کی وجہ سے افراد کی آزادیاں محدود ہو جاتی ہیں تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ انجمنیں مثلاً گرجاگھر، کلب اور تجارتی یونین ایسے قوانین بناتی ہیں جن کی ہر رکن کو پابندی کرنا پڑتی ہے۔ گورنمنٹ بہت سے ایسے قوانین بناتی ہے جن کی معقولیت میں کسی کو شبہ نہیں ہوتا اور جن کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں انفرادی آزادی کو لازمی طور پر کچھ پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں۔ صنعتی معاملات میں خصوصیت کے ساتھ انفرادی آزادی سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ جب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اس وقت تو آزادی کو قربان کرنے میں تامل نہیں کرتے لیکن جب دوسروں کے مفاد میں آزادی پر کوئی پابندی عاید کی جاتی ہے تو آزادی کا نام لے کر شور مچاتے ہیں مثلاً ریلوے کے مالک دوسرے سرمایہ داروں سے اتحاد کر کے اپنی آزادی پر خود تو پابندیاں عاید کر لیتے ہیں لیکن جب مال روانہ کرنے والوں کے مفاد میں پابندیاں عاید کی جاتی ہیں تو اس کو مداخلت بیجا سے تعبیر کرتے ہیں۔ غلاموں کا مالک تجارت کی آزادی کا تو طالب تھا لیکن انسان کی آزادی کی طرف سے بے پروا تھا۔ صناع اپنے بیرونی حریف سے تو تحفظ چاہتا ہے لیکن فیکٹری کے قوانین کی مخالفت کرتا ہے۔ جب مبادلہ خارجہ کے سٹہ سے کپاس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو کپاس بونے والا اس بات کی تعریف کرتا ہے لیکن سوت کاتنے والا سٹہ کی آزادی کی برائی کرتا ہے۔ فیکٹری کا مالک خود تو فروخت کرنے والی انجمنوں میں شامل ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ اشیاء کی پیداوار پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں یا قیمتوں کو مقرر کیا جاتا ہے لیکن مزدور سبھاؤں کے ظلم کا رونا روتا رہتا ہے۔ مزدور سبھائے امیدواروں کے داخلہ مزدوروں کی آزاد بھرتی اور بائی کاٹ کے بارے میں تو قانون بناتی ہے لیکن سرمایہ داروں کی طرف سے جو مزدوروں کو فیکٹری میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ یا سرمایہ دار جب ٹرسٹ بناتے ہیں تو اس کی سخت مخالفت کرتی ہے ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوا کہ اس معاملہ میں کس قدر کج بحثی سے کام لیا جاتا ہے۔ آزادی کا صحیح مفہوم

سمجھنے کے لئے آزادی کو معاشری اور انفرادی دونوں نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ افراد نے جو کچھ بھی ترقی کی ہے وہ جماعتی کوشش کے طور پر کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرد جماعت کا پابند ہے۔ جس آزادی سے معاشری ترقی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ مشترکہ مقصد کے حاصل کرنے کے لئے فرد ہمیشہ آمادہ رہے۔ اگر یہ آمادگی ذاتی مرضی اور اختیار سے نہیں ہے تو اس طرف مائل کرنے کے لئے یا تو ترغیب دینا چاہیئے یا مجبور کرنا چاہئے۔ آزادی تاراج اور ظلم کی قوتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا دوسرا نام ہے ایسی انفرادی آزادی جو دوسروں کے حقوق کو یا اکثریت کے بہترین مفاد کو فراموش کردیتی ہے اصلی آزادی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے اسی طرح سے جماعت کی طرف سے ایسی پابندیاں جو افراد کی ترقی کے امکانات کو بھلا دیتی ہیں اصلی آزادی کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ معاشی نقطۂ نگاہ سے صرف اسی چیز کو آزادی کہا جا سکتا ہے جو گروہ کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے نصب العین کو سامنے رکھتی ہے اور گروہ کے اندر اور باہر ہر فرد کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت صرف کرنے کے مواقع کو ترقی دیتی ہے۔ ایک شخص کی آزادی سے دوسرے اشخاص کی معاشی ترقی خطرہ میں نہ پڑنا چاہیئے۔

جس طرح آزادی کی سیاسی تعبیر یہ ہے کہ حکومت میں جمہوریت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح معاشی آزادی جو ترقی کی ضامن ہے اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب معاشی جمہوریت پیدا ہو جائے۔ اس کی کمترین شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو معاشی مواقع حاصل ہوں اور مواقع کا انحصار بڑی حد تک مساوات اور ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ اس مفہوم کے مطابق بہترین حکومت وہ نہیں ہے جو کم سے کم مداخلت کرتی ہے بلکہ وہ ہے جو وسیع اور بعید تر آزادی کی لازمی شرائط کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ آخری تجزیہ کے بعد معلوم ہوگا کہ معاشی آزادی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے بے عملی کا نہیں۔ مداخلت سے پیدا ہوتی ہے عدم مداخلت سے نہیں۔

اعلان

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا ہے۔ جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انھیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھی گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں اور تمام مقالے سکریٹری اردو اکادمی کے پاس ۱۵ ستمبر تک پہنچ جانے چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکریٹری کو مطلع کر دیں۔

ازطرف
سکریٹری اردو اکادمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

فہرست مضامین

اشتراکیت
نازی ازم
سامراج
وطنیت
سرمایہ داری
بحیرۂ روم کی سیاست
بحرالکاہل کی سیاست
امریکہ اور سیاست عالم
نوآبادیوں کی تقسیم
ممالک اسلامیہ کی سیاست
فاسزم۔

نئی کتابیں

۱۔ گئودان: منشی پریم چند مرحوم بی۔ اے کا یہ دلچسپ ناول پہلی بار ہندی سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔ اور دیہات کے ان پڑھ اور سادہ لوح انسانوں کی زندگی کا صحیح ترین مرقع ہے۔ قیمت مجلد عہ/

۲۔ محکومیت نسواں: معین الدین صاحب انصاری بی۔ اے (کنٹیب) بارایٹ لا یہ مل کی معرکۃ آلارا تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جانے کی پر زور طریقے پر حمایت کی گئی ہے۔ قیمت مجلد عمر/

۳۔ خیالستان: سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔ اے۔ جس کی اشاعت نے اردو ادب میں ایک نہایت دلکش انداز پیدا کر دیا ہے اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نویں بار چھپی ہے۔ قیمت مجلد عا/

۴۔ دنیا کی کہانی: پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) نے ہزاروں برس کی تاریخ اس قدر دلچسپ اور نرالے انداز سے لکھی ہے کہ پڑھنے والا آسانی سے تاریخ کا اصل مفہوم سمجھ جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد عا/

۵۔ رحمۃ للعلمین: حصہ اول الحاج مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب کی مستند اور مقبول ترین تصنیف جو ہم نے خاص اہتمام سے حال ہی میں پانچویں بار شائع کی ہے۔
قیمت دو روپے

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ

مضامینِ محمّد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی۔اے (آنرز) فاضل جامعۂ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دَور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست جنیدۂ ہند
۲۔ مسائل ملی: سنت ابراہیمیہ اور سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند
۴۔ مسلمان اور کانگرس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس
۹۔ مسلمان اور آزادی
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی راجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۶۰۰ صفحات مجلد قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ
قرولباغ - نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ
جامع مسجد - دہلی

مکتبہ جامعہ
لوہاری دروازہ - لاہور

مکتبہ جامعہ
امین آباد - لکھنؤ

مکتبہ جامعہ
پرنس بلڈنگ - جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

مکتبہ جامعہ دہلی

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے

سیاست کی پہلی کتاب قیمت ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتداء ... " ... ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض ... " ... ۴ر

مسئلہ آبادی .... " ... ۴ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم-اے

جلد ۳۲	ستمبر ۱۹۳۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱- فلسفۂ لغت — از جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل
۲- قومی تنظیم — از پروفیسر کے-ٹی شاہ جنرل سکریٹری قومی تنظیمی کمیٹی
۳- کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟ — از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ
۴- کمپنی کی تجارت ہندوستان میں — از جناب منت اللہ رحمانی صاحب ایم-ایل-اے
۵- فلسفۂ مزاج — از جناب عبدالعزیز صاحب فاروقی بی-اے
۶- ملکوں کی دولت مندی کا اندازہ کس طرح کیا جاتا ہے .. ..
۷- کاروبار کی تنظیم کی مختلف شکلیں .. ..
۸- دنیا کی رفتار

م-م

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلہ خیالات کر سکیں گے۔
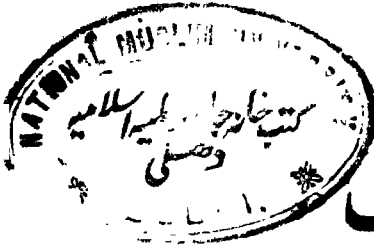
فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب باعالی فرنگی محل)

تمہید | انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے وہ جماعت سے الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جماعت میں رہنے والا تبادلہ خیالات اور اظہار مطلب کے لئے مجبور ہے تاکہ ابتدائی زندگی کے ضروریات میں ایک انسان کو دوسرے سے مدد مل سکے۔ اس مقصد کے لئے اول اول صرف اشارے اور کنائے مقرر ہوئے جن سے ادائے مطلب کا کام ناقص طور پر انجام پاتا تھا۔

کیونکہ دور بربریت کے ابتدائی عہد میں ضروریات زندگی محض سادہ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق ہوتی تھیں آبادیاں نہایت قلیل تھیں پیٹ بھرنے کے لئے پھل پھلاری یا شکار کا گوشت تن ڈھانکنے کے لئے چوڑی پتیاں یا جانوروں کی کھالیں موسمی شدائد سے بچنے کے لئے پہاڑی غار یا درختوں کے کھوکھلے تنے کافی تھے اس لئے عرصہ دراز تک چند مہمل آوازوں کے ساتھ ساتھ جسم کی حرکت دست و ابرو کے اشارے ان کا مافی الضمیر ادا کرتے رہے۔

لیکن رفتہ رفتہ آبادیاں بڑھنے لگیں انسانی ضروریات میں اضافہ ہوا معاملات گنجلک اور معاشرت پیچیدہ ہوتی گئی اب خارجی دنیا اور خود انسانی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر بڑھ گیا کہ اشارات و علامات ادائے مطالب کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہونے لگے علاوہ بریں اشیاء مادی کے ذریعہ اظہار خیال میں غلط فہمیاں بھی ہونے لگیں جن کی وجہ سے معاملات میں خلل واقع ہوتا تھا۔ لہذا اظہار خیالات کے لئے دوسرے ذرائع کی دریافت کی جانب انسان کا ذہن رجوع ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح جذبات و احساسات کا اظہار آوازوں سے خواہ وہ کتنی ہی بھونڈی کرخت اور ثقیل کیوں نہ ہوں کیا جاتا ہے اسی طرح تمام ضروریات خواہشات اور خیالات بھی ترتیب وار آوازوں کے ذریعے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ

ساتھ آوازوں نے بھی ترقی کر لی تھی اس لئے متکلم ہونے میں پہلا وقت آوازیں کام آگئیں۔

شروع شروع جب آوازوں کے ذریعے سے انسان نے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو اس کے سامنے زندہ یا مردہ آوازوں کی ایک وسیع دنیا موجود تھی جیسے بادل کی گرج ہوا کی سنسناہٹ ٹہنیوں کا چرانا یا مثلاً گھوڑے کی ہنہناہٹ مینڈک کا ٹرانا کتے کا بھونکنا وغیرہ۔ ابتدا میں اس نے اشیاء کے نام ان آوازوں کی نقل کر کے رکھے جو اشیائے مذکورہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً (کٹ) ایسی آواز ہے جو کسی چیز کے کٹنے سے پیدا ہو یہ آواز اسی معنی میں باختلاف مخارج دنیا کی اکثر زبانوں میں پائی جاتی ہے جیسے انگریزی میں CUT عربی میں (قط قطع وغیرہ) یہ طریقہ آسان اور قدرتی تھا۔ پہلے تو صرف مسموعات ہی کی نقل ہوتی تھی لیکن بعد میں مرئیات اور ملموسات وغیرہ سے بھی اسمار اصوات حسی بننے لگے جیسے اردو میں سبزہ لہلہانا چہرہ تمتانا۔ چراغ ٹمٹمانا۔ جواہرات جگمگانا۔ آنسو ڈبڈبانا اصوات مرئی کی مثالیں اور گدگدی۔ بدن سنسنانا۔ بلبلانا۔ پیر جھنجھلانا۔ اصوات لمسی کی مثالیں اور چٹپٹا صوت ذوقی کی مثال ہے۔ عربی میں (تضعضع تذبذب۔ مربب۔ مقبقب۔ وغیرہ)

جب تمدن نے کسی قدر ترقی کی اور انسان کو ایک چیز کی مختلف حیثیتوں کا علم ہوا تو اس نے معلومہ لفظ میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کر کے نئے الفاظ بنا لئے جن میں پہلا مفہوم قائم رہا۔ جس کی مثالیں اردو میں (کٹ۔ کوٹ۔ کھد) اور عربی میں (قط۔ قطع۔ قتل) ہیں۔ جب انسانی ضروریات زیادہ بڑھ گئیں اور مفرد الفاظ سے کام نہ چل سکا تو ان پر علامات کا اضافہ کیا گیا جیسے کٹنا۔ کاٹنا کٹوائی۔ پھر مشتقات پیدا ہوئے جیسے کاٹا۔ کاٹتا ہے۔ کاٹے گا۔ کاٹنے والا۔ کٹا ہوا۔

یہ تغیرات ایک ہی دن میں نہیں تمام ہو گئے۔ بلکہ روزافزوں انسانی ضروریات کے ساتھ جاری رہے موجودہ زبانیں قرنہا قرن کے حوادث طبعی کا نتیجہ ہیں۔ جب تک دنیا میں نسل انسانی کا وجود ہے اس وقت تک زبانوں میں تغیرات ارتقائی جاری رہیں گے۔

زبان یا لغت۔ لغت ایسی بامعنی آوازوں کا نام ہے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر ادا کر سکے۔ قوموں کے اختلاف اور ان کی گوناگوں آوازوں کی بدولت بے شمار زبانیں یا لغتیں عالم وجود میں آ گئیں

جو ایک دوسرے سے اسلوب بیان معانی اور الفاظ کی ساخت میں الگ الگ ہیں۔ کیونکہ جس طرح کی آوازیں ایک قوم آسانی سے نکال لیتی ہے بسا اوقات اسی طرح کی آوازیں نکالنا دوسری قوم کے لئے دوبھر بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اس چیز کا ہم آپ روزانہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یورپین اپنی پوری کوشش صرف کرنے پر بھی بدقت تمام شاید ہی (ح، خ، ع، غ، ض) کا تلفظ صحیح طور پر ادا کرسکیں۔ اسی طرح عربوں میں اکثر و بیشتر وہ لوگ ملیں گے جو (T, D, P, WH) کسی طرح بھی ادا نہیں کرسکتے۔ وسط افریقہ میں بسنے والے قبائل کی لغت سے حروف شفویہ (جو حروف ہونٹوں کی مدد سے ادا کئے جاتے ہیں جیسے م، پ، و، ہ، ف) یکسر مفقود ہیں۔ کولمبیا کے سرخ ہندوستانی (ب، ف، ج، د، و) بالکل نہیں نکال سکتے۔ آسٹریلیا کے اکثر باشندے حروف صفیریہ (جن حرفوں میں سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے مثلاً س، ش، ص، ث، ز، ظ) کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ نیوزیلینڈ والے مندرجہ ذیل حروف (ب، س، د، ف، ح، ح، ل، ق، ص، د، ی) سے بے نیاز ہیں۔ قدیم مصری زبان ہیروگلیفی (HIEROGLYPHIC) ان حروف سے یکسر خالی ہے (ب، ج، د، ز، ظ، ض) سنسکرت میں یہ حروف نہیں (ف، ق، خ، ع، غ، ز، ذ، ظ) تامل میں ان حرفوں کا استعمال نہیں ہے (ج، ح، خ، د، ذ، ڑ، ز، ش، ع، غ، ف، ق، ہ) اس اختلاف تلفظ سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ایک زبان بولنے والی قوم کے اعضاء نطق کی ساخت طبعی طور پر یکساں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بعض مخارج پر قادر ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ (ت، م، ن، ہ) ایسے حروف ہیں جن کو ہر قوم آسانی سے ادا کر لیتی ہے کیونکہ اختلاف ہوتے ہوئے بھی یہ حروف تقریباً کل زبانوں میں پائے جاتے ہیں (بجز ہار مخلوط کے) اگر ہم "ہ" کے طریقہ تلفظ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا تلفظ طبعی ہے جس کو ادا کرنے میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی جب کہ ہم عادتاً سانس نکالتے وقت منہ بھی کھول دیں "ت" اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ سانس خارج کرتے وقت زبان اوپر کے دانتوں سے لگا لی جائے۔ جو آواز منہ کو اندر سے پولا کرکے ناک اور منہ سے نکالی جائے وہ "م" ہوگی۔ "ن"

"بمی اُم" ہی کی طرح ادا کیا جاتا ہے جب کہ زبان تالو سے لگا کر منھ کھول دیا جائے۔

ان آوازوں کے معانی اور مرکب الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں زبانیں اور لہجے پیدا ہو گئے جو شمار سے باہر ہیں۔ موجودہ زمانہ کا علم اللغت (PHILOLOGY) ان کی حالتوں کا اندازہ کر کے دو قسمیں کرتا ہے "ترقی یافتہ" اور "غیر ترقی یافتہ" اس دوسری قسم میں وہ زبانیں شامل ہیں جو اسلوب بیان کے اعتبار سے کمتر درجہ کی ہیں اور الفاظ کے اعتبار سے بسیط۔ مثلاً زنگیوں کی زبانیں جو جنوبی افریقہ میں بولی جاتی ہیں یا امریکی زبان جو سرخ ہندوستان میں مستعمل ہے چینی بھی انھی زبانوں میں شامل ہے جس کی خاص صفت یہ ہے کہ تمام الفاظ ایک ہی طرح کے ہیں جن میں اسم فعل اور حرف کا مطلق امتیاز نہیں۔ ایک ہی لفظ اسم فعل اور حرف کا کام دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ دوسرے معنی دار الفاظ لگا دیے جائیں۔ حامی زبانیں قدیم مصری قدیم حبشی بربری بھی اس قسم میں داخل ہیں۔ (بعض ماہرین لغت نے قدیم مصری زبان "HIEROGLYPHIC" کو مشرقی زبانوں میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ اکثر حالتوں میں ان سے ملتی جلتی ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ اصل زبان ہے اور وہ سب اس کی فرعین ہیں اس کا اصلی نام حامی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کو حام بن نوح ؑ کی اولاد بولتی تھی۔)

اب رہیں ترقی یافتہ زبانیں جن کی امتیازی شان یہ ہے کہ غیر محدود بولنے والے رکھتی ہیں اور انسان کی مختلف تعبیری ضروریات کو پورا کر دیتی ہیں انھیں کی فرعین متمدن اقوام میں مستعمل ہیں۔ یہاں سے ان کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ اگر ان میں اس کی صلاحیت ہے کہ گردانیں گردانی جاسکیں اور صیغہ بنائے جاسکیں تو وہ "متصرفہ" کہلائیں گی ورنہ "غیر متصرفہ" آخر الذکر میں تورانی زبانیں شامل ہیں جن کی شاخوں میں سے ایک شاخ ترکی ہے۔ یہ ایشیائے کوچک۔ تاتار اور وسط ایشیا میں شرقاً اور سائبیریا کے شمالی حدود تک شمالاً بولی جاتی ہے۔ اس کی دوسری شاخیں منگولی۔ تنگناسی اور اوگرانی ہیں۔

"ترقی یافتہ غیر متصرف" زبانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ترتیب جامد اصول پر ہوتی

ہے اور اپنی بناوٹ میں کسی قسم کا تغیر قبول نہیں کرتیں جن میں صیغے بنانے کے لئے کچھ بے معنی مقرر شدہ الفاظ ان اصلوں کے آخر میں لگا دئے جاتے ہیں جن سے اصلیں بلا تغیر باقی رہتی ہیں۔ مثال کے لئے ترکی لفظ "اوقو" کو لیجئے، یہ ایک اصل ہے جس کے معنی ہیں پڑھائی۔ اس سے مصدر بنانے کے لئے آخر میں علامت مصدر "مک" لگا دی جائے گی (اوقومک) جب ماضی مطلق بنایا جائے گا تو اس کے آخر میں "دی" کا اضافہ کرکے کہیں گے "اوقودی" (اس نے پڑھا) پھر ماضی بعید بنانے کے لئے "ایدی" اور "دی" کا اضافہ ماضی مطلق پر ہوگا "اقودیدی" (اس نے پڑھا تھا) جب جمع بنانا چاہیں گے تو اسی پر علامت جمع "لر" لگا دیں گے "اقودیدیلر" (انھوں نے پڑھا تھا) اب منفی بناتے وقت علامت نفی "ما" کو اصل اور دیگر اضافہ شدہ علامتوں کے درمیان رکھ دیں گے "اوقومدیدیلر" (انھوں نے نہیں پڑھا تھا) یہی اضافۂ علامات کی صورت طلب تمنا اور استفہام وغیرہ کے لئے بھی ہوگی لیکن اصل فعلی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے پہلا ہی لفظ رہ گیا۔

متصرفہ زبانوں کی خصوصیت ہے کہ ان کی گردانیں بنانے کے لئے اصلوں کے اول آخر بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور بیچ میں بھی۔ ان کی دو بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آریائی اور سامی۔

۱۔ آریائی زبانیں۔ یا ہندی یورپی جن کا دوسرا نام یافث ابن نوح کی نسبت سے "یافثی" بھی ہے۔ اس کی ایک قسم جنوبی ہے جس میں جنوبی ایشیا کی تمام زبانیں شامل ہیں جیسے سنسکرت (اور اس کی تمام شاخیں ہندی وغیرہ) فارسی۔ پشتو۔ کردی۔ بخاری۔ ارمنی اور اوستی۔ دوسری قسم شمالی ہے جس میں یورپ کی کل زبانیں شامل ہیں۔ اس کی چار قسمیں ہیں "قلتی" جس کی فرعیں جزائر برطانیہ میں (انگلستان کو چھوڑ کر) بولی جاتی ہیں۔ "اطالوی" جس کی فرع لاطینی ہے اور لاطینی کی شاخیں فرانس اٹلی۔ اسپین اور پرتگال میں رائج ہیں۔ "ہیلینی" جو قدیم و جدید یونانی اور ونڈی کی اصل ہے۔ ونڈی کی شاخیں روس بوہمیا اور بلگیریا میں مستعمل ہیں "تیو تونی" جس سے انگلینڈ، جرمنی ہالینڈ۔ ڈنمارک اور آئس لینڈ کی زبانیں پیدا ہوئیں۔ آریائی زبانوں کو گرداننے کے لئے ابتدا یا آخر اصل میں لگنے والی علامتیں بامعنی (جو تنہا بغیر کسی لفظ سے ملائے اپنے مستقل معنی رکھتی ہیں)

بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ علامتیں زیادہ تر آخر میں لگتی ہیں اور کبھی کبھی ابتدا میں بھی جیسے انگریزی کا ایک لفظ ہے THANK (شکریہ) جس سے "THANKFUL" (بہت شکر گذار) بنایا گیا پھر -UN THANKFUL "(غیر متشکر) اور "UNTHANKFULNESS" (عدم تشکر) بنا۔ یا مثلاً "CAPABLE" (قادر) سے "INCAPABLE" (غیر قادر) اور "INCAPABILITY" (عدم قدرت) بنایا گیا۔

یہی صورت تمام گردانوں میں ہوگی۔

(۲) سامی زبانیں۔ سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں جس سے اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہی قسم بہت بڑی ہے کیونکہ سامی نسل (جو ان زبانوں کو بولتی ہے) دنیا میں سب سے زیادہ آباد ہے سامی زبانوں کو لغات شرقی بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ان میں عربی جیسی زبان موجود ہے لہٰذا ان کا شمار ایسی زبانوں میں کیا جاتا ہے جو باعتبار اسلوب بیان بہترین باعتبار نطق وسیع تر باعتبار الفاظ سریع اور باعتبار تعبیرات لطیف ہیں ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ قدیم ترین تاریخ کی محافظ ہیں (میری مراد توریت سے ہے جو عبرانی زبان میں ہے) یہ تو معلوم ہی ہے کہ سب سے پہلے تمدن انہی زبانوں کے بولنے والوں میں پھیلا۔ جیسے فنیقی۔ بابلی اور آشوری وغیرہ۔ ان زبانوں کی تین بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آرامی عبرانی اور عربی۔

۱۔ آرامی۔ اس کی دو شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ آرامی بابل کی پرانی زبان ہے جس کے آثار بابل اور آشور کے کھنڈروں میں اب تک خط میخی اور خط انباری میں کھدے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کلدانی میں زمانہ کے ہاتھوں ایسا تغیر ہوا کہ اس کے بعض الفاظ ہی تبدیل ہو گئے۔ اس میں عہد قدیم کے بعض سفرنامے لکھے ہوئے تھے جیسے سفر دانیال وغیرہ۔ اس کا بھی نام وہاں زبردستی آرامی ہی رکھ لیا گیا تھا حالانکہ اس میں اور اصلی آرامی میں الفاظ معانی کا بیّن فرق موجود ہے۔ اسی طرح آشوری بھی بابلی سے مختلف ہے۔ آج کل سریانی گروہ جس زبان کو کلدانی کہتا ہے وہ کلدانی نہیں بلکہ سریانی ہے جس کے اعراب میں کچھ تغیر ہو گیا ہے کلدانی تو درحقیقت سریانی کی اصل ہے جس کے الفاظ اور معانی میں تغیر ہو کر سریانی بنی۔ پرانی بابلی زبان شہر رہا میں آرامی ہی کہی جاتی تھی جب اس میں تھوڑا سا تغیر ہوا تو وہ

کلدانی کے نام سے موسوم کی گئی۔ جب اس میں دوبارہ تغیر ہوا تو اس کا نام سریانی پڑ گیا پھر اس کے ابواب میں تبدیلی ہونے سے دو الگ الگ زبانیں سریانی شرقی اور سریانی غربی شمار کی جانے لگیں۔

بعض تاریخی حالات اصلی آرامی زبان میں محفوظ ہیں اور بابل و آشور کے کھنڈروں میں کھدے ہوئے ہیں۔ سریانی ہی میں وہ انجیل بھی محفوظ ہے جس کا ترجمہ۔ ترجمۂ لبسیط کے نام سے دوسری صدی عیسوی میں کیا گیا۔

۲۔ عبرانی۔ اس کی خصوصیت کا راز قدیم تاریخ کی محافظت میں مضمر ہے۔ جیساکہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اور اس کے بولنے والے تمام قوموں میں نمایاں رہے۔ جو زبان آج کل اسرائیلی بولتے ہیں وہ خالص عبرانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں آرامی اور کلدانی کے بعض الفاظ بھی اس وقت داخل ہو گئے جب کہ یہ لوگ بابل والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ زمانہ قدیم الیام کرنہ ہے جس پہ یہ سب زبانیں مل جاتی ہیں۔ عبرانی کی دو شاخیں تھیں فینیقی اور قرطجنی۔ جو اب مردہ ہو چکی ہیں۔

۳۔ عربی۔ یہ تمام سامی زبانوں میں بلند پایہ ہے اور اس کا جاننا دوسری ہم نسل زبانوں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ صرف جزیرہ نمائے عرب ہی میں بولی جاتی تھی۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد پھیلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ مشرق اور مغرب اس سے گونج اٹھے ہندوستان سے جبل طارق تک شرقاً و غرباً اور بحر عرب سے بحر اسود تک شمالاً و جنوباً اس کا چرچا پھیل گیا۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اس زمانے کی دنیائے تمدن میں عام طور پر رائج تھی۔ عربی حروف کا عجمی زبانوں مثلاً ترکی فارسی اور اردو۔ میں استعمال اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے مشرقی زبانیں تو رہیں ایک طرف یورپین زبانیں بھی اس کی خوشہ چین ہیں جیساکہ آگے چل کر ہم بتائیں گے عربی کی شاخوں میں سے حبشی اور دوسری زبانیں پیدا ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ واضح رہے کہ اگر قرآن شریف جیسا مرکز موجود نہ ہوتا تو اب تک نہ معلوم کتنی شاخیں عربی سے پیدا ہو چکی ہوتیں۔

اصل لفظ "عرب" کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "عبر" ہے جو الٹ پلٹ کر عرب ہو گیا بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ "عَرَب" سے

ماخوذ ہے جس کے معنی فصاحت کے ہیں چونکہ عربی فصیح ترین زبان ہے لہذا اس کا نام عرب ہوا۔ کچھ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ یہ لفظ "یعرب" سے ماخوذ ہے۔ یعرب وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عربی بولی۔ ڈاکٹر وانڈیک کی رائے مندرجہ ذیل ہے۔

جس زمانہ میں سامی قوم خلیج عرب کے کنارے کنارے اس جگہ آباد تھی جس کا نام بعد میں عراق عرب مشہور ہوا۔ اس وقت کوشی قوم مہرا حضر موت اور الحسا کی راہ سے آکر ان پر حملہ آور ہوئی اور ان کو مار بھگایا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بلاد فارس کی طرف نکل گئے۔ کچھ لوگ فرات کے کنارے بس گئے۔ (یہ تارحی کہلاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے اسلاف میں سے تھے) کچھ لوگ مغربی سمت چلے گئے (جس کا نام بعد میں جزیرہ عرب ہوا) ان لوگوں نے لفظ عرب ערב "غرب" سے لیا جس کے معنی ہیں "سورج ڈوبنے کی سرزمین" عبرانی رسم الخط میں عین اور غین کی ایک ہی شکل ہوتی ہے کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ اردبا (یوریپ) بھی اسی ערוב ה (عروبہ) کی تغیر شدہ شکل ہے (رالنسن اور ماکس مولر کی تصانیف اور فورسٹ کی لغت دیکھو) کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اس کا نام لفظ "عرب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی عبرانی میں مخلوط اور ملے ہوئے کے ہیں چونکہ یہ گروہ بنی قحطان "بنی اسمٰعیل۔ بنی مدیان۔ بنی مواب۔ بنی عمون۔ اور بنی عملاق سے مل کر بنا تھا لہذا اس کا نام عرب ہوا۔ (ممکن ہے کہ جنوب میں کوشی قوم بھی مخلوط ہو گئی ہو) واللہ اعلم۔

سامی زبانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی اصلیں سہ حرفی ہیں اور مشتقات بنانے کے بعد میں بسا اوقات باقی رہتی ہیں یعنی ان کی حرفوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اعراب میں تغیر واقع ہو جاتا ہے جس سے اس کے مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جیسے عربی میں ایک اصل "قتل" ہے جس کے معنی مار ڈالنے کے ہیں۔ اس کے اعراب میں تغیر کر کے مختلف اسما اور افعال بنائے جا سکتے ہیں... "قَتَلَ" فعل ماضی معروف "قُتِلَ" فعل ماضی مجہول "قَتْلٌ" مصدر "قِتْلٌ" بمعنی دشمن "قَتِیْلٌ" "مَقْتُول"

کی جمع کبھی کبھی یہ اعراب کھینچ کر بڑھ بھی جاتے ہیں جیسے قَاتِلٌ" "قَاتَلَ" "قَتِیْلٌ" "قَتُوْلٌ" "قِتَالٌ" "قُتَّالٌ"
اور "قَتْلیٰ" وغیرہ۔ لیکن علامات بڑھا کر صیغے بنانے میں آریہ زبانوں جیسی ہیں تمام اس میں دو امتیازی
خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اول یہ کہ اس کے مشتقات کا بڑا حصہ اعراب کے تغیر ہی سے بنتا ہے
دوسرے یہ کہ اس کے صیغے ایسی علامتیں قبول نہیں کرتے جو معنی دار ہوں۔

اس تقسیم سے یہ بات صریحی طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ ان سب زبانوں کی اصل ایک ہی ہے
خاص کر جب کہ شاخیں پھوٹنے کے بعد بہت زیادہ تغیرات ہو گئے۔ لیکن تلاش اور مقابلہ سے
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سامی اور آریائی دونوں زبانوں میں اضافہ علامات کر کے یا بلا اضافہ
گردانے جانے کی صلاحیت موجود ہے لہذا متصرفہ کی شاخیں سمجھی جائیں گی۔ متصرفہ اور غیر متصرفہ
میں مشتقات بنانے کی قابلیت پائی جاتی ہے اس لئے یہ دونوں ترقی یافتہ زبانیں متصور ہونگی
اگرچہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں تغیرات کی بنا پر بہت زیادہ اختلاف اور بعد ہو گیا ہے
تاہم تلاش اور مقابلہ سے ان دونوں کا درمیانی رشتہ ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ
سے واضح ہو جائے گا۔

تمام زبانوں کی اصل | زبانوں کی تقسیم سے ان قوموں کی تقسیم مراد ہے۔ جو ان کو مافی الضمیر ظاہر کرنے کا
ذریعہ بنائیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد ہے کہ زبانوں کی قسمیں طورانی۔ آریائی اور سامی ہیں جو قومیں
اس وقت طورانی زبانیں بولتی ہیں ایک نسل سے ہیں۔ آریائی زبانیں بولنے والی قومیں ایک
نسل سے۔ یہی حال دوسرے گروہوں کا بھی ہے۔ مثلاً جو قومیں آریائی زبانیں بولتی ہیں ان میں
کے کچھ فرقے یورپ میں اور کچھ فرقے ہندوستان اور فارس میں ہیں۔ اگرچہ آج فاصلہ کی
زیادتی سے ان کے عادات و اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر بھی اس میں شک
نہیں کہ قدیم ترین زمانہ میں ایک ہی فرقہ یا خاندان تھا جو ایک سرزمین پر زندگی بسر کرتا تھا پھر امتداد
زمانہ سے ان میں علیحدگی شروع ہوئی یہاں تک کہ دو جگہ تقسیم ہو گئے جن کو ہم قسم جنوبی اور قسم
شمالی کہیں گے۔ قسم جنوبی تو وسط ایشیا میں جا بسی اور قسم شمالی نے یورپ میں قدم جمائے جیسا

جدول لغات

زبانوں کا نسب نامہ
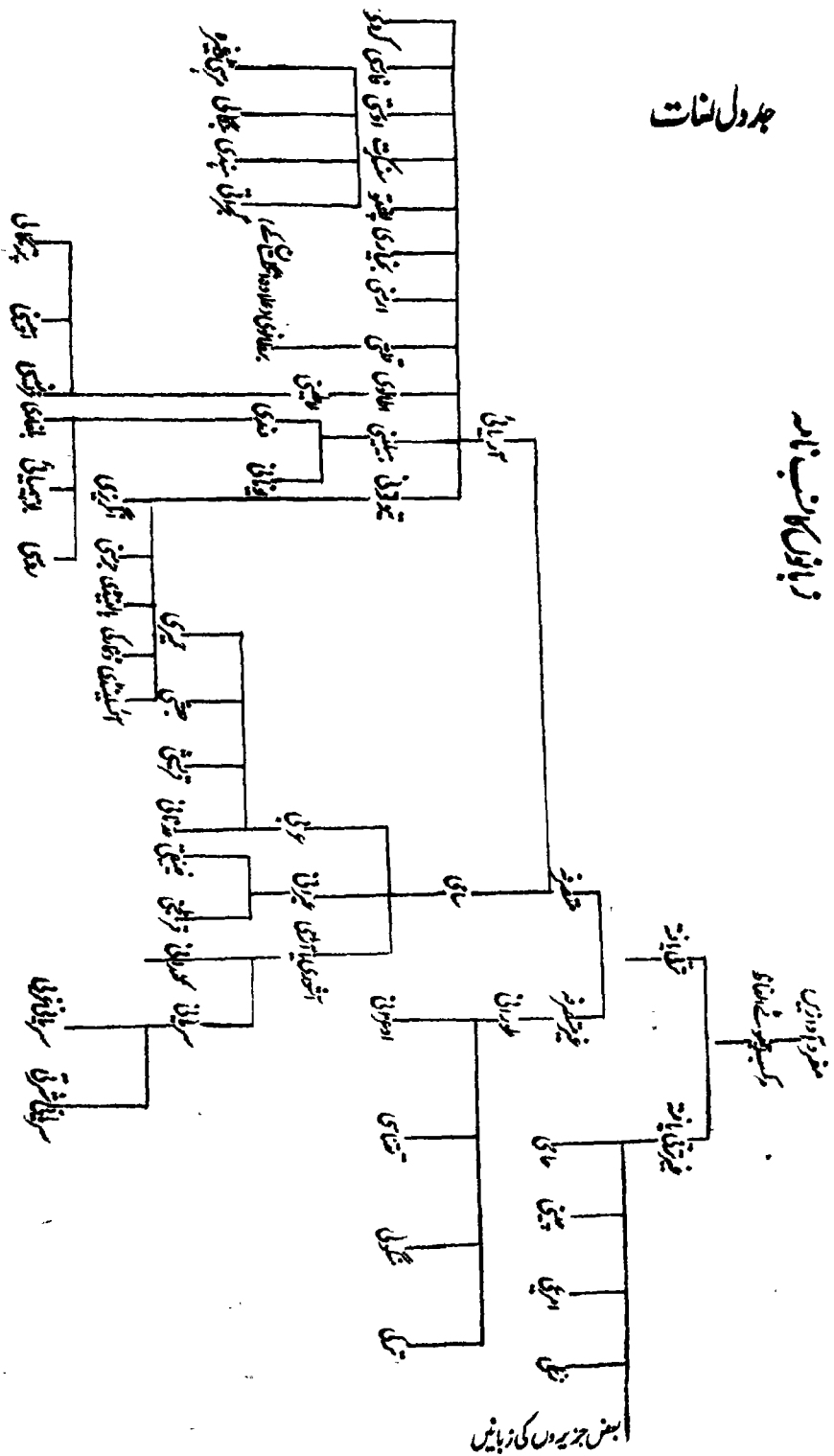
جیسا زمانہ گزرتا گیا ان قسموں کی بھی قسمیں ہوتی چلی گئیں ۔ بعینہ یہی حال سامی زبانوں کا بھی ہوا کہ اس کے بولنے والے دوآبہ (دجلہ و فرات) کے درمیان رہتے تھے اور ایک زبان بولتے تھے ۔ جب زمانہ نے پلٹا کھایا یا تو بعض لوگوں نے ترک وطن کیا ۔ خواہ کسی سبب سے بھی ہو ۔ تلاش یا جنگ سی گریز اور جزیرۃ العرب پہونچ کر سکونت اختیار کرلی ۔ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی زبان ترقی کرنے کی وجہ سے بدلنا شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان عربی اور قوم عرب بن کر تیار ہوگئی پھر ان میں سے دوسری گروہ نے ہجرت کرکے شمالی جزیرۃ العرب میں قیام کیا ۔ ان کی زبان بھی بدلنے لگی یہاں تک کہ اس کی مستقل حیثیت ہوگئی اور عبرانی کے نام سے موسوم ہوئی ۔ (غالباً اس طرف کے پہلے مہاجر حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں جس وقت یہ شاخیں اپنی اپنی جگہوں پر ارتقائی مدارج طے کر رہی تھیں اسی زمانہ میں ان کی اصل بھی دوآبہ کے درمیان ترقی کر رہی تھی ۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کا میلان کسی نہ کسی طرف تھا ۔ اسی پر تمام زبانوں کی شاخوں کو قیاس کرلینا چاہیئے ۔ عبرانی نے جب مستقل صورت اختیار کرلی تو اس سے فینیقی زبان پیدا ہوئی ۔ انھی میں سے ایک گروہ نے مغرب کی طرف جاکر قرطبجنہ کو اپنا وطن بنالیا اور ان کی زبان مستقل ہونے پر قرطجنی کہلائی ۔ یہی صورت دوسری فرعوں میں بھی ہوئی ۔ قرطجنی زبان الفاظ اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے اپنی بہن فینیقی ۔ اس سے اوپر اپنی خالہ عربی پھر اپنی نانی سامی سے بہت ملتی جلتی ہے جو آریائی جیسی ہے ۔ آریائی کا سلسلہ طورانی تک پہنچتا ہے جو چینی سے مشابہ ہے ۔ جیسے جیسے قومیں اپنے اصلی قبیلوں سے دور ہوتی گئیں ویسے ہی ویسے ان کی زبانیں بھی اپنی اصل سے مختلف ہوتی چلی گئیں ۔

جب ہم زبانوں کے مدارج نشو و نما کو سامنے رکھ کر موجودہ زبانوں سے مقابلہ کریں گے تو ہم کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی فرعیں کیسے اور کس زمانہ میں بنیں ۔

یہ مشہور ہے کہ انسان کی ابتدائی نشو و نما فرات اور دجلہ کے درمیان عراق سے آرمینہ (کوہ قاف) تک ہوئی جب نسل زیادہ بڑھ جاتی تو کچھ لوگ علیحدہ ہوکر دوسری جگہوں میں جا بستے ۔ تمام گروہ بیک وقت الگ نہیں ہوگئے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جب سرزمین وطن ان کے قیام کے لئے ناکافی ہوتی

اور ذرائع معاش کم ہو جاتے تو ایک فرقہ ان سے جدا ہو کر کسی نہ کسی طرف چلا جاتا۔ توریت میں ایک ایسی ہجرت کا ذکر موجود ہے جس کی وجہ سے متعدد زبانیں پیدا ہو گئیں۔ اس قصہ کی سرخی "حکایت تبلبل الالسنہ" ہے۔ توریت ہی میں دوسری جگہ روئے زمین پر قوموں کے متفرق ہونے اور پھیلنے کا ذکر موجود ہے لیکن صرف وہی قومیں گنائی ہیں جو حضرت نوح کی نسل کو طوفان کے بعد پھیلیں۔ ان قوموں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قبل طوفان نشو و نما پا چکی تھیں بنسل قابیل اور اس کی فرعین کیا ہوئیں؟ قبل طوفان پائی جانے والی قومیں کہاں گئیں؟ ان باتوں میں توریت بالکل خاموش ہے۔ صرف انہی لوگوں کے حالات سے بحث کرتی ہے جو دوآبہ کے درمیان رہتے تھے اور طوفان میں غرق ہو گئے۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے اور طوفان کے درمیان ایک طویل مدت ہے۔ اس عرصہ میں قومیں بنیں ان سے نسلیں پیدا ہوئیں اور مہاجرت کر کے روئے زمین کا بڑا حصہ آباد کر دیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ غیر ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والے دوآبہ کے درمیان بسنے والوں سے کہیں زیادہ پرانے ہیں جیسے چینی اور قدیم مصری جن میں سے ایک فرقہ مشرق میں چلا گیا اور دوسرا مغرب میں۔ اس معاملہ میں تاریخ ہماری تائید کرتی ہے کہ یہ قومیں دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں کیونکہ اگر وہ قدیم ترین قومیں نہ ہوتیں تو ان کی زبانیں بھی بسیط نہ ہوتیں بلکہ قبل طوفان ہی ان کی فرعین بن جاتیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زبانیں ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہیں۔ ابتدائی دور سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ علامتیں پیدا نہیں ہوئی تھیں اور نہ اسم فعل اور حرف میں کوئی امتیاز کیا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ چین قابیل نسل سے ہوں اس لئے کہ توریت ہم کو قابیل کا ماہر صنعت و موسیقی ہونا بتاتی ہے اور چینی قوم مختلف صنعتوں میں پرانی ماہر ہے۔

چین کو عربی سین (صین) کہتے ہیں۔ ہم کو صین اور قابیل میں یہاں تک لفظی مشابہت معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی لفظ شمار کرنا صحیح ہوگا کیونکہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں قاف اور صاد کا آپس میں تبادلہ ہوا ہو۔ علاوہ ازیں یورپی زبانوں میں حرف (c) کبھی تو قاف یا

کاف کی آواز ظاہر کرتا ہے اور کبھی صاد یا سین کی۔ نیز پرانی انگریزی میں اس کا تلفظ جیم اور کاف کی درمیانی آواز سے کیا جاتا تھا "ج" اور "چ" قریب المخرج ہیں لہٰذا بہت ممکن ہے کہ بعض زبانوں میں قائین کا تلفظ" CHINA چائنا" یا چین ہوگیا ہو۔ اسی طرح قبائل عرب میں "گ" کے تلفظ میں اختلاف ہے بعض قبائل اس کا تلفظ "ک" کرتے ہیں بعض "چ" بعض "سین" اور بعض "شین" یہی مشابہت قائین اور قدیم مصر کے نام میں بھی دکھائی دے گی جو (کیم، یا کیمی) کہلاتا تھا (ممکن ہے کہ علم الادویہ کے متعلق اسی قوم نے ابتدائی معلومات حاصل کئے ہوں اور اس فن کا نام اسی قوم کی طرف منسوب کرکے کیمیا رکھا گیا ہو) کاف اور قاف قریب المخرج ہیں۔ نون اور میم کا آپس میں تبادلہ مشہور ہے، رہا زیر و زبر کا اختلاف تو وہ کوئی چیز نہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غیر ترقی یافتہ زبانیں بولنے والی قومیں روئے زمین کو طوفان سے پہلے ہی آباد کر چکی تھیں۔ پھر تورانی بولنے والی قوموں کے اجداد نے ہجرت کرکے شمالی ایشیا میں سکونت اختیار کرلی جن کی نسل سے منگل اور تاتاری وغیرہ قومیں ہیں۔ پھر وہ گروہ بھی الگ ہوگیا جو بعد کو آریہ کہلایا۔ اس کی شاخیں ہندوستان۔ فارس کردستان۔ اور یورپ میں جا بسیں۔ اسی طرح سامی اور ان کی نسلیں بھی الگ ہوگئیں۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جب کوئی زبان اپنی اصل سے جدا ہوئی تو خود اس میں نشو و نما پیدا ہو جایا کرتی تھی اور دونوں زبانیں اپنے بولنے والوں کے حالات کے مطابق چلتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ویسے ہی ویسے یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں لیکن ان دونوں دور افتادہ زبانوں کی مشابہت تحقیق اور مقابلہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ زبانوں کو اپنی اصل سے جدا ہوئے جتنا زیادہ زمانہ گذرا اتنا ہی زیادہ اختلاف پیدا ہوگیا اور جتنا کم زمانہ گذرا اتنا ہی اختلاف بھی کم رہا۔ عبرانی اور عربی زبان کے الفاظ طریق تعبیر اور مشتقات کی مشابہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایسی ہی مشابہت ان یورپی زبانوں میں بھی محسوس ہوگی جو لاطینی سے نکلی ہیں۔ ان میں کی ہر زبان اس وقت اپنی اصل سے علیحدہ ہوئی جبکہ مختلف قسم کی تعبیریں اور اشتقاق اصل میں نشو و نما پاچکے تھے لہٰذا مشابہت خوب نمایاں رہی۔ لیکن عربی اور لاطینی مشابہت کے اعتبار سے

بہت دور ہوگئیں کیونکہ یہ اس وقت الگ ہوئیں جس وقت تک اصل میں پوری طرح نشو ونما نہیں ہو چکی تھی بلکہ ان دونوں نے بذات خود الگ الگ ارتقائی مدارج ایک دوسرے سے مختلف طور پر طے کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشابہت میں بہت کمی واقع ہوگئی۔ اسی سبب سے عربی اور چینی زبانوں میں انتہائی بعد ہوگیا کیونکہ چینی اصلی سامی قوم سے ہزار ہا سال پیشتر اس وقت علیحدہ ہوئی جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی۔

اب ہم لغت کے اس قدیم ترین مواد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو تمام زبانوں کی اصل میں پایا جائے جس کی وجہ سے ہم ان کی باہمی مشابہت معلوم کر سکیں گے۔

لغت کے سب سے پرانے لفظوں میں ضمیریں گنتی اور ضروریات زندگی کے نام مثلاً کھانا پانی۔ قیام گاہ اور پوشش وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔

ضمیریں ضمیریں صرف تین ہوتی ہیں متکلم۔ مخاطب اور غائب جن پر جمع اور تانیث وغیرہ کی علامتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ جب ہم ان کو علامات اور اس نون سے خالی کر لیں گے جو بعض زبانوں میں پایا جاتا ہے تو ان کے آپس کی مشابہت ظاہر ہو جائے گی۔ ضمیر متکلم "ی" اور "ک" آوازوں سے بنتی ہے (کسی زبان میں دونوں حرف پائے جائیں گے اور کسی میں ایک) اردو میں "ی" اور "ہ" ہے جو ہم کو (میں اور ہم) میں نظر آتی ہے ("ی" "ء" "ح" "ہ" وغیرہ کا آپس میں تبادلہ ہوا کرتا ہے) عربی میں "ی" یا "ح" ہے جیسے "نحن" اور "ی" جو ضمیر واحد متکلم منصوب میں خواہ متصل ہو یا منفصل اور ضمیر مجرور میں پائی جاتی ہے۔ فارسی میں "ام" اور "ایم" بحالت اتصال۔ سریانی میں (لدہ ان کی) جس کا تلفظ "الوخی" ہوگا۔ عبرانی میں אנכי (انوک) یا אני (انی) قدیم مصری میں (ان کو، یا (یا)، (آ)، آشوری میں (aga) لاطینی میں (ago) یونانی میں (egum) سنسکرت میں (aha یا ahom) انگریزی میں (I) جرمنی میں (ich) چینی میں (nga، یا ga، یا a) منگولی میں (na)

مخاطب کی ضمیر سے جس وقت جنس اور عدد کی علامتیں ہٹالی جائیں تو سب زبانوں میں اصل "ت" نکلے گی۔ جیسے اردو میں (تم۔ تو۔ تیرا۔ تجھ) عربی اور سریانی میں (انت) عبرانی میں אתה

[illegible] لاطینی میں (tu) فرانسیسی میں (tu) انگریزی میں (thou) جرمنی میں (du) یا (du) سنسکرت میں (tvam) فارسی میں (تو) آشوری میں (اتا) کلدانی میں (انت) پرانی مصری میں (ntuk) [illegible] قبطی میں (ntok) چینی میں (nee) منگولی میں (ta)۔

ضمیر غائب کی اصل تمام زبانوں میں "ہ" ہے۔ یونانی میں (e) جرمنی میں (er) فارسی میں (وے) اردو میں (وہ) چینی میں (woh) اس کا تلفظ "اوہ" ہوگا "s" زائد ہے) عربی میں (ہو ہی۔ ہما۔ ہن۔ ہم۔ ہ۔ ہا) سریانی میں (ہو۔ ہی۔ ہُ۔ ہِ۔ ہنون۔ ہنین) عبرانی میں (ہوا۔ ہیا۔ ہُ۔ ہَ ہم۔ ہن) انگریزی میں (he - his - him - her)۔

گنتی اندازہ کیا جاتا ہے کہ گنتیاں ضمیروں کے بہت بعد وجود میں آئیں اسی واسطے جتنی مشابہت ضمیروں میں پائی جاتی ہے اتنی گنتیوں میں نہیں پائی جاتی۔

عربی کے لفظ واحد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب سامی زبانیں آریائی زبانوں کے مقابلہ میں مستقل ہو چکیں تب یہ معرض وجود میں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے آریائی زبانوں میں پایا جاتا ہو جس کے آثار سوا یونانی کے اب مفقود ہو گئے۔ عربی کے واحد میں اصل (حد) ہے جو دوسری سامی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یونانی زبان میں واحد کے معنی میں (hen) مستعمل ہے۔ آریائی زبانوں میں جن الفاظ سے "ایک" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے ان کی اصل "و" اور "ن" ہے۔ لاطینی میں (unus) یونانی میں (en) انگریزی میں (one) یا (on) اسی طرح دیگر آریائی زبانوں میں بھی ہے۔ اب رہیں سامی زبانیں تو ان میں اصل "و" اور "ل" ہے جو عربی کے لفظ (اول) میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اردو میں اس کی یادگار لفظ (پہلا) میں "ل" باقی رہ گیا ہے۔ (ل۔م۔ن۔ر۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے)

(دو) اس کی اصل "ت" ہے جس کا تبادلہ (ث۔س۔د) سے ہوتا ہے۔ عربی میں (اثنان) فارسی میں (دو) یونانی میں (duo) لاطینی میں (duo) انگریزی میں (two) یہی حال باقی زبانوں کا بھی ہے عربی میں الف اور نون زائد ہیں جن کا استعمال بطور علامت تثنیہ ہوتا ہے۔

(تین) عربی میں اس کی اصل (ثلث) ہے جو تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اسی طرح آریائی زبانوں میں بھی جیسے لاطینی میں (tres) یونانی میں (treis) انگریزی میں (three) فارسی میں (سہ)۔

(چار۔ پانچ) آریائی اور سامی زبانوں میں مشترکہ طور پر ان کی اصل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

(چھ) اس کی اصل "ست" ہے ("س" اور "چ" قریب المخرج ہیں یہاں تک کہ بعض زبانوں میں دونوں آوازوں کے لیے ایک ہی حرف استعمال کیا جاتا ہے) عربی میں (ستہ) عبرانی اور فارسی میں (شش) لاطینی میں (sex) یونانی میں (hex) سلافونی میں (شست) انگریزی میں (six)

(سات) عربی میں (سبعہ) لاطینی میں (septem) یونانی میں (hepta) فارسی میں (ہفت) سنسکرت میں (سپتا) انگریزی میں (seven) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل (سب) ہے جس پر سامی زبانوں میں (ع) اور اکثر آریائی زبانوں میں (ت) کا اضافہ ہو گیا۔

سات کے اوپر کوئی صورت مطابقت کی نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سامی اور آریائی گروہ اس وقت علیحدہ ہوئے جب کہ آٹھواں عدد پیدا نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں اب تک کچھ وحشی قومیں ایسی ہیں جن کی زبان میں پانچ کے اوپر کوئی عدد نہیں پایا جاتا۔

ہم کو مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ گنتی کی مشابہت صرف آریائی اور سامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ زبانیں گنتی پیدا ہونے کے پہلے ہی اپنی اصل سے الگ ہو چکی تھیں بالفاظ دیگر چینی اور مغل اس وقت دوآبہ سے ہجرت کر گئے جب ان کی زبان میں گنتیوں کا وجود بھی نہ تھا۔ بعد میں ان کے یہاں گنتی پیدا ہوئی جس کا تعلق مذکورۂ بالا زبانوں سے نہ تھا۔ چینی زبان میں دو کو (شونگ) تین کو (شام) چار کو (سی) پانچ کو (نچو) چھ کو (لوک) کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ضروریات زندگی کے نام | عہد اول کے انسان نے اپنی بول چال میں سب سے پہلے ان اشیا کے نام رکھے جو اس کی جہد للبقا میں کام آسکیں۔ چونکہ یہ ضمیروں اور گنتیوں سے بھی پہلے بن چکے

تھے۔ اس لئے ان کی مشابہت تمام زبانوں میں اچھی طرح نمایاں ہے۔ واضح ہے کہ زبان ہمیشہ نشو ونما کی حالت میں رہتی ہے نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے ہیں اور پرانے متروک ہو جاتے ہیں۔ الفاظ میں تغیر کمی بیشی۔ تبادلہ۔ اور حروف کے مقدم مؤخر ہونے سے ہو جاتا ہے۔ اکثر زبان زد الفاظ میں اسی قسم کی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ضروریات زندگی کے نام سب سے پرانے زبان زد الفاظ ہیں۔ یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ مشابہ الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی یا ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں بیک وقت مل جائیں گی۔ کبھی کوئی لفظ سامی اور آریائی زبانوں میں مشترک ملے گا یا کبھی ان میں سے ایک اور چینی میں۔ کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو سب میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) ماں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک ہی لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں رائج ہے کیونکہ یہی انسانی بولی کا قدیم ترین لفظ ہے۔ لاطینی میں (mater) یونانی میں (miter) سنسکرت میں (matri) انگریزی میں (mother) فارسی میں (مادر) اردو میں (ماں) عربی عبرانی اور سریانی میں (اُم) تبتی میں (یم) چینی میں (مو) قبطی میں (ماد) جس طرح ان سب الفاظ میں اصل "م" ہے اسی طرح ان الفاظ میں بھی جو ماں کو مخاطب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے ہندی میں (ماتا) اردو میں (اماں) عربی میں (اُمّی) اکثر یورپی زبانوں میں (Mama) یا (Mami)

(۲) باپ۔ آریائی زبانوں میں (pater) یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں جیسے انگریزی میں (Father) فارسی میں (پدر) ہندی میں (پتا) اس میں اصل "ب" ہے جو سامی زبانوں میں بھی (اب) کی شکل میں پائی جاتی ہے چینی میں (بو) یا (فو) ب۔ پ۔ ف۔ د۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔

(۳) دنیا۔ لاطینی میں (DO) ایسے ہی الفاظ بقیہ آریائی زبانوں میں بھی ہیں۔ فارسی میں (دادن) "دن" علامت مصدر ہے جس کو گرانے کے بعد صرف "دا" باقی رہ جاتا ہے اردو

میں "دینا" اس میں "نا" علامت مصدر ہے۔ اس لفظ میں اصل "د" ہے۔ عربی میں (ادّی) یا (اعلیٰ) عین زائد ہے۔ قدیم مصری میں (طا) "د" "ت" اور "ط" ہم مخرج ہیں۔

(۴) کٹنا۔ کاٹنا۔ یہ لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں مشترک ہے۔ لاطینی میں (Ceodo) انگریزی میں (cut) فرانسیسی میں (Casser) چینی میں کت قدیم مصری میں (کھت) عربی میں (قط قص قطع)

(۵) ہونا۔ لاطینی میں (Esse) سنسکرت میں (اس) انگریزی میں (was-is) عبرانی میں (یش) سریانی میں (ییت) اردو میں (تھا) عربی میں (ایس) مگر عربی میں یہ لفظ لا رنافیہ کے بغیر نہیں پایا جاتا (لاایس جس کا مخفف لیس ہے)

(۶) مرد۔ لاطینی میں۔ (Homo) یونانی میں (Anir) اسپینی میں (Nambee) انگریزی میں (Person) فارسی میں (مردم) اردو میں (مرد) عربی میں (مرء) منگولی میں (Ere) اس لفظ میں اصل "ر" ہے۔

(۷) حرف نفی۔ اکثر سامی زبانوں میں (لا) اور آریائی زبانوں میں (Na) یا اس کی شاخیں مستعمل ہیں۔ عربی میں (لا۔ ما) انگریزی میں (un - Non - no) فارسی میں (نہ۔ مَ) اردو میں (نہ۔ نہیں۔ مت) تمام طورانی زبانوں میں (ال۔ نہ۔ ما) تامل میں (الے) ل۔م۔ن۔ کے درمیان نسبت لفظی معلوم ہی ہے۔

مذکورۂ بالا مثالیں ایسے الفاظ کی ہیں جن کی اصل تمام بڑی بڑی زبانوں میں ایک جیسی ہیں لیکن وہ مشابہ الفاظ جو چند زبانوں میں پائے جائیں۔ اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا ایک جگہ جمع کرنا غیر ممکن ہے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اردو (کھوہ) لاطینی (cavo) انگریزی (Cave) عربی (کہف) ــــ عربی (ارض۔ ثری) انگریزی (Earth) فرانسیسی (Terra) ــــ عربی (الٰہ) تبتی (لہا) ــــ عربی (ماء) قدیم مصری (ما) چینی (مو) وغیرہ وغیرہ۔

(باقی)

قومی تنظیم

(از پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ جنرل سکریٹری قومی تنظیمی کمیٹی)

(ذیل میں اس نوٹ کے ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو پروفیسر کے۔ٹی۔شاہ نے قومی تنظیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی سب کمیٹیوں کی ہدایت کے لئے شائع کیا ہے۔ مدیر)

پلاننگ یا تنظیم کسے کہتے ہیں؟ جمہوری نظام میں پلاننگ کے معنی ہیں عوام کی منتخب شدہ جماعتوں کی طرف سے چند جماعتی نصب العینوں کا مقرر کیا جانا اور ان کے مطابق ایسے ماہران فن کا جن کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے ذیل کے مختلف کاموں میں باہمی ربط پیدا کرانا یعنی دولت کے صرف کرنے، دولت کے پیدا کرنے، کاروبار میں سرمایہ لگانے، تجارت کرنے اور قومی آمدنی کے تقسیم کرنے کے مختلف کاموں میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا۔ اس قسم کی پلاننگ کو صرف معاشی نقطۂ نگاہ سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس میں تمدنی اور روحانی قدروں اور زندگی کے دوسرے انسانی پہلوؤں کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

پھر تنظیم کے لئے صرف جماعتی نصب العین کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پلین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قوت اور اقتدار کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ قوت کسی اعتبار سے محدود ہوئی یا پلین کو عملی جامہ پہناتے وقت کسی اور قسم کی معاشی یا سیاسی پابندیاں حایل ہوئیں تو ہمہ گیر تنظیم رکھنے والی معیشت ترقی نہ کر سکے گی۔ صحیح تنظیم مکمل سیاسی اور معاشی آزادی کی صورت میں ہی کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہندوستان میں قومی تنظیم کے لئے مکمل کوشش تو اسی وقت کی جا سکے گی جب اس ملک کو پورا اقتدار بالادست حاصل ہوگا۔ لیکن ملک میں جو حالات آج کل

موجود ہیں اور ہم پر طرح طرح کی جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہم کو اپنے پلین یا منصوبہ
میں ایسی تجویزیں بھی رکھنا ہوں گی جو فوری طور پر قابل عمل ہوں گی اور ہم کو ایسے اقدامات کو تبلانا
ہوگا جن کو پلین کے پورا کرنے اور ملک کے ذرائع سے زیادہ سے زیادہ امکانی فائدہ اٹھانے
اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے ہم اس وقت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ ان اقدامات کو منظم
معیشت کی مکمل اسکیم کا ہم آہنگ ہونا چاہیے اور کسی حال میں بھی ہم کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے
جو پلین کے پورا کرنے میں مزاحم ہو۔

ہمارے جماعتی نصب العینوں کا جہاں تک تعلق ہے ملک میں ایک بڑی حد تک اتفاق
رائے پایا جاتا ہے اگرچہ بعض بنیادی اختلافات بھی موجود ہیں جن میں سے بہت سے ممکن
ہے ہماری اس تحقیقات کے بعد ختم ہو جائیں۔ ایک حد تک ان نصب العینوں کی طرف
نیشنل کانگرس نے اپنی متعدد قراردادوں اور اپنے عام طرز عمل سے ہماری رہنمائی اور ہدایت
بھی کی ہے۔ ہمیں کانگریس کے اس عام طرز عمل کی پیروی کرنی چاہیے اور کانگریس کے تبلائے
ہوئے مقاصد کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں کراچی کانگریس کے بنیادی حقوق کی
قرارداد اور کانگریس کے انتخابی مینی فیسٹو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کانگریس بہت سے سالوں سے گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے پر بہت زور دے رہی ہے
اور ملک کو گاؤں کے لوگوں کی حالت کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ ہم بھی اس بات کو نہیں بھلا
سکتے کہ ہندوستان کی ترقی کا اندازہ ان کروڑوں آدمیوں کے معیار زندگی کی بلندی سے
ہی کیا جا سکتا ہے جو دیہاتوں میں آباد ہیں۔ لیکن لوگوں کے ذہن میں دیہاتی صنعتوں اور بڑے
پیمانہ کی صنعتوں کے مطالبات کے سلسلہ میں ایک غیر واجب تصادم پیدا ہو گیا ہے۔ تصادم
اس بات کا تو ہو سکتا ہے کہ کس کو کس قدر اہمیت دی جائے اور ہندوستان میں اس
وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں بلاشبہ خانگی صنعتوں کو خوب ترقی دینا جمہور کی فلاح
وبہبود کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صاف اور کھلی

ہوئی ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ملک کی نہایت فوری ضرورت ہے۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر کسی ملک کو سیاسی یا معاشی آزادی نہیں مل سکتی اور جب سیاسی آزادی ہی مفقود ہو تو دیہی اور خانگی صنعتوں کی بہت زیادہ ترقی کی بھی کوئی اُمید قائم نہیں کی جا سکتی بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر لوگوں کے معیار زندگی کو موثر طریقہ پر تیزی کے ساتھ بلند کرنا ممکن نہیں ہے۔ کلیدی صنعتوں، مدافعت کی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کو بڑے پیمانہ پر ہی چلایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ دیہی اور خانگی صنعتوں کی ترقی میں بھی سستی قوت محرکہ اور مناسب مشینوں کے فراہم ہو جانے سے جنھیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لئے ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ دستی صنعتیں اور بڑے پیمانہ کے کاروبار ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ملک کے سامنے مسئلہ کسی ایک کے انتخاب کا نہیں بلکہ دونوں سمتوں میں ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرنے کا ہے اور جہاں تک ہو سکے ہمیں اس بات کی کوشش کرنا چاہیئے کہ دیہی صنعتوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں باہمی تصادم نہ ہونے پائے۔

کانگریس کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی ترقی پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی خاص وجہ یہ خواہش ہے کہ تقسیم دولت کے نظام میں زیادہ انصاف پیدا کیا جائے اور نگرانی اور امتیاز کی عدم موجودگی میں صنعتی ترقی سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا سدّباب کیا جائے۔ منظم معیشت میں چونکہ تقسیم دولت کی نگرانی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جب تقسیم دولت انصاف پر مبنی ہوتی ہے تو صنعتی ترقی کی برائیوں کا چونکہ سدباب کیا جا سکتا ہے اس لئے ہندوستان کی قومی تنظیم میں تقسیم دولت کی ایک مناسب اسکیم نہایت لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

صنعتی وزرا کی دہلی کی کانفرنس میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اور جس کی وجہ سے قومی تنظیمی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے اس میں کمیٹی کو صنعتوں کو ترقی دینے کی نہایت واضح طور پر ہدایت کی گئی ہے اور وزنی کلیدی صنعتوں، اوسط پیمانہ کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کا مطالبہ

کیا گیا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کے حدود تحقیقات اسی بات پر مشتمل ہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کانگریس نے اپنی بنیادی حقوق کی قرارداد میں اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ "ریاست کلیدی صنعتوں اور خدمتوں، معدنی وسائل، ریلوں، آبی راہوں، جہاز رانی اور پبلک نقل وحمل کے دوسرے ذرائع کی یا خود مالک ہوگی یا ان کی نگرانی کرے گی۔"

قومی معیشت کی تنظیم کا خاص مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے قومی خود کفالت کو حاصل کیا جائے نہ یہ کہ بیرونی منڈیوں کے لئے قومی معیشت کو ترقی دی جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بین الاقوامی تجارت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اس کی تو ضرور حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے، لیکن اس طرح پر کہ معاشی سامراج سے محفوظ رہ سکیں۔ ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ملکی ضرورتوں کے لئے غذا، کچا مال اور مصنوعہ اشیا کی رسد مہیا کی جائے البتہ زائد پیداوار کی نکاسی کے لئے راستے ڈھونڈھے جا سکتے ہیں تاکہ ہندوستان کی بین الاقوامی قرضوں کا بھگتان کیا جا سکے۔

ہمیں جس بنیادی مقصد کو سامنے رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے لئے ایک مناسب معیار زندگی یقینی طور پر حاصل کیا جائے۔ مناسب معیار زندگی میں کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ آرام اور آسایش کا ایک اضافہ پذیر حصہ بھی شامل ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کے لئے معاشیات کے ماہروں نے کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے، روپیہ کی موجودہ قیمت کے ساتھ پندرہ روپیہ ماہوار سے لے کر پچیس روپیہ ماہوار تک کی رقم کا تخمینہ کیا ہے۔ لوگوں کی کم ترین احتیاجات کو رقموں کی شکل میں محض سہولت کے خیال سے ظاہر کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً ان کا اظہار اشیا اور خدمات کی شکل میں کرنا چاہیئے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی سالانہ فی کس آمدنی کے اوسط کا تخمینہ پچیس یا تیس روپے کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف غذا بلکہ انسانی زندگی کی اور دوسری لازمی ضرورتیں بھی اس آمدنی کے ذریعہ پوری نہیں کی جا سکتیں۔ اس لیے آئندہ دس سالوں میں ہر شخص کے لئے کم ترین معیار زندگی

مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ ہندوستان کی منظم معیشت میں آبادی کو اس لئے قصداً نہیں بڑھایا جائے گا تاکہ زائد آبادی کو دوسرے ملکوں میں بسنے کے لئے روانہ کیا جا سکے بلکہ جو زائد آبادی فی الواقعی موجود ہوگی اسے معاہدوں کے ذریعہ ترک سکونت کی اجازت دی جائی لیکن اس کا خیال رکھا جائے گا کہ نئے علاقوں میں ان مہاجرین کے حقوق کا مناسب تحفظ کیا جائے۔

اس پلین کی تکمیل کے لئے دس سال کی میعاد مقرر کرنا چاہیئے اور مختلف زمانوں اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی کے نگرانی کے لئے درمیانی زمانہ کے معیاروں (CONTROL FIGURES) کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے۔

مدافعت کی صنعتوں[1] کی ملکیت اور نگرانی ریاست کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے، پبلک کے فائدہ کی صنعتوں[2] پر بھی ریاست کی ملکیت یا نگرانی ہو سکتی ہے لیکن اس رائے کو سختی سے رکھنے والے لوگ بھی ہیں جو ہر حال میں پبلک کے فائدہ کی صنعتوں پر ریاست کی ملکیت قائم کرانے کے حامی ہیں۔ دوسری کلیدی صنعتوں[3] پر بھی حکومت کی ملکیت یا نگرانی ہونا چاہیئے۔

جب دوسرے حالات (مثلاً اشیار خام اور وسائل کی موجودگی اور صرف کرنے والے مرکزوں سے قرب) یکساں ہوں تو پلین میں صنعتی حیثیت سے پس ماندہ علاقوں کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف صنعتوں کو تقسیم کرنے کی سفارش کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر صوبہ اور ریاست کو جہاں تک ہو سکے اپنے کچے مال سے فائدہ اٹھانے، اپنے مزدوروں کے لئے روزگار فراہم کرنے اور اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کا پورا موقع ملے۔

مزدوروں کے بارے میں قواعد اور ضوابط، تندرستی بیماری اور بے روزگاری کے بیموں

---

[1] [2] [3] مدافعت کی صنعتوں، پبلک کے فائدہ کی صنعتوں اور کلیدی صنعتوں کی فہرست اس مضمون کے خاتمہ پر ضمیمہ نمبر (ب) میں درج کی گئی ہے۔

قوم کے لیے مکانات کی فراہمی اور معاشری فلاح کی دوسری اسکیموں میں بھی پلین کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں اور ریاستوں کی طرف سے ان کی ابتدا کی جائے گی لیکن قومی تنظیم کے کمیشن کی طرف سے اجرتوں اور مزدوروں کو روزگار سے لگانے کے سلسلہ میں کم ترین معیاروں کو مقرر کر کے ایک عام طرز عمل کا تعین کر دیا جائے گا۔

مختلف صوبوں میں سرمایہ کے وسائل اور صنعتی تجربوں اور ابتدائی کاموں کے شروع کرنے کی اہلیت کے اعتبار سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ قومی تنظیمی کمیشن اور ان کے متعلقہ شعبوں کی معرفت اپنے کام کرائیں۔

جہاں تک عام منظم معاشی ترقی کے لئے مالی ذرایع اور وسائل کے فراہم کرنے کا تعلق ہے صوبہ اور مرکز کی حکومتوں کے اعتبار سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ملک کی ساہوکارے اور بیمہ کے اداروں کے روپیہ لگانے کی پالیسی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہیں جن سے صنعتی تنظیم کو ترقی دی جا سکے۔

منظم معیشت کی مکمل اسکیم کا بنانا ایک بہت بڑا کام ہے جس کے لئے مکمل معلومات، اعداد و شمار اور فنی ماہروں، صنعتی تاجروں، منتظموں اور عام پبلک کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے اس اسکیم کو ترقی پذیر ہونا چاہیئے۔ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرتے رہنا چاہیئے اور عملی کارروائی کے دوران میں جو تجربے حاصل ہوں ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیئے یہ ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ قومی تنظیمی کمیٹی اس طرح کی مکمل اسکیم کے بنانے سے قاصر ہے اور نہ وہ اس منزل پر اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ اس وقت جس کام کے کرنے کا ارادہ ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منظم معیشت کی ایک ایسی بنیاد رکھ دی جائے جس پر آئندہ عمارت تعمیر کی جا سکے لیکن اس منزل پر بھی پوری تصویر کے خاکہ کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ بعد میں جب موقع ملے اور وسائل بہم ہو جائیں تو اس تصویر کو مکمل کیا جا سکے۔ ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جن کے حدود کے اندر ایک منظم نظام کی تعمیر کے تقریباً پورے وسائل

کو حاصل کرنے کے واسطے قومی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اس کمترین معیار کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف پیدائش دولت کو بڑھانا ہوگا بلکہ تقسیم دولت کو بھی زیادہ منصفانہ طریقہ پر تنظیم دینا ہوگا۔

ایک حقیقی ترقی پذیر معیار زندگی کے لئے تو ہمیں قومی دولت کو پانچ یا چھ گنا زیادہ کرنا ہوگا لیکن فی الحال آئندہ دس سالوں میں کم ترین معیار زندگی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں آمدنی کو دوگنا تین گنا بڑھانا پڑے گا اور ہمیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اپنی تنظیم کے کام کو شروع کرنا چاہئے۔

منظم ترقی کو چند معروضی طریقوں سے جانچا جا سکتا ہے جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(I) غذا میں ترقی پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات (اور دوسری ضروری منفعتی غذاؤں) کے کم ترین معیار کو سامنے رکھ کر جس کی قوت حرارت ایک بالغ کام کرنے والے کے لئے ۲۸ سو تا ۳۰ سو کیلاریز ہونا چاہیے،

(II) کپڑے کی ترقی موجودہ ۱۵ گز فی کس سالانہ کے مقابلہ میں ۳۰ گز فی کس سالانہ تک

(III) مکان کے معیار کو کم از کم سو مربع فیٹ فی کس تک پہنچنا چاہیے۔

دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ترقی کے ناپنے کے دوسرے حسب ذیل پیمانے مقرر کئے جا سکتے ہیں:۔

(I) زرعی پیداوار میں اضافہ } کم از کم اتنا اضافہ کہ جس کے ذریعہ اوپر کے درج کئے ہوئے
(II) صنعتی پیداوار میں اضافہ } غذا اور کپڑے کے کم ترین معیار کو حاصل کیا جا سکے۔

(III) بے روزگاری میں کمی

(IV) فی کس آمدنی میں اضافہ

(V) ناخواندگی میں کمی

(VI) پبلک کے فائدے کی خدمات میں اضافہ

(VII) طبی امداد کی فراہمی اس معیار کے مطابق کہ ایک ہزار کی آبادی کے لئے ایک شفاخانہ

قائم ہو جائے۔

(viii) زندگی کی اوسطاً جو توقع کی جاتی ہے اس میں اضافہ ۔۔۔

پلین کی تکمیل کو وقتاً فوقتاً ناپنے کے لئے اعداد و شمار کا جمع کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اعداد و شمار کے جمع کرنے کے کام میں بھی ترقی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔

پلین کے مختلف شعبوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا بہت لازمی ہے تنظیم کا راز یہ ہے کہ ترقی کا سلسلہ ہر محاذ پر جاری رکھا جائے۔ مزارعت کی تنظیم اس لئے ہو کہ اشیاء غذا کے معاملہ میں ان معیاروں کے مطابق جنھیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے ملک اپنی ضرورتوں کی خود کفالت کر سکے۔ اسی طرح اشیاء خام کو بھی پہلے سے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق پیدا کیا جائے۔ زمین کی زرخیزی کا تحفظ، جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا، گھاس کی زمینوں کا انتظام سیلاب کی نگرانی، دریاؤں کا انتظام، اور اندرون ملک کے دریائی نقل و حمل کی اصلاح مویشیوں اور چارے کی ترقی یہ منظم پروگرام کے چند ایسے عنوانات ہیں جن کو باقاعدگی کے ساتھ ابھی تک شروع نہیں کیا گیا ہے۔ قوت محرکہ کی ترقی اور صنعتی قوت محرکہ کے لئے کوئلہ اور دوسرے قسم کے ایندھنوں کا تحفظ بھی تنظیم کا محتاج ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم مختلف قسم کی صنعتوں مثلاً بڑے اور اوسط پیمانہ کی اور گھریلو صنعتوں کی تنظیم ہے کہ صرف ان کے ذریعہ سے ہی زمین کے موجودہ دباؤ کو موثر طریقہ پر کم کیا جا سکتا ہے۔ مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ دس سال کے اندر اندر ایک ایسا متوازن معاشی نظام پیدا ہو جائے جس میں تقریباً نصف آبادی مزارعت پر انحصار کرے۔ پھر تنظیم کے پروگرام میں عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم اور ترقی میں امداد دینے والی تحقیقات علمی بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سرکاری خدمات کے مقاصد اور تنظیم کو بھی اس پلین کی ضروریات کا پابند ہونا چاہیئے۔

اگر معاشی ترقی کے مقابلہ میں آبادی کے اضافہ کی شرح زیادہ رہی تو تنظیم کی کوئی کوشش

آب، صفائی اور دیہات کے لیے مکانوں فراہم کرنے کی اسکیم شامل ہے)

(۱۰) تعلیم کی تنظیم

زراعتی تعلیم اور پروپیگنڈا ۔ مختلف درجوں کی فنی تعلیم جس میں کارکنوں کی تعلیم بھی شامل ہے
صنعت اور ترقی کے لئے تحقیقات علمی۔

ضمیمہ (ب)

مدافعتی صنعتوں، کلیدی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کی فہرست

مدافعتی صنعتیں

۱۔ آتشیں ہتھیار (زمین، ہوا اور سمندر کے) اور ان کے حصے
۲۔ گولہ بارود، کارتوس، آتشگیر سامان، شیلس، ٹارپیڈو وغیرہ
۳۔ ٹینک اور مسلح کاریں اور فوجی ضرورت کے لئے دوسرے مشین لگے ہوئے سامان
۴۔ ہر نمونہ کے جنگی جہاز جن میں آب دوز کشتیاں بھی شامل ہیں۔
۵۔ ہر قسم کے جنگی ہوائی جہاز
۶۔ جنگ کے لئے ہوائی گیسیں اور گیس کے نقاب

نوٹ: جنگی جہاز اور جنگی ہوائی جہاز امن کے زمانہ کے کارخانوں میں بھی بنائے جا سکتے ہیں

کلیدی صنعتیں

۱۔ قوت محرکہ آبی اور حرارت کی
۲۔ ایندھن، کوئلہ اور لکڑی کا ایندھن، معدنی تیل، قوت محرکہ کے لئے کام آنے والا الکوہل، قدرتی گیسیں۔
۳۔ دھاتیں لوہے اور غیر لوہے والی جس میں ان سے خام دھات حاصل کرنا بھی شامل ہے
۴۔ مشین کے اوزار بنانے والی صنعتیں
۵۔ مشین اور مشین کے حصے بنانے والی صنعتیں
۶۔ جہازوں، ریلوں، واگنوں، موٹروں، ہوائی جہازوں وغیرہ کی بنانے والی انجنیری کی وزنی صنعتیں
۷۔ اوزار اور آلات۔ تجارتی صنعتی، علمی
۸۔ کیمیادی، وزنی کیمیادی، باریک کیمیادی جس میں رنگ بھی شامل ہیں، زمین کو زرخیز کرنے

موجود ہیں۔

اس لئے کمیٹی کا ارادہ ہے کہ جو اعداد و شمار موجود ہیں یا جو آسانی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں ان کی مدد سے تصویر کا ایک عام خاکہ تیار کرے۔ امید یہ ہے کہ آئندہ سال کے شروع میں ایک ابتدائی رپورٹ پیش کی جا سکے گی۔ جسے تنظیم کی دوسری منزلوں کی بنیاد بنایا جا سکے گا۔

قومی تنظیم کی اسکیم کا ایک خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ (الف) قومی معاشی تنظیم کی اسکیم کا خاکہ

(۱) زمین کی تنظیم

زمین کی زرخیزی کا تحفظ۔ جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا اور گھاس کی زمینوں کا انتظام — آبادی، غذا اور فصلوں کی تنظیم — صوبہ کے درمیان نقل سکونت اور دوبارہ بستی بسانا۔ مویشیوں کی ترقی، مقامی نسلوں کی ترقی اور معاشی حیثیت سے غیر فائدہ بخش نسلوں کا ختم کر دینا۔

(۲) پانی کی تنظیم

سیلاب کی نگرانی اور دریاؤں کا انتظام — نہروں کا بنانا اور آبپاشی کی ترقی — ملک کے اندر دریائی سفر کی ترقی۔ سمندری اور اندرون ملک کے ماہی گیری کے مرکزوں کی ترقی — خشک دریاؤں اور آبی راہوں کو دوبارہ ترقی دینا۔

(۳) قومی وسائل کی تنظیم

قوت محرکہ اور ایندھن کی ترقی (جس میں آبی بجلی کی ترقی اور کوئلہ یا دوسرے قسم کے ایندھن کو صنعتی قوت محرکہ یا متحدہ صنعتوں کے لئے ترقی دینا بھی شامل ہے)۔ ہر قسم کے کچے مال کو (جس میں جنگل کی پیداواریں بھی شامل ہیں) دریافت کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا۔ معدنی وسائل سے فائدہ اٹھانا۔

(۴) مزدوروں کی تنظیم

مزدوروں کے لئے ضوابط اور قانون سازی۔ مزدوروں کی تنظیم۔ تندرستی، بیماری اور بے

روزگاری کا بیمہ۔ مکانوں کی فراہمی اور جماعتی بہبود کی کوششیں۔

(۵) زراعتی تنظیم

بیجوں، کھادوں، اوزاروں اور کھیتی کرنے کے طریقوں میں اصلاح۔ کھیتی میں امداد باہمی اور اگر ضرورت ہو تو ان کی اشتمالی اصول پر تنظیم دیہات کے نقل وحمل اور طریقہ خرید وفروخت میں جس کے ساتھ دیہی اعتبار بھی منسلک ہے اصلاح۔ قرض میں کمی کرنا اور زرعی ساہوکارے کی نگرانی زمین کے معاملہ اور ترکہ کے قوانین پر نظر ثانی۔ زراعت سے متعلق خانگی صنعتیں اور ضمنی پیشے۔

(۶) صنعتی تنظیم

کلیدی اور بنیادی صنعتوں کی ترقی (کیمیادی، معدنی اور دھات سازی کی صنعتیں، مشینیں مشین کے اوزار اور قوت محرکہ فراہم کرنے والے انجن)۔ ہلکی صنعتوں کی ترقی۔ زراعتی صنعتوں کی ترقی۔ بڑی منظم صنعتوں کو عقل کے مطابق تنظیم دینا تاکہ اندرونی مقابلہ کا تدارک ہو سکے اور بڑے پیمانہ اور چھوٹے پیمانہ اور دستکاری کی صنعتوں میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکے۔ مختلف صوبوں کی صنعتی پالیسی میں کچے مال، کم ترین اجرتوں اور مزدوروں کے ملازم رکھنے کے معیاروں میں یکجہتی پیدا کرنا۔

(۷) تجارتی تنظیم

امتیازی تحفظ کی پالیسی پر عمل درآمد۔ زراعت کے خاص فائدہ کے لئے، باہمی فائدہ کے معاہدے۔

(۸) اعتبار کی تنظیم

زر کی پالیسی میں تنظیم۔ مختلف اعتبار کی ایجنسیوں میں مرکزی نگرانی کے ماتحت ہم آہنگی اور یکجہتی۔ زراعت کے لئے طویل مدت کے اعتبار کی تنظیم۔ صنعتی بنک کاری کی ترقی۔

(۹) مالیات کی تنظیم

محصول کے بار کی ایسی نظر ثانی جس سے دیہی عوام کو فائدہ پہنچے۔ زمین کی معاملہ کی پالیسی پر نظر ثانی۔ دیہی جماعتی فلاح کے مختلف کاموں پر خرچ (اس میں اندرونی وسائل آمد ورفت، بہم رسانی

والے مسالے کی صنعتیں ۔

پبلک فائدہ کی صنعتیں

۱۔ بجلی گیس اور دوسرے قسم کی قوت کو تقسیم کرنے والی صنعتیں
۲۔ نقل وحمل اور رسل و رسائل کے سلسلہ میں پبلک کی خدمت کرنے والی صنعتیں
۳۔ بہم رسانی آب
۴۔ صفائی

بنک کاری اور بیمہ پر بعد میں غور کیا جائے گا ۔

(نوٹ) اوپر جو فہرستیں درج کی گئی ہے یہ صرف عارضی ہیں ان میں آئندہ اضافہ اور تبدیلی ہو سکتی ہے ۔

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ دہلی)

بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں میں اور ان ابتدائی مدرسوں میں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے مطابق تعلیم ہو رہی ہے یہ سوال تمام پڑھانے والوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر استادوں نے اس کا حل بھی سوچا ہے لیکن انھیں ابھی شبہ ہے کہ جو طریقہ ان کی سمجھ میں آیا ہے وہ موثر اور نتیجہ خیز بھی ہے یا نہیں۔ ابتدائی مدرسہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تو ہمارا کام کسی نہ کسی طریقہ سے چل ہی جائے گا اور اگر کہیں مضامین کا براہ راست کسی حرفہ سے تعلق نہ بھی ہوگا تو کام میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوگی لیکن استادوں کے مدرسوں میں جہاں اکثر خود سوچنے والے اساتذہ بھی ہوتے ہیں ہمارا اچھا لائحہ عمل ہی ان کی تشفی کر سکے گا۔

نئی تعلیم میں اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کا سوال تو بہت بعد میں آئے گا۔ اس کے لئے تو ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی لیکن حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی تعلیم کا سوال تو پہلے ہی دن سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس تعلیم کے نئے پن نے ملک کے قابل لوگوں کا رخ بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں کی طرف کر دیا ہے اور جو لوگ ان ٹرننگ اسکولوں کے ذمہ دار ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مدرسوں میں آنے والے اساتذہ پہلے ہی دن سے اس چیز کے معلوم کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ان کو وہ باتیں معلوم ہو جائیں جن سے وہ حرفہ سے مضامین کے مربوط کر کے پڑھانے کی طریقوں سے واقف ہو سکیں۔ لہٰذا یہ سوال اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم کی دو ہی خوبیاں ملک کے لوگوں کو بہت بھائی ہیں ایک تو اس کا اپنا خرچ آپ برداشت کرنا دوسرے بچے کی مکمل تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہونا۔ ملک کے قابل سے قابل لوگوں نے

اس کی ان دونوں خوبیوں کو اب تک سراہا ہے اور جن مدرسوں میں بنیادی قومی تعلیم کا نصاب پڑھایا جارہا ہے وہاں روزانہ اس بات کے دیکھنے کے لئے لوگ آتے رہتے ہیں اور ہمارے کام سے زیادہ ہماری گفتگو سے تشفی پاتے ہیں لیکن اس بات کا عرصہ تک جاری رہنا خود اس اسکیم کے لئے بہت مضر ہے۔ اس اسکیم کا جو کچھ خاکہ ہمارے ذہنوں میں ہے اور جس کو ہم ان مہمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کی تشفی کرتے ہیں اس کو اب عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔ اس سے ایک طرف تو ہم ان مدرسین کی تشفی کر سکیں گے اور دوسری طرف اس اسکیم کے بھی خواہوں کی بات رکھ سکیں گے۔

ہم نے اپنے مدرسہ میں حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی پڑھائی کا تجربہ کیا اس دوران میں اس کے نئے نئے طریقوں پر غور کرنے اور آزمانے کا برابر موقعہ ملتا رہا۔ ان مواقع کو میں نے اپنی رپورٹ "گتے کے کام سے مضامین کا ربط" میں درج کر کے شائع کر دیا ہے اور ہم نے جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تجربہ کیا ہے وہ بھی "بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟" کے عنوان سے رسالہ جامعہ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں ان اساتذہ کو جو بچوں کے ساتھ اس قسم کے تجربہ میں جگہ بہ جگہ لگے ہوئے ہیں اپنے تجربوں کو قلم بند کر کے رسالوں اور اخباروں میں شائع کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ اگر تجربوں میں غلطی ہوگی تو ہم اس سے بھی سیکھیں گے۔ اگر ہمارے پہلے تجربہ کا نتیجہ غلط ہوگا تو ہم دوسرا بہتر طریقہ سوچ کر اختیار کریں گے اور اس غور و فکر سے بہتر راستہ نکال سکیں گے۔ نئے کام میں پہلے پہل اچھے نتائج دیکھنے میں نہیں آتے لیکن وہ ہمیں ایسے طریقوں کے سوچنے میں ضرور مدد دیتے ہیں جن سے اچھے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ایک سال کے اندر کارڈ بورڈ کو بطور حرفہ قرار دے کر مربوط پڑھائی کا جو کچھ تجربہ ہم نے کیا اس کو ہم نے کتابی شکل میں شائع کر دیا بغیر اس پس و پیش کے کہ یہ غلط ہے یا صحیح نئے کام میں جب تک کوئی کیا ہوا تجربہ ہمارے سامنے نہ ہو ہم اس کے حسن و قبح پر کس طرح غور کر سکتے ہیں؟ اگر کارڈ بورڈ کے کام پر کئی تجربے ہمارے سامنے ہوں تو ہم مربوط پڑھائی کے بہترین طریقے پیش کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس تجربہ کے بعد ایک ایسا خاکہ پیش کرتے ہیں جو لوگوں کے لئے تھوڑی ترمیم کے بعد مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

کارڈبورڈ کے کام میں کارڈبورڈ سے ماڈل بنانا اصل مقصد تھا لیکن اس بڑے کام میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے با مقصد کام کرنے پڑے، جن کا کرنا اس بڑے کام کے ضمن میں ضروری تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے عملی کام اس بڑے کام کے کرانے میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں کبھی ارادی طور پر کبھی غیر ارادی طور پر اور کبھی بچوں کے سوالات کرنے کے دوران میں مثلاً

(۱) بازار جا کر کارڈبورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا۔

(۲) کاغذ اور کارڈبورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

(۳) لیئی پکانا

(۴) شہر کی ان دوکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈبورڈ سے لوگ مختلف چیزیں بناتے ہیں

(۵) تیل اور لیئی کی ابری بنانا

(۶) ہاتھ سے کاغذ بنتے ہوئے دیکھنا

(۷) خود ہاتھ سے کاغذ تیار کرنا

(۸) شہر کے لوگ کارڈبورڈ سے جو چیزیں تیار کرتے ہیں وہ کس کام میں استعمال ہوتی ہیں ؟

(۹) جو ماڈل بچے بناتے ہیں وہ کس کس کام میں استعمال ہوتے ہیں

(۱۰) چیزوں کے بیچنے کا انتظام کرنا۔

(۱۱) کارڈبورڈ کے کام میں جو اوزار اور چیزیں استعمال ہوئی ہیں ان کو کن کن لوگوں نے تیار کر کے ہماری ضرورت کے لئے مہیا کیا ہے ؟

(۱۲) کارڈبورڈ اور کاغذ جن چیزوں سے بنتا ہے ان کی پیداوار کا مشاہدہ کرنا

یہ چند ان کاموں کی فہرست ہے جن میں بچوں کو عملاً کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اس قسم کے عملی کاموں کے علاوہ چند مسائل بھی کام کرنے کے دوران میں بچوں کے سامنے آتے ہیں مثلاً

(۱) کاغذ سب سے پہلے کہاں کہاں بننا شروع ہوا ؟ کس طرح شروع ہوا ؟

(۲) دوسرے ملکوں میں کس طرح کن کن لوگوں کے ذریعہ پھیلا۔ اس کی ترقی میں کن ممالک

کے حکمرانوں اور لوگوں نے مدد کی؟

(۳) کاغذ کی ایجاد سے دوسری کون کون سی چیزیں ایجاد ہوئیں؟

(۴) کاغذ یا کارڈ بورڈ کن کن چیزوں سے بنتا ہے؟ وہ چیزیں ملک کے کس کس حصہ میں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کے لئے کس قسم کی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے؟ آب و ہوا کا اثر انسان پر کیا ہوتا ہے؟

(۵) کس کس قسم کا کاغذ ہندوستان کے باہر سے آتا ہے اور کن ممالک سے؟ ہندستانی کارڈ بورڈ کے علاوہ باہر سے کہاں کہاں سے کارڈ بورڈ آتا ہے؟

(۶) ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں کیسے جاتی ہیں؟

(۷) ہم کن کن چیزوں میں کاغذ استعمال کرتے ہیں؟

عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے چند ہی عنوانات ہم نے لکھے ہیں لیکن کام کرانے کے دوران میں کام کی وسعت اس قدر ہو جاتی ہے کہ اس میں زیادہ عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ میں نے چند باتیں اس لئے لکھی ہیں تاکہ میں ربط کے امکانات کو مضامین کے عنوانات کے تحت ظاہر کر سکوں یہ وہ SITUATIONS مواقع ہیں جہاں مضامین کے مربوط کرنے کا امکان صاف طور پر نظر آتا ہے اور یہی مواقع ہمارے لئے مربوط پڑھائی کا راستہ کھول سکتے ہیں۔ کام کرانے والوں کو دستی کام میں اس قسم کے مواقع کی تلاش خاص طور پر کرنی چاہیے پھر یہ بات خود سمجھ میں آنے لگے گی کہ ان مواقع پر زبان، حساب، سماج کے علم اور جنرل سائنس کے کون کون سے اسباق بچوں کو پڑھائے جائیں!

آئیے پہلے عملی کاموں کی فہرست سے شروع کریں اور دیکھیں کہ ان کاموں کے کرانے میں کن کن مضامین کے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۱) بازار جا کر کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا

طریقہ کار: اس سامان میں مختلف کاغذ رنگین اور سادے کارڈ بورڈ، چاقو، قینچی، گنیا، فٹ رول

پنسل، چمڑا، کپڑا وغیرہ چیزیں شامل ہوں گی۔ سامان کی خریداری میں لازمی طور پر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھنا اور بھاؤ معلوم کرنا چاہیئے۔ زندگی میں چیزوں کی خریداری میں جو صورتیں پڑتی جاتی ہیں اس کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کو زندگی کے لئے صحیح طور پر تیار کریں تو ہمیں ان کے لئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے۔ بچوں کے لئے خود سامان مہیا کر دینے سے بچوں میں RESOURCEFULNESS نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر بچے خود جا کر اپنے کام کے مطابق چیزیں خریدیں گے تو وہ اس چیز کی عملی تعلیم حاصل کریں گے کہ چیزوں کے اصل نرخ کیا ہیں اور کون سی چیز کس بازار میں دستیاب ہوتی ہے؟ جغرافیہ کی موجودہ تعلیم دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں سے تو ہمیں واقف کرا دیتی ہے لیکن ہمیں خود اپنے شہر کی منڈیوں کا علم بالکل نہیں ہوتا۔

استاد کے لئے ساری جماعت کا لے جانا مناسب نہ ہوگا بلکہ بچوں کی اس بارے میں رہنمائی کی جائے کہ وہ اپنی جماعت سے چند طلبا کو منتخب کریں جو جا کر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھیں اور نرخ معلوم کرکے اپنی رپورٹ مرتب کرکے جماعت کے سامنے پیش کریں۔ رپورٹ کا خاکہ بھی خود بچوں کو استاد کی رہنمائی میں جماعت میں طے کرنا چاہیئے۔ مثلاً چیزوں کی کتنی اقسام ہیں۔ مختلف اقسام میں کون کون سی فرق نمایاں ہیں؟ کس طرح بکتی ہیں (من کے حساب، یا پونڈ کے حساب، یا رم کے حساب یا فی عدد وغیرہ) کیا کیا نرخ ہیں؟ کہاں کہاں سے آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ چیزوں کی فہرست طویل ہوگی اس لئے کئی کمیٹیاں بنانی چاہیئیں۔ اگر دکانوں پر تمام باتیں نہ معلوم ہو سکیں تو کتابوں سے معلوم کرنا چاہیئے (اس انداز پر کتابیں ابھی نہیں لکھی گئی ہیں) ورنہ استاد اپنی معلومات سے بچوں کو رپورٹ مرتب کرنے میں مدد دے۔ (اس طرح کام کرانے سے جو ذہنی اثرات مرتب ہوں گے ان کا تذکرہ کسی دوسرے مضمون میں کروں گا)

اگر استاد دیکھے کہ کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام بہت زیادہ ہوگا تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کے لئے ایک بڑی کمیٹی کے بنانے کی طرف بچوں کی رہنمائی کرے۔ اس بڑی کمیٹی کی کئی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ مثلاً کاغذ اور کارڈ بورڈ کے متعلق دریافت کرنے کا کام یقیناً بہت

زیادہ ہوگا۔ مختلف رنگ مختلف قسم اور مختلف سائز کے کاغذات مختلف ممالک سے آتے ہیں سادے فل اسکیپ کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۶ پونڈ تک ہوتے ہیں' لائن دار کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۴ پونڈ تک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کارڈ بورڈ ہندوستان کے علاوہ جاپان اور ہالینڈ سے بھی منگایا جاتا ہے۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ کے کئی کارخانے ہندوستان میں بھی ہیں۔

۷۔ اگر ان باتوں کو مضامین اور اسباق کے تحت تقسیم کرکے دیکھا جائے تو ذیل کی باتیں صاف طور پر بتلائی جاسکتی ہیں

زبان | مختلف دوکان داروں کے نام کمیٹیوں کا خط لکھنا کہ وہ انھیں اپنی دوکان پر آنے اور چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دیں (تمام طلبا خط لکھیں جو اچھا ہو وہ بھیجا جائے۔ ایک خط کمیٹی کے فائل میں رہے) دکانیں دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا۔ خط لکھنے کے متعلق کوئی مضمون پڑھنا جس سے یہ معلوم ہو کہ خطوط کن باتوں کے متعلق لکھے جاتے ہیں اور ان کے لکھنے کا کیا کیا ڈھنگ ہوتا ہے نمونہ کے خطوط جماعت میں پڑھ کر سنانا۔ نمونہ کے خطوط جماعت میں لکھ کر آویزاں کرنا خطوط کا کوئی معیار طے کرنا۔ کمیٹیوں کا رپورٹ مرتب کرنے کے لیے" جماعت کی رائے اور استاد کے مشورہ سے' خاکہ تیار کرنا۔ کمیٹیوں کا اپنی اپنی رپورٹیں جماعت کے سامنے پیش کرنا۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہو تو استاد کے مشورہ سے اس کو شامل کرنا یا ایسی باتوں کو صحیح کرکے لکھنا جو غلط معلوم ہوتی ہوں۔ رپورٹوں کے مرتب کرنے کے دوران میں ان چیزوں کے متعلق کتابوں' رسالوں اور اخباروں سے بھی پڑھنا۔ رپورٹ کا اپنے قلمی رسالہ میں شایع کرنا

حساب | مختلف چیزوں کے نرخ کا چارٹ تیار کرنا۔ مثلاً جاپانی گتا کتنے من بکتا ہے؟ ہندوستانی اور ہالینڈ کا گتا کس حساب سے بکتا ہے؟ گرس' رم' کوڑی' کے پیمانے لکھ کر آویزاں کرنا۔ ہندوستانی تول اور انگریزی تول کے پیمانے لکھ کر جماعت میں لگانا۔ پیمائش کے پیمانہ لکھنا۔ ابتدائی جماعتوں میں جمع' تفریق' ضرب اور تقسیم کے سادے اور مرکب قاعدوں کی مشق کے لئے چیزوں کی خریداری کے سلسلہ میں سوالات مرتب کرنا اور بڑی جماعتوں میں حساب تجارت اور اکائی کے طریقوں سے

قیمت کا پھیلانا۔

سماج کا علم | ہندوستان کے نقشہ پر ان شہروں کا درج کرنا جہاں کاغذ اور کارڈ بورڈ کے مِل ہیں ان شہروں کا درج کرنا جہاں چاقو اور قینچیاں تیار ہوتی ہیں۔ ان شہروں کا لکھنا جہاں ہاتھ سے کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے نقشہ پر ان ممالک کا درج کرنا جہاں سے ہندوستان میں کاغذ آتا ہے۔ ان ملکوں کی بابت کتابوں سے پڑھنا ذرایع آمد و رفت کے متعلق پڑھنا۔ رسل و رسائل کو طریقوں کا معلوم کرنا۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں کے لئے کیوں چیزیں تیار کرتے ہیں؟ ہندوستان میں ہندوستان کی ضروریات کے مطابق کاغذ کیوں نہیں تیار ہوتا؟

(۲) کاغذ اور کارڈ بورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

طریقہ کار | ہندوستان میں ابھی اتنے کارخانے قائم نہیں ہوئے ہیں کہ مدرسوں کو کہیں قریب ہی اس قسم کے کارخانوں کے دیکھنے کا موقعہ مل سکے۔ لیکن اگر کہیں قریب ہی اس قسم کا کوئی کارخانہ ہو تو جماعت کو آپس میں مشورہ کرکے طے کرنا چاہیئے کہ وہ کارخانوں میں جاکر کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ تمام کارخانوں میں یہ دقت ہوتی ہے کہ بچوں کو کارخانہ دیکھنے کے لیے اندر نہیں جانے دیتے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا ہے کہ بچے اندر نہیں جا سکتے۔ غالباً بچے مشینوں کی دیکھ بھال میں بالکل محو ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ مشینوں سے بچ کر دیکھنے کا خیال جاتا رہتا ہے اور اس طرح حادثات ہو جاتے ہیں لیکن اگر استاد ذمہ داری لے تو غالباً اجازت مل جاتی ہے استاد کو تھوڑے تھوڑے لڑکوں کو کارخانہ میں لے جاکر چیزیں دکھلانا چاہیئے تاکہ بچے مشینوں سے بچ کر تمام باتوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ بننے کا پورا طریقہ اس طرح سمجھانا چاہیئے کہ بچے بعد کو اس کو قلم بند کر سکیں۔ پاور ہاؤس اور اس کچے مال کا مشاہدہ خاص طور پر کرنا چاہیئے جس سے کاغذ یا گتا تیار ہوتا ہے کارخانوں میں مزدوروں کی زندگی کا مشاہدہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے تقسیم کار کی منظم مثال کی طرف بچوں کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانی چاہیئے۔

زبان | کارخانہ دیکھنے کے لئے اجازت حاصل کرنا۔ اجازت حاصل کرنے کے لیے درخواست لکھنا

درخواست میں لکھنا کہ کیا کیا باتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ کارخانہ دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا اور رپورٹ مرتب کرنا۔ رپورٹ کا رسالہ میں شائع کرنا۔ کارخانوں کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ کارخانہ کی تاریخ کے متعلق پڑھنا۔ سفر کے حالات لکھ کر رسالہ میں شائع کرنا۔ ریل پر نظمیں پڑھنا

حساب | اگر سفر ریل کے ذریعہ کیا گیا ہو تو کرایہ خوراک تانگہ اور قلی وغیرہ کا حساب کرنا۔ مختلف درجوں کا کرایہ ریل معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل۔ آمد و خرچ کا بجٹ بنانا۔ آمد و خرچ کا حساب رکھنا۔ آمد و خرچ کا حساب رسالہ میں شائع کرنا۔ اگر سفر لاری کے ذریعہ کیا گیا ہو تب بھی کرایہ خوراک اور رہائش کا حساب معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل بذریعہ لاری معلوم کرنا۔ پٹرول کی قیمت فی گیلن معلوم کرنا گیلن کا پیمانہ لکھ کر جماعت میں آویزاں کرنا۔ ایک گیلن پٹرول میں کار اور لاری کتنے کتنے میل جاتی ہیں؟ ٹائم ٹیبل دیکھنا سیکھنا ٹائم ٹیبل بنانا۔ ریل کی رفتار کے سوالات اکائی سے کرنا۔

سماج کا علم | پٹرول کہاں کہاں نکلتا ہے؟۔ دنیا میں کوئلہ کہاں کہاں نکالا جاتا ہے؟ انجن، موٹر اور بجلی کے ایجاد کرنے والے کون تھے؟ ان کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ ریل موٹر اور بجلی کی ایجاد سے دنیا کو کتنا فائدہ ہوا؟ مزدور گاؤں چھوڑ کر ملوں میں کام کرنے کیوں جاتے ہیں؟ کارخانہ دار اور مل کے مالک مزدوروں کے لئے کیا کیا کرتے ہیں؟ جو کچھ وہ کرتے ہیں کیا وہ کافی ہے؟ مزدوروں کی تحریکیں اور ان کے چلانے والے۔ کسانوں کی تحریکیں ان کے مقاصد اور چلانے والے ملوں اور کارخانوں میں حادثات کی روک تھام کس طرح کی جاتی ہے۔ مزدوروں کی تندرستی اور صحت کے لئے اور کیا کیا انتظامات ہیں؟ جن جن چیزوں سے کاغذ تیار ہوتا ہے وہ کہاں کہاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کارخانہ تک کیسے آتی ہیں؟ ذریعہ آمد و رفت۔ بیل گاڑی، ٹرالی، موٹر لاری، ریل وغیرہ

جنرل سائنس | بانس، گنا، گیہوں، روئی اور چاول کیسے پیدا کرتے ہیں۔ پودوں کی زندگی کے متعلق معلوم کرنا۔ بانس کے جنگل میں کون کون سے پرند جانور اور کیڑے پائے جاتے ہیں؟ بجلی اور گیسوں کے متعلق پڑھنا۔ بجلی کی طرح ہوا، پانی اور بھاپ میں بھی طاقت ہوتی ہے ان طاقتوں کو کیسے معلوم کیا گیا؟ معمولی حادثات علاج معالجہ کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کی جاتی ہیں؟

(۳۴) لپئی بنانا

[طریقۂ] کار بظاہر لپئی پکانا بہت معمولی سا کام ہے لیکن اس کو جب ہم پڑھائی کے نکتہ نظر سے دیکھتے [ہ]یں تو اس میں کمیسٹری کے اصولوں کے مشاہدہ کا پورا موقعہ ملتا ہے۔ لپئی اچھی اسی وقت بن سکتی ہے [ج]بکہ اس میں زیادہ سے زیادہ چپک ہو۔ ایسی لپئی چیزوں کے مناسب طریقہ سے ملانے سے [ہ]ی بن سکتی ہے پھر لپئی عرصہ تک صحیح حالت میں اس طرح رہے کہ اس کی وہ چپک بھی برقرار رہے [ا]س کو اگر آپ کہیں رکھ دیں تو کوئی جانور یا پرندہ پکا ہوا آٹا سمجھ کر کھا نہ جائے۔ لپئی پکاتے وقت [ن]یلا تھوتھا ملانا بچوں کے لئے یہ بہت دلچسپ تجربہ ہوگا اگر نیلا تھوتھا بنا کر دکھایا جائے۔

[ز]بان کسی ایسے قصے کا سنانا جس میں زہریلے سانپ نے کاٹا ہو اور مرے ہوئے آدمی کو کسی [کس]ی نے زندہ کیا ہو (جیسے منشی پریم چند جی کا افسانہ منتر) ایک آدمی کا قصہ جس نے بہت سے چوہوں کو [آ]ٹے میں گولی دے کر مار ڈالا۔ ایسے قصے جس جس میں کسی نے کسی کو زہر دیا ہو جیسے حضرت حسنؓ کا [قص]ہ۔ یا سقراط حکیم کا قصہ جس کو زہر سے بھرا ہوا پیالہ پینے کے لئے دیا گیا تھا۔ بادشاہوں کے قصے [جن]ن کو زہر دیا گیا۔ زہر کی روک تھام کے لئے خاص قسم کے پیالہ کا مغلوں کے وقت میں بننا ایجاد ہونا۔

[حس]اب تھوڑی لپئی پکانے میں لکڑی یا کوئلہ میدہ اور نیلے تھوتھے کا خرچ زبانی سوالات کے ذریعہ [مع]لوم کرنا۔ ہر چیز کی مقدار کا مقرر کرنا۔ تناسب اور فی صدی (یہ قاعدے جس جماعت کے نصاب [می]ں ہوں وہاں پڑھائے جائیں)

[تاری]خ کا علم سانپ کے کاٹے سے کتنے لوگ ہندوستان میں مرجاتے ہیں۔ سانپوں کی قسمیں بچھو کی [قسم]یں۔ زہر کیا ہے؟

[سا]ل سائنس زہر کن کن چیزوں میں ہوتا ہے اس کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور کس قسم کا ہوتا ہے؟ نیلا [تھو]تھا کس طرح بنتا ہے؟ کس اور زنگ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

[۔] شہر کی ان دکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈ بورڈ سے لوگ مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں؟

[طریق]ۂ کار بچوں کو کئی ایسے کارخانے دکھلانے چاہئیں جہاں لڑکے لڑکیاں مرد اور عورتیں کارڈ بورڈ

کے مختلف سایز کے بکس ان دوکانداروں کے لئے تیار کرتے ہیں جو اپنی چیزوں کو ان بکسوں میں رکھ کر فروخت کرتے ہیں۔ بعض کارخانے ایسے ہوتے ہیں جو کارڈ بورڈ اور چمڑے کو ملا کر سوٹ کیس بناتے ہیں اور بعض کارخانے کارڈ بورڈ کی فینسی چیزیں تیار کرتے ہیں مثلاً زیورات کے ڈبے سگار دان اور گڑیوں کے ڈبے وغیرہ۔ اس مشاہدہ میں ان کے اوزاروں اور ان کے بنانے کے طریقوں کو اچھی طرح دکھلانا چاہیے کس وزن کا کارڈ بورڈ کس چیز کے بنانے میں استعمال کرتے ہیں؛ وہ اپنا سامان کہاں کہاں سے منگاتے ہیں؛ کتنے دیر کام کرتے ہیں؛ اپنے یہاں کام کرنے والوں کو کیا اجرت دیتے ہیں؛ وغیرہ وغیرہ باتیں پیش نظر رکھی جا سکتی ہیں۔

زبان | بچوں سے اس مشاہدہ کے بعد مضمون لکھوائے جائیں جو ان کے ماہواری یا پندرہ روزہ رسالہ میں شائع ہوں۔ ان چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں عموماً گندگی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں بچوں کی تجویزیں لکھی جائیں اور ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان پر غور کرایا جائے کارخانوں کی حفاظت اور نقصان سے بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے کہا جائے اور ان کی تجویزیں قلمبند کر کے شائع کی جائیں (یہ کام استاد کے مشورہ سے ہونا چاہیے تاکہ بچے بہترین تجویزیں سوچ سکیں اس سے سوشل اسٹڈیز کے نصاب میں پولیس اور مونسپلٹی کے بارے میں تبلانے میں آسانی ہوگی) اس کے متعلق پڑھانا کہ کونسی دستکاری بڑے پیمانہ پر ملوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور کونسی چھوٹے پیمانہ پر گھروں میں کرائی جا سکتی ہے۔

حساب | بکسوں اور ڈبوں پر لاگت اور بکری کے سوالات چاروں مرکب قاعدوں تجارت اور اکائی کے ذریعہ بطور مشق کرانا۔ چونکہ مختلف سایز اور کوالٹی کے بکس اور ڈبے بنتے ہیں لہذا مختلف قیمتوں کے درسے درجن یا گرس کی قیمت معلوم کرائی جا سکتی ہے۔ کام کرنے والوں کی اجرت معلوم کرنا اور اس کا حساب زبانی سوالات میں نکالنا کہ وہ ایک ماہ میں یا ایک سال میں کتنا پیدا کر لیتے ہیں؛

سماج کا علم | لوگ اپنے بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کے لئے کیوں بھیجتے ہیں؟ ان کو تعلیم کے لئے کیوں نہیں بھیجتے؟ پولیس اور میونسپلٹی کارخانوں کی حفاظت اور صحت کے لئے کیا کرتی ہیں؟ اجارہ داری

کا کیا مطلب ہے؛ لوگ اپنی چیزیں رجسٹرڈ پیٹینٹ کیوں کراتے ہیں اس قسم کے کارخانوں کے قیام کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟

جنرل سائنس | ایک طرح سے بیٹھ کر متواتر کام اور دیر تک کام کرنے میں دوران خون پر کیا اثر پڑتا ہے دوران خون کے صحیح طریقہ پر انجام نہ پانے کی وجہ سے اعضا کی نشو ونما پر کیا اثر پڑتا ہے کم جگہ میں بہت سے لوگوں کے کام کرنے سے صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

کمپنی کی تجارت ہندوستان میں

(از جناب منت اللہ رحمانی صاحب ایم۔ایل۔اے)

انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ہندوستان کی صنعتیں بے نظیر شمار کی جاتی تھیں خصوصاً مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں تو ہندوستانی صنعتوں نے اس قدر ترقی کی اور ان کی برآمد اس قدر بڑھی کہ دوسرے ملکوں پر ہندوستان کا مال چھایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے اور قالین، موتی، جواہر اور زیورات مرصع طلائی اور نقرئی سامان، خوشبوئیں، رنگ اور مسالے، چوبینہ کا کام، لوہے کا سامان، فولاد کے آلات اور ہتھیار، غرضکہ تمدن اور تمول کی اعلیٰ سے اعلیٰ ضروریات دور دور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے، اور چونکہ ہندوستان نے جہاز سازی اور جہازرانی میں بھی بہت ترقی کرلی تھی، اس لئے یہ ساری چیزیں ہندوستان ہی کے بنے ہوئے جہازوں میں ہندوستانی جہازراں کی زیرنگرانی جایا کرتی تھیں، اور بعض مصنوعات کی خاطر یورپ والے ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے، اور اس کی راہ میں جان ومال لٹاتے تھے۔

سولھویں صدی سے یورپ کے تاجر بحری راستہ سے ہندوستان آنا شروع ہوئے اور سترھویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کے تاجر ہندوستان پہنچے، اور سترھویں صدی کے وسط سے تجارت میں ترقی شروع ہوئی اور سترھویں صدی کے آخر میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ سوتی کپڑا ریشم اور ریشمی کپڑا، اون، متفرق مصنوعات، شورہ، نیل، مصالحے اور ادویات خاص کر انگلستان کو برآمد ہوتی تھیں۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی معرفت ہندوستانی کپڑا انگلستان کے علاوہ آئرلینڈ، اسپین، فرانس، جرمنی اور تمام قرب وجوار کے یورپی ممالک میں پھیل گیا، اور ایسا مقبول ہوا کہ امیر وغریب سب ہی استعمال کرنے لگے، ہندوستانی کپڑا خوش وضع، خوش رنگ، پائدار، اور بہت سستا تھا یوں تو وہ عام طور پر کالیکو کہلاتا تھا، لیکن چھینٹ، ورسیس، گنگم، ہمم وغیرہ اس کی بہت سی قسمیں مشہور

تھیں، تن پوشی سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فیشن اور زیب و زینت کی ضروریات انھیں سے پوری ہوتی تھیں۔ انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی کپڑے کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز تھے، وہ زیادہ تر ادنیٰ کپڑا تیار کرتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ہمسایہ ممالک سے کچھ سن کا کپڑا بھی منگاتے تھے۔ جو لینن کہلاتا تھا۔ انھیں کپڑوں سے پہننے اوڑھنے کا کام چلتا تھا، ہندوستانی کپڑا اپنی خوبیوں کی بدولت اس قدر مقبول ہوا کہ پارچہ بافوں کا روزگار بالکل مارا گیا اور دوسرے ملکوں سے انگلستان میں سن کا کپڑا آنا بھی بند ہو گیا۔

جیمس اول کے زمانہ سے انگلستان میں ریشمی کپڑے کی صنعت پر بھی توجہ جاری تھی، پہلے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارس اور چین سے کچھ ریشم خام لا کر دیا، تو انگلستان کے صناع بہت خوش ہوئے اور صنعت میں جان پڑ گئی، لیکن بنگال ریشم کا گھر ہے، وہاں ریشمی کپڑے کی صنعت درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارخانے قائم کرکے پارچہ بافوں سے ریشمی کپڑے تیار کرانا شروع کر دئے، بلکہ انگلستان سے کچھ پارچہ باف بلا کر ان کی مدد کے لئے رکھ دئے۔ طرح طرح کے لاجواب ریشمی کپڑے تیار ہونے لگے، مثلاً اطلس، کم خواب، ساٹن، تن زیب اور رومال وغیرہ اور سب کے سب پائدار اور ارزاں، جب یہ مال انگلستان پہنچا تو لوگ دیکھ کر دنگ ہو گئے اور بے ساختہ بول اٹھے کہ دنیا میں اس سے بہتر کپڑا ملنا محال ہے، اول تو سوتی کپڑے کی بہتات کچھ کم نہ تھی، ریشمی کپڑے نے اور بھی دلوں کو موہ لیا، اس کے علاوہ متفرق مصنوعات میں مندرجہ ذیل سامان ہندوستان سے تیار ہو کر انگلستان جایا کرتے تھے اور وہاں بہت مقبول ہوتے تھے۔ ریشمی رومال۔ باناتی ہیٹ یعنی انگریزی وضع کی ٹوپیاں) سلے سلائے کپڑے خوشنما دستی پنکھے چینی کے برتن، تانبے، پیتل کے منقش برتن اور صندوقچے، چوبینہ کے سامان، میز کرسی وغیرہ جو نقاشی اور رنگ سازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے، کھلونے اور تصویریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی فہرستوں میں یہ سامان بکثرت درج ہیں کہ فلاں فلاں جہاز میں اس اس قدر سامان ہندوستان سے انگلستان پہنچا۔

ہندوستان سے جو سامان خام برآمد ہوتا تھا، اہمیت کے لحاظ سے اس میں شورہ سب سے مقدم نظر آتا ہے، اس کے بعد نیل، لاک مصالحہ اور ادویات کی برآمد تھی۔

'شورہ' بارود کی جان ہے اور ہر سلطنت کو بارود کی جس قدر ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں، اس کی پیداوار عام نہیں شورہ دنیا کے خاص خاص حصوں میں ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے صوبہ بہار میں شورہ قدرتی طور پر افراط سے پیدا ہوتا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت انگلستان کے واسطے ہندوستان سے شورہ لے جاتی تھی اور اس کی برآمد پر اس کو ناز تھا۔

جس طرح شورہ بارود کی جان ہے، اس زمانہ میں نیل رنگ سازی کی جان تھی، اور اس کی جگہ پر بہت مانگ تھی، خوش قسمتی سے نیل بھی ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا تھا اور کمپنی اس کی برآمد بھی خوب کرتی تھی، جب تک یورپ اور خاص کر جرمنی میں نئے نئے رنگ نہیں ایجاد ہوئے، ہندوستان میں نیل کا کاروبار خوب چلتا رہا، اور بیسویں صدی کے وسط سے نیل کا کاروبار پھیکا پڑ گیا۔

'لاک' بھی ہندوستان کے جنگلوں کی خاص پیداوار ہے، قدیم زمانہ میں اس سے اعلیٰ قسم کی رنگین وارنش تیار ہوتی تھی۔ جس سے لکڑی کی مصنوعات پر نہایت خوشنما نقش ونگار بنتے تھے اور یہ ہندوستان کی خاص صنعت تھی، سترھویں صدی تک اس کی مانگ بڑی اچھی تھی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطے سے اس کی برآمد جاری تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے کچھ ادویات کی جڑی بوٹی بھی برآمد کرتی تھی۔ افیون بھی لے جاتی تھی۔ کاہی۔ جو کوہ نیلگری پر پیدا ہوتی ہے، اس کا بھی استعمال انگلستان میں شروع ہو گیا تھا اور وہ بھی برآمد کی فہرست میں نظر آتی ہے۔ بعد کو انگلستان میں چائے کا شوق بھی پیدا ہو گیا اور وہ بھی ہندوستان سے برآمد ہونے لگی۔

سترھویں صدی کے آخر تک ان تمام چیزوں کی برآمد بہت بڑھ گئی اور خصوصیت سے انگلستان، ہندوستانی مال کی فروخت کے لیے منڈی بن گیا، اور اس کے مقابلہ میں انگلستان

لی معدودے چند صنعتوں میں اونی کپڑا قومی صنعت مانا جاتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی خوبی نہ تھی، گراں بہت تھا اور ہندوستان میں تو اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انتہائی کوشش کی کہ انگریزی اونی کپڑا برآمد ہو۔ کمپنی نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ فارس میں تو کچھ ضرور فروخت ہوا لیکن ہندوستان میں تو کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ پارلیمنٹ نے ۱۶۹۳ء کے منشور میں کمپنی کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ وہ کم از کم ایک لاکھ پونڈ قیمتی اونی کپڑا ہر سال انگلستان سے برآمد کرتی رہے۔ مجبوراً کمپنی کو منظور کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہندوستان میں فروخت نہیں ہوتا تھا۔ کمپنی کے گماشتے یہاں سے بار بار لکھتے کہ کپڑا گودام میں پڑا ہوا ہے، دیمک لگ رہی ہے، کوئی نہیں خریدتا اور وہاں سے تاکید آتی کہ اونے پونے جس طرح بھی نکل سکے نکال دو، قیمت کی کچھ پروا نہ کرو ہم بھی کیا کریں مجبور ہیں، جو کچھ نقصان ہوگا دوسری مدوں سے پورا کر دیں گے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۱۶۹۴ء میں لکھا ہے کہ:۔

> "ہم کو نیا منشور ملا ہے، اس کے مطابق ہم پہلے سے زیادہ اونی کپڑا فروخت کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی جو مقدار رکھی گئی ہے اس کا فروخت ہونا کسی طرح ممکن نہیں، اس میں سے کچھ تو فارس بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں اس کی کچھ مانگ بھی ہے، اور بقیہ ہندوستان چلا جاتا ہے وہاں بمشکل تھوڑا سا فروخت ہوتا ہے، باقی کو خواہ ہم مفت تقسیم کر دیں، یا گودام میں پڑا رہنے دیں حتیٰ کہ دیمک اور کیڑے جن سے ہم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کو چٹ کر لیں۔"

بہر حال ہندوستانی مصنوعات خاص کر کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا رواج بڑھا، تو انگلستان میں بے کاری پھیلنے لگی اور سخت برہمی پیدا ہونے لگی، اور انگلستان کے صناعوں نے مختلف طریقہ پر حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنا شروع کئے اور پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں جن میں سے چند ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) درخواست گذار پھول دار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اون اور ریشم ملا کر بھی کپڑا بنتے ہیں

اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا، اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(۲) اس علاقہ میں ریشمی اور ریشم اور اون ملا ہوا کپڑا بنایا جاتا ہے اور لوگوں کا یہی عام پیشہ ہے کچھ دنوں پہلے خوب فراغت سے زندگی بسر ہو رہی تھی، لیکن چند دنوں سے کاروبار بہت گر گیا اور لوگ بے کاری سے پریشان ہیں، استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دی جائے۔

(۳) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور انھیں پر معاش کا مدار تھا، لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آ رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ پہلے دوسروں کی امداد کرتے تھے آج وہ خود بے کار اور محتاج ہیں۔ لہذا درخواست دینے والوں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(۴) عرضی گذار ایک بڑی جماعت ہیں، ایک زمانہ سے ان کو قانونی طور پر حقوق حاصل ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان میں بہت سی باناتی ٹوپیاں (ہیٹ) بنوا کر منگائی ہیں اگر ان کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی، اس لئے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے، اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستانی لوگ ہمارے ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں، پنکھوں کی صنعت بھی انھوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوبینہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی صنعتوں کو برباد کر دیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں ہندوستان پیرس کا جانشین بن کر ہم پر فیشن عاید کرے گا ہم کو تو فرانس ہی کے وضع دار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا، اب ہندوستان سے خوب وضع دار لباس تیار ہو کر بکثرت آ رہا ہے، اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرض اس قسم کی بے شمار شکایتیں اور درخواستیں پیش کی گئیں اور یورپ کے صناعوں نے مل کر ہندوستانی مال کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا اور ساتھ ہی ساتھ سودیشی کی تحریک بھی پوری قوت سے چلائی گئی، وہی سودیشی کے استعمال کی تحریک جب ہندوستان میں چلائی جاتی ہے تو انگریز اس کو کوتاہ نظری سے تعبیر کرتے ہیں اور حکومت اس پر سزائیں دیتی ہے جیل بھیجتی ہے اور ہر ممکن طریقہ پر اس کے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب خود انگلستان کی صنعت خطرہ میں تھی تو اس حربہ کو پوری قوت سے استعمال کیا گیا۔ سودیشی کی تائید و حمایت میں نظمیں لکھی گئیں مضامین میں شائع کئے گئے اور رسالے چھاپے گئے اوران میں ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا اور انگلستان ہی کا بنا ہوا مال پہننے اور استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی۔ انگلستان کی عورتیں خصوصاً فیشن کی بہت زیادہ دلدادہ ہوتی ہیں اور وہی ہندوستانی مال کی زیادہ قدر کیا کرتی تھیں۔ اس لئے عورتوں کے لئے خاص طریقہ پر رسالے شائع کئے گئے جن میں ان سے ولایتی مال کے استعمال کی اپیل کی گئی اور مختلف جذباتی اور نفسیاتی طریقہ پر ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا تھا۔

ولایتی صنعتوں کی تباہی و بربادی کے علاوہ ایک سب سے بڑا غم انگلستان والوں کو یہ تھا کہ ہندوستانی مال کے بدلے میں انگلستان سے سونا اور چاندی ہندوستان بھیجا جاتا ہے، جس سے ایک ملک کی تباہی یقینی ہے اور جس کو کوئی بھی اپنے ملک سے باہر نکالنا نہیں چاہتا چنانچہ اسی زمانہ میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ:۔

> "یہ تجارت (ہندوستانی) بدترین قسم کی تجارت ہے، چاندی اور سونا جو کسی طرح بھی ہم کو علیحدہ نہ کرنا چاہیے، ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں ہندوستانی مصنوعات اور کھیل کھلونے آرہے ہیں۔ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

غرض جب اس طرح یورپ والوں نے ہندوستانی مال کے خلاف اپنے ملک میں ہنگامہ کیا تو پھر حکومت کو اس کی طرف توجہ کرنی پڑی اور کیوں نہ کرتی وہاں تو خود ملک والوں کی حکومت

تھی وہاں ہندوستان کی طرح دوسروں کی حکومت تو تھی نہیں کہ ہندوستانی مریں یا زندہ رہیں حکومت کو اپنے نفع سے مطلب ہے، ہندوستان کی صنعت تباہ ہو یا محفوظ رہے، حکومت کو اس سے کیا غرض! بہرحال انگلستان کی حکومت نے اپنے ملکی بھائیوں کی چیخ و پکار اور ولایت کی صنعت کے تحفظ و بقا کی طرف توجہ کی، اور پارلیمنٹ میں بھی اس پر بحث شروع ہو گئی چنانچہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کرنل بریچ COL. BREECH تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ "کالیکو" یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اس نے ہمارے اونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا۔ کیا افسوس ہے کہ ہندوستانی تو دولت لوٹ رہے ہیں، اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں۔"

ایک اور صاحب اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

"انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے، اس لئے کہ اول تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے، دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روز پر گذر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہندوستان کے لوگ مالا مال ہو جائیں گے، اور ہم غربت اور افلاس میں گرفتار ہوں گے۔"

ایک تیسرے صاحب نے ہندوستانی تجارت پر اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ:۔

"ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے، کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مال کی درآمد سے خطرے میں پڑ گئی ہیں، ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جایا کرتی تھیں، وہ ان کی جانشین بن گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر یا تھ لگانے والا ہے۔"

مسٹر پالکسفن MR. PALKISFAN نے اپنی تقریر میں کہا کہ :-

"ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے، وہ نہ صرف ہمارے یہاں اونی کپڑے کی بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں بھی ہمارے اونی کپڑے کی جگہ لے لیتا ہے اور ان ملکوں کے کپڑوں کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے، جو ہم پہلے اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ غرضکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اونی کپڑے کا کام تمام کر دیا اور اپنے مقابل دوسرے ملکوں کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

ریشمی کپڑے کے متعلق مسٹر شیلڈن MR. SHIELDEN نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ :-

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا۔ وہ بالکل بند ہو گیا، اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اس سے نصف قیمت پڑتا ہے، اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل یہ کہ جب ہندوستان کی مصنوعات نے یورپ اور خصوصاً انگلستان کے بازاروں پر قبضہ کر لیا، اور انگلستان کی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو انگلستان کے صناع اور وہاں کے بااثر لوگوں نے خوب ہنگامے کئے۔ سودیشی کی تحریک چلائی، حکومت سے ہندوستانی مال کو قطعاً بند کر دینے اور اس کے استعمال کو جرم قرار دینے کا مطالبہ کیا، اور چونکہ زیادہ تر ہندوستانی مال ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے ذریعہ آیا کرتا تھا۔ اس لئے انگلستان میں عام طریقہ پر کمپنی کی مخالفت شروع ہو گئی اور ناراضگی پھیل گئی، یہاں تک کہ ایک روز پارچہ بافوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتروں پر حملہ کر دیا اور قریب تھا کہ غصہ میں اس کا سارا خزانہ لوٹ لیں — حکومت پر اتنا دباؤ دیا گیا کہ ایک دفعہ کپڑا بننے والوں کی عورتوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر ہلہ بول دیا اور اس کو گھیر لیا، تاکہ اگر کوئی ممبر ہندوستانی مال پر بندش کی مخالفت کرے تو وہ اس کی اچھی طرح مرمت کریں۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حامیوں نے آزاد تجارت کے فوائد بہت سمجھائے اور بڑی کوشش کی کہ ہندوستانی تجارت کا وہی پہلا سا سلسلہ جاری رہنے دیا جائے، لیکن ایک

نہ چلی اور آخر ش ۱۷۰۰ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر ہی دیا جس کی رو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد بند کر دی گئی اور ہندوستانی کپڑے کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ ایک عرصہ تک یہ قانون جاری رہا اور جب ہندوستان کی صنعت ختم ہوگئی تو انگلستان میں ہندوستانی پارچہ کی درآمد کی اجازت دے دی گئی لیکن اس پر اتنا زبردست محصول لگایا گیا کہ وہ فروخت نہ ہو سکے۔

جس وقت انگلستان میں ہندوستانی مال کے متعلق امتناعی قانون پاس نہیں ہوا تھا اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہی مسلک اور طریقہ رہا کہ ہندوستانی مصنوعات کی تجارت پھیلے اور دوسرے ملکوں میں اس کے بازار پیدا ہوں کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے اندر جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے مختلف جایز اور ناجایز طریقوں سے صنعت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے ہندوستانی تجارت کی ترقی سے سراسر کمپنی کا فائدہ تھا لیکن جب ۱۷۰۰ء میں امتناعی قانون انگلستان کی پارلیمنٹ میں پاس ہوگیا تو پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنا طریقہ بدل لیا یعنی ہندوستان سے مصنوعات برآمد کرنے کے بجائے خام سامان لے جانے کی کوشش شروع کر دی اور ہندوستان میں ولایتی مال کے رواج دینے کی تدبیریں اختیار کیں اور اسی روپے سے جو کمپنی ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان سے لے گئی تھی انگلستان میں مختلف قسم کی مصنوعات اور گوناگون ایجادات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

حاصل یہ کہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی تاریخ میں ایک افسوس ناک انقلاب کا زمانہ ہے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی صنعت و تجارت کو ختم کر دیا اور ہندوستان سے کچے مال کی برآمد شروع کی اور ولایتی مصنوعات کو ہندوستان میں رائج کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد سارا ہندوستان ولایتی کپڑوں میں لپٹا ہوا نظر آنے لگا۔ ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضروری اور غیر ضروری مصنوعات یورپ سے آنے لگیں یہاں تک کہ ہندوستان سوئی اور تاگے میں بھی انگلستان کا محتاج بن بیٹھا۔

فلسفۂ نراج

کیا نراج (انارکزم) اور دہشت انگیزی ہم معنی ہیں

(از جناب عبدالعزیز صاحب فاروقی بی اے ایبٹ آباد، صوبہ سرحد)

جہالت بھی دنیا میں عجب کرشمے دکھاتی ہے لیکن جہالت اور لاعلمی کے طفیل سے بڑا نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہمارا علم محدود ہو۔ بہت سی اچھی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ دل میں غلط منظرے قائم کئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لئے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے اس رویہ کی وجوہات پر غور کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کسی چیز، شخص۔ اصول یا خیال کے خلاف آپ کی حقارت اور بدظنی کی حقیقی وجہ ناکافی معلومات — خواہ اسے کم علمی کہئے یا جہالت — کا ہونا ہی شمال کے طور پر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کو لیجیے۔ ان دنوں وہاں کے اچھے اچھے علما اور فضلا اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہوا خیال کرتے تھے۔ اور بانیٔ اسلام کو (نعوذ باللہ) بت پرست — مانا کہ اس میں مخالف پروپیگنڈا کا بھی کچھ حصہ تھا لیکن پراپیگنڈہ کا اثر بالعموم ناخواندہ اور جاہل عوام پر ہی ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ جنھیں حقایق کا علم ہوتا ہے۔ آسانی سے پراپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر وہ بھی بعض مسائل میں غلط آرا رکھیں تو اس کی وجہ ان کی جہالت — عالمانہ جہالت یا جاہلانہ علمیت — ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ جہالت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غلط ہوں۔ اگر ہماری لاعلمیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ ہٹ جائے تو بہت ممکن ہے کہ ہم بجائے اس چیز کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یا کم از کم اس کی مخالفت ہی ترک کر دیں۔ موجودہ دور میں بہت سے مسائل اور

نظریات ایسے ہیں جو اس خاص قسم کی جہالت کی وجہ سے قبول عام نہیں حاصل کر سکے اور لوگوں میں ان کے متعلق طرح طرح کی مضحکہ خیز اور بعید از حقیقت باتیں مشہور ہیں۔ ان ہی نظریات میں سے ایک انارکزم یا نراج بھی ہے۔ انارکزم کا نام سنتے ہی آپ کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے اور آپ نے اپنے ذہن میں ایک نیم پاگل۔ ضدی جیسے شخص کا تصور کر لیا ہو گا جس کا کام صرف یہ ہے کہ ہر وقت لوگوں پر بم پھینکنے کی دھن میں رہے۔ طرح طرح کی بھیانک تشدد انہ حرکات سے پبلک میں دہشت پھیلائے اور اپنی انتہا پسند سیاسی آرار کو مجرمانہ حرکات کے جواز کے لئے نقاب کے طور پر استعمال کرے۔ آپ کو اپنی یہ رائے بالکل قدرتی اور صحیح نظر آتی ہو گی لیکن حقیقت سے یہ ایسی ہی دور ہے جیسے ازمنہ وسطیٰ کے یورپی علمار کا اسلام کے متعلق نظریہ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں چند افراد ایسے بھی ہیں جو انارکزم کے معتقد ہوتے ہوئے بھی دہشت انگیز حرکات کے حامی ہیں۔ لیکن حقیقی نراج (جسے بعض اوقات دہشت پسندی سے ممتاز کرنے کے لئے فلسفیانہ انارکزم کا غیر ضروری اور بھدا نام دیا جاتا ہے) دوسروں کو دہشت انگیز حرکات سے ڈرانے دھمکانے اور کسی فعل بر خلاف ضمیر مجبور کرنے کے قطعی خلاف ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو بقول برٹرانڈرسل صرف بعض انارکسٹ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ مناسب حالات میں بم پھینکنا اور جبر یہ دوسروں سے اپنی بات منوانا روا جانتے ہیں۔ اس لیے جو نام کے انارکسٹ تشدد کے حامی ہیں وہ گاندھی جی ایسے حامیان عدم تشدد کو چھوڑ کر سماج کے باقی طبقات سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی جماعتی جنگ (جو مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے باہمی مفاد کی تصادم کی پیدا وار ہے) کے قائل ہیں اس لئے اگر وہ بم استعمال کریں تو یہ بعینہ ایسے ہے جیسے حکومتیں دوران جنگ میں بم اور دیگر آلاتِ ہلاکت استعمال کرتی ہیں۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں ایک انارکسٹ ایک بم تیار کرتا ہے۔ وہاں حکومتیں لاکھوں بم توپیں اور بندوقیں بناتی ہیں اور جہاں وہ ایک آدمی قتل کرتا ہے۔ وہاں حکومتوں کے استبداد اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم انارکزم کے تصور کو بجا طور پر تشدد سے جدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تشدد

اور دہشت انگیزی نہ تو انارکزم کے لازمی اصولوں میں سے ہیں۔ اور نہ ہی محض انارکسٹوں کے لئے مخصوص۔
اب یہ دیکھنا ہے کہ آخر انارکزم ہے کیا۔ انارکزم کے فلسفہ اور اس کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ہمیں
مروجہ فلسفۂ سیاسیات کی بیٹھک جانا پڑتا ہے۔ آج سے کوئی نصف صدی پہلے کے بیشتر علمائے
سیاسیات (سر ہنری مین MAINE وغیرہ) نظریۂ جبر کے قائل تھے اور ریاست STATE کی ابتدا اور ارتقا
کی بنا مادی قوت کو قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں جمہور کی نراجی اور خود سرانہ جبلت کو قابو میں
رکھنے اور امن و امان قائم کرنے کا واحد ذریعہ جبری قوت تھا۔ آج کل اس نظریہ کی صحت سے انکار
کیا جاتا ہے۔ جب بھی بڑے بڑے علمائے سیاست خواہ وہ پروفیسر لاسکی اور پروفیسر میک ایور
MACIVER کی طرح ریاست کے حلقہ اقتدار و اختیار کو جمہور کی مکمل آزادی برقرار رکھنے کے لئے محدود
کرنے کے قائل ہی کیوں نہ ہوں۔ کم از کم یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ ریاست کی منتہائی بنا جمہور کی رضا
مندی ہے۔ اور اگرچہ قوتِ جبر ریاست کی روح اور اصل اصول نہیں لیکن اس کا امتیازی اور
لازمی نشان ضرور ہے۔ یہ نظریہ پرانے نظریہ سے اس حد تک مختلف ہے کہ اس کے مطابق
ہم قوانین کی پابندی اور حکومت کی اطاعت اس وجہ سے نہیں کرتے کہ ہمیں کسی سزا یا دباؤ کا خوف
ہوتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ہماری ثقافتی روایات اور مجلسی جبلتیں INSTINCTS ہمیں قانون
شکنی سے روکتی اور آئین پسندی پر مجبور کرتی ہیں اور قانون کی بنا رضا پر ہے جبر پر نہیں۔ لیکن یہ نیا
نظریہ بھی جبری طاقت کی ضرورت کا قائل ہے۔ اور بجائے یہ کہنے کے کہ چونکہ قانون جمہور کی مرضی سے
بنتے ہیں۔ اس لئے ان کے مفاد کے لئے کسی مادی طاقت اور قوت کی قطعاً ضرورت نہیں یہ
کہتا ہے کہ "قانون کی عمومیت کو ممکن العمل بنانے والی چیز رضا ہے۔ لیکن اس عمومیت کا اطلاق
قائم رکھنے کی گارنٹی طاقت ہے" (میک ایور)۔ آسان لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ
اگرچہ کسی قانون کی موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ جمہور کی اکثریت اس کے اصول سے متفق اور
اس کی پابندی کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو قانون پسندی کی
کم صلاحیت رکھنے یا کسی اور وجہ سے قانون کی پابندی سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو قانون کی پابندی پر مجبور کئے بغیر قانون کی عمومیت (سب لوگوں پر برابر اطلاق) میں فرق آتا ہے اور ان لوگوں کو قانون پسند بنانے کے لئے طاقت کا استعمال بعض دفعہ قانون کی عمومیت کو حقیقی معنوں میں قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے موجودہ نظریہ کے مطابق ریاست کا امتیازی نشان جبری طاقت کی موجودگی ہے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر انارکسٹ دوسرے علمائے سیاسیات سے جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کے لئے (اگر وہ قانون سب کی مرضی سے بنا ہے) کسی طاقت اور جبر کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ جب تمام لوگ ایک کام ہنسی خوشی سے اور مل جل کر سرانجام دے سکتے ہیں تو طاقت کا استعمال کیا جائز ہے؟ انارکزم یا نراج جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ حکومت کا مخالف اور اس کی ضرورت کا منکر ہے۔ کیونکہ حکومت جمہور پر حاکمانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے استعمال کی جانے والی طاقت کا سرچشمہ اور مظہر ہے۔ اگر انارکزم کسی حکومت کو گوارا کر سکتا ہے تو وہ حکومت صرف آزاد حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ آزاد حکومت کا نراجی تخیل اس کے عام معنی اور مفہوم سے جدا ہے۔ اور اس کے مطابق آزاد حکومت وہ نہیں جو بیرونی دباؤ اور خارجی رسوخ سے آزاد ہو۔ جیسا کہ تمام خود مختار ریاستیں SOVEREIGN STATES ہیں اور نہ ہی وہ حکومت ہے جس کی باگ ڈور بجائے ایک مختار مطلق بادشاہ یا آمر یا کسی محدود گروہ یا طبقہ کے ہاتھوں میں ہونے کے اکثریت کے ہاتھوں میں ہو۔ بلکہ وہ حکومت جو سب کی مرضی سے چلائی جائے۔ جس میں کوئی ایک گروہ کسی دوسرے گروہ پر کسی طرح کا مادی دباؤ نہ ڈال سکے جس میں اکثریت اقلیت کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر جبری ذرائع سے مجبور نہ کر سکے۔ جس میں ہر فرد کو ہر طرح کی مکمل آزادی ہو۔ منفی اور مثبت دونوں یعنی اسے کسی فعل پر خلاف مرضی مجبور نہ کیا جا سکے اور اپنی مرضی پر چلنے کی اجازت ہو۔ جب ہم اس نظریہ کا موازنہ مروجہ حالات سے کرتے ہیں۔ تو ہماری سمجھ میں بات آجاتی ہے کہ انارکسٹ کیوں پولیس اور تعزیری قوانین جیسے اداروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ جمہور کے ایک طبقہ کی مرضی دوسروں پر جبراً ٹھونسی جاتی ہے اور یہ صورت صرف مطلق العنان

آمروں کی حکومتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جمہوری ممالک میں بھی موجود ہے۔ اس لئے جب تک جمہوریتوں میں بھی قانونی طاقت کے بل بوتے پر اقلیت کو اکثریت کا تابع فرمان بننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ انارکسٹ جمہوری حکومت کو دوسری حکومتوں پر بہت زیادہ قابل ترجیح نہیں سمجھ سکتا۔ انارکسٹ کے مذہب میں سب سے اہم چیز آزادی ہے —— نوع انسان کے ہر فرد کے لئے مکمل اور مساوی آزادی۔ اس آزادی کے مفہوم کو جامۂ واقعیت پہنانے کے لئے انارکسٹ چاہتا ہے کہ جماعت یا اکثریت کے پاس افراد کو مجبور کرنے کے لئے جس قدر اختیارات ہیں۔ وہ سب موقوف کر دئے جائیں۔

اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکسٹ محض اکثریت کی حکومت نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ حکومت چاہتا ہے جو سب کی مرضی کے مطابق چلائی جائے جس میں جماعتی نظام (پارٹی سسٹم) کا نام و نشان نہ ہو۔ اور سچ پوچھئے تو ان کی خواہش کچھ بے جا بھی نہیں۔ کیونکہ اکثریت کی حکومت آزادی کی ایسی ہی دشمن ہو سکتی ہے جیسے ایک مٹھی بھر آدمیوں کی۔ اکثریت کی حکومت کے اصول کو مروجہ سیاسی تخیل میں جو الہامی رنگ اور تقدس کا درجہ دیا جاتا ہے وہ سچ سے کوسوں دور ہے۔ ایک طاقتور جمہوری ریاست بڑی آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر بدترین مظالم ڈھا سکتی ہے۔ —— ان شہریوں پر جو اپنی روشن خیالی اور آزادیٔ ضمیر کے باعث ارتقاء کا منبع و مخزن ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ جمہوری حکومتیں آزادی کی روح کچلنے میں دوسروں سے بہت پیچھے نہیں رہیں۔ خود انگلستان میں مسٹر بڑیڈلا اور مسز اینی بینٹ پر مقدمات ٹریڈ یونین اور اشتمالی تحریکات سے بدظنی اور ان طرح طرح کی آئینی و غیر آئینی قیود اکثریت کی دراز دستی کا واضح ثبوت ہیں۔ اس لئے انارکزم اگر اکثریت کی حکومت والے اصول کے خلاف علم بغاوت بلند کرے تو تعجب نہیں۔

جدید انارکزم کا بانی مشہور روسی مفکر باکونین —— کارل مارکس کا شدید ترین مخالف اور حریف —— تھا۔ لیکن نراجی فلسفہ بذات خود کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ ایک قدیم عقیدہ ہے جس کے

نشانات ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفیوں اور مفکرین کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اشتراکیت اور نراج میں نمایاں مشابہت ہے۔ دونوں زمین اور اصل کی اجتماعی ملکیت کے حق میں ہیں اور اصل شاہی CAPITALISM کے خلاف۔ دونوں کا بنیادی نظریہ ایک ہی ہے یعنی سرمایہ کی انفرادی ملکیت بعض افراد یا جماعت کو باقی افراد یا جماعتوں پر ظلم اور جبر کرنے کی قوت دے دیتی ہے اور زیر دستوں پر معاشی استبداد کا سرچشمہ ہے۔ راسخ العقیدہ سوشلسٹ کا خیال ہے کہ موجودہ اصل شاہی نظام کو ختم کر کے حکومت کو واحد سرمایہ دار بنا دینے سے افراد کو ہر طرح کی مساوات اور آزادی مل جائے گی۔ لیکن یہاں انارکسٹ سوشلسٹ سے اختلاف رکھتا ہے۔ اور ڈرتا ہے کہ اس صورت میں انفرادی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ اور جابرانہ خصائل حکومت میں پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اجتماعی ملکیت کے اصول کا تو حامی ہے۔ مگر ساتھ ہی حکومت کے اختیارات جس حد تک ہو سکے گھٹانا بلکہ حکومت کو ہی بالکلیہ اڑا دینا چاہتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سماجی نظام انارکزم کے تجویز کردہ اصولوں پر ڈھالا جائے تو آخر دنیا کا کام کہاں تک چلے گا؟ جب پیدا شدہ دولت میں ہر شخص کو حصہ لینے کا حق ہو گا لیکن کام کرنے پر کوئی مجبور نہ کیا جا سکے گا تو کیا لوگ کام کرنا چھوڑ دیں گے اور یہ پیدائش دولت میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہو گا؟ انارکسٹ اس کا جواب دیتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے انارکزم کوئی خیالی پلاؤ اور ناقابل عمل سکیم نہیں۔ موجودہ نظام کے ماتحت پیدائش دولت کا عمل جن اصولوں پر جاری ہے وہ نہ صرف نامنصفانہ اور غیر موزوں ہیں اور مساوات انسانی کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتے ہیں۔ بلکہ بہت بڑی تقیع ذرائع پر منتج ہوتے ہیں یعنی موجودہ ذرائع کے بہترین اور مناسب ترین استعمال سے جس قدر دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اتنی نہیں پیدا ہو رہی۔ اگر پیدائش دولت کا عمل صحیح اور سائنٹیفک اصولوں پر ایک معینہ ترتیب PLAN کے ماتحت کیا جائے تو تمام کام کم وقت میں اور خوشگوار طریقے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور سب لوگ خوش حالی اور آرام کی

زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انارکسٹ بجا طور پر کہتا ہے کہ اگر تہذیب اور ترقی کو مساوات کے پہلو بہ پہلو چلنا ہے تو اس کا منشا یہ نہ ہونا چاہیے کہ آبادی کی واضح اکثریت محض روح اور جسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے سارا وقت تکلیف دہ اور ناگوار مشقت میں گذار دے۔ فنون لطیفہ اور علوم کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت کو اس قدر فراغت ہو کہ وہ ان میں دلچسپی سے دلچسپی لے سکے۔ جب لوگوں کو کام کاج کے دھندوں سے ہی فرصت نہ ملے گی تو فنون لطیفہ اور علوم میں کون دلچسپی لے گا۔ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا عمل کیسے جاری رہ سکے گا؟

جو نظام انارکزم کا منتہائے نظر ہے۔ وہ ہر مروجہ یا مجوزہ نظام سے کہیں بہتر ہے۔ انارکزم کا فلسفہ شروع سے آخر تک انسانی ہمدردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی لئے اس کے عملی پروگرام کا پہلا جزو ہی موجودہ انسانیت کش اور ظالمانہ نظام اجرت کو منسوخ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں انارکزم سوشلزم اور کمیونزم سے بھی دو قدم آگے ہے۔ مروجہ اصل شاہی نظام میں مزدور کو مطلوبہ کام کی معینہ مقدار پوری کرنے کے صلہ میں اجرت ملتی ہے۔ سوشلزم میں ہر وہ شخص اجرت پانے کا حق دار ہے جو کام کرنے پر رضامندی ظاہر کرے — کام کی نوعیت یا مقدار کی قید نہیں۔ لیکن انارکزم میں کام کرنے پر رضامندی کی شرط بھی نہیں۔ ہر شخص کو کام کرنے نہ کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن پیدا شدہ دولت میں حصہ پانے کا ہر شخص حق دار ہے۔ ایسے نظام میں ہر شخص نکمار ہنے کی نسبت کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ لوگوں کا نکما رہنے اور کام سے گریز کرنے کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں نکما رہنے سے کوئی خاص الفت اور کام کرنے سے نفرت ہے (ممکن ہے دنیا میں چند آدمی ایسے بھی ہوں جو فطری کاہل ہوں۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عام لوگ کسی نہ کسی شغل میں مصروف رہنا پسند کرتے ہیں مثلاً وہ دولت مند لوگ جنھیں وافر دولت کا مالک ہونے کے باعث محنت کرنے کی ضرورت نہیں مگر وہ پھر بھی بے کاری اور کاہلی سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی اعزازی کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔) بلکہ یہ وجہ ہے کہ انھیں سلسلہ حیات قائم رکھنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر نہایت ناخوش گوار اور تلخ حالات میں بھی بعض اوقات اپنی صلاحیت سے بڑھ کر دس بارہ گھنٹے لگاتار روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ جب کام کا مطلب حد سے زیادہ کام اور معاشی غلامی نہ ہوگا۔ بلکہ دن کے چند

محدود اور معینہ گھنٹوں کے دوران میں ایک خوش گوار مشغلہ جس میں ہر شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق اپنی فطری صلاحیتیں اور قوی بروئے کار لا سکے گا۔ تو اس وقت کوئی وجہ نہیں کہ کوئی کام سے جی چرائے۔ ایسی جماعت میں کوئی جبر نہیں کوئی طاقت برتنے والی حکومت نہیں۔ جماعتی قانون البتہ ضرور ہوں گے لیکن طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سب لوگوں کی رضامندی سے نافذ ہوں گے اور کسی "خورد بینی" اقلیت کو بھی بجز اس کی مرضی کے خلاف نہ چلایا جا سکے گا۔

یہ سوال کہ ایسا نظام عملی دنیا میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے کسی آئندہ فرصت میں زیر بحث لایا جائے گا۔ ان چند صفحات کے لکھنے سے مدعا صرف یہ تھا کہ انارکزم کے متعلق تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ انارکزم وہ ہوا نہیں جو عام طور پر لوگوں کو ڈرانے کے لئے گھناؤنی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکزم کا کوئی اصول ایسا نہیں جو تشدد کے جواز کا حامی یا اس کے ارتکاب کی ترغیب دیتا ہو۔ برعکس اس کے انارکزم کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ کسی طرح دنیا سے جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جاوے لیکن اگر بعض نیم دیوانے انارکسٹ کہلاتے ہوئے بھی تشدد کا ارتکاب کریں یا کوئی نام نہاد انارکسٹ اپنے لب و لہجہ میں درشتی کا اظہار کرے۔ تو اس سے انارکزم پر قیاس کرتے ہوئے سب انارکسٹوں کو دہشت انگیز اور تشدد پسند قرار دینا صریح ناانصافی اور حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

ملکوں کی دولت مندی کا اندازہ کس طرح کیا جاتا ہے

بعض ملک ایسے ہیں جو دولت مند مشہور ہیں اور بعض ایسے ہیں جو غریب کہلاتے ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بہت دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دولت مندی یا غریبی کا فیصلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ آئیے اس سوال کا جواب دینے کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیاء کا مقابلہ دنیا کے باقی ملکوں سے کریں۔

پہلے "قدرتی وسائل" کی اصطلاح کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ "قدرتی وسائل" میں دنیا کی زمین، اس کا لوہا، کوئلہ، معدنی تیل اور دیگر معدنیات، قدرتی گیسیں، پانی اور جنگلات شامل ہیں یعنی "قدرتی وسائل" میں وہ چیزیں شامل ہیں جو زمین کے اندر یا اس کے اوپر پائی جاتی ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

"مصنوعہ اشیاء" سے مراد اگر ایک طرف دنیا کی ریل پٹریاں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف ہیں تو دوسری طرف روئی کا کپڑا اور اونی کپڑا، گیہوں اور دوسرے اناج اور کھیتوں میں پیدا کی ہوئی روئی ہے۔ اس میں وہ بھیڑیں بھی شامل ہیں جن سے کپڑے کے لئے اون حاصل کیا جاتا ہے اور وہ کاغذ بھی جس کا وجود ہماری موجودہ دنیا کے لئے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اس میں وہ ربڑ بھی شامل ہے جس پر دنیا کے لوگ اپنی موٹروں میں سوار ہو کر گھومتے پھرتے ہیں اور جو دنیا کی بہت سی ضروری اور عیش کی چیزوں کے بنانے میں کام آتا ہے۔ غرضکہ اسی قسم کی بے شمار دوسری چیزیں شامل ہیں جنھیں لوگ مصنوعہ شکل دیتے رہتے ہیں۔

ان اصطلاحوں کی وضاحت کے بعد اب سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیاء

کا کس قدر حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ملا ہوا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے سے ہی ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ آیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک دولت مند ملک ہے یا نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں دنیا کی زمین کا حصہ

سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ دنیا کی زمین کا کس قدر حصہ ریاست ہائے امریکہ کے قبضہ میں ہے؟ زمین کو دو سو سال سے زائد عرصہ تک امریکہ کی خاص دولت سمجھا جاتا رہا۔ اس براعظم میں آدمیوں کی تعداد کم تھی لیکن زمین کی بہت افراط تھی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی پوری مدت میں جتنے مغرب کی طرف لوگ بڑھتے جاتے تھے انھیں زمین کے ایسے ٹکڑے ملتے جاتے تھے جن پر کسی کا قبضہ نہیں تھا۔ جو شخص زمین لینا چاہتا تھا وہ بغیر کسی جھگڑے کے اپنی مرضی کے مطابق زمین کا انتخاب کر سکتا تھا۔

چنانچہ دو صدی سے زاید مدت تک یورپ کے مہاجرین شمالی امریکہ کے براعظم میں نوآبادیاں بساتے رہے۔ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وسعت مشرق سے مغرب تک تین ہزار میل اور شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس ہے اور دوسری طرف بحر الکاہل۔ اس کے شمال میں کناڈا ہے اور جنوب میں میکسیکو۔ اس کا مجموعی رقبہ ۳۰ لاکھ ۲۲ ہزار ۷۰۹ مربع میل ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیا کی زمین کا مجموعی رقبہ ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ۵۵ ہزار دو سو ہے گویا دنیا کا ۱/۱۷ حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ پھر یہ رقبہ صرف وسعت میں ہی زیادہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی زمینیں شامل ہیں۔ اس میں جنگلات، میدان، پہاڑ، ریگستان، وادیاں اور ساحل سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے حدود میں ایک بڑا مرکزی علاقہ ایسے میدانوں اور سرسبز زمینوں کا ہے جو گیہوں، مکہ اور دوسری فصلوں کے پیدا کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے میسی سپی کے مغرب اور کوہ راکی کے مشرق میں زمین کا ایک ایسا وسیع ٹکڑا ہے جس میں لاکھوں مویشیوں کو چرایا جا سکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے پہاڑی اور کوہستانی علاقوں میں لاکھوں ایکڑ زمین پر جنگلات کھڑے ہوئے ہیں۔ کوہ اپالیشین مرکزی

میدان اور مغرب بعید کے بعض حصوں میں کوئلہ کی بڑی زرخیز کانیں موجود ہیں اور منے سوٹا میں خام لوہے کے قیمتی پہاڑ پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی آبادی کا کس قدر حصہ رہتا ہے

امریکہ کی دولت مندی کا خاص سبب یہ ہے کہ اس ملک میں زمین کے رقبہ کی کثرت ہے، لوہے اور کوئلہ کی قیمتی کانیں پائی جاتی ہیں، معدنی تیل کے کنوئیں موجود ہیں، آبشار ہیں اور بڑے بڑے جنگلات ہیں۔ لیکن یہ سب وسائل بیکار ہوتے اگر امریکہ میں آدمی موجود نہ ہوتے۔ زمین اسی وقت مفید ہوتی ہے جب اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوہا، کوئلہ، معدنی تیل بھی اسی وقت مفید ہوتے ہیں جب ان کو کانوں سے نکال کر استعمال کیا جاتا ہے اور یہی حال تمام دوسرے قدرتی وسائل کا بھی ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی دولت کا اہم ترین حصہ اس کی آبادی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی آبادی قوم کے لئے سب کام انجام دیتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سے آدمی موجود ہیں اور ان کی تعداد اس قدر کافی ہے کہ وہ اس ملک کے کاموں کو اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے لوہے کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں چار کروڑ ۴۴ لاکھ ٹن لوہا سالانہ پیدا کیا جاتا ہے اور باقی تمام دنیا میں ۵ کروڑ ۴۴ لاکھ ٹن سالانہ۔ آج جو ملک لوہا پیدا کر سکتے ہیں وہی فولاد بھی بنا سکتے ہیں اور فولاد ہماری نئی تہذیب کی سب سے اہم پیداوار ہے۔ مہذب ملکوں کے لوگ ہر چہار طرف فولاد سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ فولاد کے بغیر ریل گاڑیاں، موٹریں، واگن، موٹر لاری کوئی چیز بھی نہیں بنائی جا سکتی۔ فولاد کے بغیر شہر قائم نہیں رہ سکتے۔ فولاد اگر نہ ہوتا تو مہذب ملکوں کے وسیع مکانات، بڑے بڑے ہوٹل، تھیٹر اور سنیما گھر، ہال اور ایلیویٹر (لفٹ) وغیرہ کچھ بھی نہ بن سکتے۔ فیکٹریوں میں فولاد کے بڑے بڑے کرین ہوتے ہیں، ریل گاڑیاں فولاد سے لدی ہوئی اور فولاد کی بنی ہوئی واگنوں کو فولاد کی پٹریوں پر کھینچتی ہیں۔ ہمارے پل فولاد کے بڑے زبردست شہتیروں سے بنائے جاتے ہیں۔ جہاز کی تعمیر میں بھی فولاد کی چادروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ غرضکہ فولاد نئی تہذیب کے لئے بالکل ناگزیر ہو گیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی ان چیزوں کے بنانے کے لیے جن کے نام اوپر درج کیے گئے

قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقدار کی ضرورت پیش آتی ہے

قوت محرکہ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

جب یہ چیزیں بن جاتی ہیں تو ان کو مفید بنانے کے لیے بھی قوت محرکہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور ان ہزاروں ریل گاڑیوں کو چلانے کے لیے بھی جو مہذب ملکوں کے طول و عرض میں گردش کرتی رہتی ہیں قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقداروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کے چلانے کے لیے جس قدر قوت محرکہ کی ضرورت ہے اس کا اندازہ کیجیے۔ اسی طرح مہذب ملکوں کی بندرگاہوں میں بیسیوں جہاز داخل ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو ایسے انجن چلاتے ہیں جو قوت محرکہ کی بڑی مقداروں کو پیدا کرتے ہیں۔ بھاپ، گیس اور پانی سے بجلی کی بڑی مقداریں ہمارے شہروں کو روشن کرنے اور ہمارے انجنوں اور مشینوں کے پہیوں کو گھمانے کے لیے پیدا کی جاتی ہیں۔ اس مشین کے عہد میں جو ملک بھی رہنمائی کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے پاس قوت محرکہ کو پیدا کرنے کے لیے ایندھن کی بڑی مقدار ہونا چاہیے۔

ہماری اس جدید تہذیب میں قوت محرکہ پیدا کرنے کے لیے کوئلہ اور معدنی تیل کو ایندھن کے طور پر چلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیز بہنے والے پانی سے بھی قوت محرکہ کے پیدا کرنے والے پہیوں کو گھمایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اتنا کافی ایندھن پایا جاتا ہے جس سے قوم کے کام کو چلانے کے لیے کافی قوت محرکہ کو پیدا کیا جا سکے؟ ایسی صورت میں کہ دشمن امریکہ کی بندرگاہوں کا محاصرہ کر لیں اور بقیہ دنیا سے امریکہ کے لوگوں کو تجارت کرنے سے باز رکھیں تو کیا امریکہ کی ریلیں اور امریکہ کی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی، امریکہ کے بڑے بڑے کھیت ویران اور پرتی پڑے رہیں گے یا امریکہ کے لوگ اپنے ملک کی قوت محرکہ کی مدد سے اپنے تمام کام کو چلا سکیں گے۔ اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۶۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن کوئلہ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ایک ارب

۸ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن کوئلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک ارب ۶۰ لاکھ کنستر معدنی تیل کے سالانہ پیدا کیا جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۸۴ کروڑ ۳۰ لاکھ کنستر پیدا کئے جاتے ہیں۔ امریکہ میں آبشار کی قوت سے بجلی کی قوت محرکہ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ گھوڑوں کی قوت کے برابر پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۴ کروڑ گھوڑوں کی قوت کے برابر قوت محرکہ پیدا کی جاتی ہے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے اس بات کا صرف ایک تصور قائم کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ والے ہر سال کس قدر کوئلہ اور معدنی تیل پیدا کرتے ہیں اور آبشار کے ذریعے کتنی بجلی سالانہ بناتے ہیں۔ لیکن ان اعداد سے اس بے شمار قوت محرکہ کا پتہ نہیں چلتا جسے امریکہ والے ہر سال استعمال کرتے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے اور بہت سی باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے یہاں گنجایش نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے کس قدر حصہ کا مالک ہے

یہ تو ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ریاست ہائے امریکہ ایک بڑے رقبہ کا ملک ہے اس کے اندر دنیا کے فولاد، کوئلہ، معدنی تیل اور آبی قوت محرکہ کا ایک بڑا حصہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کی آبادی ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور یہ اس کے وسیع علاقہ میں ہزاروں جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو رقبہ کی وسعت کے باوجود ایک متحدہ قوم بنائے رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ اسے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے متعدد رشتوں سے باہم منسلک کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے عہد کی فولاد اور قوت محرکہ کی تہذیب میں چیزوں اور خبروں کو تیزی کے ساتھ منتقل کرنے کے لئے بھی عمدہ ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کی ضرورت ہے۔

گذشتہ سو سال میں امریکہ کے لوگوں نے ویران جنگلوں کو صاف کر کے فارم بنائے، کانیں کھودیں اور شہروں کو بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی یعنی ریلوں، ٹیلیگرافوں اور ٹیلیفونوں کو بھی بہت ترقی دی۔ ڈاک خانوں، اخباروں اور رسالوں کا بھی ایک نہایت عمدہ نظام قائم کیا۔ چنانچہ امریکہ کے لوگوں کی دولت مندی میں ان چیزوں کا بڑا زبردست حصہ ہے

لیکن اس زمانے میں جب کہ امریکہ اپنی ریلوں اور اخبار کے چھاپہ خانوں کو ترقی دے رہا تھا انگلستان فرانس اور دوسرے ملک بھی اس کام کو کر رہے تھے۔ اس لئے اس بات کا پتہ چلانے کے لئے کہ ان میں سے کون زیادہ دولت مند ہے یہ ضروری ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کا مقابلہ دنیا کے باقی دوسرے حصوں سے کیا جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ریل کی سڑکیں ۲ لاکھ ۶۲ ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ باقی تمام دنیا میں ریلوں کی لائن کی لمبائی ۵ لاکھ ۱۵ ہزار میل ہے۔ امریکہ میں دو کروڑ ۶۶ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں باقی تمام دنیا میں موٹروں کی تعداد ۸۰ لاکھ ہے۔ امریکہ میں دنیا کے ۵ فی صدی رقبہ اور ۶ فی صدی آبادی کے مقابلہ میں ۹۵ فی صدی ٹیلیفون پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے پہننے کے کپڑوں کے لئے کس قدر خام مال مہیا کرتا ہے؟

ہماری نئی تہذیب میں کپڑوں کو روئی، اون، ریشم اور چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ اگر روئی، اون یا ریشم کپڑوں، سوٹوں، قمیصوں بنیانوں، رومالوں اور موزوں کے بنانے کے لئے موجود نہ ہوتا تو ذرا سوچیے لوگ تن پوشی کا کیا انتظام کرتے امریکہ میں ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ لوگوں کی پوشاک کا انتظام کرنا پڑتا ہے اس پوشاک کے بیشتر حصہ کو انہیں چیزوں سے بنانے کی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ روئی اون اور ریشم سے زیادہ سستی ہوتی ہے اس لئے اس کی اہمیت ان خام مالوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہر سال روئی کی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ گانٹھیں پیدا کرتا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا کے باقی حصوں میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار گانٹھیں پیدا کی جاتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اناج کی پیداوار

مشینوں، فولاد اور قوت محرکہ کی وجہ سے بڑے بڑے شہر تو پیدا ہو گئے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے لئے غذا حاصل کرنے کے واسطے امریکہ میں کیا انتظام کیا جاتا ہے؟ امریکہ کی تقریباً نصف آبادی شہروں میں رہتی ہے اور شہر کے لوگوں کو غذا پیدا کرنے کے کام سے بہت کم واسطہ ہوتا ہے لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ اس ملک میں بڑی

بڑے فارم بھی موجود ہیں لیکن امریکہ کی آبادی کا صرف ایک چوتھائی حصہ کھیتوں پر فی الواقعی کام کرتا ہے۔ باقی لوگ اور دوسرے مختلف طریقوں پر کام کرتے رہتے ہیں یعنی مشینوں پر گوداموں میں چلتی ہوئی ریل گاڑیوں میں یا چیزوں کو خریدنے اور فروخت کرنے کے کام سے لگے ہوئے ہیں پھر اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکہ کے کسان کھیتی کا کام ہاتھ سے نہیں کرتے بلکہ مشین کے ذریعہ سے کرتے ہیں وہ لکڑی کے ہلوں اور کھرپوں سے کام نہیں لیتے بلکہ ایسے ٹریکٹروں کے ذریعہ کام کرتے ہیں جو زیادہ کام کو تیزی کے ساتھ پورا کر سکتے ہیں۔ یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ امریکہ میں دنیا کے رقبہ کا تقریباً ۵ فی صدی اور دنیا کی آبادی کا تقریباً ۶ فی صدی حصہ پایا جاتا ہے۔ دنیا کے مقابلہ میں غذا کی رسد کا تناسب ذیل کے اعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۸۰ کروڑ ۷۰ لاکھ بوشل گیہوں پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۳ ارب ۲۶ کروڑ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ گویا امریکہ میں دنیا کے گیہوں کا ۲۵ فی صدی حصہ پیدا ہوتا ہے دوسرے قسم کے اناج کی پیداوار ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۳ ارب ۶۰ کروڑ بشل ہے اس کے مقابلہ میں تمام دنیا میں ۱۲ ارب بشل دوسری قسم کے اناج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی دنیا کی رسد کا تقریباً ۲۵ فی صدی ہوتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کا کس قدر کاغذ پیدا کیا جاتا ہے

موجودہ زمانے میں کاغذ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ ہم اپنے مدارسوں کو کاغذ کے بغیر نہیں چلا سکتے ہمارے آباؤ اجداد کے زمانہ میں کاغذ کی رسد بہت کم تھی اور وہ اپنی تحریر کا کام تختیوں پر کیا کرتے تھے لیکن اب ہمارے اسکولوں میں کاغذ کا صرف بہت بڑھ گیا ہے۔ پھر سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے شہروں میں بھی کاغذ کا استعمال بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ خرید و فروخت کے پوری کاروبار کا اندراج کاغذ پر کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی خبروں کو بھی اخباروں پر چھاپ کر شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا کے اخباروں کے لیے جو کاغذ تیار کیا جاتا ہے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۵ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے

مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۵۰ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ پیدا کیا جاتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی کس قدر لکڑی پیدا کی جاتی ہے

کاغذ مختلف چیزوں سے بنایا جاتا ہے مثلاً گودڑ، سبائی گھاس پھوس وغیرہ۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کاغذ کا بیشتر حصہ لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور یہ لکڑی امریکہ کے جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے لوگ جب کبھی اخبار پڑھتے ہیں تو گویا وہ اپنے جنگلات کی لکڑی کے ایک حصہ کو اپنے صرف میں لاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جس قدر لکڑی کاٹی جاتی ہے اس کے پورے حصہ سے کاغذ نہیں بنایا جاتا۔ لکڑی کے ایک بڑے حصہ سے عمارتیں، فرنیچر، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے کھمبے ریل کے سلیپر، جہاز اور بہت سی اور دوسری چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض قسم کے کپڑے بھی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں مثلاً مصنوعی ریشم کی وہ قسم جسے رے آن (RAYON) کہتے ہیں لکڑی سے ہی بنائی جاتی ہے اور ایک سو سال پہلے تو تمام وہ چیزیں جو اب فولاد سے بنائی جاتی ہیں لکڑی سے ہی بنائی جایا کرتی تھیں۔ گرم کرنے اور پکانے کے لئے بھی لکڑی کو ہی ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود لکڑی کا جس قدر صرف آج کل کیا جاتا ہے پرانے زمانہ میں اس کا اتنا صرف نہیں تھا۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سالانہ ۲ ارب ۸۷ کروڑ ۵۰ لاکھ مکعب فٹ عمارتی لکڑی کاٹی جاتی ہے۔ دنیا کے باقی دوسرے حصوں میں ۲۲ ارب ۴۲ کروڑ ۸۵ لاکھ مکعب فٹ لکڑی کاٹی جاتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کے اظہار کا ایک اور طریقہ۔ امریکہ کی ملکیت کا تخمینہ ڈالروں کی شکل میں

اوپر کے بیان سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کا کچھ اندازہ تو ہو گیا۔ اس ملک میں زمین، کوئلہ، لوہا اور معدنی تیل کے قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں اور مصنوعہ اشیاء میں یہ ریل کی لائنیں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، کاغذ، سوتی کپڑا، عمارتی لکڑی وغیرہ کثیر مقداروں میں پیدا کرتا ہے۔ اس کے قدرتی وسائل زیادہ ہیں اور ان سے وہ اشیاء کو مصنوعہ

شکل دینے کا کام خود ہی انجام دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کی دولت مندی کے تخمینہ کرنے کا کوئی اور دوسرا طریقہ بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں روپیہ آنے پائی کی شکل میں بھی امریکہ کی دولت مندی کا خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ زمین اور دوسرے قدرتی وسائل، مصنوعہ چیزیں، فیکٹریاں، گودام، کانیں اور فارم، ریل کی پٹریاں، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون، کاروبار کے لئے حکومت کے کاموں کے لئے اور لوگوں کے رہنے کے لئے جو عمارتیں استعمال کی جاتی ہیں —— یہ سب دولت ہیں اور ان سب کو روپیہ آنہ پائی کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ریاست ہائے امریکہ میں اس قسم کا تخمینہ سنہ ۱۸۵۰ء میں کیا گیا تھا جس سے ۷ ارب ۱۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کی دولت کے اعداد حاصل ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جب اسی قسم کا تخمینہ دوبارہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ ۳ کھرب ۵۲ ارب ڈالر حاصل ہوا یعنی سنہ ۱۸۵۰ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۲۲ء میں امریکہ کی دولت ۴۹ گنا زیادہ ہوگئی ہندوستانی سکہ میں اس کی قیمت تقریباً ساڑھے نو کھرب روپیہ ہوتی ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ دولت کے اس تخمینہ کی میزان میں کون کون سی چیزیں کس تناسب کے ساتھ شامل ہیں۔ کھرب کی رقموں کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ جب امریکہ میں گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں حکومت کا بجٹ ایک ارب ڈالر سالانہ کا بنا تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے۔ ایک ارب ڈالر اس زمانہ میں اتنی بڑی رقم سمجھی جاتی

(ارب ڈالر)

۰ ۲۵ ۵۰ ۷۵

مکانات فرنیچر اور ذاتی سامان

زراعتی دولت

تمام دوسرے تھوک اور خوردہ فروشی کی تجارت وغیرہ

مصنوعات اور کان کنی

ریل کی لائنیں اور پبلک افادہ کی چیزیں

سرکاری ملکیت (وفاقی، صوبائی اور مقامی)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت یعنی مکانات، فارم، گودام، فیکٹریاں، کانیں، ریل کی لائنیں، پبلک افادہ کی چیزیں اور سرکاری ملکیت

تھی کہ اس کا کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا لیکن اب امریکہ کی قومی دولت میں سالانہ ۱۳ ارب ڈالر کا اضافہ ہو رہا ہے اور امریکہ کی حکومت تقریباً ۴ ارب ڈالر کا اپنا بجٹ بناتی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب کہ امریکہ کی دولت کا تخمینہ ۳ کھرب ۵۳ ارب ڈالر کیا گیا تھا اس وقت امریکہ کی آبادی ۱۱ کروڑ تھی۔ اس حساب سے امریکہ کی فی کس دولت کا حساب ۳ ہزار دو سو ڈالر یعنی تقریباً آٹھ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اگر امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی کو سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا تو ہر شخص کے حصہ میں جائداد اور پس انداز کئے ہوئے روپیہ کا حصہ ۸ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا اور چونکہ امریکہ کا اوسط خاندان باپ ماں اور دو تین اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے امریکہ کے ہر خاندان کی اوسط دولت کا تخمینہ ۱۳ ہزار ڈالر یا تقریباً ۳۶ ہزار روپیہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ۳۶ ہزار کی جائداد کے معنی ہیں ایک کوٹھی ضرورت کی تمام چیزیں اور کچھ تعیشات کی چیزیں۔ لیکن امریکہ میں اس سے ایک چھوٹا مکان، ضرورت کی تمام چیزیں اور تعیشات کی کچھ چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ اوپر کے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ کی دولت واقعتہً مساوی طور پر آبادی کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ اس دولت کا ایک بڑا حصہ ریل کی لائنوں، فیکٹری، کاروبار کی اونچی اونچی کوٹھیوں پر مشتمل ہے جن کی مالک انجمنیں اور کمپنیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دولت کا ۲/۳ حصہ یا تو حکومت کی ملکیت میں ہے یا ریل کی لائنوں، روشنی، گرمی اور قوت محرکہ مہیا کرنے والی کمپنیوں اور کانیں کھودنے والی کارپوریشنوں کی ملکیت میں ہے یا تھوک فروشی اور خوردہ فروشی کرنے والی دوکانوں کے قبضہ میں ہے۔ ان کے علاوہ جو دولت باقی بچتی ہے صرف اس میں مکانات، فرنیچر، کپڑے، کھیت اور ان کی پیداواریں شامل ہیں۔

کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اپنے ملک میں ہی پیدا کر لیتا ہے؟

اوپر جو مثالیں درج کی گئیں ان کے مطالعہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی

ضرورت کی تقریباً تمام چیزوں کو خود اپنے ملک کے حدود کے اندر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے
غذا، کوئلہ، لوہا، لکڑی، کپاس غرضکہ تمام چیزیں جس سے یہاں کی آبادی آرام اور اطمینان کی زندگی بسر
کرسکتی ہے امریکہ میں پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ دوسرے ملکوں کی پیداوار سے
بالکل آزاد ہے۔ مثلاً اگر فرض کیجیے انگلستان، فرانس، جرمنی اور جاپان ایک دن اس بات کا فیصلہ
کریں کہ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اپنی تجارت جاری نہیں رکھیں گے تو کیا یہ ملک
اپنے کاروبار کو حسب سابق جاری رکھ سکے گا۔ بظاہر اس قسم کا امکان بہت غیر اغلب معلوم ہوتا
ہے لیکن یہ چیز ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ، فرانس، روس، اٹلی اور ریاست
ہائے امریکہ نے جرمنی اور آسٹریا کو اس طرح محصور کرلیا تھا کہ ان ملکوں کے لئے باہر سے کچا یا بنا ہوا مال
لانا ناممکن ہوگیا تھا۔ اور ان دونوں ملکوں کو اپنی دس کروڑ آبادی کی غذا اور نگہداشت کے لئے پورے
طور پر اپنے وسائل پر ہی دار و مدار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ ملک بڑی سخت تنگی
کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو اپنے تعیشات کو ترک کرنا پڑا
پھر کچھ مہینوں کے بعد اپنی آرام و آسایش کی چیزوں کو اور بعد میں فاقہ کی نوبت آگئی۔ جب جنگ
ختم ہوئی تو سینکڑوں آدمی ان سختیوں کو برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے مر چکے تھے۔ اس لئے
اس قسم کی افتاد کو ناممکن سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ آئیے اس بات کا پتہ چلائیں کہ امریکہ کن چیزوں کے لئے
دوسرے ملکوں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ مثال کے طور پر ربڑ کو لیجیے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے ربڑ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

یہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں
موٹروں اور موٹر لاریوں کی بہت کثرت ہے اور ان کے
پہیوں کے بنانے میں ربڑ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ فرض کیجیے کہ ان
سینکڑوں جہازوں کا داخلہ جو ربڑ لاد کر امریکہ میں لاتے ہیں ناممکن ہوجائے تو امریکہ کے موٹر
کتنے دن تک چلتے رہیں گے؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ موٹر
کے اچھے ٹائر کتنے میل سفر کرنے کے بعد بے کار ہوجاتے ہیں۔ غالباً دس ہزار میل یا غیر معمولی

حالات میں ۱۵ ہزار میل تک یہ ٹائر چل سکتے ہیں۔ پھر جب اس قدر چل کر یہ گھس جائیں گے تو کیا کیا جائے گا۔ بلا شبہ نئے ٹائروں کی ضرورت ہوگی اور ابھی تک ربڑ کے علاوہ کسی اور دوسری ایسی چیز کا علم حاصل نہیں ہو سکا ہے جسے ٹائر کے طور پہ استعمال کیا جا سکے۔ جب ربڑ نہیں رہے گی تو مجبوراً ایسے دھات کے ٹائروں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جنہیں ربڑ کے ہوا سے بھرے جانے والے ٹائروں سے پہلے گاڑیوں اور کوچوں کے کھینچنے کے لئے استعمال کیا جایا کرتا تھا۔

پھر اس کے علاوہ ربڑ سے اور بھی بہت سی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں جنہیں ہم روز مرہ استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً ٹیلیفون میں باغوں کے پانی دینے کے نلوں میں مشینوں میں ریل گاڑیوں کے ہوائی بریک میں ربڑ کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ربڑ کہاں پیدا ہوتا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ سے معلوم کیا جا سکے گا

دنیا کی میزان = ایک ارب اکیانوے کروڑ ستائیس لاکھ تئیس ہزار
ریاست ہائے ملایا جزائر مشرقی اور سیلون } = ایک ارب ۵۰ کروڑ ایک لاکھ ترانوے ہزار
جزائر برازیل = چار کروڑ تہتر لاکھ بہتر ہزار
دوسرے ذرائع = ایک کروڑ اکیاون لاکھ اٹھاون ہزار
ریاست ہائے متحدہ امریکہ = صفر

دنیا کے ربڑ کی پیداوار کا کس قدر فی صدی حصہ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے

کہ ربڑ کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ۹۰ فی صدی سے زائد ربڑ جزائر شرقی میں پیدا ہوتا ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غالباً مشکل سے ایک پونڈ ربڑ پیدا ہوتا ہوگا۔

مگر اس کے باوجود ربڑ کے استعمال کرنے والوں میں جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے امریکہ کا نمبر اول ہے۔ امریکہ دنیا کی پیداوار کا تقریباً ¾ حصہ صرف کرتا ہے

پیدا کچھ نہیں کرتا جو پیدا تو نہ کرے اور خرچ بہت زیادہ کرے۔ ایسا ملک دوسرے ملکوں کی تجارت سے اپنے آپ کو کس طرح آزاد کر سکتا ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصوں سے امریکہ کا تعلق قطع ہو جائے تو امریکہ کے لوگوں کو اپنے رہنے سہنے کے طریقوں میں بڑی زبردست تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

(کروڑ پونڈ)

۰ — ۵۰ — ۱۰۰ — ۱۵۰

ریاستہائے متحدہ امریکہ = ۱،۱۸،۴۰،۸۲،۰۰۰

جزائر برطانیہ = ۲۷،۴۴،۲۹،۰۰۰

فرانس = ۱۲،۳۴،۰۸،۰۰۰

جرمنی = ۱۱،۰۳،۷۹،۰۰۰

جاپان = ۷،۷۸،۹۷۱۴۰

باقی تمام دنیا = ۲۳،۳۲،۶۲۰۰۰

دنیا میں جس قدر کل ربڑ استعمال ہوتا ہے اس کا کتنا فی صدی حصہ امریکہ میں صرف کیا جاتا ہے
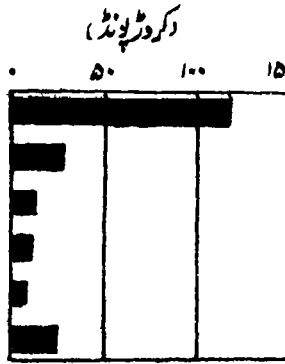
غرضکہ اوپر کے بیان سے امریکہ کی دولت مندی اور محرومی کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کو چند چیزوں کے لیے تو بلاشبہ دوسرے ملکوں پر دارومدار کرنا پڑتا ہے لیکن باقی بیشتر چیزوں کو امریکہ خود اپنے علاقہ میں پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں یہ چیز نہیں کہی جا سکتی بعض ملکوں کی دولت مندی تقریباً تمام تر دوسروں کے ساتھ تجارت کرنے پر منحصر ہے۔ بعض ملک نوآبادیوں کو اپنی سلطنت کا جزو بنا کر اپنی خوش حالی کو قائم رکھتے ہیں بعض نوآبادیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں اور اپنی موجودہ دولت مندی کو دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر دیکھتے ہیں۔ بعض اپنے قدرتی وسائل سے خود فائدہ اٹھانے کی صلاحیت یا قدرت نہیں رکھتے۔ غرضکہ ملکوں کی دولت مندی کا فیصلہ کرنے کے لیے ان تمام باتوں کو نظر کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

کاروبار کی تنظیم کی مختلف شکلیں

ابتدائی معاشی مصروفیت
اور جرگہ یا CLAN

کاروبار کے معنی ابتدا میں حصول معاش کے لئے مصروف رہنا ہوا کرتے تھے لیکن اب اس کے معنی نفع کے لئے مصروف ہونا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح کاروبار کی تنظیم کے معنی ابتدا میں کسی ایسی معاشی جدوجہد کے ہوا کرتے تھے جو منظم طریقہ پر کی جائے لیکن اب اس میں نفع یا توفیر کا مفہوم بھی چھپا ہوا موجود رہتا ہے۔ تنظیم کے لئے انگریزی لفظ انٹرپرائز ENTERPRISE ہے جس کے معنی ہیں تہیہ کرنا۔ جب ہم دولت کے حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ ہماری معاشی جدوجہد ہوتی ہے۔ جب ہم منظم جدوجہد کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ گویا کاروباری تہیہ یا انٹرپرائز بن جاتا ہے۔

عہد جدید میں اس قسم کی جدوجہد کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ناظم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ناظم کو انڈرٹیکر UNDERTAKER کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اب چونکہ یہ لفظ ایک خاص کاروبار[1] کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے اس لئے اب تہیہ کرنے والوں کو انتری پرینیور ENTREPRENEUR کہنے لگے ہیں۔

نہایت ابتدائی قسم کی کاروباری تنظیم خاندان ہی کی ایک وسیع تر شکل ہوا کرتی تھی۔ لیکن خاندان بذات خود ایک طویل سلسلہ ارتقا کا ماحصل ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے خاصی وسیع شہادتیں موجود ہیں کہ انسانوں کے وحشی آباواجداد چند درجن افراد کے چھوٹے چھوٹے گلوں یا گروہوں میں ادھر ادھر گھوما کرتے تھے۔ ان کی تعداد کی کمی اور بیشی کا انحصار عموماً اس بات پر ہوا کرتا تھا کہ غذا کی

---

[1] یعنی ان پیشہ ور لوگوں کے لئے جن کا کام تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔

لئے جڑوں بوٹیوں کی رسد کتنی ہے شکار کے دستیاب ہونے کے امکان کس قدر ہیں اور پانی کی موجودگی کی کیا کیفیت ہے۔ ابتدا میں گلہ یا گروہ کے سردار کو جنسی تعلقات پیدا کرنے کا اجارہ حاصل ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں جب یہ اجارہ ختم ہوا تو جنسی تعلقات میں سخت انتشار اور بے عنوانی پیدا ہوگئی۔ لیکن آہستہ آہستہ شادی کی مستقل شکلیں پیدا ہونے لگیں جن میں رشتہ داری کا شمار ماں کی طرف سے ہونے لگا ماں کی طرف سے نسل کا پتہ اس لئے لگایا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں شادی کا جو جامعی طریقہ رائج تھا اس میں کسی بچہ کے لئے اپنے باپ کا پتہ چلانا بہت مشکل تھا۔ اس قسم کے جو گروہ تاریخ کی ابتدا میں ہمیں ملتے ہیں انھیں CLAN یا جرگہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ ان جرگوں کے اراکین اپنے نسب کا سلسلہ ماں سے چلاتے تھے اس لئے انھیں رحمی مادری یا اموی قبیلوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں عورتوں کی ابتدائی زراعت یا کھرپی کی کاشت نے زیادہ اہمیت اختیار کرلی تھی یا جہاں خانگی فنون مثلاً کپڑا بننے اور کھانا پکانے کی ضرورت کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا وہاں عورتوں کی اہمیت میں ان معاشی وجوہ کی بنا پر بھی اضافہ ہوگیا اور ان جگہوں پر ہمیں جماعت کا وہ نظام نظر آتا ہے جسے MATRIARCHATE یعنی عورتوں کی حکومت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا مادری MATRIARCHAL نظام تو ہمیں کہیں کہیں ہی ملتا ہے لیکن مادری یا اموی جماعت جس کا انحصار رحمی قبیلہ پر ہوتا تھا تقریباً ہمہ گیر تھی۔

اس ابتدائی قبیلہ کی جماعتی خصوصیات کو یہاں صرف اختصار کے ساتھ ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ عہد کے خاندان کے قسم کی کسی چیز کا اس عہد میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ماں اپنے چند بہت چھوٹے بچوں کے ساتھ یک جا رہا کرتی تھی۔ رشتہ کا عام تعین قبیلہ کی رکنیت کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اور قبیلہ کے افراد کے درمیان جنسی تعلق کا پیدا کرنا سخت جرم سمجھا جاتا تھا ہر قبیلہ اپنی اصل کا پتہ ایک قدیم ترین جدامجد سے لگایا کرتا تھا یہ عام طور پر کوئی لکوئی جانور یا پودا ہوتا تھا اور ٹوٹم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور مقدس اور لائق پرستش سمجھا جاتا تھا۔ ٹوٹم کی پرستش کس

طرح شروع ہوئی یہ بات ابھی تک ایک راز سربستہ ہے لیکن اس کے وجوہ غالباً معاشی تھے۔ ٹوٹم ابتدا میں غذا کا خاص ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں بارٹر کے لئے اس قدر مفید ہو گیا کہ اس کا غذا کے طور پر استعمال کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جہاں حالات آبادی کے بڑھنے کے لئے موافق ہوتی تھے وہاں جرگے ترقی کر کے بڑے قبیلے بن جاتے تھے اور ان قبیلوں میں باہم دور کی رشتہ داری پائی جاتی تھی۔ چھوٹے قبیلے اور بعض صورتوں میں بڑے قبیلے مشترکہ کھیلوں، تقریبوں اور عبادتوں کے مرکز ہوا کرتے تھے اور ان کے درمیان ایسے قبائلی مراسم پیدا ہو گئے جنھوں نے بعد میں ترقی پا کر قوانین اور اخلاقی اصول کا مرتبہ حاصل کر لیا۔

خاندان | چھوٹے قبیلوں کی معاشرت کے ختم ہو جانے کے اسباب بھی معاشی ہی تھے۔ جہاں حالات گلہ بانی کی ترقی کے لئے سازگار تھے وہاں جانوروں کے گلے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور باپ کا اقتدار ملکیت کے محافظ اور روزی فراہم کرنے والے کی حیثیت سے مسلّم ہو گیا۔ جن مقامات پر جڑ کھودنے والی اور شکاری منزل کی جگہ زراعت نے لی وہاں زمین کے جوتنے، مکان کے بنانے اور ترکہ کو قائم رکھنے میں مرد کی محنت نہایت اہم ہو گئی اور اس کے بعد سے معاشی تنظیم میں مرد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی اور اس بنا پر ابوی یا PATRIARCHAL خاندان پیدا ہو گئے۔

FAMULUS جس سے انگریزی لفظ FAMILY نکلا ہے لاطینی زبان میں ملازم یا غلام کو کہتے ہیں۔ اور اس لفظ کے معنی خاندان اس لئے ہو گئے کہ اس نئے خاندانی گروہ کے تمام اراکین اپنے باپ یا ابو الآبا کے خادم ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ خاندان کے تمام رشتے ملکیت کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔ باپ زمین، گلوں، بیوی یا بیویوں، بچوں اور غلاموں کا مالک ہوتا تھا اور ان کے علاوہ خاندان کے اور تمام رشتہ داروں پر بھی اس کا اقتدار مالکانہ ہی ہوا کرتا تھا۔ باپ کی ہی بیوی اور بیٹے کو نام ملنے لگے اور ترکہ خاندان کے ایک سردار سے دوسرے سردار کو وراثت میں ملنے لگا۔ اب زبردستی گرفتار کر کے شادی کرنے کی جگہ خرید کر شادی کی جانے لگی اور ابتدائی قبیلوں کے جماعتی رشتہ ازدواج کی جگہ تعدد ازدواج نے لی اور آخیر میں گھر کے کھیا کا صرف

ایک بیوی سے رشتہ ازدواج قائم ہونے لگا جس کی وجہ سے اس نئے خاندانی گروہ کے اتحاد میں زیادہ قربت اور اس کی تنظیم میں زیادہ مضبوطی پیدا ہو گئی اور معاشی تعلقات کی شدت کے احساس نے وہ پدرانہ اور برادرانہ تعلقات پیدا کر دیئے جنھیں اخلاقی ترقی کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ اس ابویانہ نظام کا تعلق بعض علاقوں میں تو زراعت سے تھا جیسے یونان اور روم کی ابتدائی تاریخ میں اور بعض جگہ گلہ بانی سے جیسے کہ بائبل کے پیٹریارکوں کی زندگی میں لیکن بہرصورت اس جدید اور حیات پرور ابویانہ نظام میں کچھ عرصہ تک قبائلی جماعت کی ظاہری شکل باقی رہی۔ لیکن جب قبائلی نظام کی معاشی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں تو قبائلی نظام کی پوری عمارت گر پڑی۔ جہاں کہیں وسیع تر معاشی مفاد کے اشتراک نے قبیلہ کے خونی رشتوں کی جگہ لے لی وہاں قبائلی جماعت کی جگہ سیاسی جماعت پیدا ہونے لگی اور اس طرح ریاست اور منظم حکومت کی ابتدا ہوئی۔

فلسطین یونان اور روم اور اسی طرح ان تمام ملکوں میں جنھوں نے تہذیب کو اپنی ذاتی کوششوں سے ترقی دی اسی قسم کے تدریجی ارتقا کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان ملکوں میں جہاں ادنیٰ تہذیبوں کو یکبارگی اعلیٰ تر تہذیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا پڑے اس تدریجی ارتقا کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ٹیوٹن نسل کے قبیلوں کے تعلقات جب روم سے قائم ہوئے تو انھوں نے قبائلی معاشرت کو چھوڑ کر سیاسی معاشرت کو اختیار کر لیا۔ تقریباً یہی صورت آئرلینڈ پر انگلستان کے اثر کے بھی کہی جا سکتی ہے کیونکہ آئرلینڈ کے SEPTS عہد وسطےٰ میں کافی زمانہ تک قبائلی زندگی گذارتے رہے تھے اور اسکاٹ لینڈ میں تو آج سے ایک دو صدی پہلے تک قبائلی معاشرت کا زور باقی رہا۔

اوپر کی تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوی خاندان معاشی اسباب کا نتیجہ تھا اور جب تک وہ معاشی اسباب موجود رہے جنھوں نے ابوی خاندان کو معاشرتی اور سیاسی زندگی کی بنیاد بنا دیا تھا۔ ابوی خاندان بھی قائم رہا۔ لیکن صنعت و تجارت کی ترقی سے نیز خاندان کے بہت سے افراد کے لئے آزادانہ اور خود مختارانہ جد و جہد کے مواقع پیدا ہو جانے سے پرانے بڑے خاندانی گروہوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور اس کی جگہ جدید عہد کے مختصر خاندان پیدا ہو گئے جن میں خاندانی تعلق بہت

قریبی رشتہ داروں تک محدود ہوگیا اور اب حال میں معاشی زندگی کے جدید ترین ارتقا اور اس کی آزادی اور مقابلہ و مسابقت نے خاندانی نظم و انضباط کو اور بھی توڑ دیا۔ عورتیں آزاد ہوگئیں، طلاق کی کثرت ہوگئی، بچوں کے غیر شادی شدہ رہنے کا زمانہ برابر طویل ہوتا گیا اور اس طرح پر جدید خاندان کی زندگی کے وہ تمام اخلاقی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوگئے جن کے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

اوپر کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان کو ایک کاروباری تنظیم کے نام سے صرف اس ابتدائی مفہوم کے ساتھ موسوم کیا جاسکتا ہے جس میں محض روزی حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کی جاتی تھی نفع حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ دولت کی پیدائش کا کام گھر کے اندر کیا جاتا تھا گھر کے لوگ ہی اس کام کو کرتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے لوگ بھی گھر کے ہی آدمی ہوتے تھے یعنی دولت کے پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والے دونوں خاندان کے ہی افراد ہوتے تھے خاندان کا ہر فرد سب کے لئے محنت کرتا تھا اور سب کی پیدائش کو صرف میں لاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کاروبار کو اس کے موجودہ مفہوم کے ساتھ یعنی نفع کے لئے تنظیم دینے کی پہلی کوششیں بھی خاندانی گروہ کی بعد کی شکلوں میں ہی شروع کی گئیں۔ مثلاً جمہوریت روما کی پلانٹیشنس میں جن کے اندر غلاموں کی محنت سے کام لیا جاتا تھا واضح طور پر کاروباری تنظیم نظر آتی ہے اسی طرح ان بڑے بڑے خاندانوں کی تنظیم بھی جو عہد وسطےٰ کے ابتدائی زمانہ میں ترقی پاکر دیہی جماعتوں میں منتقل ہوگئے تھے کم از کم جزی طور پر کاروبار جیسی تھی۔ پھر ہمیں خاندان کی کاروباری تنظیم اور اشتراک عمل کی ایسی مثالیں صرف زراعت میں ہی نہیں ملتیں بلکہ تجارت میں بھی ملتی ہیں مثلاً عہد وسطےٰ کی پنچایتوں COMMUNES کے تجارتی معاملات اور لین دین کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی نیز یہ چیز صنعت میں بھی ملتی ہے جیسے روس کی آرتل میں جو مزدوروں کی انجمن ہائے امداد باہمی کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کے لئے اگر اس کا مفہوم نفع طلبی لیا جائے خاندان کی تنظیم کچھ زیادہ موزوں نہیں تھی اور مسابقت کی زندگی کو جتنی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی اتنے ہی خاندان کے قابل و کارگزار افراد خاندان کی

تنظیم سے علیحدہ ہوتے گئے۔ زراعت پیشہ لوگوں کی قدامت پسندی کی وجہ سے زراعت میں تو یہ چیز آہستہ آہستہ پیدا ہوئی لیکن صنعت وتجارت میں یہ ترقی تیزی کے ساتھ ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ کاروبار کی اعلیٰ ترین ترقی یافتہ شکلوں کو صنعت وتجارت میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

مددگاروں یا مزدوری پہ کام کرنے والوں کا نظام

جب صنعت خاندانی گروہ بندی کی حدود سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور جب حالات غلامی کی ترقی کے لئے سازگار نہیں رہتے تو صنعت کے کام میں بیرونی امداد لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور آوارہ گرد آزاد کاریگر جو گاؤں گاؤں اور گھر گھر گھومتے پھرتے ہیں خاندان کا بہت سا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بڑھئی، چمار، قلعی گر، معمار، کپڑا سینے والی عورتیں اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ ان گھومنے والے دستکاروں کو ان کی خدمات کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور انھیں عارضی طور پر خاندان کا رکن بنا لیا جاتا ہے۔ یہ رسم آج تک باقی ہے۔ نیو انگلینڈ (امریکہ) میں اس قسم کے کام کرنے والوں کو مددگار "HELP" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مغربی امریکہ کے کسانوں کو جو مزدور امداد دیتے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں اور انھیں مزدوری پر کام کرنے والے "HIRED MAN" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لئے اس نظام کے لئے "مددگاروں یا مزدوری پہ کام کرنے والوں کے نظام" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ہر جماعت کی ابتدائی تاریخ میں اس قسم کا نظام ملتا ہے اور جو لوگ سوئٹزرلینڈ یا اسکنڈینیویا کی دیہی جماعتوں سے واقف ہیں وہ موجودہ زمانہ میں بھی اس نظام کے رائج ہونے کی شہادت دیں گے۔

مددگاروں کے نظام کو ایک درمیانی اور عبوری چیز سمجھنا چاہیئے کیونکہ خاندانی گروہ کو اس نظام کے رائج ہونے کے بعد بھی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ چیزوں کو استعمال کرنے والا شخص پہلے کی طرح اب بھی کچا مال مہیا کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں اسے بنا ہوا مال مل جاتا ہے۔ محنت اور اوزار کاریگر کے ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ تبدیلی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ چھوٹا کنبہ رکھنے والے خاندان محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انھیں بیرونی امداد کی ضرورت اکثر پیش آنے لگی ہے گو یہ ضرورت بہت زیادہ سخت نہیں ہوتی اور بڑے خاندانی گروہوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ زائد مددگاروں کو رکھنا ان کے لئے

نفع بخش ہے۔ اس طرح پر لوہاروں، آٹا پیسنے والوں، نانبائیوں اور جولاہوں کے پیشے مستقل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں جو کاریگر آوارہ ادھر ادھر گھوما کرتے تھے اب وہ ایک جگہ سکونت اختیار کرتے ہیں اور مددگاروں سے بھی دست کاروں کا ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو خاندانی گروہ سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ جب یہ منزل آجاتی ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے نظام دست کاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دستکاری کا نظام اس نظام میں کاریگر بالکل خود مختار ہوتا ہے۔ اب وہ مصرف کے گھر میں کام نہیں کرتا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔ خود ہی بازاروں میں خام اشیا خریدنے کے لئے جاتا ہے۔ خام اشیا کو اپنے گھر میں اپنے اوزاروں سے بناتا ہے اور بنی ہوئی اشیا کو اپنی دوکان سے مصرف کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اب خاندانی نظام کی طرح دولت کی پیدائش خاندان کے لئے نہیں کی جاتی۔ یا مددگاروں کے نظام کی طرح خام شے اور مصنوعہ شے کا مالک مصرف نہیں ہوتا بلکہ اب کام کا ہر پہلو (آخری شے مصنوعہ کے فروخت ہونے تک) کاریگروں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔ کاریگر ہر چیز کو اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کو ہم دستکاری کے نظام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چیزیں اس سے پہلے یا اس کے بعد ہاتھ سے نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ اس سے اس حقیقت کا اظہار کرنا منظور ہے کہ اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کاریگروں کا ایک مستقل طبقہ بن جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے کاروبار کی تنظیم ذاتی طور پر کرنے لگتے ہیں لیکن چونکہ کاریگر اپنے گاہکوں کی فرمائش پر چیزیں بناتے ہیں اس لئے اس نظام کو سائی کے نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں ان کاریگروں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو پنچایتوں یا پیشوں میں منسلک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے تاریخ میں اس نظام کو پنچایتی نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے لیکن پنچایتیں سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہوا کرتی تھیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں ہمیں ایسے دستکاروں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو پنچایتوں سے منسلک نہیں تھے۔ پنچایتی نظام میں ہر کاریگر کو پنچایت کے رکن بن جاتے

کی توقع رہتی تھی۔ کام کی ابتدا امیدوار کے درجہ سے کی جاتی تھی۔ پھر خلیفہ کی حیثیت سے چند سال گذاری جاتے تھے اور جب پیشہ کے جزو کل سے خوب واقفیت پیدا ہو جاتی تھی تو استاد کا درجہ مل جاتا تھا۔ اگر موجودہ اصطلاحوں کو استعمال کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دستکار آجر بھی ہوتے تھے اور تاجر بھی سرمایہ دار بھی ہوتے تھے اور مزدور بھی۔ طبقوں کی موجودہ تفریق اس وقت موجود نہ تھی۔ اپنے اقتدار کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پنچایتوں کو سیاسی اقتدار بھی حاصل ہونے لگا تھا۔ دستکار چونکہ اکثر شہروں میں رہتے تھے اس لئے شہری اور دستکار ہم معنی لفظ بن گئے تھے۔ دیہات اور شہر کی تقسیم عمل بھی بہت نمایاں ہو گئی تھی اور MANOR مینر کی حیثیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ وہ شہری پنچایتوں کو خام مال مہیا کیا کرتے تھے جس طرح عزلت نشین گھریلو معیشت سے صنعت کا خاندانی نظام وابستہ تھا اسی طرح تجارتی یا مقامی معیشت کے ساتھ پنچایتی یا دستکاری کا نظام وابستہ تھا۔

صلیبی جنگوں کے کئی صدی بعد تک یورپ کی صنعتی زندگی پر پنچایتی نظام حاوی رہا۔ لیکن دولت کے اضافہ سے دو نئی باتیں ترقی پاتی رہیں۔ اول تو یہ کہ پنچایتیں زیادہ خودغرض اور محدود ہوتی گئیں یہاں تک کہ وہ اجارہ دار بن گئیں .... اور صنعتی ترقی میں معاون ہونے کی جگہ مزاحم ہونے لگیں۔ رکنیت صرف چند منتخب افراد تک محدود ہو گئی جن کے درمیان پیشہ اختیار کرنے کا حق ورثتاً منتقل ہونے لگا اور عام کاریگروں کو منافع میں شرکت کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ اور اس لئے جہاں کہیں ممکن ہو سکا انھوں نے اپنے لئے پرانے دستکاروں سے علیحدہ نئی صنعتیں شروع کیں۔ اور دوسری بات جو زیادہ اہم تھی یہ تھی کہ جب دستکاروں کے پاس دولت جمع ہونے لگی تو ان کو یہ خواہش بھی ہوئی کہ اسے نفع بخش کاروبار میں لگائیں چنانچہ صحیح معنی میں صنعتی سرمایہ پیدا ہونے لگا اور چونکہ اس صنعتی سرمایہ کو پرانے نظام کے ماتحت کاروبار میں لگانا ممکن نہیں تھا اس لئے پنچایتی یا دستکاری کا نظام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور اس کی جگہ دوسری منزل جسے خانگی نظام سے موسوم کر سکتے ہیں پیدا ہو گئی۔

خانگی نظام | خانگی نظام میں سب سے پہلے سرمایہ دار یعنی آجر اور مزدور کے درمیان ایک خلیج حایل ہونا

شروع ہو گئی۔ مددگاروں کے نظام میں بھی آجر ہوا کرتے تھے لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ مزدور اور مصرف بھی ہوتے تھے۔ دستکاری کے نظام میں آجر اور مصرف میں فرق پیدا ہو گیا لیکن پھر بھی آجر جزئی طور پر کاریگر کا کام کیا کرتا تھا۔ لیکن خانگی نظام میں آجر اور کاریگر میں پوری طرح تفریق پیدا ہو گئی۔ اس کے علاوہ بنائی ہوئی چیز کے فروخت کرنے کا طریقہ بھی بدل گیا جس کی وجہ سے خانگی نظام نہ صرف مددگاروں کے نظام سے بلکہ دستکاروں کے نظام سے بھی مختلف ہو گیا۔ مددگاروں کے نظام میں پیداوار کو فروخت نہیں کیا جاتا تھا بلکہ آجر اسے اپنے صرف میں لے آتا تھا۔ دستکاروں کے نظام میں دولت کی پیدائش چھوٹے پیمانے پر اور فرمائش کے مطابق کی جاتی تھی اس لئے مصنوعہ شے کو دستکار براہ راست مصرف کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ مگر جب سرمایہ کی وجہ سے دولت کی پیدائش بڑے پیمانہ پر ممکن ہو گئی تو بازار اتنا وسیع ہو گیا کہ دستکار کے لئے ذاتی اور انفرادی طور پر حاوی ہونا ممکن نہیں رہا اور نہ اس کے لئے یہ بات ممکن رہی کہ ان خاص طریقوں کو اختیار کرے جو اشیاء مصنوعہ کو فروخت کرنے کے لئے ناگزیر ہو گئے تھے۔ سرمایہ دار ہی ان کاموں کو کر سکتا تھا اس لئے یہ سرمایہ دار ہی کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ خانگی نظام کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اوزاروں کا مالک تو کاریگر ہی رہتا ہے اور کام کو اکثر اپنے خاندان والوں کی مدد سے اور زراعتی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے گھر پر ہی انجام دیتا ہے لیکن شے مصنوعہ کی پیدائش کا کام اب دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اول تو وہ طبقہ جو کچے مال کو خریدتا اور مصنوعہ اشیاء کو فروخت کرتا ہے اور دوسرا وہ طبقہ جو اپنے ہاتھ کی محنت سے دولت پیدا کرتا۔ اپنے اوزاروں کو خود ہی فراہم کرتا اور اپنی ہی کارگاہ میں کام کو انجام تک پہنچاتا ہے۔

خانگی نظام کی اصطلاح مفہوم کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے کیونکہ دستکاری اور پنچایتی نظام میں بھی کاریگر اپنے گھر پر ہی کام کیا کرتا تھا۔ مگر اس اصطلاح کو بعد میں آنے والے اس نظام سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کاریگر کو اپنے گھر پہ کام کرنا ترک کرنا پڑا تھا۔ خانگی نظام میں کاریگروں نے ہاتھ سے کام

کرنا جاری رکھا تھا مگر چونکہ اب ان کا اختیار دولت کی پیدائش کے پورے کام پر باقی نہیں رہا تھا اس لئے اس نظام کو دستکاری کے نظام سے بھی مختلف قرار دیا جا سکتا ہے۔ خانگی کاریگر کے لئے جو اصطلاح اس نظام کی ترقی کے زمانہ میں استعمال کی جاتی تھی وہ مینوفیکچر یعنی چیزوں کو ہاتھ سے بنانے والے کی اصطلاح تھی۔ کبھی کبھی اس کے کام کو خانگی کام کی جگہ مفوضہ کام COMMISSIONWORK سے بھی موسوم کیا جاتا تھا کیونکہ اس نظام میں سرمایہ دار جو خام شے کا مالک ہوتا تھا ایک دوسرے خود مختار شخص کے ذمہ یہ خدمت تفویض کرتا تھا کہ وہ خام شے کو مصنوعہ شکل دے کر سرمایہ دار کو واپس کر دے۔

خانگی نظام کو سترھویں صدی میں ترقی ہوئی اور انگلستان میں یہ نظام اٹھارھویں صدی میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ لیکن جیسے جیسے کاروبار کی مختلف منزلوں میں سرمایہ کا اضافہ ہوتا رہا اس میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ سب سے اہم تبدیلی پیدائش دولت کے کام میں کفایت کی تدبیریں اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں محنت کو بچانے والے طریقے اور مشینیں ایجاد کی جانے لگیں جو انسانی قوت کی جگہ مشین کی قوت سے کام لیتی تھیں اور ان کی وجہ سے کاروبار میں نفع بخش طریقہ پر سرمایہ لگایا جانے لگا۔ سنہ ۱۷۷۰ء سے قبل اس قسم کے ابتدائی تجربے پارچہ بافی کی صنعت میں شروع کئے گئے تھے لیکن سنہ ۱۷۷۰ء سے سنہ ۱۷۹۰ء تک کے زمانہ میں بہت سی بڑی بڑی ایجادیں ہوئیں۔ پھر سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد دخانی ریلوے اور دخانی جہازوں کی استعمال کی وجہ سے مال کی منڈیاں بہت وسیع ہو گئیں۔ دوسری صنعتوں میں بھی اسی قسم کی ترقیاں ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے فیکٹری کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فیکٹری کا نظام | یہی وہ نظام ہے جس کے ماتحت جدید دنیا اپنی زندگی گذار رہی ہے۔ اس نظام میں سرمایہ دار آجر نہ صرف کچا مال مہیا کرتا ہے اور مصنوعہ مال کو فروخت کرتا ہے بلکہ کام کرنے کے طریقوں پر بھی اسے پورا اختیار و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مشین اتنی مہنگی ہوتی ہے کہ مزدور کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور چونکہ مشین آجر کی ملکیت میں شامل ہوتی ہیں اس لئے وہ عمارتیں

بھی جن میں مشینیں لگی ہوتی ہیں اور جہاں دولت کی پیدائش کا کام کیا جاتا ہے اسی کے قبضہ میں آجاتی ہیں اور انھیں فیکٹری کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔ دستکاری کے نظام کی طرح اب مزدور خود مختار نہیں رہتا۔ اب اوزار اور کارگاہ پر بھی خانگی نظام کی طرح اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اب اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اس محنت کو مہیا کرتا رہے جو سرمایہ دار کی مشینوں کو اس کی کارگاہ میں چلاتی ہیں۔ دولت کی پیدائش میں اس نئے نظام کے رائج ہونے سے جو غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اس کا اثر مزدور پر بھی دولت کے پیدا اور صرف کرنے والے کی حیثیت سے پڑتا ہے اور مزدوروں کی آبادی میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگتا ہے اور دیہات سے شہر کی طرف ایک مسلسل آمد شروع ہوجاتی ہے صنعتی جماعت کو اس کی موجودہ شکل ملنے لگتی ہے اور جماعتی آمدنی زمیندار کے لگان، مزدور کی اجرت، سرمایہ دار کے سود اور آجر کے نفع کی شکل میں تقسیم ہونے لگتی ہے مینوفیکچرر کے معنی اب دستکار کے نہیں رہتے بلکہ اب اس کے معنی اس شخص کے ہوجاتے ہیں جو دوسروں کو اپنا کام کرانے کے واسطے ملازم رکھتا ہے۔ سرمایہ کی ترقی سے مقابلہ اور تخمین میں اضافہ ہوتا ہے۔ درمیانی سرمایہ داروں کے نئے طبقے نمودار ہوجاتے ہیں اور اعتبار اور مبادلہ کے طریقے بالکل بدل جاتے ہیں صنعتی سرمایہ دار اور آجر کا اقتدار اس قدر نمایاں ہوجاتا ہے کہ سارے کاروباری نظام کو فیکٹری سسٹم کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔

اس نئی منزل کا ارتقا اپنی تمام پیشرو منزلوں سے اس درجہ مختلف ہے کہ جس طریقہ سے یہ وجود میں آئی ہے اسے صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے لیکن اگر انقلاب کا مفہوم یہ ہے کہ پرانا نظام یکبارگی مکمل طور پر بدل دیا گیا تو اس نام کا انتخاب ٹھیک نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ کام تدریجی طور پر ہوا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت میں پوری طرح تبدیلی پیدا ہونے کے لئے تیس چالیس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور دوسری صنعتوں میں فیکٹری نظام خانگی نظام کی جگہ انیسویں صدی میں لے سکا۔ انگلستان سے باہر یہ تحریک اور بھی زیادہ آہستہ آہستہ چلی اور انگلستان میں آج بھی

بعض ایسی صنعتیں موجود ہیں مثلاً شیشہ کی صنعت، چھری کانٹوں کی صنعت، لوہے کی زنجیر بنانے کی صنعت جس میں فیکٹری سسٹم بہت معمولی طریقہ پر داخل ہو سکا ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کاروبار کی تنظیم کی یہ تمام صورتیں دوسری صورتوں سے نہایت واضح طور پر مختلف ہیں۔ ہر منزل میں ہمیں گذشتہ منزلوں کے باقی ماندہ آثار ملتے ہیں۔ خاندانی نظام اب بھی تمام ملکوں کے ان دور افتادہ علاقوں میں ملتا ہے جہاں جدید خیالات کی رسائی ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے مثلاً امریکہ کے جنوبی اپالیشن پہاڑوں میں مددگاروں کے نظام کا مشاہدہ مختلف قسم کی گھریلو اور دوسری خدمتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ دستکاری نظام کا نمونہ چمار اور درزی کے یہاں مل سکتا ہے خانگی نظام یورپ کے پارچہ بافوں اور جدید شہروں کے ان حصوں میں مل سکتا ہے جہاں بہت کم مزدوری قبول کر کے لوگ کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی قوم کی معاشی زندگی کی امتیازی خصوصیت کا فیصلہ نمونہ کی اور اوسط قسم کی تنظیمی شکلوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ گذشتہ نظاموں کے باقی ماندہ آثاروں سے نہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جدید کاروباری تنظیم بہت بڑی حد تک فیکٹری نظام پر منحصر ہے۔

کاروبار کی مشترکہ اور جماعتی تنظیم | اس وقت تک ہم نے کاروبار کی تنظیم کا مطالعہ منتظم کی تفریق کے نقطہ نگاہ سے کیا ہے۔ اب ہمیں مشترکہ پیدائش کے نقطہ نگاہ سے اس چیز کو مختصراً بیان کرنا چاہیے یہاں ہمیں چار منزلیں نظر آتی ہیں (۱) ایسے کاروبار جنھیں افراد کرتے ہیں (۲) ایسے جنھیں ساجھی کرتے ہیں (۳) ایسے کاروبار جنھیں کارپوریشن کرتی ہیں اور (۴) ایسے کاروبار جو ٹرسٹوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

(۱) یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ مشترکہ معاشی جدوجہد کی شکل خاندان تھی لیکن کاروباری زندگی کے ساتھ جو سخت معاشی مقابلہ اور کشمکش قریبی طور پر وابستہ ہے اس کے لیے تنظیم کی یہ شکل کچھ زیادہ موزوں نہ تھی۔ کاروباری تنظیم درحقیقت کاروباری آدمیوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور کاروباری اہلیت رکھنے والا آدمی آج کی طرح اس وقت بھی اکتساب و کوشش سے نہیں

بلکہ طبعی طور پر پیدا ہوتا تھا۔ عقل مندی، بہادری، قوت فیصلہ کی صحت اور انتظامی قابلیت ایک کامیاب تاجر کے لئے ضروری صفات ہیں۔ جس حد تک کسی فرد میں یہ قابلیتیں پائی گئیں اس نے ترقی کی لیکن جب کاروباری تنظیم کا کام پھیل گیا تو افراد کے لئے تن تنہا تمام کام کو نپٹانا مشکل ہو گیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو ملانا شروع کیا جن میں وہ صفات پائی جاتی تھیں جن کی خود ان کے اندر کمی ہوتی تھی۔

(۲) شراکت دراصل کاروبار کے کمزور پہلوؤں کو مضبوط کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اس کے ذریعہ سے مختلف اہلیتوں کے لوگ مل کر کام کرنے لگتے تھے اور کبھی کبھی سرمایہ رکھنے والوں اور اہلیت رکھنے والے لوگوں میں بھی میل ہو جاتا تھا۔ جس قدر یہ میل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی کاروباری وحدہ کی اہلیت کارگذاری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن شراکت کی خوبیاں محدود ہیں۔ کاروبار میں شرکت کرنے والوں کے لئے ذاتی تعلقات اور ایک دوسرے پر مکمل اعتماد رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شراکت کو لازمی طور پر صرف چند افراد تک محدود رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن جب کاروبار کے لئے اتنے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہونے لگتی ہے جسے چند آدمی مہیا نہیں کر سکتے تو کاروبار کی ایک نئی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے اور اس ضرورت کو کارپوریشن پورا کرتی ہے۔

(۳) ڈیلوم DELOUME اور ویبر نے جو جدید تحقیقات کی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کمپنیاں یا کارپوریشن جمہوریت روما کے آخری دور میں بھی موجود تھیں لیکن موجودہ شکل میں ان کا ابتدائی پتہ عہد وسطےٰ کے اٹلی کے شہروں میں ملتا ہے اس کی ابتدائی شکل وہ تھی جسے غلط طریقہ پر بنک کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس میں چند اشخاص اپنے سرمایہ کو یکجا اکٹھا کر لیتے تھے اور حکومت کو اس کی آمدنی کی خاص خاص مدوں کو رہن رکھ کر قرض دے دیتے تھے اور اپنے قرضہ کے حصہ کی نسبت سے نفع میں شریک ہوا کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری قرضے اور مشترکہ کاروبار نہایت قریبی طور پر باہم متعلق تھے۔ مشترکہ سرمایہ کے اصول کی دوسری اہم

ترقی سولھویں صدی کی تجارتی کمپنیوں میں نظر آتی ہے جو ابتدا میں صرف ایک واحد بحری سفر کے لئے عارضی طور پر بنائی جایا کرتی تھی لیکن جن کو بعد میں آہستہ آہستہ ایک زیادہ مستقل شکل حاصل ہو گئی تھی۔ مگر مشترکہ کاروبار کی وہ ترقی جو جدید عہد کی امتیازی خصوصیت ہے ہمیں انیسویں صدی میں ملتی ہے جب تجارتی سرمایہ پر صنعتی سرمایہ کا اقتدار قائم ہو گیا تھا۔

کمپنی یا کارپوریشن کے معاشی فوائد تین ہیں: مشترکہ سرمایہ، محدود ذمہ داری اور دائمی زندگی کمپنی کی متحدہ ضمانت پر سرمایہ داروں کی تعداد میں غیر محدود اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جتنا جس شخص کا کمپنی میں حصہ ہوتا ہے اتنا ہی کاروبار کے انتظام میں اس کا دخل ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے حصہ کے بقدر کمپنی کے قرضوں اور ذمہ داریوں کا پابند ہوتا ہے۔ عہد جدید کی حکومتوں نے محدود ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا لیکن اب اس نظام کو معاشی زندگی کی جان سمجھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ سے وہ غلط فہمیاں اور بداعتمادیاں رفع ہو گئی ہیں جو غیر محدود ذمہ داری اور ساجھے کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھیں۔ حصوں کے فروخت اور منتقل کرنے میں بھی اس کی وجہ سے سہولت پیدا ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے سرمایہ کا وہ اجتماع اور اس کی جزئی تقسیم کا وہ امکان پیدا ہوا ہے جو ہمارے عہد کی معاشی زندگی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ پھر کمپنی کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ افراد کی طرح کمپنی سوائے اس صورت کے کہ کاروبار ختم کر دیا جائے کبھی مرتی نہیں ہے۔ حصہ دار غائب ہو سکتے ہیں لیکن حصے باقی رہتے ہیں۔ اس لئے اس کو دوام اور پائداری کے تمام فوائد حاصل رہتے ہیں۔ یہ حال اور مستقبل دونوں کے لئے منصوبے بنا سکتی ہے اور اپنے ڈائرکٹروں کے مناسب انتخاب اور ان کی تجدید سے بہترین قابلیت سے فائدہ حاصل کر سکتی ہے اور بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔

ان فوائد کے ساتھ ساتھ اس میں چند ناقابل انکار خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کمپنی کو تین قسم کے لوگوں سے تعلقات قائم رکھنا پڑتے ہیں اول حصہ داروں سے دوسرے مزدوروں سے اور تیسرے پبلک سے اور انہی کی وجہ سے کمپنی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حصہ داروں

کی ہوشیار اور باخبر اقلیت کے مفاد کو محفوظ رکھا جائے یا بھولے اور ناواقف روپیہ لگانے والوں کی اکثریت کے مفاد کو دیکھا جائے، پھر حصہ داروں اور قرض داروں کے مفاد میں کس کے مفاد کو مقدم رکھا جائے۔ آیا ڈائرکٹروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ متولی کے فرائض کو ٹھیک طرح پر انجام دیں ــــ یہ مسائل ہیں جن کا ابھی تک کوئی مناسب حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی طرح مزدوروں اور آجروں کے تعلقات میں بھی وہ پرانی ہمدردی باقی نہیں رہی ہے جو شخصی تعلق کی بنا پر پیدا ہوتی تھی کمپنی ایک غیر شخصی ادارہ ہو گئی ہے اور اس میں خالص نفع طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کمپنی کے روح نہیں ہوتی۔ چنانچہ پبلک کے ساتھ بھی کمپنی کی طرف سے ایسا برتاؤ کیا جا سکتا ہے جس کے کرنے کی ہمت افراد کبھی نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی اخلاقی حس کو افراد کی اخلاقی حس کی سطح تک بلند کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود جدید معاشی مشاغل کے لئے کمپنی کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے۔ کمپنیوں کے بغیر دنیا کو دوبارہ معاشی تنظیم کے ابتدائی دور میں پہنچنا پڑے گا اور کثیر سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کے جو مواقع سرمایہ داری نظام میں کمپنی کے ذریعہ پیدا ہوئے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔

(۴) متحدہ سرمایہ کے فوائد جب اور زیادہ بڑے پیمانہ پر ظاہر ہونے لگتے ہیں تو پھر کمپنیوں کو متحد کرنے کا بھی ارادہ کیا جانے لگتا ہے۔ ابتداً غیر پختہ معاہدوں سے ہوتی ہے جن سے قیمتوں اور پیداوار کے طریقوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل وہ ہوتی ہے جب آمدنی متحد ہو جاتی ہے اور کمپنیاں POOLS کا نام اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد تیسری منزل میں کمپنیاں ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ قریب آجاتی ہیں اور مختلف کاروبار ایک مشترکہ سردار کی نگرانی میں آجاتے ہیں اور اسے ٹرسٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ابتداً میں اتحاد کرنے والی کمپنیاں اپنے حصوں کو ایک متولی کو سپرد کر دیا کرتی تھیں جو اس مشترکہ کاروبار کی نگرانی یکجائی طریقہ پر کیا کرتا تھا۔ جہاں اس قسم کے اتحادوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وہاں یہی کام ایک نئی اور آزاد کمپنی بنا کر کیا جاتا ہے۔ جن چیزوں کو آج ٹرسٹ

کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ حقیقتہً وسیع اور زبردست کمپنیاں ہوتی ہیں۔اس لئے ٹرسٹ کے مسائل کمپنیوں کے مسائل سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ٹرسٹ کو اسی طرح کمپنیوں کی ایک ترقی یافتہ شکل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسے کمپنی خود ساجھا کرنے والوں کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی یا ساجھا کرنے والے انفرادی کاروبار کی ایک ترقی یافتہ شکل تھے۔اس ترقی کے اسباب اور اس کے حدود کا مطالعہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کی فی الحال گنجایش نہیں ہے۔یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جدید صنعت کی غیر معمولی ترقی کے زیر اثر سرمایہ کا جو اضافہ اور تفریق ہوئی ہے اس سے کاروبار کے طریقے روز بروز پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔
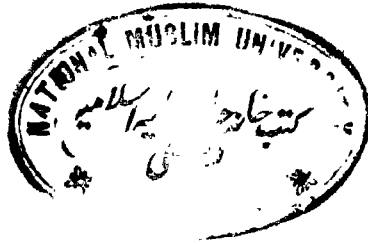
دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آپ نے ریڈیو پر کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کا حال ایسے لوگوں کی زبانی سنا ہوگا جو خود کھڑے دیکھ رہے تھے اور اب آپ کے سامنے ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح پیش کر رہے ہیں۔ سیاست کا تماشا دیکھنے والا سب کچھ ایک ہی وقت میں نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ دکھا سکتا ہے لیکن پچھلے ہفتے جو حادثہ اچانک پیش آیا اسے سمجھنے کے لئے آپ میری خاطر فرض کر لیجئے کہ یہ کرکٹ کا میچ تھا اور مجھے اجازت دیجئے کہ جو کچھ ہوا اسے .... میں دوبارہ بیان کر دوں۔ یہ تشبیہ کچھ بے جا بھی نہیں ہے اس لئے کہ انگلستان میں پہلے آدمیوں کا فرض مانا جاتا ہے کہ اپنے معاملات میں کرکٹ کے قاعدے برتیں یعنی ایمان داری کریں اور یہ یاد رکھیں کہ کھیل کا مزہ اس میں ہے کہ آدمی اپنی بازی لے اور دوسرے کی دے۔

ہاں تو صورت سمجھئے یہ تھی کہ مسٹر چمبرلین (BATTING) کر رہے تھے اور ہر ہٹلر گیند پھینک رہے تھے۔ مسٹر چمبرلین بہت سنبھل کر کھیلنے والے آدمی ہیں اور ہر ہٹلر گیند کو چاہے جیسا چکر دے کر پھینکے اور وہ چاہے جہاں گدا کھائے مسٹر چمبرلین اسے ٹھوک ضرور دیتے ایک بارگی کیا دیکھا گیا کہ تینوں وکٹ ہر ہٹلر کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اور اس کے ساتھی "آؤٹ آؤٹ" چلا رہے ہیں۔ اور فیلڈ میں لوگ اپنی جگہ اس طرح بدل رہے ہیں کہ گویا انھیں نئے کھلاڑی کے آکر بیٹ کرنے کا انتظار ہے۔

مسٹر چمبرلین نے پہلے تو ذرا حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر طے کیا کہ وہ آؤٹ نہیں ہوئے ہیں۔ اور اپنا بیٹ لئے جہاں تھے وہیں ہٹ لگانے کو تیار کھڑے رہے۔ اس کھیل میں کوئی امپائر تو تھا نہیں کہ فیصلہ کرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہٹلر نے بولنگ شروع کر دی۔ ابھی کھٹ سے آواز آئی ہے مگر گیند نہیں

معلوم کہ کدھر گئی اور رن بھی ہوا یا نہیں۔

یہ حادثہ کرکٹ کے میدان میں پیش آتا تو ہم شاید اپنی رائے قائم کر سکتے سیاست کا میدان اتنا بڑا ہے کہ اس میں آدمی کی نظر ہر جگہ پہنچ نہیں سکتی اور ہمیں بہت کچھ اب سوچنا پڑتا ہے یا دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ مسٹر چیمبرلین کے وکٹ یعنی روس نے ان کو دغا کیسے دی اور دغا بھی دی تو ہٹلر کے ہاتھ میں کیسے پہنچ گیا۔ پھر یہ سوال کہ مسٹر چیمبرلین آؤٹ ہو گئے ہیں یا زبردستی کھیل کھیل رہے ہیں اور سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ اب وہ جم کر کھیلتے رہیں گے یا ہٹلر کی بولنگ انھیں مات کر دے گی۔

اب ذرا اسی موقعہ کا بیان سیاست کی زبان میں سن لیجئے۔ ۲۰ر اگست تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ یورپی سیاست پلٹا کھانے والی ہے ڈانزگ میں ہر فورسٹر نے تقریر میں یہ کہا کہ ہم پولینڈ کے حملے کو روکنے کے لئے تیار ہیں اور جرمنی کی طرف سے معلوم ہوا کہ خالی ڈانزگ کو جرمن ریاست میں شامل کرنے کے بجائے اس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ سنہ ۲۰ء میں لڑائی کے بعد جو علاقے جرمنی سے چھین کر پولینڈ کو دیدئے گئے تھے وہ سب واپس کر دئے جائیں۔ آج کل جو ایسی خبروں سے پریشان ہو جائے اس کے لئے جینا مشکل ہے، چنانچہ ہم نے بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن ۲۲ کو معلوم ہوا کہ ہر فون ربن ٹروپ موسکو جانے والے ہیں اور روس اور جرمنی میں معاہدہ ہونے والا ہے، اخباروں نے سمجھا یا کہ یہ جرمن سیاست کی گیدڑ بھبکی ہے روس اور جرمنی کا اتحاد بھلا کیسے ہو سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ خبر تھی کہ برطانوی وزارت نے پھر اعلان کیا ہے کہ پولینڈ سے جو اس کا عہد و پیمان ہے وہ اس پر قائم ہے، چنانچہ ہم سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگلے دن فون ربن ٹروپ ہٹلر کی دعائیں لے کر ماسکو کی طرف اڑے وہاں پہنچ کر عہد نامے پر دستخط کر آئے اور رات کو آرام سے سو کر دوسرے دن واپس جرمنی چلے گئے ہم سے کہا گیا تھا کہ عہد نامے سے پہلے لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوں گی روس جرمنی سے پوری خوشامد کرائے گا اور جتنی گالیاں اسے ہر ہٹلر سے ملتی ہیں وہ سب کی سب بلکہ اس سے کچھ زیادہ گالیاں فون ٹروپ کو سنا پڑیں گی تب کہیں وہ معاہدے پر راضی ہوگا۔ اس کی جگہ ہمیں پتہ چلا کہ روس اور جرمنی میں پچھلی فروری سے دبی زبان میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی اور اس زمانہ میں بھی جبکہ فرانس برطانیہ اور پولینڈ کی فوج کے نمائندے ماسکو میں تھے

یہ گفتگوئیں ہو رہی تھیں معاہدے کی خبر ہم تک پہنچی بھی نہ تھی کہ مسٹر چیمبرلین نے پارلیمنٹ میں (DEFENSE OF THE REALM ACT) پاس کر کے وہ تمام اختیارات حاصل کر لئے جن کی لڑائی کے زمانہ میں ہر حکومت کو ضرورت ہوتی ہے اور ادھر روس کو راضی کرنے کی آخری کوشش اس طرح کی گئی کہ پولینڈ کے نمائندوں نے مان لیا کہ جنگ ہوگی تو روسی فوجوں کو پولینڈ کے اندر آکر لڑنے کی اجازت ہوگی مگر اس کی باوجود فوجی مشوروں کا سلسلہ بند ہوگیا اور مشورہ کرنے والے معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ کر جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ حالت تھی بھی بڑی نازک روس نے اچانک اپنے تیور بدلے تھے ہر ہٹلر برلن میں اپنے سپہ سالاروں سے قریب قریب رات بھر مشورہ کرتے رہے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ۲۷ اگست کو وہ (TANNA BARG) میں تقریر کرنے کے ۱۲-۱۳ گھنٹے بعد پھر اپنی فوجوں کو جو سرحد پر تیار کھڑی ہیں۔ پولینڈ پر دوڑا دیں گے۔ اخباروں نے یہاں تک بتا دیا کہ کونسی فوج کہاں پر حملہ کرے گی لیکن اگر ایک طرف لڑائی کی دھوم مچ رہی تھی برطانوی شہریوں سے کہدیا گیا تھا کہ جرمنی چھوڑ دیں اور جرمنی شہریوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ انگلستان سے چلے آئیں تو دوسری طرف مسٹر چیمبرلین کی حسب مرضی گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا ہر ہٹلر نے مشرق اور مغرب دونوں طرف اپنی سیاست کا کبوتر دوڑایا ہر فون ربن ٹروپ ماسکو گئے تو اسی کے ساتھ برطانوی سفیر سر نیولا ہنڈرسن ہر ہٹلر کا ایک پیغام لے کر پولینڈ پہنچے اس کے بعد اگرچہ ہر ہٹلر نے موسیو دلادے اور پریزیڈنٹ روزولٹ کے کہنے پر پولینڈ سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی جہازوں کو بحر روم اور بحیرہ بالٹک میں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ جرمنی میں رشن کارڈ جاری ہو گئے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سر نیول ہنڈرسن کا لندن سے برلن اور برلن سے لندن جانا بھی ہو رہا ہے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوگا ابھی مسٹر چیمبرلین خود بھی نہیں بتا سکتے آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے نتیجہ کا انتظار کر سکتے ہیں، چاہیں تو اس پر غور کر سکتے ہیں کہ روسی جرمنی تعلقات نے اچانک پلٹا کیوں کھایا اور اس کا پولینڈ اور یورپ کی سیاست پر کیا اثر ہوگا۔

روس اور جرمنی میں اب تک آپ جانتے ہیں کہ بڑی گہری تجارتی دوستی تھی مگر اس کے ساتھ ہی

کم از کم دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتنی ہی گہری سیاسی عداوت بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جب روس اور جرمنی ایک دوسرے کو اس طرح گالیاں دے رہے ہیں تو روس، انگلستان اور فرانس کو آپس میں اتحاد قائم کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو لوگ اس پر تعجب کرنے لگے اور کسی نے اس میں روس اور کسی نے برطانیہ کا قصور ثابت کیا مگر اتحاد کی تجویز کا جو حشر ہوا اس کا کسی کو بھی گمان نہ تھا۔ جرمنی کی طرف سے ہر فون ربن ٹروپ نے یہ بیان کیا ہے کہ برطانیہ ہمیں گھیرنا چاہتا تھا اور ہم نے روس کو اپنے ساتھ ملاکر یہ گھیرا توڑ دیا ہے۔ روس کی طرف سے اس کا یا پلٹ کا کوئی سبب نہیں بتایا گیا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے تو ایک نہیں بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

روسی پہلے چاہتے تھے اور شاید اب بھی اس پر تیار ہوں ان کا برطانیہ اور فرانس سے ایسا معاہدہ ہو جائے کہ جس کے بعد کسی مخالف کو دھونس جمانے کی ہمت نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے اور شاید برطانیہ فرانس اور پولینڈ کے انداز سے ظاہر ہوتا گیا کہ وہ ایسا نہیں چاہتے، تو روس نے اپنے لئے بہتر سمجھا کہ وہ جرمنی سے دوستی کرے اور اس طرح ان جھگڑوں سے الگ ہو جائے جو یورپ میں آئے دن ہوتے ہیں۔ جرمنی سے دوستی کرنے میں اپنے عقیدوں کو جھٹلانے کا اندیشہ ضرور تھا اور ان بے چاروں کو دکھ پہنچانے کا خطرہ تھا جو روس کو بین الاقوامی کمیونزم کا علم بردار اور جرمنی کو کمیونزم کا سب سے کٹر دشمن مانتے ہیں لیکن یہ دکھ پہنچنا تو ایسے لوگوں کی قسمت میں لکھا تھا اور یہی سمجھتے ہوئے شاید سٹالن نے اور بھی کم تامل کیا۔ پھر اگر آپ یہ بھی سوچیں کہ روس اور جرمنی کے اس اتحاد سے وہ اینٹی کومنٹرن معاہدہ جو جاپان، جرمنی اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا خود بخود ٹوٹ جاتا ہے تو اس اتحاد میں آپ کو روس کا ایک بڑا فائدہ بھی نظر آئے گا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جاپان کی ایک وزارت ٹوٹ گئی اور جاپانی سیاست ایک آہ بھر کر بیٹھ گئی۔ برطانیہ اور فرانس سے معاہدہ کرنے میں جاپان کی طرف سے خطرہ گھٹنے کی بجائے بڑھ جاتا۔

روس اور جرمنی کے درمیان طے یہ ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے، ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہ کریں گے، ایسی فریق بندی میں شریک نہ ہوں گے کہ جس کا مقصدان

میں سے کسی ایک کی مخالفت ہو' اپنے معاملات دوستانہ گفتگو کے ذریعے طے کریں گے اور ایک دوسرے کو ایسی باتوں کی خبر دیتے رہیں گے جن سے دونوں کا تعلق ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر پولینڈ خدا نخواستہ لڑائی کا میدان بنا تو روس کا رویہ کیا ہوگا۔ اگر روس نے پولینڈ کی مدد نہ کی تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے خیال میں جرمنی کا پولینڈ کو فتح کرلینا کوئی حرج کی بات نہیں لیکن اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار نے یہ فرض کرکے کہ روس اب ہر لڑائی میں جرمنی کا ساتھ دے گا یہ دکھلایا ہے کہ دراصل وہ جرمنی کی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ روس کو اس کا اندیشہ ہی نہیں ہے کہ لڑائی ہوگی۔ بلکہ جرمنی نے اسے اطمینان دلایا ہوگا۔ کہ وہ اپنا مطلب بغیر لڑے حاصل کرے گا۔ ممکن ہے فرانس اور برطانیہ کے نمائندوں سے جو مشورے ہوئے انھوں نے بھی یہی بات موسیو مولوتوف اور سٹالن کے ذہن نشین کردی ہو' اور انھوں نے آخر میں طے کیا ہو کہ خواہ مخواہ کے مشوروں سے یہ بہتر ہے کہ روس صاف کہدے کہ ہم آپ کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اب آپ جانئے اور آپ کا کام جانے۔ روس سے یہ کہلوا دینا جرمن سیاست کے لئے بڑی کامیابی کی بات ہے۔ اور اگرچہ مسٹر چمبرلین برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ پولینڈ کی مدد کرے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے گفتگو کا دروازہ پورا کھول دیا ہے' اور گفتگو کے ذریعے ہر ہٹلر کو معاملہ طے کرنے کا پورا موقع دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی سنا گیا ہے کہ ہر ہٹلر میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے صلح کی ایسی شرائط پیش کرنے والے تھے کہ جنھیں نہ مانا جائے تو وہ کہ سکیں کہ اب فساد کرنے کا الزام ان پر نہیں آتا اور وہ زبردستی اپنا حق وصول کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ یہ بھی سیاست کی بڑی اچھی چال ہے۔ اور ہر ہٹلر اسے آزما بھی چکے ہیں۔

تعلیم بالغاں کی کتابیں

تعلیم بالغاں کے قاعدے:- از ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب۔ قیمت حصہ اوّل ۔ حصہ دوم ۰ر حصہ سوم ۰ر

مدرس کا قاعدہ :- اس مختصر سے رسالے میں تعلیم بالغاں کے قاعدوں کو پڑھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ قیمت ۲ر

اردو سکھانے کا آسان طریقہ :- صاحبزادہ ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب نے جو ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت اچھے اور کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان ہی تجربوں کی بنیاد پر اس مختصر سے رسالے میں اردو سکھانے کا سب سے آسان طریقہ پیش کیا ہے۔ قیمت ۴ر

نماز :- یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور چند مسائل جو نماز سے متعلق ہیں بتائے گئے ہیں۔ ۱۶ صفحے قیمت ۳ر

حکایتیں مکمل :- اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی سادے اور پیارے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ جو اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ قیمت مکمل ۱۰ر

حبیب خدا :- آنحضرت کی سیرت پاک بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۳ر

میونسپلٹی :- اس میں بالغوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قیمت ۳ر

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم' اے

سیاست کی پہلی کتاب   قیمت ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتدار ..... " ... ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض ..... " ... ۴ر

مسئلہ آبادی .... " .. ۴ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

مطبوعات جامعہ

اجتماعیات

(الف) سیاسیات معاشیات وغیرہ

معاہدہ عمرانی۔ قیمت مجلد ۱۲ — آزادی ۔ قیمت ۱۲
محکومیت نسواں۔ قیمت ۱۲ — مبادی معاشیات۔ قیمت ۱۲
سیاسیات کی پہلی کتاب قیمت ۱۲ — ہندوستان کا دیہی قرض قیمت ۱۲
دیہی صنعتیں۔ قیمت ۲ — ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ۔ ۱۲
جدید دستور کا خاکہ قیمت ۲ — شہری آزادی قیمت ۱۲
ہندوستان میں قانونی حکومت ۸ — کسان ۔ قیمت ۱۲
مالیات عامہ۔ قیمت ۱۲ — قوم کی آواز قیمت ۱۲
اجتماعی زندگی کی ابتدا قیمت ۸ — نہرو رپورٹ قیمت کمل ۱۲
مسئلہ آبادی قیمت ۱۲

(ب) تعلیم

پستالوزی۔ قیمت ۱۲ — مسلمانوں کی آئندہ تعلیم قیمت ۸
بنیادی قومی تعلیم کا نصاب۔ اردو، ہندی، انگریزی ہر ایک کی
قیمت ۸ — ایمیل (زیر طبع)
مقاصد تعلیم (زیر طبع) — بنیادی دستکاری ...
باغبانی پر دو کتابچے قیمت ۸ — سیلا دانی پر کتابچہ قیمت ۵

بیت بازی پر کتابچہ (زیر طبع) — اردو سکھانے کا آسان طریقہ قیمت ۱۲
تعلیم بالغان کے قاعدے قیمت ۸ — حصہ اول قیمت ۸
حصہ دوم قیمت ۸ — حصہ سوم قیمت ۸
درس کا قاعدہ نیا قیمت ۲ — حرفوں کا قاعدہ قیمت ۲
آسان قاعدہ قیمت ۸ — بچوں کا قاعدہ قیمت ۸
نیا قاعدہ۔ قیمت ۲ — ہندوستانی کی پہلی کتاب قیمت ۸
نئی کتابیں:۔ پہلی کتاب ۸ — دوسری کتاب قیمت ۸
تیسری کتاب قیمت ۸ — چوتھی کتاب قیمت ۹

تاریخ

تاریخ ہند کی تمہید ۵ — دنیا کی کہانی قیمت ۱۲
ہندوستان کے آثار قدیمہ ۵ — دلی کی دستکاریوں کی تاریخ ۵
تاریخ ہند قدیم۔ قیمت ۸ — ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ۱۲
تاریخ مغربی یورپ قیمت ۱۲ — صحیفہ چین۔ قیمت ۱۲
جاپان ۔ قیمت ۱۲ — تاریخ الامت ——
سیرۃ الرسول ۱۲ — خلافت راشدہ قیمت ۱۲
خلافت بنو امیہ قیمت ۱۲ — خلافت عباسیہ قیمت ۱۲
عباسیہ بغداد قیمت ۱۲ — عباسیہ مصر قیمت ۱۲
خلافت عثمانیہ قیمت ۱۲ — تاریخ نجد قیمت ۱۲

عربوں کا تمدن، قیمت ۶؍ المدینہ والسلام ۔قیمت ۶؍
سیرۃ نبوی اور مستشرقین قیمت ۸؍ رحمۃ للعالمین حصہ اول ۶؍
حصہ دوم وسوم (زیر طبع) سیرت الرسول قیمت ۸؍
خلافت راشدہ قیمت ۸؍ سیرت عمرو بن عاص قیمت ۸؍
ولی اللہ ۔قیمت ۱۰؍ جمال الدین افغانی ۔ ۸؍
ضیاء الدین برنی قیمت ۱۲؍ ذکر غالب ۔قیمت ۸؍
حیات حافظ ۔قیمت ۸؍ حیات جامی ۔قیمت ۸؍
سیرت محمد علی (زیر طبع) تلاش حق مکمل ۳؍
میری کہانی مکمل ۱۸؍ انقلاب فرانس ۱۲؍
انقلاب آئرلینڈ (زیر طبع) انقلاب اٹلی (زیر طبع)
انقلاب امریکہ (زیر طبع) انقلاب روس (زیر طبع)

فلسفہ و نفسیات

تاریخ فلسفۂ اسلام قیمت ۶؍ نفسیات شباب قیمت ۳؍
ضبط نفس اور نفس پرستی قیمت ۵؍ نفسیات مذہب قیمت ۸؍

ادب

(الف) نثر، مقالات و انشاء، تاریخ و تنقید ادب

مضامین محمد علی قیمت ۵؍ جوہر اقبال ۔قیمت ۹؍
ہندوستانی کیا ہے؟ قیمت ۱۲؍ باقیات بجنوری
مراۃ الشعر ۔قیمت ۳؍ مضامین رشید ۔قیمت ۶؍
بڑھاپے کی برکتیں ۔ ۸؍ سیر المصنفین حصہ اول (زیر طبع)
حصہ دوم قیمت ۱۲؍ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
قیمت

(ب) نظم

شعلۂ طور ۔قیمت ۹؍ جنون و حکمت ۔قیمت ۹؍

سلسلہ منتخبات نظم اردو

معارف ملت حصہ اول ۸؍ حصہ دوم قیمت ۸؍
حصہ سوم قیمت ۸؍ حصہ چہارم قیمت ۸؍
جذبات فطرت حصہ اول ۸؍ حصہ دوم قیمت ۸؍
حصہ سوم قیمت ۸؍ حصہ چہارم قیمت ۸؍
مناظر قدرت حصہ اول ۸؍ حصہ دوم قیمت ۸؍
حصہ سوم قیمت ۸؍ حصہ چہارم قیمت ۸؍
گنجینۂ بیخود ۳؍ انتخاب سودا ۸؍
انتخاب حسرت ۸؍ انتخاب میر ۸؍
زنداں حماقت ۶؍ جوش و عمل ۱۲؍
سو شعر کا سٹ :- فانی کے سو شعر ۲؍
میر کے سو شعر ۲؍ غالب کے سو شعر ۲؍
حسرت کے سو شعر ۲؍ اصغر کے سو شعر ۲؍
جوش کے سو شعر ۲؍ جگر کے سو شعر ۲؍
درد کے سو شعر ۲؍ داغ کے سو شعر ۲؍
مومن کے سو شعر ۲؍ اکبر کے سو شعر ۲؍

دور متقدمین ۲ر دور متوسطین ۲ر

دور متاخرین ۲ر دور حاضر ۲ر

ضرب الامثال ۲ر کلام جوہر ۸ر

دیوان غالب قسم اول ۱۲ر قسم دوم عہ

قسم سوم ۸ر دیوان شید قسم اول ۱۲ر

قسم دوم عہ تسخیر یاس ۵ر

فردوس خیال ۸ر مسدس حالی ۸ر

سبد چین ۶ر جواہر ۶ر

رباعیات اختر ۸ر تضمین ۸ر

ناول وافسانے

میدان عمل ۱۲ر گئودان ۱۲ر

بیوہ ۸ر واردات ۸ر

خیالستان ۱۲ر دلی کا سنبھالا ۸ر

کیمیاگر ۸ر بنی اسرائیل کا چاند عہ

نیرنگ ۱۲ر

ڈرامے

پردۂ غفلت ۸ر انجام ۶ر

کھیتی ۶ر گناہ کی دیوار ۸ر

ہمزاد ۶ر صید زبوں ۱۰ر

نقش آخر ۱۰ر نیم شب ۸ر

نفرت کا بیج ۸ر

(ط) قواعد ولغت

نور اللغات قیمت ہر چہار حصص - چالیس روپے

قواعد عربی عہ ضرب الامثال ۸ر

مذہب

بیان ۱۲ر صراط مستقیم ۵ر

سبیل الرشاد ۱۰ر عبرت ۱۲ر مجلد ۸ر

برہان ۱۲ر سبل السلام ۱۲ر

ذکری ۵ر مجلد ۱۲ر بصائر ۸ر

متفرقات

مشاہدات سائنس ۱۲ر اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم

قواعد اور اسلامی تعلیم کا نظام ۳ر مسلمانوں کی تعلیم درجامعہ ۲ر

لطائف غالب ۳ر

بچوں کی کتابیں

ہمارے نبی ۳ر آخری نبی ۲ر

قرآن پاک ۶ر رسول پاک ۸ر

آنحضرت ۴ر ہمارے رسول ۵ر

سرکار دوعالم ۸ر سرکار کا دربار ۶ر

خلفائے اربعہ ۸ر چاریار ۶ر

دس جنتی ۵ر عقائد اسلام ۸ر

ارکان اسلام ۲ر ہمارا دین ۲ر

ارود الرجان ۲ر چالیس حدیثیں ۲ر

محاسن اسلام ۸ر — اچھی باتیں ۳ر

مسلمان بیبیاں ۶ر — نبیوں کے قصے ۵ر

اسلامی تاریخ کی کہانیاں ۱ر — تاریخ ہند کی کہانیاں مکمل ۸ر

دہلی ۴ر — دھوئیں کی پھانسی ۸ر

کائنات ۳ر — دنیا کے بسنے والے ۵ر

دنیا کے بچے ۵ر — تعلیمی کھیل ۳ر

بچوں کی نظمیں ۳ر — بچوں کے کھیل ۵ر

بچوں کا چڑیا گھر ۴ر — بچوں کی رباعیاں ۱ر

سمندر کا عجائب خانہ ۱۰ر — ایورسٹ کی کہانی ۵ر

ننگا پربت ۳ر — جادو کا جہاز ۲ر

جھوٹے اور سچے دوست ۲ر

کہانیاں :-

ننھی مرغابی ۲ر — بچوں کی کہانیاں ۲ر

لال مرغی ۲ر — جگنو کی بلی ۲ر

مرغی اجمیر علی ۲ر — تانبیل خاں ۲ر

پوی جو کرسمائی سے نکل بھاگی ۲ر — چھوٹا چمو ۳ر

نیت کا پھل ۳ر — شیدلا ۳ر

چھدو ۳ر — انعامی مقابلہ ۳ر

بیکاری ۳ر — شہزادی گلنار ۳ر

عقاب ۴ر — ترکوں کی کہانیاں ۴ر

دو بھائی ۴ر

ڈرامے

دیانت ۲ر — شریر لڑکا ۳ر

قوم پرست طالب علم ۳ر — بچوں کا انصاف ۳ر

اسکول کی زندگی ۳ر — کایا پلٹ ۳ر

THE GREAT PROPHET.

مصنفہ

ایف کے - خاں درانی

یہ آنحضرتؐ کی مختصر سوانح عمری ہے۔ مصنف نے رسول مقبولؐ کو ایک مکمل انسان کی حیثیت
سے پیش کیا ہے۔ طرز بیان اتنا آسان ہے کہ بچے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ قیمت عہ

THOUGHTS ON THE PRESENT DISCONTENT

مصنفہ

مولانا محمد علی

اس میں مولانا مرحوم نے نہایت واضح طور سے ہندوستان کی سیاسی بے چینی اور اس کا علاج
بتایا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش کے لئے یہ ایک مفید حل ہے۔ قیمت ۸ر

THE NATIONS OF TO-DAY

مصنفہ

John Buchan

ماضی کی تاریخ مستقبل کے واقعات کا پس منظر ہے جب تک اس پر نظر نہ ہو دنیا کی سیاست انسان کی بے جان چیز ہے
تمام اقوام کی تاریخ پر ایک مفید سلسلہ نیشنز آف ٹو ڈے کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے کو ہر کتب خانے میں
ضرور رکھنا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت جو دس جلدوں پر مشتمل ہے ماڈرن ۱۲۵ روپے ہے۔ پبلک لائبریری کیلئے رعایت بھی ممکن ہے۔

INDIA IN THE BALANCE

مصنفہ

خواجہ کمال الدین بی۔ اے

اس کتاب کا خاص مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کے سامنے ہندوستانیوں کی اصلی حالت صفائی او بے باکی سے پیش کی جائے۔ مصنف نے
یہ کوشش کی ہے کہ غیر جانبدارانہ طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا ایک مرقع پیش کیا جائے اور بتایا جائے کہ مستقبل میں ان کے جذبات کی
صورت اختیار کرنے والے ہیں قیمت ۲ر

انگریزی کی چند اچھی کتابیں

THE QUEST FOR EMPIRE.

مصنّفہ

ڈاکٹر محمود حسین پی ایچ۔ ڈی

مسئلہ نوآبادیات پر نہایت مفصل و مشرح بحث۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان کے توسیع پروگرام پر خاص نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد سے

NIZAMUL MULK ASAFJAH

مصنّفہ

ڈاکٹر یوسف حسین ڈی لیٹ

مصنف نے بہت مستند ماخذوں سے نظام الملک اور اس کے زمانے کی تاریخ مجتمع کی ہے۔ نظام الملک کی حیثیت اس معنی میں اور بھی اہم ہے کہ اس نے مغلیہ حکومت کے آخری تباہ کن دور میں کوئی معمولی کام انجام نہیں دیا ہے۔ طرز بیان تنقیدی ہے اور دلچسپ۔ تاریخ کے طلبار کو عموماً اور مغلیہ عہد آخری دور پڑھنے والے طلبار کو خصوصاً اس کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ قیمت مجلد ...

THE KHILAFAT & ENGLAND

مصنّفہ

ڈاکٹر سید محمود۔ وزیر تعلیم بہار۔

ڈاکٹر محمود نے خلافت کی پچھلی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور نہایت واضح طور سے سلطنت عثمانیہ اور برطانوی حکومت کے گذشتہ اور موجودہ تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔" ابوالکلام آزاد

قیمت عہ

تعلیم بالغان پر چند کتابیں

جامعہ کے شعبہ "تعلیم و ترقی" نے تعلیم بالغان کے لئے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کئی قاعدے اور عام مطالعے کے لئے بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ایک سال میں عام مطالعے کی کتابوں کی تعداد پوری ایک سو کر دی جائے گی۔ یہ کتابیں بڑے سائز پر شائع کی گئی ہیں۔ کتابت صاف اور روشن ہے۔ رسم الخط میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگوں کے مطالعے میں آسانی ہو۔ اردو میں اس انداز کی کتابیں اب تک شائع نہ ہوئی تھیں۔ تعلیم بالغان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے انھیں غیر معمولی طور پر مفید پایا ہے۔

نام کتاب	مصنف	قیمت
اردو کا قاعدہ نمبر ۱	ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب سابق وزیر تعلیم بھوپال	۱۰/
اردو کا قاعدہ نمبر ۲	" " "	۱۰/
اردو کا قاعدہ نمبر ۳	" " "	۱۰/
مدرس کا قاعدہ نما	" " "	۲/
نماز		۱۰/
حبیب خدا	الیاس احمد صاحب مجیبی	۱۰/
صدیق اکبر	" "	۱۰/
حکایتیں ۔ حصہ اول		۱۰/
حصہ دوم		۱۰/

نام کتاب	مصنف	قیمت
نظمیں	مولوی شفیع الدین صاحب نیر	۸/
غزلیں		۸/
خط و کتابت		۸/
بیا غفور پڑھنے لگے		۸/
میونسپلٹی	شیخ فضل الرحمن صاحب قدوائی بی اے ایم اے دھلیک	۸/
ضلع کا انتظام	" " " "	۱۲/
ہمارا ہندوستان		۸/

جدید اُردو اٹلس

مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے' بی' ٹی سررشتہ تعلیمات سرکار عالی موصوف نے نہایت محنت اور کوشش سے یہ اٹلس تیار کئے ہیں۔ ان کی قبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں داخل نصاب ہیں۔ کاغذ طباعت وغیرہ بہترین۔

تاریخی اٹلس ———— قیمت ۶/

جدید اٹلس ———— " ۱۲/

ارزاں اٹلس ———— " ۹/

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن صاحب ہاشمی، ایم، اے (علیگ)

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

۱- کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟ — از جناب سید احمد علی صاحب — ۲۱۲
۲- ہماری مشکلات کا حل — از جناب محب الحسن خاں صاحب — ۲۲۰
۳- فلسفۂ لغت — از جناب محمد کامل صاحب — ۲۳۰
۴- جمہوریت جدید اور اسلام — از جناب محمد مظہر الدین صاحب — ۲۴۹

اعتذار

ستمبر ۳۹ئہ کا رسالہ بعض دشواریوں کے سبب صرف ایک دن تاخیر سے تیار ہوا۔ اس لئے ڈاک خانہ والوں نے اپنے قاعدے کے مطابق اسے روانہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ لاہور کے صدر ڈاک خانہ سے خط و کتابت میں اتنی تاخیر ہوئی کہ ستمبر کا رسالہ جو شروع مہینے میں شائع ہوتا تھا آخر مہینے میں روانہ کیا جاسکا۔

اکتوبر کا رسالہ بھی کچھ ایسی ہی مجبوریوں کے سبب نسبتاً کم ضخامت پر شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ امید ہے کہ نومبر سے یہ دقتیں نہ رہیں گی۔

اس پرچے سے رسالہ کی ادارت میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اب تک یہ اہم کام پروفیسر محمد عاقل صاحب کے سپرد تھا۔ اب اس مہینے سے ادارت کے فرائض مولوی نور الحسن صاحب ہاشمی انجام دیں گے۔ گو پروفیسر محمد عاقل صاحب رسالے کی ادارت سے سبکدوش ہو چکے ہیں پھر بھی اکتوبر کا رسالہ ان ہی کے مرتب کئے ہوئے مضامین پر مشتمل ہے اور آئندہ بھی امید ہے کہ ناظرین ان کے اعلیٰ مضامین سے استفادہ کرسکیں گے۔ اب تک جس ذوق اور دلچسپی سے جناب عاقل صاحب نے رسالے کا کام کیا ہے میں کارکنان "جامعہ" اور رسالے کے ناظرین کی جانب سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ان کی امداد اور مشورے رسالے کو آئندہ بھی حاصل رہیں گے۔

مہتمم

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جاسکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ قرول باغ، دہلی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(اس اشاعت میں اس سلسلہ کا دوسرا مضمون شایع کیا جا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اس مضمون کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کریں۔ اس کے قابل عمل اور کامیاب ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکے گا جب اس طریقہ سے تعلیم دیئے ہوئے طلبہ زندگی کے کاروبار میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے لیکن تعلیم کے مقاصد اور ذرائع کو پیش نظر تعلیم کے ماہر اگر اس پر تنقید فرمائیں گے تو ممکن ہے اس کی خامیوں، فروگذاشتوں، غلطیوں یا گمراہیوں کو رفع کیا جا سکے۔ مدیر)

اپنے گذشتہ مضمون میں میں نے چار ضمنی کاموں (Minor Projects) کا تذکرہ کرتے ہوئے ان مواقع کو بیان کیا ہے جہاں استاد کوئی سبق، خواہ وہ زبان کا ہو، خواہ جنرل سائنس اور سوشل اسٹڈیز کا، مربوط حرفہ کرکے پڑھا سکتا ہے ان ضمنی کاموں (Minor Project) میں جو خاص (Major Projects) کے سلسلہ میں اختیار کئے جاتے ہیں، میں نے صرف انھیں مواقع کا تذکرہ کیا ہے جو بالکل صاف طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بچوں کے سوالات اور ان کی پوچھنے گچھنے کی فطری عادت ان بیان کردہ مواقع سے کہیں زیادہ مربوط پڑھائی کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ لیکن استاد کو چاہیئے کہ ضمنی کاموں میں پیدا شدہ مواقع سے فائدہ اٹھائے جتنا مضامین اور مضامین کے اسباق کے عنوانات کو مربوط کرکے پڑھانے کی ضرورت ہو۔ اس لئے کہ بعض اوقات بچوں کی دلچسپی اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ اصل کام یا خاص حرفہ میں دلچسپی کم ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ لہذا استاد کی تھوڑی سی رہنمائی بچوں کو اصل مقصد یا حرفہ پر دلچسپی اور شوق سے کام کرنے پر قائم رہے گی اور یہ ضمنی کام ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً کرائے جائیں گے اور کسی مضمون یا

کسی مضمون کے کسی سبق کی تکمیل تک ہی اس کام کی دلچسپی کو بڑھایا جائے گا۔

تمام ان مواقع سے جن کا میں نے کسی ضمنی کاموں (Minor Projects) میں تذکرہ کیا ہے کسی ایک جماعت میں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ نہ تمام مواقع کے بیان کرنے کا یہ مطلب ہے۔ بلکہ یہ تمام باتیں کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جماعت کے معیار کے مطابق اس میں سے باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور مواقع کے مطابق اسباق تعلق دے کر پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً لیئی بنانے میں لیئی بننے کا خرچ معلوم کرنے کے لئے زبانی حساب کسی جماعت میں نکلوایا جا سکتا ہے۔ لیکن لیئی میں پانی میدہ اور نیلا تھوتھا کس نسبت سے ہے اور کتنے کتنے فی صدی ہے؟ یہ باتیں ساتویں جماعت میں تبلائی جا سکتی ہیں، یا کسی چیز کی قیمت کا صرف مرکب کے ذریعہ پھیلانے کا کام چوتھی جماعت میں کرایا جا سکتا ہے۔

کام کرانے والوں کو ایک اور تجربہ ہو گا یعنی کسی عملی کام کے کرانے کے دوران میں بہ یک وقت کئی باتوں کے سکھانے کا موقعہ ملے گا۔ مثلاً گتے سے کام کرانے کے دوران میں مختلف سائز کے گتے ناپ کر کاٹنے میں رقبہ نکلوانے کا موقعہ پیدا ہو گا لیکن ساتھ ہی ساتھ چیزوں کی خریداری میں روپے آنے اور پیسے کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے سکھانے اور مشق کرانے کا بھی موقعہ پیدا ہو گا۔ اب اگر استاد کے رقبہ سکھانے کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر بچوں کو رقبہ سکھانا شروع کیا ہے تو اسے بغیر اس قاعدے کی اچھی طرح مشق کرائے اور بچوں کو ذہن نشین کرائے روپے آنے کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے قاعدوں کے سکھانے کی طرف نہ آنا چاہیئے۔ ورنہ کام میں بے حد انتشار پیدا ہو جائے گا دھیان (Coneentration) جاتا رہے گا اور کوئی بات پختہ طریقہ پر نہیں سکھائی جا سکے گی۔ یہی اندیشہ دوسرے مضامین میں بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا استاد کی استادی اور ہوشیاری اسی میں ہے کہ کسی ضمنی کام میں پیدا شدہ مواقع سے اس طرح فائدہ اٹھائے کہ انتشار نہ پیدا ہو۔ یہ صورت نہ پیدا ہو کہ آج ایک بات سکھائی گئی تو کل بچوں کا رجحان کسی دوسری طرف دیکھتے ہوئے دوسری بات سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے طریقہ کار میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ کام میں پیدا شدہ مواقع کی دلچسپی اس وقت تک قائم رکھے جب تک زیر بحث سبق یا حساب کا کوئی قاعدہ پختہ طریقہ پر بچوں کو نہ سمجھا دیا گیا ہو اور اس کی کافی مشق نہ ہو چکی ہو۔

خیال یہ ہے کہ اس طرح کام کرانے سے بچوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بے جا طریقہ پر روکا جائے گا لیکن نہیں اس کی نوبت بہت کم آئے گی۔ اس لئے کہ بچے جس شوق سے کسی بات کے کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں اسی رفتار سے بہت جلد ان کی دلچسپی جاتی رہتی ہے جب تک استاد برابر کوئی ایک طریقہ نہ اختیار کرتا رہے جس سے اس آمادگی اور دلچسپی میں تناہی زور (Force) برقرار رہے جتنا کام کے شروع کراتے وقت نظر آرہا تھا بچوں کی دلچسپیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اصلی اور نقلی۔ کسی کام کے آغاز میں جب بچے آمادگی ظاہر کرتے ہیں، خواہ یہ آمادگی ان میں خود بخود پیدا ہوئی ہو یا استاد کے کام کے پیش کرنے کے دوران میں پیدا ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں استاد کو بچوں کی اس آمادگی کو اچھی طرح پرکھ کر کام شروع کرانا چاہیئے۔ کبھی دو چار سوالات کرنے سے اور کبھی جماعت کی رائے لینے سے بچوں کی آمادگی کے اصلی اور نقلی ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ بچوں کی اصلی دلچسپی میں سنجیدگی اور پختہ آمادگی نظر آئے گی۔ اس وقت ان کی نشست اور طرز گفتگو سے ان کی دلچسپی کے اصلی ہونے کا اندازہ ہو رہا ہوگا۔ آپ کی تھوڑی سی بے توجہی سے ان میں افسردہ دلی نظر آنے لگے گی لیکن نقلی دلچسپی میں یہ باتیں نہ ہوں گی۔ وہ دلچسپی نہ ہوگی بلکہ دل لگی ہوگی۔ اس میں غور و فکر نہ ہوگا اور جب آپ اس کام کے متعلق تجاویز طلب کریں گے تو معنی خیز خاموشی چھا جائے گی جس سے اب اندازہ لگا سکیں گے کہ بچوں نے جس بات کا ارادہ کیا ہے، وہ محض تفریح کے لئے ہے، اس سے وہ کوئی تعلیمی فائدہ حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، محض جماعت میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں، لہٰذا جس دلچسپی میں دل لگی کا شائبہ پایا جاتا ہو اسے کوئی اہمیت نہ دینی چاہیئے، اس لئے کہ اس سے کوئی تعلیمی فائدہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ اس وقت بچوں سے کام کرانا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ بچوں کی دلچسپی کو تعلیم کے لئے استعمال کرنا فنی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عملی کام میں بھی دلچسپی اور آمادگی اصل مرکز اور طاقت ہے۔ یہی ربط کی بنیاد ہے۔ بچوں کی اس آمادگی اور دلچسپی کو صحیح راستہ پر ڈالنا ہی اصل کمال ہے۔ ہوشیار استاد وہی ہے جو عملی کام سے پیدا شدہ دلچسپی سے زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھائے، اور اسباق کو بچوں کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ عملی کام کو اچھی طرح کرنے اور اس سے واقف ہونے کے ضمن میں اسے ایک نہایت ضروری کام سمجھیں۔ بچے اس سبق کے مطالعہ کے

لئے بھی اتنے ہی بے تاب ہوں جتنا کسی عملی کام کے شروع کرتے وقت ہوتے ہیں۔ مثلاً جتنی آمادگی چولہے میں کوئلہ لانے، کوئلہ جلانے، میدہ اور نیلا تھوتھا پانی میں ملانے اور لیئی پکانے میں ہوتی ہے اتنی ہی آمادگی اور شوق اس بات کے معلوم کرنے میں بھی پیدا ہو جانا چاہیئے کہ دیگچی سے نکلی ہوئی بھاپ کہاں گئی اور میدے میں ملا ہوا پانی کہاں غائب ہو گیا یا بھاپ نے دیگچی سے نکلتے وقت ڈھکنا کیوں گرا دیا؟ لیئی پکتے وقت ان تمام باتوں پر روشنی پڑنی چاہیئے، اور بھاپ اور پانی کے اسباق اس طرح مربوط ہو کر سامنے آنے چاہیئں۔ اگر طالب علموں نے کئی بار لیئی پکائی، اور پھر بھی انھیں کوئلے کا نرخ نہیں معلوم ہے اور انھوں نے اس کا ایک ادھ سوال نہیں نکالا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ پیدا شدہ ضمنی کام سے پورا تعلیمی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اگر عملی کاموں سے اس طرح تعلیمی فائدہ نہیں حاصل کیا گیا ہے تو ہر عملی کام محض کھیل اور شوق کا مقصد پورا کر سکے گا۔

۵۔ تیل اور لیئی سے ابری بنانا

طریقہ کار: تیل کی ابری بنانے کے لئے (Oil colour) آئل کلر، برش، جست کی کشتی، لیئی اور مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیئی کی ابری بنانے میں بڑے برش، کپڑا رنگنے کے رنگ، بڑے پیالے اور لیئی کی ضرورت ہے۔ تیل کی ابری کا ڈزاین اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ رنگ کی جیسی نہ پانی پر ہو گی ویسی کاغذ پر آجائے گی۔ لیئی کی ابری اختیاری ہے۔ مرضی کے ڈزاین بنا سکتے ہیں۔ لیکن تیل کی ابری نیچرل ہونے کی وجہ سے نسبتاً خوشنما ہوتی ہے اور بہت آسانی سے بن سکتی ہے۔ لیئی کی ابری میں کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے لیکن وہ زیادہ تخلیقی (Creative) ہے۔ وہ مشق ڈرائنگ کے ہے لیکن ڈرائنگ بنانے سے آسان اور رنگوں کے خرچ کے اعتبار سے کم خرچ۔

ابری خواہ لیئی کی بنوائی جائے خواہ تیل کی بچوں کی آمادگی اور دلچسپی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان سے بہت کام لے سکتا ہے۔ بچے ابری بناتے وقت بہت خوش ہوتے ہیں۔ نئے نئے ڈزائن اور نئی نئی شکلیں بنتی ہیں اور رنگوں کے استعمال سے برابر تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے لہذا خوشی اور مسرت میں بے قابو بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر ایک طالب علم کو ابری بنانے کا کافی موقعہ نہیں دیا جاتا تو وہ کاپی

سے ورق پھاڑ پھاڑ کر کشتی میں ڈال دیتا ہے اور ابری بنا کر گھر لے جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کافی سامان ہو۔ ایک بڑی کشتی میں چار لڑکے یا زیادہ سے زیادہ چھ لڑکے کام کر سکتے ہیں۔ شروع شروع میں بچوں کو اپنی بنائی ہوئی ابری، واپس لانے کے وعدہ پر، گھر لے جانے کی اجازت ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنی بہنوں اور والدہ کو دکھلا سکیں۔ ایسا کرنے سے بچے نہ تو چھپا کر ابری لے جائیں گے اور نہ کاپی سے ورق پھاڑیں گے اگر کوئی بچہ ابری واپس نہ لائے تو باز پرس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے اگر اپنا کیا ہوا کام یا بنائی ہوئی چیزیں گھر پر دکھلانے لے جاتے ہیں تو گویا وہ مدرسہ کی تعلیم کا اثر گھر تک لے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کا چرچا گھروں پر بھی کرتے ہیں۔ بچوں کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب وہ کوئی نئی چیز بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس وقت تو واقعی انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے جب ان کی کامیابی کی تعریف گھروں پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر بچے پوچھ کر ابری گھروں کو لے جانا چاہتے ہیں تو مدرسہ کو تھوڑا سا نقصان برداشت کرنا چاہیے۔

اس کام میں رنگوں کے متعلق بہت کچھ تبلایا جا سکتا ہے۔ مختلف رقیق چیزوں کے ہلکے اور بھاری ہونے کے متعلق بھی تبلایا جا سکتا ہے۔ رنگوں کے متعلق بچوں کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ وہ شوخ رنگوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگوں کی ترتیب کا بھی انھیں کوئی خیال نہیں ہوتا یعنی کون سا رنگ کس رنگ کے ساتھ زیادہ خوشنما اور جاذب نظر ہوگا۔ یہ بات خود ہمارے استادوں کو بھی نہیں معلوم ہے۔ رنگوں کے ملانے میں اور ترتیب دینے میں ہم خود اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ رنگوں کے متعلق مختلف لوگوں کا مختلف مذاق (Taste) ہے۔ پھر بھی ہمیں اس کا معیار بلند کرنا چاہیے۔ بازار کی مختلف رنگین چیزوں کا معیار تو بہت پست ہے، وہ تو آنکھوں کو بھی بری معلوم ہوتی ہیں بچوں کو اگر آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے دیں گے اور اپنی ہدایت اور نگرانی میں کام نہ کرائیں گے تو وہ نہایت گہرے رنگ کی ابری بنائیں گے۔ جس رنگ کو بحیثیت 'زمین' کے کاغذ پر ہونا چاہیے، وہ بحیثیت 'بیل بوٹے' کے بنایا گیا ہوگا یا جس رنگ کو 'بیل بوٹے' کے لئے استعمال کرنا چاہیے تھا، وہ 'زمین' کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا اور اس پر نہایت گہرے 'بیل بوٹے' دوسرے رنگ کے بنے ہوئے

ہوں گے۔ بچوں کو رنگوں کے ملانے میں بھی خاص تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ رنگوں کی تمام پیالیاں خراب کردیں گے۔ اور بعض بعض بچے تو کام میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اپنے کپڑوں پر بھی ابری بنا لیتے ہیں۔

عملی کام میں بھی اچھے ڈسپلن سے بہت اچھا کام ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ بہ یک وقت پچیس تیس لڑکوں کے لئے کام مہیا کرنا ہوتا ہے اس لئے ضبط کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بہتر ہوگا اگر استاد ابتدا میں کام شروع ہونے سے پہلے خود تھوڑی سی تیاری کرلے۔ مثلاً جن کاغذوں پر ابری بنوانا ہے انھیں کاٹ کر رکھ لے۔ رنگوں کو پیالوں میں ملاکر بچوں کو دکھادے اور کشتی کے اردگرد کرنے سے رکھ دے۔ کاغذ کو ابری بنانے کے لئے تیل پر ڈالنے اور اٹھانے کا دو تین مرتبہ ڈیمانسٹریشن دے پھر باری باری سے بچوں کو بلاکر اس کے مطابق عمل کروائے۔ اس وقت دوسرے بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر دیکھیں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔ اس عمل کے دوران میں استاد بچوں کو رنگوں کے متعلق زبانی بتلاتا بھی جائے اور بچوں کی آمادگی سے فائدہ اٹھائے۔ اس بنیادی کام اور پیش بندی سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب بچے ان کے متعلق اپنی کتاب سے اسباق پڑھیں گے تو بہت زیادہ توجہ اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔

زبان | رنگوں پر بچوں سے مختلف سوالات کئے جائیں مثلاً خاص رنگ کون کون سے ہیں؟ کس رنگ کو کس رنگ میں ملانے سے کون رنگ تیار ہو جاتا ہے؟ (عملی طور پر استاد بچوں کو ملاکر دکھلائے کہ فلاں رنگ کو فلاں رنگ کے ساتھ ملانے سے فلاں رنگ تیار ہو جاتا ہے اور پھر بچوں سے بھی ایک ایک کرکے یہ کام کروایا جائے) مقررہ رنگ کس کس چیز میں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بچے بڑی مستعدی سے لکھوائیں گے اور ایک لمبی فہرست تیار ہو جائے گی جس کو استاد ذیل کے عنوانات میں تقسیم کرسکتا ہے (۱) مختلف قسم کی تیتریاں، (۲) مختلف قسم کے پرندے، (۳) مختلف قسم کے پھول، (۴) مختلف قسم کے جانور، (۵) مختلف قسم کی چھالیں (۶) دھنک

رنگوں پر ایک سبق ترتیب دیا جاسکتا ہے جس میں اس قسم کی جملہ باتیں آسکتی ہیں اس کے علاوہ تیتری، پھول، اور پرندوں پر حسب معیار اور نصاب کے مطابق اسباق لکھے اور پڑھائے جاسکتے ہیں۔

جو ادبی حیثیت سے مفید ہوں گے۔ پھولوں، پرندوں، اور تیتری پر نظمیں پڑھائی جاسکتی ہیں۔ اسباق کو زیادہ
بامعنی موثر اور واضح کرنے کے لئے، بچوں سے مختلف رنگ کے اونی اور سوتی کپڑے جمع کرائے جاسکتے
ہیں۔ اس ضمنی بامقصد کام میں اگر بچوں کی چیزیں جمع کرنے کی فطری عادت کو تحریک دی جائے تو بچے مختلف
رنگ کی تیتریاں، پر، تاگے، پھول، پتیاں اور ایسی ہی کتنی رنگین چیزیں جمع کرلائیں گے جن کو استاد کارڈ بورڈ
پر نہایت قرینہ سے ترتیب دے کر جماعت میں آویزاں کرسکتا ہے اور اس سے تعلیمی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔
عملی کام میں ابری بناتے وقت ایک جماعت نے تیتری کے سبق کے بعد کشتی میں تیتری کے پروں
سے ملتی جلتی ابری بنائی اور پھر تیتری کی طرح قینچی سے کاٹ کر ایک پن میں لگا کر رکھا اس طرح کئی قسم کی تیتریاں
بنوائی جاسکتی ہیں۔ رنگ برنگ کے پرندے اور پھول بھی ایسی ہی ابری میں بنائے جاسکتے ہیں۔ انہیں کارڈ
بورڈ پر چپکا کر فریٹ ورک کی طرح کاٹا جاسکتا ہے کارڈ بورڈ کے ریشے جو اس آری سے کاٹنے سے نکل آئیں گے
ریگ مال سے صاف کئے جاسکتے ہیں۔
حساب | رنگوں کی خریداری میں روپے، آنے اور پیسے کی ضرب اور تقسیم سکھائی جاسکتی ہے۔ بذریعہ تجارت
اور اکائی بھی قیمتیں پھیلائی جاسکتی ہیں۔ رنگوں کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں ایسا موقعہ آنے پر فی صدی کے
سوالات سکھائے اور مزید مشق کے لئے نکلوائے جاسکتے ہیں۔ رنگوں میں مختلف رنگوں کی قیمتیں پھیلائی
جاسکتی ہیں۔ مثلاً تیل کا رنگ (Oil colour) بٹی کلر، مومی پسٹل کلر، واٹر کلر کپڑے رنگنے کے رنگ
اور وارنش کے رنگ۔
سوشل اسٹڈیز | ہندوستان کی صنعت رنگ سازی بیسویں صدی کے وسط تک خوب ترقی پر تھی لیکن اس
کے بعد سے اس صنعت کا کاروبار پھیکا پڑتا گیا۔ اس کی وجوہات کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کرنا تاریخی
واقعات کے سمجھنے میں مدد دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام باتوں کا مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہوگا
جن سے ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی تباہی واقع ہوئی۔ ہندوستان میں رنگ کی ضرورت اب
بھی مختلف طریقوں سے پوری کی جاتی ہے۔ مثلاً ہرسنگھار کے پھول سے لال رنگ نکالتے ہیں۔ مہندی
کی پتیوں سے لال رنگ حاصل کرتے ہیں۔ ہلدی سے اور بھٹ کٹیٹر کے پھول سے زرد رنگ نکالتے ہیں

اور دیہاتوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن یہ تمام صورتیں محنت طلب ہیں اس لئے عوام باہر سے آئے ہوئے رنگ ہی کو استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کا نقشہ بنوایا جا سکتا ہے اور صوبہ بہار اور اس کا وہ رقبہ بنوایا جا سکتا ہے جہاں نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ صوبہ بہار کی دوسری پیداواروں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اس علاقہ میں اب نیل کی کاشت کی بجائے گنے کی کاشت ہوتی ہے اور وہ تمام رقبہ جہاں بیسویں صدی کے وسط تک نیل بنانے کے کارخانے نظر آتے تھے، شکر سازی کے کارخانوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ خام اجناس اور پھل کی پیداوار کے اعتبار سے بہار کا صوبہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔ جغرافیہ کے اسباق میں آب و ہوا، ذریعہ آمد و رفت اور مشہور شہر اور منڈیاں تبلائی جا سکتی ہیں۔

آج کل تمام رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے ہیں۔ ان کی بابت بھی جغرافیہ کے اسباق کے تحت معیار کے مطابق مختلف جماعتوں میں مختلف باتیں تبلائی جا سکتی ہیں۔ ذریعہ آمد و رفت اور بندرگاہوں کے اسباق تیار کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مٹی کا تیل کہاں سے آتا ہے؛ کیسے نکالا جاتا ہے؟ کیسے آتا ہے؟ بازاروں میں کیسے بکتا ہے؟

- اس کا کیا استعمال ہے۔ برما کے علاوہ دنیا میں مٹی کا تیل اور کہاں کہاں پایا جاتا ہے؟ نقشوں کی مدد سے اس کے متعلق ضروری واقفیت دی جا سکتی ہے۔

جنرل سائنس | تیتری کی مکمل زندگی، یعنی لاروا، پیوپا اور مکمل تیتری۔ تیتری ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر جانے میں کیا خدمت انجام دیتی ہے؟ مکمل پھول اور نامکمل پھول۔ ان کی پہچان۔ نامکمل پھول جس میں صرف مادہ حصہ ہوتا ہے اس وقت مکمل ہوتا ہے جب تیتری نر پھول کا برادہ جس کو پولن کا برادہ کہتے ہیں، اپنے پیروں اور سونڈوں کے ذریعہ لے جا کر مادہ پھول پر ڈالتی ہے۔ تیتری کی طرح کے دوسرے کیڑے بھی جو اس قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں پڑھائے جا سکتے ہیں۔

تیل اور دوسری تیل سے ملتی جلتی رقیق چیزیں پانی پر کیوں تیرتی ہیں؟ تجربے سے معلوم کیا جائے۔

"ہماری مشکلات کا حل"

(از جناب محب الحسن خاں صاحب بی اے۔ آنرز (لندن)

گذشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک نے حیرت انگیز اختراعات اور ترقیاں کی ہیں لیکن ابھی تک وہ سماجی انصاف کے اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند لوگوں کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور وہ عیش و آرام سے زندگی گذارتے ہیں لیکن محنت اور مشقت کرنے والوں کے دن بھوک تنگدستی اور مصیبت میں کٹتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور محبت ہر طرف مفقود ہو رہی ہے اور اس کے بجائے تجارتانہ ذہنیت اور خود غرضی کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔ چند سرمایہ دار ملک دنیا کو غلامی اور استبدادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی مطمئن نہیں نظر آتے بلکہ ایک دوسرے سے ایسی جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہیں جو یقیناً موجودہ تمدن کو خاک میں ملا دے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان تمام کا کیا علاج ہے۔ کیا ہماری موجودہ سوسائٹی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری زندگی کو بہتر بنا سکے۔ یا سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ موجودہ سماج کو شیرازہ کشی نئے اصول پر چلایا جائے۔ یہی دو مسئلے ہیں جو کہ اس مضمون میں زیر بحث ہوں گے۔

دنیا میں بہت سے ماہر تعلیم[1] اور فلسفی ایسے ہیں جن کو سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی غلطی نقص نہیں نظر آتا بلکہ صرف چند ظاہری خامیاں جو کہ ان کے خیال میں رفتہ رفتہ اچھی تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح کلیسا کے سربرآوردہ پیشواؤں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں ایک عظیم الشان

---

[1] جان ڈیوی (John Dewey) جو امریکہ کا بہت بڑا ماہر تعلیم اور فلسفی ہے اپنی کتاب فلسفہ اور تمدن صفحہ ۲۲۹ میں اس نظریہ کو بہت زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

تغیر ظہور میں آسکتا ہے اگر حضرت عیسیٰ کی ہدایت پر لوگ قدم بقدم چلیں۔ ہندوستان میں گاندھی جی اپنے فلسفہ اہنسا کے ذریعہ سے نہ صرف اس ملک کا بلکہ تمام دنیا کا اخلاق اور روحانی معیار بلند کرنے کے لیے تیار ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا محض تعلیم ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتی ہے اور کیا اس میں اتنی قدرت ہے کہ ہماری مشکلات کو حل کر سکے۔ ان سوالات کے جواب کے لیے ہمیں مغربی یورپ کے حالات پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ مغربی یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حالانکہ وہاں ایک عرصہ سے تعلیم عام ہے لیکن پھر بھی بے روزگاری افلاس اور تمام انسانی کمزوریاں موجود ہیں۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہاں تعلیم میں بڑے نقائص ہیں اس لیے سوسائٹی میں بھی خامیاں ہیں لیکن اگر اچھی تعلیم کا پرچار کیا جائے تو لوگوں کا اخلاقی معیار بہت بلند ہو سکتا ہے اور ان کی زندگی سے ظلم اور بے انصافی وغیرہ مٹائے جا سکتے ہیں، مگر اس خیال کے حامی بدقسمتی سے یہ نہیں سمجھتے کہ موجودہ حالات میں اچھی تعلیم کا رائج کرنا ہی ناممکن بات ہے۔ جو برسر اقتدار طبقہ ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام نظام ملکی ہے، وہ یہ نہیں چاہتا کہ عوام کو اچھی تعلیم دی جائے اور ان پر حقیقت روشن کی جائے کیونکہ اس میں ان کے مفاد معرض خطر ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی ادارے حکمراں طبقہ کے لیے ایسے مفید آلہ ہیں کہ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے اثر اور قوت کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ عوام کو ایسی تعلیم دیتے ہیں جو ان کو ان کی موجودہ حالت پر قائم رکھے۔ ان کو ابھرنے نہ دے اور جو ان میں فرماں برداری اور غلامی کی ذہنیت پیدا کرے، مثلاً انگلستان میں بادشاہ سے محبت اور وفاداری کرنے کے لیے ایک عظیم الشان پروپگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے دلوں پر یہ بات جاگزین کی جاتی ہے کہ سرمایہ داری ایک قدرتی نظام ہے۔ امیر حکومت کے لیے پیدا ہوا ہے اور غریب محکومیت کے لیے، غربت اور امارت ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ بالکل یہی تعلیم ہم کو ہندوستان میں دی جاتی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم محض یہاں کے امرا کا گیت گائیں ہم کو اپنے غیر ملکی حکمرانوں کی بھی قصیدہ خوانی کرنی پڑتی تھی، چنانچہ

تعلیم کا مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم بالکل بے کار ہے جو حقیقتِ حال کو پوری طرح واضح نہ کرسکے بلکہ واقعات پر پردہ ڈال دے ہماری سوسائٹی میں فی الحال اسی طرح کی تعلیم رائج ہے اور یہ رہے گی جب تک اس میں دو طبقہ قائم رہیں گے یعنی حاکم و محکوم آسودہ وغیرہ آسودہ۔ امیر و غریب وہ جو بغیر محنت کے آرام و آسائش اٹھاتے ہیں، اور وہ جو محنت و مشقت کے باوجود بھی پیٹ اور تن کے محتاج رہتے ہیں۔

اب ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا محض وعظ و تلقین سے دنیا کی حالت بہتر ہو سکتی ہے؟ انگلستان میں فیبین سوشلسٹس (Fabian Socialists) جن کے برنارڈ شا (Bernard Shaw) اور سڈنی ویب (Sidney Webb) بڑے رکن ہیں اسی خیال کے حامی ہیں کہ اگر اشتراکیت کا کافی پروپگنڈہ کیا جائے تو سرمایہ دار خود بخود اس کی خوبیاں سمجھ کر سوشلسٹس بن جائیں گے اور اپنی جائدادیں خوشی سے قوم کے حوالہ کر دیں گے۔ اسی طرح جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ہمارے ملک میں گاندھی جی انسان کو بغیر سوسائٹی کے نظام میں بنیادی تبدیلی کئے ہوئے اپنے اہنسا کے ذریعہ سے فرشتہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ وعظ اور تلقین کے اثر کے اس قدر قائل ہیں کہ انسانی نفسیات کو بالکل بھول جاتے ہیں یہ اس بات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ جو سماجی نظام غیر مساوات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ اپنے میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ اس میں معدودے چند لوگ ذرائع پیداوار پر قابض ہو جانے کی وجہ سے دنیا کی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اکثریت کو وہ مواقع نہیں ملتے جس سے وہ اپنی شخصیت کو ترقی دے سکیں۔ عوام کی زندگی جہالت غلامی اور افکار معاش میں صرف ہوتی ہے۔

دوسری بات جو ہم کو سمجھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتی خواہ کتنی ہی اس کو تلقین کی جائے۔ اگر محض بات چیت سے کام چلتا ہوتا تو فرانس اور روس میں انقلاب نہ ہوتے اور بے کار خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ بغیر انقلاب کے

ترقی نہیں ہوتی، اور جو پارٹی اس راز کو نہیں سمجھ سکتی وہ صحیح قیادت نہیں کر سکتی ہے۔ آسٹریا، جرمنی، اور اٹلی کی اشتراکی پارٹیاں "وعظ و تلقین" پر زیادہ زور دیتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کو سرمایہ داروں کی طرف سے بہت حسن ظن تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ان ملکوں میں ایسی ہولناک تنزل پذیر اور وحشیانہ حکومت قائم کرنے کے لئے، جس کو ہم فسطائیت کے نام سے پکارتے ہیں، راستہ کھول دیا۔

میرا اس بحث سے یہ مطلب نہیں کہ انسان فطری طور پر بے حس، بد خلق، خود غرض، بے انصاف اور ظالم پیدا ہوا ہے جیسا کہ انگریز فلسفی ہابس (Hobbes) کا خیال تھا۔ نہ میرا روسو (Rousseau) کی طرح ایمان ہے جس کی رو سے انسان طبیعتاً نیک نفس، منصف مزاج، خوش اخلاق اور ایثار پسند ہے لیکن اس کو سماج نے خراب کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان نہ پیدائشی طور سے اتنا برا ہے جیسا کہ ہابس (Hobbes) کا خیال ہے اور نہ اتنا اچھا جیسا کہ روسو (Rousseau) کا۔ انسان کی طبیعت کا انحصار اس کے ماحول پر ہے اور اس کے معاشی حالات پر جب تک کہ اس مسئلہ کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے گا، ہماری زندگی بہتر نہیں بن سکتی۔

ہماری سوسائٹی میں اس قدر عیوب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ نہیں بلکہ افراد کا ہے۔ دولت آفرینی عوام کے فائدے کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ ذاتی منفعت کے لئے، یہی دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ بین الاقوامی جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ اس لئے کہ ایک ملک کے سرمایہ دار دوسرے ملک کے سرمایہ داروں کے بازاروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی کمزوری کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہمارا موجودہ معاشی نظام ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ کسی اور بات کی طرف توجہ کی جائے، ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم اس کی تشکیل اشتراکی اصول پر کریں۔ میرا اس بحث سے یہ مقصد نہیں کہ تعلیم غیر ضروری چیز ہے اور بس اشتراکی حکومت قائم کر دینے سے تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ہرگز نہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ معاشی نظام کا سوال ایک بنیادی

مسئلہ ہے اس لیئے اس کا حل سب سے پہلے ضروری ہے۔ دوسری دشواریوں کو ہم اسی وقت دور کر سکتے ہیں جب ذرائع پیدا وار پر قوم کا قبضہ ہو جائے۔

میدان تعلیم میں جو نئی نئی باتیں معلوم کی گئی ہیں یا فرائڈ (Freud) نے جو نئے نئے نظریہ انسانی نفسیات پر قائم کئے ہیں ان سے ہم موجودہ سرمایہ داری نظام کے ہوتے ہوئے فائدہ نہیں حاصل کر سکتے اس لئے کہ سرمایہ دار اس کے مخالف ہوں گے۔ مثلاً ایڈورڈ گلوور (Edward Glover) جو کہ فرائڈ (Freud) کے ایک بڑے شاگرد ہیں اپنی کتاب "انسان ہونے کے خطرات" میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں جتنی خرابیاں ہیں تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں" ان کا خیال ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کی پرورش پہلے چار پانچ برس کرنا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو عورت تین بچے رکھتی ہو اس کو تقریباً دس برس تک ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی اور اس زمانہ میں یہ باپ کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کافی وقت صرف کرے۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کو پانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ باقی وقت کھانے آرام کرنے اور اپنے بیوی بچوں میں صرف کرے۔ ڈاکٹر گلوور (Glover) نے یہ اسکیم تو خوب پیش کی لیکن ان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سرمایہ پرست سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے کب اس پر کاربند ہونے کی اجازت دیں گے یہ اس کی شدید مخالفت کریں گے کیونکہ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا اور کم سے کم اجرت دینا ان کا شیوہ ہے۔ ڈاکٹر گلوور کی اسکیم پر اگر کہیں عمل ہو سکتا ہے تو صرف سوویٹ روس میں اس لئے کہ وہاں کی حکومت کے مدنظر کسی ایک طبقہ کا فائدہ نہیں بلکہ عوام کا۔ اس لئے کہ وہاں کے لوگوں نے سرمایہ داری نظام سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے اور اشتراکی حکومت قائم کر دی ہے جس میں ذرائع پیداوار پر افراد کا قبضہ نہیں ہے بلکہ قوم کا۔

---

[1] "انسان ہونے کے خطرات" ۱۵۶ء (Dangers of Being Human)

میرا اس بحث سے تعلیم و تربیت، پند و نصائح کی اہمیت کو کم کرنا نہیں صرف مقصد یہ
ہے کہ میں دنیا کے معاشی نظام کو سب سے بنیادی سوال سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے اسی
کا حل ضروری ہے۔ اس کے بعد اور چیزوں کا۔ اگر معاشی نظام بدل دیا جائے تو پھر تعلیم و تربیت
پر کافی زور دیا جاسکتا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال نیکی کے لئے تلقین
ذرا بے معنی ہوتی ہے اس لئے کہ اس پر عمل مشکل ہے یہ کہنا کہ "چوری مت کرو" تو بہت آسان
ہے لیکن کیا اس پر وہ آدمی عمل کرسکتا ہے جس کو دو یا تین دن سے کھانا نہ ملا ہو اور جس کے
بیوی اور ننھے ننھے بچے بھوک کی وجہ سے تلملا رہے ہوں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ کچھ
دن ہوئے انگلستان میں ایک بھوکی عورت نان بائی کی دوکان سے ایک روٹی چراتی ہو
پکڑی گئی۔ گورنمنٹ نے بجائے اس کے کہ اس کو نوکری دلائی ہوتی قید کی سزا دی۔ یہ کوئی تعجب
کی بات نہیں یہ تو تمام سرمایہ داری حکومتوں کے طریقے ہیں ہم یہ نہیں سمجھتے کہ جرائم پیشگی کی بنیاد
ہمارے معاشی نظام میں ہے، اگر اس کو بدل دیا جائے تو جرائم بھی دور ہو جائیں گے۔ بجائے
اس کے کہ لوگوں سے کہا جائے کہ چوری مت کرو، جھوٹ مت بولو وغیرہ وغیرہ۔ ہم کو چاہئے
کہ ایسی صورتیں پیدا کردیں، ایسا نظام قائم کریں کہ برائی کرنے کی ترغیب ہی نہ رہے یعنی اگر
لوگوں کا افلاس دور کردیا جائے تو جرائم کی تعداد میں بہت کثرت سے کمی ہوسکتی ہے۔
درست ہے کہ جرائم دماغی خرابیوں کی وجہ سے بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ دماغی خرابی بھی
ہمارے موجودہ سماج کا ایک نتیجہ ہے۔ ایک نئے قسم کا ماحول اور ایک نئے قسم کی تعلیم کے ذ
سے جرائم کے نفسیاتی اسباب بھی دور کئے جاسکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے قبل ہمارے سماجی نظام کی تشکیل صرف ذا
ملکیت ہی کی بنیاد پر ہوسکتی تھی اس وجہ سے کہ اس وقت کی پیدائشی قوتیں غیر ترقی شدہ اور کم
تھیں۔ سوسائٹی کی بقا کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ دو طبقوں میں منقسم رہے۔ ایک طبقہ ایسا
جو محض پیدائشی کا کام کرے اور اتنا وافر سامان پیدا کرے کہ دوسرے طبقہ کو اس کی تلاش

معاش کے افکار سے نجات دے تاکہ یہ حکومت کے انتظام میں اور علوم و فنون کی ترقی کے لئے اپنا وقت صرف کرے۔ یہ تقسیم کار اٹھارھویں صدی کے قبل ضروری تھا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ جن گروہوں نے اس اصول کے خلاف کوشش کی کہ ذاتی ملکیت کو اڑا دیں اور معاشی مساوات قائم کریں وہ ناکامیاب رہے۔ اس لئے کہ ایسے نظام کے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سوسائٹی کا ہر فرد پیدائشی کام میں مشغول رہتا تب کہیں سب کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن پھر حکومت کا کام کون کرتا۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو جو انسان کی دماغی زندگی کے لئے وہی اہمیت رکھتے ہیں جیسے کھانا اور پینا اس کی جسمانی زندگی کے لئے کون ترقی دیتا۔ ان حالات میں سماج کا کام ایک دن بھی ٹھیک سے نہیں چل سکتا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد حالات بالکل مختلف ہو گئے چنانچہ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن اصولوں پر ڈیڑھ سو برس پہلے عمل محض خواب و خیال تھا اب اس پر عمل نہ صرف دائرہ امکان میں آ گیا ہے بلکہ اگر ان اصولوں کو اختیار نہ کیا جائے گا تو موجودہ سوسائٹی تباہ و برباد ہو جائے گی

پیدائشی قوتیں اب اتنی ترقی کر گئی ہیں کہ پرانے تقسیم کار کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ فی زمانہ اس کی ضرورت نہیں کہ سوسائٹی دو طبقوں میں منقسم رہے۔ اب اگر سب لوگ چند گھنٹے روزانہ پیدائشی کام میں اپنا وقت صرف کریں تو نہ صرف اتنا وافر سامان پیدا ہو سکتا ہے کہ سب کی ضروریات پوری ہو جائیں بلکہ سب کو اتنا موقع اور وقت مل سکتا ہے کہ وہ حکومت کے کام میں اور علم و فن کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ باوجود ان باتوں کے دنیا کا بیشتر حصہ ابھی پرانے اصول پر منظم ہے یعنی ذاتی ملکیت پر۔ چند اشخاص کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے ایک کثیر اکثریت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ صرف پیدائشی قوتوں کی ترقی رکی ہوئی ہے بلکہ وہ تیزی کے ساتھ تنزل کی طرف جا رہی ہیں۔ بے روزگاری، مستقل کساد بازاری، افلاس اور خطرہ جنگ اس کے لئے صاف دلالت کرتی ہیں۔

دنیا میں صرف ایک ملک ہے جس نے اپنے معاشرتی نظام کی عمارت اس بے بہا بنیاد
پر کھڑی کر لی ہے جس میں ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ ہے نہ کہ افراد کا۔ وہ ملک سویٹ روس ہے
جب سے سویٹ روس نے ذاتی ملکیت کو اڑا دیا وہ ترقی کے مدارج تیزی کے ساتھ طے کر رہا ہے
ان حالات کو دیکھ کر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسان اتنا خوش اور بہتر ہو جائے گا
جتنا کہ وہ اپنی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا بیس برس کے قلیل معیار میں جو ترقیاں وہاں ہوئی ہیں، وہ
مغربی یورپ کی صدیوں کی تہذیب اور تمدن کو شرمانے کے لئے ابھی سے کافی ہیں۔ فرانس اور
انگلستان کے مدبرین ایک عرصہ سے بے روزگاری کے سوال کو حل کرنے کے لئے کوشش
کر رہے ہیں لیکن ابھی تک نہ کوئی کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ اس کے کوئی آثار نظر آتے ہیں
البتہ جرمنی نے بے روزگاری دور کر دی ہے لیکن ود تباہ کن طریقہ اختیار کر کے یعنی مزدوروں کی
اجرت کم کر کے اور ان کو اسلحہ جنگ کی فیکٹریوں میں نوکری دلا کر برخلاف اس کے روس میں مزدوروں
کی اجرت برابر بڑھ رہی ہے اور مزدور اس کام پر نہیں مامور ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کی آزادی
چھیننے کے لئے سامان جنگ تیار کریں، بلکہ ان کی تمام قوتیں ان کی ضروریات زندگی کی چیزیں بنانے
میں صرف ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں لوگوں کا معیار زندگی برابر بڑھ رہا ہے اور مزدور
اتنے خوش و مطمئن نظر آتے ہیں جتنے کہ دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہیں۔ ان کو روزانہ زیادہ سے
زیادہ آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، یہ محض اس لئے کہ وہ اپنا باقی وقت مختلف دلچسپیوں میں
صرف کریں۔ ان کے بچوں کے لئے اسکول اور پرورش گاہیں ہیں جہاں وہ بہت اہتمام اور
آرام کے ساتھ رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ شہروں کی گلیوں میں جب کہ ان کے ماں باپ کام
میں مشغول ہوں کس مپرسی کی حالت میں آوارہ گردی نہ کریں۔ چنانچہ اس وقت ماسکو
(Moscow) جیسے بڑے شہر میں میلے کچیلے بچے گلیوں میں کھیلتے ہوئے مشکل سے
دکھلائی دیں گے۔ سویٹ روس نے عورتوں کے مرتبہ کو بھی بہت بلند کر دیا ہے۔ دنیا کی
تاریخ میں عورت کو سب سے پہلے اسی ملک میں آزادی نصیب ہوئی ہے۔ ان کو وہی حقوق

حاصل ہو گئے ہیں جو کہ مردوں کو۔ ان کو مرد کے برابر اجرت ملتی ہے ہر آدمی کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ لڑکے کی ماں (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کی اپنی کمائی کے چوتھائی حصہ سے کفالت کرے چاہے وہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرے یا نہ کرے۔ حاملہ عورتوں کو چار ماہ کی پوری تنخواہ پر چھٹی مل جاتی ہے اور یہ معیار ڈاکٹر کی رائے سے بڑھ سکتا ہے عصمت فروشی قریب قریب بالکل کم ہوگئی ہے۔ انقلاب سے پہلے زار کے (Czar) زمانے میں تقریباً بیس ہزار رنڈیاں ماسکو میں تھیں لیکن اب صرف چار سو رہ گئی ہیں اور یہ تعداد بھی ملک کی معاشی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ باقی نہ رہیگی۔

سویٹ حکومت عوام کی محض جسمانی نشو و نما کو ضروری نہیں سمجھتی بلکہ ساتھ ساتھ ان کی دماغی اور روحانی زندگی کو بھی بہتر بنانا اپنا فرض جانتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے پہلے حکومت وقت تعلیمی معاملات میں نہ صرف دلچسپی ہی نہیں لیتی تھی بلکہ تعلیم عامہ کی مخالف تھی اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں میں سیاسی شعور اور کسی قسم کی بیداری پیدا ہو۔ لیکن جب سے بالشویک پارٹی برسر اقتدار ہوئی ہے، ملک میں تیزی کے ساتھ تعلیمی ترقی جاری ہے۔ تاتاریوں اور مغلوں کی زبانوں کے حروف جو کہ پہلے ملاؤں اور پادریوں کا اجارہ تھے اور ان کا سیکھنا دشوار تھا اب آسان کر دئے گئے ہیں تاکہ عوام ان کو آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں۔ بہت سی زبانوں کے پاس نہ کوئی حروف تھے اور نہ کوئی خط چنانچہ حکومت نے بڑے بڑے ادیب مقرر کئے، جنھوں نے محنت اور مشقت کر کے ان زبانوں کے لئے نئے حروف ایجاد کئے۔ مزدوروں اور کسانوں کے پڑھنے کے لئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ فیکٹریوں میں کتب خانے قائم ہیں اور ملک میں تقریباً سات عرب کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں جس میں مختلف اقوام کے بڑے بڑے پرانے ادیب اور فلسفیوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔

اقلیتوں کے مسئلہ میں بھی روس نے جرأت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں غیر رواداری اور قومی تعصب کا چرچہ ہو رہا ہے لیکن روس ہی ایسا ملک ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اقلیتوں کا سوال تقریباً بالکل حل ہوگیا۔ نہ صرف روسی حکومت

اقلیتوں کی اقتصادی زندگی کی ترقی کی ذمہ دار بن گئی بلکہ اس نے ان کی تہذیب، زبان اور ان کے روایات کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کا بھی ذمہ لے لیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں سویٹ جمہوریت میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے اور جہاں مغربی یورپ کے باشندوں پر افسردگی، بے اطمینانی اور بے بسی کے آثار چھائے ہوئے ہیں وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جوش بھروسہ اور استقلال موجیں مار رہا ہے اس لئے کہ یہ ان کا ایمان ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

اس بیان سے یہ نہ اخذ کرنا چاہیے کہ ذرائع پیداوار کو افراد کے چنگل سے نکال کر قوم کے سپرد کرنے کے بعد سویٹ روس کے سامنے اب کوئی سوال نہیں ہے۔ اصل میں ابھی تو بڑے بڑے مرحلے سر کرنا ہیں لیکن میرا جو اس بحث سے مقصد ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی بنیادی اور مستقل تبدیلی محض تلقین اور وعظ سے نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذرائع پیداوار کو افراد کے تصرف سے نکال کر قوم کے حوالے کریں اس کے بعد پھر پند و نصائح مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور تعلیم و تربیت سچے معنوں میں کی جا سکتی ہے۔

فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل)

(بہ سلسلۂ سابق)

درصل عربی زبان کیا ہے | دنیا کی اکثر زبانیں خواہ وہ تورانی کی شاخیں ہوں یا آریائی کی کچھ نہ کچھ سامی زبانوں سے متاثر ضرور ہوئی ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ سامی تمام زبانوں میں الفاظ کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد جزیرۃ العرب میں بولی جانے والی دوسری زبانیں اس میں جذب ہوگئیں۔ علاوہ بریں اس کا دامن علمی خزانوں سے مالا مال ہے۔

علماء لغت کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ سامی زبانوں میں کون کس کی شاخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ سامی کی بڑی بڑی اصلیں عبرانی سریانی اور عربی اب تک زندہ ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسری کی شاخ نہیں ہے۔ لیکن یہ تینوں ایک اصل کی شاخیں ضرور ہیں جس کو دوآبہ میں بسنے والے سامی بولتے تھے مگر امتداد زمانہ سے فنا ہوگئی جن لوگوں نے طوفان کے بعد دوآبہ کی درمیانی سرزمین کو آباد کیا توریت انکو ارض شنعار کے بسنے والے سے تعبیر کرتی ہے۔ اقتضار زمانہ سے اس قوم کے فرقے منتشر ہونا شروع ہوئے اور ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلتے چلے گئے جن کی ضروریات زندگی کے مطابق زبانوں میں ارتقا ہوتا رہا۔ ان مہاجرین میں سے بعض لوگ شام کے ساحلی مقامات پر آباد ہوگئے ان کی زبان جو عبرانی کی ایک شاخ ہے فینیقی کے نام سے موسوم ہوئی بعض لوگ عراق عرب میں جا بسے۔ ان کی زبان آشوری کہلاتی تھی جس کی شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ کچھ لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کی سکونت اختیار کی، ان کی زبان ترقی کرکے عربی کہلائی جس کی شاخیں حبشی، حمیری، عدنانی۔ اور قریشی تھیں

مؤخر الذکر وہ زبان ہے جس میں کلام پاک نازل ہوا اور جس کو ابھی تک عربی بولنے والی قومیں بطور تحریری زبان کے استعمال کرتی ہیں۔

مذکورۂ بالا سامی زبانیں ایک ہی مرتبہ میں نہیں پیدا ہوئیں بلکہ ضرورتوں کے مطابق تبدریج ارتقار طبعی کے مدارج طے کرتی رہیں۔ ان زبانوں کو سامی سے علیحدہ ہوئے جس وقت تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا اس وقت آپس میں ایک دوسری سے بہت مشابہ تھیں۔ وہ تمام عربی قبائل جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب مصر، شام، عراق اور بلاد مغرب میں آباد ہیں عربی بولتے ہیں لیکن ایک گروہ دوسرے گروہوں سے جتنا دور ہے اسی تناسب سے اس کی زبان اور دوسروں کی زبان میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف ان سب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کلام پاک نہ ہوتا تو ہر شاخ اپنی جگہ ایک مستقل زبان ہو جاتی اور جس کو دوسری شاخیں بولنے والے سمجھ بھی نہ سکتے جیسا لاطینی زبان کی فرعون (فرانسیسی، ہسپینی، پرتگالی وغیرہ) میں ہوا لیکن عربی بولنے والے قبائل اپنی اپنی زبانوں کی حفاظت کلام پاک کے نمونہ پر کرتے ہیں اور تحریری زبان میں اس کی اتباع کرتے ہیں جو سب فرعون کو ایک اصل پر جمع کئے ہوئے ہے (تھوڑا بہت اختلاف بازاری اور عامیانہ زبانوں میں پایا جاتا ہے)

زمانہ قدیم میں جب سام کی نسل منتشر ہوئی اس وقت ان کے پاس کوئی لغت مدون نہ تھی اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا جو سب فرعون کو جمع کئے رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتضا ر زمانہ نے طبعی طور پر اپنا اثر دکھایا کہ ان کی زبانیں شاخ در شاخ ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ کچھ صدیاں گذرنے پر ہر فرع ایک مستقل زبان بن گئی اور دوسری شاخوں سے مختلف ہو گئی۔ تاہم اگر کوئی شخص چاہے تو اصول و قواعد کی یکسانی جیسے وسائل اس کو مل جائیں گے جن سے وہ اصل تک پہنچ سکتا ہے عربی اور سریانی کی گردانوں اور الفاظ و معانی میں اتنی زبردست مشابہت ہے کہ ان کی اصل ایک ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر عہد قدیم کے سفرنامے پڑھے جائیں تو یہی معلوم ہوگا کہ پرانے زمانہ میں یہ سب زبانیں

ایک جیسی تھیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا زمانہ آگیا اور وہ چالیس سال تک دشت سینا اور جزیرہ نمائے عرب میں رہے۔ باوجودیکہ ان کی زبان عبرانی تھی مگر جب عربوں سے ملتے تھے تو ایک دوسرے کی زبان بلا امداد ترجمان سمجھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً اسی واقعہ کو لیجئے کہ ملکۂ سبا جو عرب کے ایک حصہ کی فرمانروا تھیں، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام شاہ بنی اسرائیل کی ملاقات کے لئے سنہ۔ ا ق۔م۔ میں گئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملیں تو دونوں نے بغیر مترجموں کے گفتگو کی۔ ایسے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک سامی زبان کی شاخیں ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ غالباً ان کی اصل سے علیحدگی اور استقلال کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔

آریائی اور طورانی کی شاخوں پر سامی زبانوں کے اثرات طورانی ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ خلافت عباسیہ ترکوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنکر رہ گئی تھی وہ جس خلیفہ کو چاہتے معزول یا قتل کر دیتے اور جس کو چاہتے خلیفہ منتخب کر لیتے۔ باوجود اس سیاسی اقتدار کے جو انھیں خلافت پر خاص دار السلام بغداد میں حاصل تھا اپنی زبان کو عربی اثرات سے نہ بچا سکے۔ ترکی زبان عربی سے خوب متاثر ہوئی اکثر وبیشتر ترکی الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ عربی الفاظ نے لے لی۔ ترکوں نے عربی رسم الخط اختیار کر لیا تھا جو مصطفےٰ کمال مرحوم کے ابتدائی دور تک رائج رہا لیکن مرحوم نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو ترک کر کے لاطینی رسم الخط کو رواج دیا۔

مخلوط ـــــ ہندوستان میں خلجیوں کے عہد حکومت تک عربی کو بڑا عروج حاصل تھا حتیٰ کہ تعلیم یافتہ طبقہ کسی دوسری زبان میں خط کتابت کرنا بھی معیوب سمجھتا تھا اور فارسی عامیانہ بازاری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ اس عہد کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لے لی تاہم مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا وقار قائم رہا۔ اب اردو جو ارتقائی حالت میں تھی فارسی کے مقابلہ پر عامیانہ زبان تسلیم کی گئی۔ باوجودیکہ اردو کی پیدائش اور نشو و نما ہندوستان ہی میں ہوئی پھر بھی آریائی زبان سے اتنی متاثر نہیں معلوم ہوتی جس قدر سامی سے ہے۔

دوسری متاثر ہونے والی زبانوں (جیسے ترکی فارسی وغیرہ) نے صرف الفاظ کی تبدیلی تک عربی کا اثر قبول کیا۔ ترکیبوں کا اس اثر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اردو زبان کے الفاظ اور ترکیبیں دونوں عربی سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ الفاظ کچھ تو اپنی اصلی حالت پر باقی رہے اور کچھ میں تلفظ کا ہلکا سا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اول الذکر کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ جیسے "ہوا" "آدمی" "لباس" "توجہ" "جاہل" "صحبت" "حکم" "صورت" "سلام" اور "منصب" وغیرہ۔ مؤخرالذکر کی کچھ مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں۔

عربی (درار) دہلی (درے) روہیلکھنڈ (اتے) ـــــ عربی (قفل) لکھنؤ (قلف) حیدرآباد و مدراس (خفل) عامیانہ (کلف)۔ کلیھ) ـــ عربی (جنزیر) شہری اردو (زنجیر) عامیانہ (جنجیر) ـــ عربی (وقت) دہلی و لکھنؤ (وقت) پنجاب (وکت) حیدرآباد (دخت) عامیانہ (وکھت)

ترکیبوں پر عربی اثرات کے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) الف و لام کا استعمال صرف سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اردو میں ہم کو ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں الف و لام فارسی اور ہندی الفاظ پر داخل ہوا جیسے۔ قریب المرگ، جوان العمر فوق البھڑک وغیرہ۔ اس میں مرگ خالص فارسی اور بھڑک ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں۔

(۲) "و۔ن" اور "ی۔ن" بڑھا کر جمع بنانا عربی کے خصوصیات میں سے ہے مگر اردو میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جیسے کھال کی جمع "کھالوں۔ کھالیں" سڑک کی جمع سڑکوں۔ سڑکیں ـ میز کی جمع میزوں۔ میزیں ـ بوتل کی جمع بوتلوں۔ بوتلیں وغیرہ۔ (عربی میں "ن" کھلی ہوئی آواز دیتا ہے، اردو میں غنہ ہو جاتا ہے اور حروف علت "و۔ی" مجہول ہو جاتے ہیں۔)

(۳) "ا۔ت" آخر میں لگا کر عربی کی جمع مؤنث سالم جیسی جمع بنائی جاتی ہے مثلاً۔ بیگمات کھنڈرات۔ باغات وغیرہ۔

(۴) الف یا ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں حرف جار عربی کی طرح اپنا اثر کرتے ہیں جیسے "لوٹا۔ یا آملہ" ان پر جب حرف جار داخل ہوگا تو "ا" یا "ہ" یائے مجہول سے بدل جائیں گے

اور طویل کسرہ کی صورت پیدا ہو گی ۔ لوٹے پر ۔ لوٹے میں ۔ لوٹے سے ۔ لوٹے تک ۔ آملے سے آملے پر ۔ آملے میں ۔ آملے تک ۔ یہی صورت حالت اضافت میں بھی عربی کی طرح برقرار رہے گی لوٹے کی ٹونٹی ۔ آملے کا مرتبہ ۔

(۵) تنوین کا استعمال بھی عربی ہی سے ماخوذ ہے جیسے ۔ اندازاً ۔ نمونتہً وغیرہ ۔

(۶) آریائی زبانوں کی گردانوں میں تذکیر و تانیث کے لئے الگ الگ صیغے نہیں پائے جا۔ تے" اور آمد" مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے یکساں مستعمل ہے ۔ بعض شاخوں میں صرف واحد مذکر غائب اور واحد مؤنث غائب میں تفریق کرنے کے لئے مذکر اور مؤنث کی ضمیریں بشرطیکہ موجود ہوں لگا دی جاتی ہیں جیسے "He came" اور "She came" لیکن اردو میں عربی اثرات کے ماتحت مذکر اور مؤنث کے صیغے الگ الگ موجود ہیں جیسے ۔

	ماضی معروف	حال معروف	مستقبل معروف	ماضی مجہول	حال مجہول	مستقبل مجہول	اسم فاعل	اسم مفعول
واحد مذکر غائب	وہ لایا	وہ لاتا ہے	وہ لائے گا	وہ لایا گیا	وہ لایا جاتا ہے	وہ لایا جائے گا	لانے والا	لایا ہوا
واحد مؤنث غائب	وہ لائی	وہ لاتی ہے	وہ لائے گی	وہ لائی گئی	وہ لائی جاتی ہے	وہ لائی جائیگی	لانے والی	لائی ہوئی
جمع مذکر غائب	وہ لائے	وہ لاتے ہیں	وہ لائیں گے	وہ لائے گئے	وہ لائے جاتے ہیں	وہ لائے جائیں گے	لانے والے	لائے ہوئے
جمع مؤنث غائب	وہ لائیں	وہ لاتی ہیں	وہ لائیں گی	وہ لائی گئیں	وہ لائی جاتی ہیں	وہ لائی جائیں گی	لانے والیاں	لائی ہوئیں
واحد مذکر حاضر	تو لایا	تو لاتا ہے	تو لائے گا	تو لایا گیا	تو لایا جاتا ہے	تو لایا جائے گا	تو لانے والا	تو لایا ہوا
واحد مؤنث حاضر	تو لائی	تو لاتی ہے	تو لائے گی	تو لائی گئی	تو لائی جاتی ہے	تو لائی جائیگی	تو لانے والی	تو لائی ہوئی
جمع مذکر حاضر	تم لائے	تم لاتے ہو	تم لاؤ گے	تم لائے گئے	تم لائے جاتے ہو	تم لائے جاؤ گے	تم لانے والے	تم لائے ہوئے
جمع مؤنث حاضر	تم لائیں	تم لاتی ہو	تم لاؤ گی	تم لائی گئیں	تم لائی جاتی ہو	تم لائی جاؤ گی	تم لانے والیاں	تم لائی ہوئیں
واحد مذکر متکلم	میں لایا	میں لاتا ہوں	میں لاؤں گا	میں لایا گیا	میں لایا جاتا ہوں	میں لایا جاؤں گا	میں لانے والا	میں لایا ہوا
واحد مؤنث متکلم	میں لائی	میں لاتی ہوں	میں لاؤنگی	میں لائی گئی	میں لائی جاتی ہوں	میں لائی جاؤنگی	میں لانے والی	میں لائی ہوئی

...مذکر متکلم	ہم لائے	ہم لاتے ہیں	ہم لائیں گے	ہم لائے گئے	ہم لائے جاتے ہیں	ہم لائے جائیں گے	ہم لانے والے	ہم لائے ہوئے
...مؤنث متکلم	ہم لائیں	ہم لاتی ہیں	ہم لائیں گی	ہم لائی گئیں	ہم لائی جاتی ہیں	ہم لائی جائیں گی	ہم لانے والیاں	ہم لائی ہوئیں

صیغوں میں تذکیر و تانیث کا فرق سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے۔

آریائی ——— فتح ایران کے بعد مشرقی آریائی زبانوں میں فارسی جس حد تک عربی سے متاثر
...ئی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی ترکوں کی طرح عربی رسم الخط
...تیار کرلیا۔ موجودہ فارسی لغت میں تقریباً نصف الفاظ عربی کے ہیں جن میں سے کچھ الفاظ فارسی
...ں کھپ گئے جیسے طلبیدن۔ اور فہمیدن وغیرہ، اور کچھ اپنی اصلی حالت پر قائم ہے جن کی مثالیں
...رت سے ملتی ہیں جیسے خطا۔ صواب۔ جنت۔ ساقی۔ انس۔ عشق۔ حسن۔ سجادہ۔ خال۔ اسیر وغیرہ
...پہلے دور کی فارسی شاعری میں عربی بھی برابر کی شریک تھی بسا اوقات ایک مصرعہ فارسی
...ا اور دوسرا عربی میں ہوتا تھا مثلاً حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

...لا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا — کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا
...وری گر ہمیں خواہی از و غائب مشو حافظ — متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و امہلہا
...نا لخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند — اشہی لنا و احلی من قبلۃ العذارٰی
...ر بتفنار از کف محبوبہ ام آمد بدست — قلتہا ذا قیل قالت اشرب قد کفاک
یا قرۃ العین طاہرہ کے اشعار ہیں
...آں صنم زرہ ستم پے کشتن من بگینہ — لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضی
...رے نگار ستمگرم قدمے نہاد ببسترم — فاذا رأیت جمالہ طلع الصباح کأنما
...سنید نالہ مرگ من پے ساز من شدہ برگ من — نشکی علیہ مجدلاً و بکی علیہ مجلجلا

مغربی آریائی یا یورپی زبانیں تقریباً سب کی سب سامی لغات سے کم و بیش متاثر ہیں۔
...یسی اور اطالوی زبانوں نے مفتوح ہونے کی وجہ سے عربی کے اثرات قبول کرلئے (مسلمانوں
...نے فتح اسپین کے بعد فرانس پر حملہ کرکے تقریباً نصف حصہ ملک پر قبضہ کرلیا تھا جو بعد میں ان کے

ہاتھ سے نکل گیا۔ صقلیہ (سسلی) کی وجہ سے اٹلی کی زبان عربی سے متاثر ہوئی) انگلستان کے محل وقوع کے لحاظ سے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریزی کسی سامی زبان سے متاثر ہو سکے گی لیکن واقعات نے بتا دیا کہ وہ بھی سامی زبانوں کے عالمگیر اثرات سے نہ بچ سکی۔ عربی الفاظ اسپین سے فرانس میں ہو کر یا اٹلی سے جرمنی میں ہوتے ہوئے انگریزی زبان میں داخل ہو گئے یا حروب صلیبیہ کے دوران میں براہ راست انگریزی نے اخذ کئے (معرکہ ہائے صلیبی کے دوران میں ایک مشترک زبان بن گئی تھی جس کو دونوں فریق اظہار ما فی الضمیر کے لئے استعمال کرتے تھے۔) یورپ کی کل آبادی بجز چند بت پرست جرمن قبائل کے مذہب عیسوی کے پیرو تھی۔ اسی بنا پر ان کی مذہبی اصطلاحیں اور گذشتہ پیغمبروں کے نام عبرانی سے لئے گئے، جن کے تلفظ میں آلات نطق کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر فرق ہو گیا۔ (واضح رہے کہ عربی اور عبرانی تلفظ میں کہیں کہیں برائے نام فرق پایا جاتا ہے) مثلاً۔

اردو	عربی تلفظ	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
ابراہیم	ابراہیم	Abraham	
آمین	آمین	Amen	
فرشتۂ موت	عزرائیل	Azrael	
آدم ؑ	آدم ؑ	Aadam	
ایک بت کا نام	بعل	Baal	حضرت الیاس کے زمانہ میں آشوری اور سوری قومیں اس کو پوجتی تھیں اس کا قدیم عبرانی تلفظ "بیت ایل" یعنی خانہ خدا ہے
بیت لحم	بیت اللحم	Bethlehem	
اونٹ	جمل	Camel	
الیاس ؑ	الیاس ؑ	Elijah	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں "ایلیاہ" لیکن اصل لفظ الیاس ہے
حوّا ؑ	حوّا ؑ	Eve	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی تلفظ	اردو
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (اضحاق)	Isaac	اسحاقؑ	اسحاقؑ
	Israelite	اسرائیلی	بنی اسرائیل
	Jacob	یعقوبؑ	یعقوبؑ
	Jesus	عیسیٰؑ	عیسیٰؑ
	Job	ایوبؑ	ایوبؑ
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (یوحنا)	Jehn	یحییٰؑ	یحییٰؑ
	Jordan	اردن۔ یردن	ایک دریا
	Joseph	یوسفؑ	یوسفؑ
	Magi	مجوس	آتش پرست
	Mennu	من (وسلویٰ)	من وسلویٰ
	Mary	مریمؑ	مریمؑ
	Mike	میکالی	میکائیلؑ
	Moses	موسیٰؑ	موسیٰؑ
حضرت عیسیٰؑ ہجرت کرکے ناصرہ تشریف لے گئے تھے اس لیے آپ بھی ناصری کہلائے	Nazarene	نصرانی۔ ناصری	شہر ناصرہ کا باشندہ
	Noha	نوحؑ	نوحؑ
	Paradise	فردوس	فردوس
	Pharoh	فرعون	شاہ مصر فرعون
یہودیوں میں دو بڑے فرقے ہیں "فریسی" اور "صدوقی"	Phariseo	فریسی	یہودیوں کا ایک فرقہ
	Sabbath	سبت	سنیچر

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی تلفظ	اردو
یہودیوں کا دوسرا فرقہ۔	Sadducee	صدوقی	صدوقی
	Samuel	اسماعیلؑ	اسماعیلؑ
	Sarah	سارہؑ	سارہؑ
	Satan	شیطان	شیطان
	Sept	سبط	نسل۔ پوتے
اس شہر کی ملکہ بلقیس سے حضرت سلیمانؑ نے نکاح کیا	Sheba	سبا	یمن کا ایک شہر
	Solomon	سلیمانؑ	سلیمانؑ
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (زکریاہ)	Zechariah	زکریاؑ	زکریاؑ
	Jerusalem	یروشلم	یروشلم

نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یورپ میں جہالت پورے شباب پر تھی۔ مذہبی خانقاہوں سے جو پادریوں اور اسقفوں کے ہاتھ میں تھیں درس گاہوں کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ ایسے مدارس یورپ کے بڑے بڑے ممالک میں پائے جاتے تھے۔ فلسفہ و حکمت کی تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ فلسفہ کی کتابوں پر راہبوں نے قبضہ کر کے جابجا مذہبی کتب خانہ میں تقفل کر دی تھیں۔ کسی کو ان کے مطالعہ کرنے یا نقل لینے کی اجازت نہ تھی۔ (اگر کہیں ان علوم کا کوئی ماہر نظر آتا تو یا وہ اندلس کے اسلامی مدارس کا تعلیم یافتہ ہوتا یا جنوبی اٹلی کے مدرسہ کا جو مسلمانان سسلی کی کوشش سے قائم ہوا تھا) مسیحی مدارس میں صرف لاطینی اور یونانی زبانیں سکھائی جاتیں جن کی صرف و نحو میں طلبہ کی عمر کا بیش قیمت حصہ برباد کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ ان زبانوں میں کسی قدر ترقی کر لیتے تو دینیات کی طرف متوجہ کر دیئے جاتے جس کی تعلیم کا اصول زبور توریت اور انجیلیں تھیں۔ منتہی طلبہ کو چند دیگر کتب روایات اور غیر مقبول اور مشتبہ انجیلیں بھی پڑھائی جاتیں تو اپاکریفہ کے نام سے مشہور تھیں

علاوہ بریں کلیسا کی پرانی تاریخیں، گذشتہ ولیوں کی سوانح عمریاں، مذہبی کونسلوں کی مفصل اور مشرح رپورٹیں بھی نصاب میں داخل تھیں۔ یہی علوم تھے جن کو لاطینی اور یونانی زبانوں میں ان کی پیچیدہ صرف و نحو کے ساتھ طلبہ پڑھا کرتے تھے۔ اس نصاب نے مدرسوں کی یہ حالت بنا رکھی تھی کہ نیچے درجوں کے طلبہ لاطینی اور یونانی کی صرفی گردانیں بلا چلا کے ازبر کرتے اور اوپر کے منتہی طلبہ آپس میں الہیات پر مباحثہ کرتے جو کبھی کبھی مکابرہ بلکہ مجادلہ اور مقاتلہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ان کو ممانعت تھی کہ سوا ان مباحث کے کسی عقلی مبحث کی طرف توجہ نہ کریں۔

یہ تھا یورپ کی جہالت کا پورا نقشہ۔ اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی بدولت یورپ نے علوم میں خاصی ترقی کرلی یورپی قومیں عربوں کی حسب ذیل علوم میں شاگرد ہیں علم الادویہ علم ریاضی ہیئت طبیعیات فلسفہ اور طب وغیرہ یہ علوم اسپین سے وسط یورپ ہو کر تمام یورپی ممالک میں پھیلے یورپ کی زبانوں میں ابھی تک مذکورہ علوم کی اصطلاحیں عربی ہی کی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے لئے انگریزی کو لیجیے جو بہ نسبت دیگر یورپی زبانوں کے عربی سے بہت دور واقع ہوئی ہے۔

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Alchemy	الکیمیا	کیمیا (علم الادویہ)
	Alcohol	الکحول	الکوہل (جوہر شراب)
	Alembice	الانبیق	قرع انبیق
زرنیخ تین رنگ کا ہوتا ہے۔ سفید جس کو سم الفار یا سنکھیا کہتے ہیں	Algebra	(علم) الجبر	جبر و مقابلہ
زرد کو ہرتال اور سرخ کو سنگ سلیمانی کہتے ہیں۔	Arsenic	زرنیخ	ہرتال
			سنکھیا
ستاروں کی معلومات حاصل کرنے کا آلہ۔			سلیمانی
	Astorlabe	اصطرلاب	اسطرلاب
	Carat	قیراط	قیراط (ایک وزن)

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
صفر	صفر	Sypher	
پہلو دار	کعب	Cube	اس میں حروف مقدم موخر ہوگئے ہیں
درجہ	درجہ	Degree	یہ وزن بارہ قیراط کے برابر ہے
درم (ایک وزن)	درہم۔ درہام	Dram	
مقناطیس	مغناطیس	Magnet	کچھ حروف کم ہوگئے
بیضاوی شکل	اہلیلجی	Oval	〃
فلسفہ (حکمت)	فلسفہ	Philosophy	
پھوڑا	دمل	Tumour	

عرب تاجروں کے قافلے اکثر سرزمین مغرب میں سامان تجارت لے جایا کرتے تھے جس میں زیادہ تر مشرقی مصنوعات اور پیداواریں ہوتی تھیں جیسے حلب کے بنے ہوئے مشہور آیئنے کشمیری زعفران اور مصری چاول۔ اس قسم کی تمام چیزوں کے نام انگریزی میں عربی سے ماخوذ ہیں اگرچہ بعض الفاظ میں کسی قدر تغیر ہوگیا ہے (کیونکہ وہ فرانسیسی یا اطالوی کی وساطت سے انگریزی تک پہنچے) لیکن تلفظ کی رعایت کرکے ان کی اصلیت معلوم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عنبر	عنبر	Amber	
انیسون	انیسون	Anise	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عرق	عرق	Arrack	
بلساں	بلساں	Balsam	اس کا تیل اکثر امراض میں مفید ہوتا ہے۔
کافور	کافور	Camphir	
قہوہ۔ کافی	قہوہ	Coffee	یمن کی خاص پیداوار ہے۔ اس کے تلفظ میں کچھ فرق ہو گیا ہے۔
زیرہ	کموں	Cummin	
پوستین	فروہ	Fur	
یشب	یشب۔ یصب	Jasper	اس کے آخر میں (R) زیادہ ہو گیا۔
مصطگی رومی	مصطکاء	Mastic	
کان	معدن	Mine	اس میں حرف کی کمی ہو گئی۔
آئینہ	مرآۃ	Mirror	عربی میں رویت سے اسم آلہ ہے
مشک	مسک	Musk	
کوکابیلی	نیلوفر۔ نینوفر	Nenuphar	
عطر	عطر	Odorous Otto Or Otto	
مرچ	فلفل		
پستہ	فستق	Pistachio	
چانول	ارز۔ رز	Rise	
زعفران	زعفران	Saffran	
تل	سمسم	Sasame	
جو چیزیں پی جائیں	شربت	Sherbat	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
صابن	صابون	Soap	
شربت (میٹھا)	شراب	Syrup	
املی	تمر ہندی	Tamarind	
ایک قسم کی گھانس	طرخون	Tarragon	اس گھانس کی جڑ عاقر قرحا کہلاتی ہے۔

یورپ سے خوش اعتقاد زائرین بیت المقدس آیا کرتے تھے اور جن نئی چیزوں سے ان کو واسطہ پڑتا ان کے نام انھیں یاد ہو جاتے اور سفرنامہ بیان کرتے وقت وہی عربی الفاظ اپنے تلفظ میں ادا کرتے جو رفتہ رفتہ ان کی زبانوں کے جزو بن گئے۔ مثلاً۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عرب	عرب	Arabia	
بدّو	بدوی	Badouin	
قاضی	قاضی	Cadi	
خلیفہ	خلیفہ	Caliph	
خطّہ - اقلیم	اقلیم	Clime	
گنبد	قبّہ	Cope	
جن	جنّی	Genii	
آدم خور دیو غول بیابانی	غول	Ghoul	
سرائے	خان	Khan	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
ایک حرف (L) زیادہ ہوگیا۔	Kraal	قریہ	قریہ۔ گاؤں
	Minaret	منارہ	مینار
تلفظ میں کسی قدر فرق ہوگیا۔	Mosque	مسجد	مسجد
	Track	طریق	راستہ

کارزار صلیبی اس لڑائی (Crusade) کو کہتے ہیں جو پانچویں صدی ہجری سے چھٹی صدی تک بیت المقدس کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہوتی ہیں۔ اس لڑائی میں سارے یورپ نے سنبھل سنبھل کر اور اپنی تمام قوت یک جا کرکے لاکھوں کے گروہ سرزمین شام میں بھیجے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ مسلمان کامیاب رہے۔ یورپ نے اس عرصہ میں شام پر نو حملے کئے۔ اسی اثنا میں ایک زبان، لنگو فرینکا، مشرقی اور مغربی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوگئی تھی۔

جنگ صلیبی کی اس طویل مدت میں لنگو فرینکا کی وجہ سے اکثر عربی الفاظ یورپی زبانوں میں جذب ہوگئے جن کی یورپی فہرست درج کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر تھوڑے سے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Alkali	القلی	بھونتا
	All	ال	الف لام استغراقی
	Ally	سلیف	حلیف

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
اس میں ایک حرف کی کمی ہوگی۔	Azure	ازرق	نیلگوں
			آسمانی رنگ
	Albeit	البتہ	البتہ
			تسپر بھی
	Breuet	براۃ	چھوٹنا
			عیب سے بیزاری
	Bug	بق	بھنگا
			پشہ
	Bugle	بوق	بگل
	Camisol	قمیص	قمیص۔ کرتہ
	Candle	قندیل	چراغ۔ قندیل
	Capote	قباء	لبادہ
	Castle	قصر	شاہی محل
	Cat	قط	بلی
	Cause	قضیہ	قضیہ، مقدمہ
	Corrode	قرض	قرض
	Cotton	قطن	روئی
	Cribble	غربال	چھلنی
	Cup	کوب	کنڈے دار پیالہ

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
زمین	ارض	Earth	
فرق کرنے والا	فارق	Forky	
جوش ہیجان	فورہ	Fury	
جنس قسم	جنس	Genus	
کھر۔ سم	حافر	Hoof	
بیمار	علیل	Ill	
چنبیلی	یاسمین	Jasmine Jessamine	
پتیلی	قدر	Kettle	
مار ڈالنا	قتل	Kill	
نیبو	لیموں	Lemon	
نرمی	لینۃ	Lenity	
خوش ذائقہ	لذیذ	Luscious	
غلام	مملوک	Mameluke	
پوشیدہ	مستتر	Misterious	
بزرگ	نبیل	Noble	
گردن	عنق	Neck	"ع" کا تلفظ یورپ والے نہیں کرسکتے۔
گدی	نقار	Occiput	
شکار	فریسہ	Prey	
چھوڑ دینا، انکار کرنا	رفض	Refuse	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
تلوار	سیف	Sabre	
اژدھا۔ زہریلا سانپ	ثعبان	Serpent	
زنجیر آہنی	سلسلہ	Shackle	
کشتی۔ جہاز	سفینہ	Ship	
ڈوبنا	غرق	Shipwreck	انگریزی کا لفظ عربی کے دو الفاظ سفینۃ غرقت سے مرکب
آواز	صوت	Sound	ہے کثرت استعمال سے درمیانی حروف غائب ہوگئے۔
اصطبل۔ طویلہ	اصطبل	Stable	اصطبل شامی عربوں کی زبان کا لفظ ہے۔
سلطان	سلطان	Sultan	
آدھا ٹکڑا	شطر	Sunder	
نقارہ طبل	طبل	Tabour	
دراز قد۔ لانبا	طویل	Tall	
گیہوں کوٹنا	درس	Thrash	
دھمکانا	تہدید	Threat	

فلسفۂ تحریر

لکھائی کی ایجاد کا قدرتی طریقہ | ہر چیز اس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جائے۔ ضرورت پڑنے پر انسان قوائے دماغی کو کام میں لا کر ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جن سے اپنی حاجت روائی میں آسانیاں حاصل کر سکے۔ اگر آگ سے پیدا ہونے والی تمام اختراعات

کی تلاش کریں جن کی ابتدا زمانۂ تاریخ سے بھی پہلے کی ہے تو آج نہایت آسانی سے ریڈیو کی لہروں تک پہنچ جائیں گے جو گھر گھر رائج ہے۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" جس نے کہا بالکل سچ کہا۔

زبانوں کی ایجاد کو ہزارہا قرن گذر گئے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر صرف آوازوں میں ادا کرسکتا تھا۔ جب اس کی نسل بڑھی اور پھیلی حتی کہ لوگوں نے کسب معیشت کے لئے سفر اختیار کیا تو اب ان کو اپنے وطن میں خبریں پہنچانے کی، یاد میں پیش آنے والے واقعات کو محفوظ کرنے کی ضرورت پیش آئی جس کی بنا پر انھوں نے نقوش اور تصاویر سے اس طرح کام لینے کی ابتدا کی۔

دور بربریت کے انسان بھی زینت و آرائش کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جن جانوروں کا وہ شکار کرتے یا جن حیوانات و نباتات کی پرستش کرتے، ان کی تصاویر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلے یہ تصویریں بچوں کی بنائی ہوئی تصاویر کی طرح بھدّی اور بھونڈی ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مہارت بڑھتی گئی۔ وہ ہڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر انسانوں اور جانوروں کی شکلیں بنا کر اپنے رہنے کے غاروں کو سجاتے تھے اور غاروں کے در و دیوار پر معمولی نقاشی بھی کر لیتے تھے۔ (اس کا رواج ابھی تک ہندوستان کے اکثر مکانوں میں پایا جاتا ہے جن کے دروازوں پر دیوتاؤں اور جانوروں کی تصویریں منقوش یا کندہ ہوتی ہیں) جب معاشرت نے زیادہ ترقی کی اور لوگ خاندانوں اور قبیلوں پر تقسیم ہوگئے تو قبائل کے سرداران تصویر دار ہڈیوں اور سینگوں کو ایک دوسرے کے پاس بطور تحفہ بھیجنے لگے کچھ عرصے کے بعد یہ تصاویر بجائے ہدیہ کے نامہ و پیام کا ذریعہ بن گئیں۔ گویا کہ اس وقت تک تصویروں پر تین دور گذر چکے تھے، پہلے دور میں وہ صرف زیبائش کی چیزیں تھیں، دوسرے دور میں بطور تحفہ و ہدیہ استعمال ہونے لگیں اور تیسرے دور میں نامۂ و پیام کے کام آئیں۔

ہم عہد اوّل کے انسانی قبائل میں سے ایک قبیلہ فرض کرتے ہیں جس کے افراد پھلوں اور حیوانوں کے شکار سے اپنی خوراک حاصل کیا کرتے تھے اور غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے

ان کے قبیلہ میں کوئی تاریخی یا اہم واقعہ پیش آگیا مثلاً شیر نے حملہ کرکے ان کے سردار کو پچھاڑ کھایا، اس واقعہ کو وہ محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا صورت اختیار کی جائے جس سے واقعہ محفوظ رہ سکے۔ آپ کے خیال میں کوئی صورت سوا تصویر کشی کے آ ہی نہیں سکتی خواہ وہ نقش کی صورت میں ہو یا ان کے حالات کے مطابق کسی چیز پر کھدائی کی صورت میں۔ اب وہ ایک تصویر بنائیں گے جس میں شیر اپنے پنجوں سے آدمی کو نوچ رہا ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری تصویر ہوگی۔ یہ پہلا قدم ہے جو انسان نے لکھائی کی طرف بڑھایا۔ اس دور کو ہم ذاتی تصویر کشی کا دور کہیں گے کیونکہ اس زمانہ میں صرف ایسے ہی حادثے محفوظ کئے جا سکتے ہیں جن میں صورت کشی ممکن ہو۔

بعض مفہوم ایسے بھی پائے جاتے تھے جن کی کوئی خارجی شکل نہیں ہے جیسے محبت عداوت۔ یا آج۔ کل۔ صبح۔ شام وغیرہ جو محض معنی ہی معنی ہیں۔ ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے کچھ اشاروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو مقرر کر لئے گئے، جیسے محبت کے لئے کبوتر۔ عداوت کے لئے سانپ۔ دن کے لئے دائرے کے اوپری حصہ میں سورج وغیرہ وغیرہ۔ ہم کچھ ایسے آدمی فرض کرتے ہیں جو کسی قبیلہ پر تین دن کی مسافت طے کرکے حملہ کرنے کے لئے رات میں ساحل پر اترے۔ سردار قبیلہ موجود نہیں تھا اس کے لڑکے نے اسے اطلاع دینا چاہی مگر بجز اس کے کوئی ذریعہ نہیں اختیار کر سکتا کہ مندرجہ ذیل تصویر بنا کر باپ کے پاس بھیج دے۔
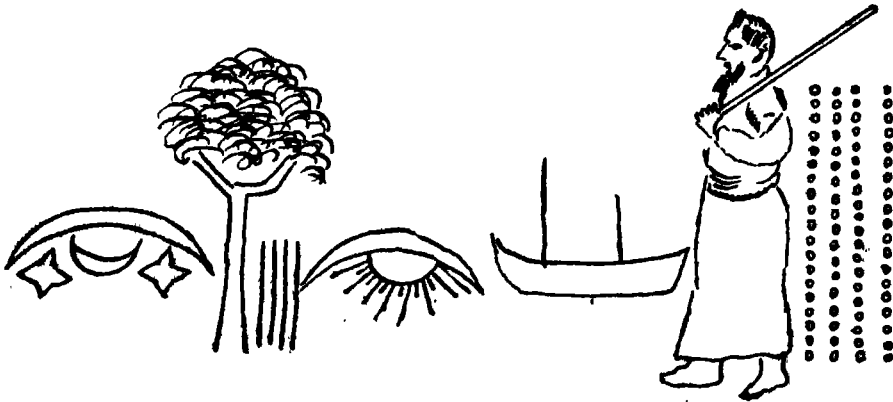
تصویر میں نقطوں سے کثرت ظاہر کی گئی ہے۔ مسلح آدمی سے دشمن مراد ہے کشتی سے سمجھا جائے گا کہ وہ لوگ بحری راستے سے آئے۔ قوس میں سورج کی تصویر دن کا وقت بتاتی ہے تین لکیروں سے تین کا عدد سمجھا جائے گا۔ درخت خشکی کی علامت ہے اور قوس سے جس میں چاند اور تاروں کی شکل بنی ہوئی ہے رات مراد ہے۔

یہ لکھائی کی طرف دوسرا قدم ہے اس میں اشارات مقرر کر کے تصویریں بنائی گئی ہیں جو بہرحال مفہوم ادا کرنے میں ذاتی صورت کشی سے کہیں زیادہ بہتر اور کارگر ثابت ہوئیں۔ اس دور کو ہم "رمزی تصویر کشی کا دور" کہیں گے جس میں انسان کی بیشتر تعبیری ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

ایک عرصۂ دراز گذرنے پر لوگوں نے تصویر کے مفہوم کا حرف اول مع اعراب مراد لینا شروع کیا جیسے دشمن کی تصویر سے پہلا حرف (د مضموم) مراد لیا یا کشتی کی تصویر سے (ک مکسور) اور شاخ کی تصویر سے (ش۔ مفتوح) وغیرہ۔ لکھائی کی ایجاد کا یہ تیسرا قدم تھا اور بہت ہی اہم کیونکہ شکلوں کے مفہوم سے پہلا حرف مع اعراب مراد لیا جانا اس بات کی ابتدا تھی کہ مفرد آوازوں کی شکلیں الگ الگ مقرر ہو جائیں۔ اس دور کو ہم "آوازوں کی شکلوں کے دور" سے تعبیر کریں گے۔

مختلف چیزوں کی تصویریں بنا لینا کوئی آسان کام نہ تھا علاوہ بریں اس طرح کی لکھائی میں پھیلاؤ بہت ہو جاتا تھا۔ کچھ تو انسان کا ہاتھ طبعی طور پر سرعت اور تیزی کی طرف مائل ہے تاکہ جلدی جلدی مختلف شکلیں بن سکیں، اور کچھ وقت کی بچت کے خیال سے مسلح دشمن کی شکل ایسی بننے لگی جو تصویر تو نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن اس سے ملتی جلتی چیز تھی پھر اس میں بھی اتنی تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں کہ اس کی اصلی شکل کا پتہ چلنا دشوار ہو گیا۔

اب وہ وقت آیا کہ انسان کو الگ الگ اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بجائے اس کی کہ وہ کسی شکل سے ایسی آواز مراد لے جس میں حرف کے ساتھ ساتھ حرکت بھی ہو ایسی آوازیں مراد لینے لگا جو صرف حرف تھیں اور اعراب کے لئے دوسری علامتیں مقرر کر لیں۔ پہلے جس شکل

سے (د پیش۔ دُ) سمجھا جاتا تھا اب اس سے فقط حرف (د) سمجھا جانے لگا اور اعراب کے لئے دیگر علامات کا اضافہ کر لیا گیا اس طرح آسانی بھی ہوئی اور وقت کی بچت بھی۔ یہ تھا دور ہجائی۔

لکھائی کو عہد اول سے ابتک چار دوروں سے گذرنا پڑا۔

(پہلا) ذاتی تصویر کشی کا دور۔ اس میں تصویریں صرف مرئیات ہی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس کی بنا پر فقط موٹے موٹے واقعات محفوظ کئے جا سکتے تھے۔

(دوسرا) رمزی تصویر کشی کا دور۔ اس کو ذاتی تصویر کشی پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ رمزی تصویریں ایسے معنوی مفہوم بھی بتاتی ہیں جن کی کوئی خارجی شکل موجود نہیں ہے۔ اس دور میں انسان اکثر وہ چیزیں قلم بند کر سکتا تھا جو اس کے ذہن میں مختلف معنوی مفہوموں کے متعلق گذرتی تھیں۔ لیکن اس صورت میں ہزارہا شکلیں بنائی جاتی تھیں اور خاصی زحمت ہوتی تھی (چینی رسم الخط دوسرے اور تیسرے دور کے درمیانی زمانہ کی یادگار ہے، جس میں اشکال حروف کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔)

(تیسرا) آواز کی شکلوں کا دور۔ اس میں منقوش تصویر اپنے نام کا پہلا حرف مع اعراب بتاتی تھی جو کتابت کی ایجاد میں سب سے بڑا اور اہم قدم ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے دونوں میں مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے ہزاروں شکلوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا جو اس دور میں گھٹ کر سینکڑوں پر محدود ہو گئیں۔

(چوتھا) دور ہجائی۔ اس میں ان شکلوں نے حروف کی صورت اختیار کر لی۔ حروف تہجی منضبط ہو جانے کی وجہ سے شکلوں کی تعداد دھائیوں تک پہنچ گی۔

اس کے بعد بھی دو دور مزید گذرے چوتھے دور تک حروف الگ الگ لکھے جاتے تھے (جیسے اب تک یورپی زبانوں کے طباعتی حروف ہیں۔ ان میں حروف کو ترتیب دے کر الفاظ بنانے کے بعد دو لفظوں میں فرق کرنے کے لئے تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تامل تلنگی اور عبرانی وغیرہ در حقیقت اس چوتھے دور کی یادگار ہیں۔) اس صورت میں بسا اوقات الفا

ایک دوسرے میں مخلوط ہو کر صاف سمجھ میں نہیں آتے تھے لہذا ضرورت ہوئی کہ حروف کو ایک دوسرے میں جوڑ کر ایک لفظ بنایا جائے پھر دوسرا پھر تیسرا تاکہ ہر لفظ دوسرے سے ممتاز اور علیحدہ رہے۔ اس جوڑائی کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ انگریزی تحریری رسم الخط میں ایک حرف کی پشت دوسرے حرف کے سرے سے جوڑ دی جاتی ہے سریانی میں بھی یہی صورت ہے۔ ہندی میں ایک لفظ پورا کرنے کے لئے حروف علت اور ماترے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ لکھائی کا پانچواں دور ہے۔

یہاں تک تو آریائی اور سامی لکھائیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ آگے بڑھ کر عربی رسم الخط اور اس کی شاخوں پر چھٹا دور گذرتا ہے۔ ابھی تک پورے پورے حروف جوڑ دئے جاتے تھے لیکن مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر حرفوں کے صرف ابتدائی حصے ایک دوسرے میں جوڑے جانے لگے اور لفظ کے خاتے پر پورا حرف جوڑ دیا گیا۔ اکثر آریائی خطوط بائیں سے داہنے کو اور سامی خطوط داہنے سے بائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ اگر داہنے ہاتھ میں قلم ہو تو طبعًا ہاتھ کی کشش بائیں سے داہنے کو ہوگی جس کی وجہ سے آسانی بھی ہوگی اور وقت بھی کم خرچ ہوگا۔ برخلاف اس کے داہنے سے بائیں کو قلم ٹھیلا جاتا ہے جس میں کسی قدر دقت بھی ہوتی ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ حروف کے سرے جوڑ کر الفاظ بنا لئے جائیں تاکہ جگہ اور وقت کی بچت ہو سکے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ قدیم عربی رسم الخط محض اٹکل پر پڑھا جاتا تھا کیونکہ اس میں نقطہ دار اور بے نقطہ حروف میں کوئی امتیاز نہ تھا اس بنا پر خیال کیا گیا کہ اسلام مختلف بلاد عجم میں پھیل چکا ہے جہاں لوگ عربی سے ناواقف ہیں اور بہت ممکن ہے کہ کلام پاک کی تلاوت میں غلطیاں رائج ہو جائیں لہذا اعراب اور نقطے ایجاد ہوئے، خط صاف اور واضح اور خوب صورت بنایا گیا۔ (اس سے پہلے اعراب کا کام حروف علت سے لیا جاتا تھا لیکن اعراب معروف اور اعراب مجہول میں کوئی فرق ممکن نہ تھا اس لئے زیر زبر پیش کی شکلیں مقرر کی گئیں،

رسم الخط میں یہ اصلاح حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں ہوئی اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری میں علامۂ سجاوندی نے آیت، وقف مطلق، اور وقف لازم وغیرہ کی علامتیں مدون کیں۔ یہ تھا خط نسخ، جو اب تک رائج ہے۔ اس میں معمولی تغیر کے بعد فارسی اور ترکی رسم الخط بن گئے۔ اگرچہ ان تینوں خطوں میں جزئی اختلاف ہے لیکن ایک کا جاننے والا بتیہ دونوں کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

ان رسوم خطوط کی تاریخ جو اب تک مستعمل ہیں | مندرجہ بالا بیان سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ لکھائی نے ابتدا سے اب تک کس طرح تدریجی ترقی کی۔ اب ہم اس کی تائید میں تاریخی واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عہد اول کے انسان نے کیسے خطوط سے کام لیا جو موجودہ خطوط کی پیدائش کا سبب ہیں۔

انسان نے عہد اول سے اب تک جن خطوط سے کام لیا ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے مگر ان میں کے اکثر خط اب متروک ہو چکے ہیں۔ ہم اس بحث میں آسانی پیدا کرنے کے لئے لکھائی کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) اصلی خطوط (۲) فرعی خطوط۔

(اصلی) یہ وہ قسم ہے جس کو قدیم متمدن قومیں کام میں لاتی تھیں۔ اس کی ابھی تک چار ہی شاخیں مل سکی ہیں۔

(۱) خط ہیروگلیفی (Hieroglyphic) (۲) خط میخی (۳) خط حبشی (۴) خط چینی۔ ان میں سے تقریباً ہر خط نے الگ الگ نشو و نما پائی اور ذاتی تصویر کشی کے دور سے ترقی کرتا رہا لیکن دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان ٹھہر گیا۔

(فرعی) وہ خطوط ہیں جو اصلی سے نکلے ہیں اور اب تک ان کا بیشتر حصہ زندہ یا مردہ پایا جاتا ہے۔ ان کا بیان آگے آئے گا۔

(۱) خط ہیروگلیفی۔ خطوط اصلیہ میں یہ سب سے اہم ہے اور عام طور پر یہی گمان کیا جاتا ہے کہ دنیا کے اکثر مشہور و معروف خطوط اسی سے پیدا ہوئے۔ یہ دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان زمانہ کا خط ہے۔ اس کی بعض شکلیں اپنے ذاتی معنی دیتی ہیں، بعض رمزی معنی اور بعض ابتدائی حروف کی

آئیڈیو گرام۔ مجازی معنی سے وہ معنی مراد ہیں جو کسی چیز کی تصویر سے اس کے لفظ پر دلالت کریں۔ ایسی تصویریں تمام اصلی خطوط میں مشابہ ہیں۔ رمزی تصویروں میں ہر قوم کی اصطلاحیں الگ الگ ہیں مثلاً مصریوں نے ان تصویروں سے حسب ذیل اشارے مقرر کر رکھے تھے۔
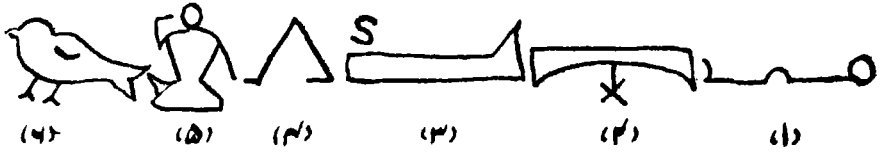
شکل (۱) سے نفی یا بربادی سمجھی جائے گی۔ شکل (۲) جس میں ستارہ لٹک رہا ہے اندھیرے پر دلالت کرے گی۔ شکل (۳) سے مراد قوت اور طاقت ہے۔ شکل (۴) جس میں دو پاؤں چلتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، حرکت کا مفہوم پیدا کرتی ہے۔ شکل (۵) میں ایک آدمی اپنے ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس سے کوئی بھی ایسا کام سمجھا جا سکتا ہے جو منہ سے متعلق ہو جیسے کھانا پینا یا بولنا۔ شکل (۶) ایک چھوٹی چڑیا کی تصویر ہے جس سے بدی مراد لی جاتی ہے۔ ہیروگلیفی حروف کی شکلیں (جو دوسرے دور تک پہنچ چکی تھیں) ذیل میں مع تفسیر درج کی جاتی ہیں۔ (بائیں سے داہنی طرف کو پڑھنا چاہیئے۔)
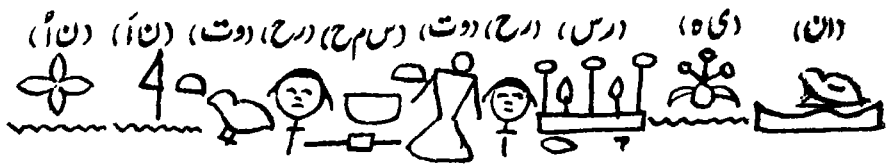
عرصۂ دراز تک مصری اسی رسم الخط کو استعمال کرتے رہے۔ اس سے دو خط 'ہیراتی' اور "ڈیموطیقی" بھی پیدا ہو گئے تھے جن سے وہ لوگ اسی کے ساتھ ساتھ کام لیتے رہے۔ ہیروگلیفی مذہبی پیشواؤں میں محدود تھا جو تیسری صدی عیسوی تک کام میں لایا گیا۔ ہیراتی ہیروگلیفی ہی کی ترقی یافتہ شکل تھی جس کے حروف تیزی سے لکھے جا سکتے تھے خط ڈیموطیقی ہیراتی کے بعد کی پیداوار ہے جو حروف ہجی کے لگ بھگ پہنچ گیا تھا۔ یہ خطوط مصر میں اس وقت تک مستعمل رہے جب تک کہ قبطیوں نے ان کو پرانے یونانی حروف سے نہیں بدل دیا۔ بعض ایسے ڈیموطیقی حروف بھی قبطی رسم الخط میں کام آ گئے جن کا مثل قدیم یونانی حروف میں موجود نہ تھا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہیروگلیفی رسم الخط دنیا کے اکثر مشہور خطوں کی اصل ہے۔ گمان غالب ہے کہ فینیقیوں نے یہ خط مصر سے لے کر تمام عالم میں پھیلا دیا فینیقی شام کے ساحلی مقامات پر تاریخی زمانوں سے پیشتر آباد تھے اور فراعنۂ مصر کے ہمعصر تھے۔ یہ سب سے پہلی قوم ہے جو عیسوی جنتری کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے کشتی رانی سے واقف ہوئی اور ملکوں ملکوں مال تجارت لئے پھری۔ اس نے ہیروگلیفی خط کو نشو ونما دے کر حروف ہجی پیدا کئے اور تمام روئے زمین پر پھیلا دئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قرنہا قرن پیشتر یونانیوں کلدانیوں اور یہودیوں وغیرہ نے اپنی فینیقیوں سے لکھنا سیکھا۔ بعد میں اس خط سے ایسی شاخیں پیدا ہوتی چلی گئیں جو اب تک دنیائے تمدن میں مستعمل ہیں۔

یہ رسم الخط فینیقیوں کا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ انھوں نے مصریوں سے سیکھ کر اس میں اچھائیاں ضرور پیدا کر دی تھیں۔ وہ تجارتی سلسلہ میں مصر آیا جایا کرتے تھے۔ مصریوں سے تجارتی معاملات قائم رکھنے کے لئے ان کو لکھائی سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تب انھوں نے ہیروگلیفی اور ہیراتی کی کچھ شکلیں جیسی مصریوں میں مستعمل تھیں لے کر ان کی بناوٹ میں سہولیت استعمال کے لئے کسی قدر تغیر کر دیا۔ یونہی ہوتے ہوتے کچھ عرصہ کے بعد ان کے پاس ۲۲ شکلیں جمع ہو گئیں جن میں ہر ایک سے وہ اپنی زبان کے ایک ایک حرف کا کام لینے لگے اور اس کا نام وہی رہنے دیا

جس کی وہ تصویر تھی۔ (۲۲ حروف حسب ذیل تھے ا۔ب ۔ج۔د۔ہ۔و۔ز۔ح۔ط۔ی۔ک۔ل م۔ن۔س۔ع۔ف۔ص۔ق۔ر۔ش۔ت۔) مثلاً بیل کی تصویر ( ) جس سے مصری لوگ بیل ہی مراد لیتے تھے اور اس کو اپنی زبان میں آوا کہتے تھے، فینیقیوں نے بیل کے سر سے ملتی جلتی ایک شکل ( ) بنائی جس کا نام (الف) یعنی بیل رکھا اور اس سے الف کا پہلا حرف (ا) مراد لیا۔ مصری ایک شکل گھر کی سی بنائی تھے ( ) اور اس کو اپنی زبان میں (با) کہتے تھے جس کے معنی ہیں گھر فینیقیوں نے سہولت کے لئے اس سے ملتی جلتی ایک شکل بنائی ( ) جس کا نام 'بیتھ' رکھا (جس کے معنی ہیں 'گھر' یا 'خیمہ' عربی میں بیت صرف گھر کے معنی میں مستعمل ہے) اور اس کا حرف اوّل (ب) مراد لیا مصری (ج) کے لئے اونٹ کی شکل ( ) استعمال کرتے تھے فینیقیوں نے اس کی شکل ( ) آسان بنا کر جمل (عربی جمل = اونٹ) نام رکھا اور حرف اوّل (ج) مراد لیا۔ اسی طرح دندانے دار شین کی خط ہیروگلیفی میں یہ شکل ہو ( ) جس میں اگے ہوئے درخت (شجر) بنائے گئے ہیں۔ انہی پر باقی حروف کو قیاس کر لینا چاہئے فینیقی لوگ حروف کا اقتباس کر کے اپنا لیتے تھے اور جس چیز کی شکل ہوتی، اسی کا نام رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی زبان کے کل حروف جمع کر لئے اور فینیقی ابجد عالم وجود میں آ گئی جس کے حرفوں کے نام ان کی شکلوں پر دلالت کرتے ہیں جیسے۔

جدول ابجد اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

فینیقیوں نے ۱۵۰۰ ق۔م۔ میں اہل یونان کو لکھنا سکھایا اور فینیقی حروف کسی قدر تغیر کے ساتھ یونانی میں رائج ہو گئے۔ عراق کے دوآبہ میں جا کر اشوریوں کو بھی سکھایا جو اس سے پہلے خط میخی استعمال کرتے تھے لیکن چونکہ فینیقی حروف کے استعمال میں زیادہ آسانی تھی لہذا انھوں نے خط میخی اس کے مقابلہ میں بالکل ترک کر دیا کیونکہ اس میں ہر لفظ کے لئے ایک علیحدہ شکل تھی اور پڑھنے والوں کو ہزاروں الفاظ کی جداگانہ شکلیں یاد رکھنا پڑتی تھیں یہ چینی رسم الخط میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔

یونانی سے رومی گاتھک یونانی جدید اور سلانی وغیرہ رسم الخط پیدا ہوئے جو اب تک یورپ اور امریکہ میں مستعمل ہیں۔ قبطی بھی یونانی ہی کی شاخ تھی جو اب مردہ ہو چکی۔

(یورپی حروف کی جدول صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ ہو)

آرامی یا کلدانی سے تمام مشرقی خطوط جیسے عبرانی مربع سطرنجیلی، نبطی اور ہندی پیدا ہوئے۔ سطرنجیلی کی شاخیں سریانی اور کوفی ہیں۔ نبطی سے عربی خط پیدا ہوا۔ ہندی کی شاخیں بنگالی اور گجراتی وغیرہ ہیں۔ فینیقی سے براہ راست قدیم عبرانی قبرسی اور قرطجنی خطوط نکلے۔ قدیم عبرانی سے سامری حروف پیدا ہوئے۔ مذکورہ بالا خطوط میں سے اکثر اب مردہ ہو چکے ہیں۔

(تیسری جدول صفحہ ۳۳ و ۳۴ پر ملاحظہ ہو)

آرامی تمام مشرقی خطوط کی اصل ہے جو ابتدا میں در حقیقت فینیقی حروف تھے جن میں اختلاف پڑتے پڑتے اصل سے دوری ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ بعض حروف اوپر سے کھل گئے اور بعض بند ہو گئے، جس کی مثال حسب ذیل ہے۔

ییتبا زی قرب معنن بر عمرن لسلم بیلحا

لحا نخشہ

سامری حروف	یونانی حروف	فینیقی حروف	عربی حروف	یونانی حروف کے نام	ان کے معنی	فینیقی حروف کے نام	عربی حروف کے نام
[illegible]	A	[illegible]	ا	الفا	تیل	الف	الف
9	B	9	ب	بیٹا	خیمہ یا گھر	بیٹھ	بار
[illegible]	Λ	Λ	ج	جملا	اونٹ	جیمل	جیم

عربی حروف کے نام	فینیقی حروف کے نام	ان کے معنی	یونانی حروف کے نام	عربی حروف	فینیقی حروف	یونانی حروف	سامری حروف
دال	دالتھ	دروازہ	ڈلٹا	د	𐤃	Δ	ࠃ
ہا	ھ	؟	ای	ہ	𐤄	Ε	ࠄ
واؤ	واؤ	گرز	او	و	𐤅	Υ	ࠅ
زا	زین	ہتھیار	؟	ز	𐤆	Ι	ࠆ
حا	حیتھ	دیوار	ایتا	ح	𐤇	Η	ࠇ
طا	طیط	سانپ	سیتا	ط	𐤈	Θ	ࠈ
یا	یود	ہاتھ	یوتا	ی	𐤉	ς	ࠉ
کاف	کاف	رکاوٹ	کپّا	ك	𐤊	Κ	ࠊ
لام	لامدہ	چھونا	لامدھا	ل	𐤋	Λ	ࠋ
میم	میم	پانی	می	م	𐤌	Μ	ࠌ
نون	نون	مچھلی	نی	ن	𐤍	Ν	ࠍ
سین	سامک	ستون خانہ	سگما	س	𐤎	Σ	ࠎ
عین	عین	آنکھ	؟	ع	𐤏	⊙	ࠏ
فا	فا	منھ	پی	ف	𐤐	ς	ࠐ
صاد	صادی	——	زیٹا	ص	𐤑	Ϟ	ࠑ
قاف	قوف	کان	——	ق	𐤒	Φ	ࠒ
را	ریش	سر	رو	ر	𐤓	Ρ	ࠓ
شین	شین	دانت	——	ش	𐤔	Σ	ࠔ
تا	تاو	نشانی	ٹاؤ	ت	𐤕	Τ	ࠕ

یورپی حرفوں کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
اے	A	A	A	A
بی	B	B	B	B
سی	C	C	C	C
ڈی	D	D	D	D
ای	E	E	E	E
ایف	F	F	F	F
جی	G	G	G	G
ایچ	H	H	H	H
آئی	I	I	I	I
جے	J	—	—	J
کے	K	K	K	K
ایل	L	L	L	L
ایم	M	M	M	M
این	N	N	N	N
او	O	O	O	O

یورپی حروف کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
پی	P	P	P	P
کیو	Q	Q	Q	Q
آر	R	R	R	R
ایس	S	S	S	S
ٹی	T	T	T	T
یو	U	U	U	U
وی	V	V	V	V
ڈبلو	W	W	W	W
ایکس	X	X	X	X
وائی	Y	Y	Y	Y
زیڈ	Z	Z	Z	Z

نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حروف کے نام	تامل حروف
۱	ا	𐡀 - 𐡀	𐢀	𐢁	ܐ - ܐ	א	اَ	அ
۲	ب	𐡁	𐢂	𐢃	ܒ	ב	آ	ஆ
۳	ج	?	?	?	?	ג	اِ	இ

تامل حروف	تامل حروف کے نام	عبرانی حروف	سریانی حروف	جدید نبطی حروف	قدیم نبطی حروف	آرامی حروف	عربی حروف	نمبر شمار
ஈ	ای	ד	ܕ	٦	(-	?	د	۴
உ	اُ	ה	ܗ	?	(ח	7	ه	۵
ஊ	او	ו	ܘ	4	?	?	و	۶
எ	اِ	ז	ܙ	?	?	2	ز	۷
ஏ	اے	ח	ܚ	ɩ	ח	7	ح	۸
ஐ	ای	?	ܛ	?	?	?	ط	۹
ஒ	اُ	י	ܝ	ح	ہ-h	2	ی	۱۰
ஓ	اُو	ך-כ	ܟ-ܟ	?	?	?	ك	۱۱
ஔ	او	ל	ܠ-ܠ	ل	ﻟ	ㄥ-ㄦ	ل	۱۲
ஃ	اِک	ם-מ	ܡ-ܡ	?	ܡ	ｙ-ｙ	م	۱۳
க	کا-گا	ן-נ	ܢ-ܢ	U	ر-ر	1-ㄣ	ن	۱۴
ஞ	نیا	ש	ܣ	?	V	ᴧ	س	۱۵
ச	سا-چا	ע	ܥ	ﻻ	ﻻ	ں	ع	۱۶
ங	نیا	פ	ܦ	?	ف	?	ف	۱۷
ட	ٹا-ڈا	צ	?	?	?	?	ص	۱۸
ண	نا	ק	ܩ	ρ	?	Þ	ق	۱۹
த	تا	ר	ܪ	^	ˉ	ㄣ	ر	۲۰
ந	نا	ש	ܫ	?	V	21	ش	۲۱
ப	با-پا	ת	ܬ	?	n	ꝑ	ت	۲۲

نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حروف کے نام	تامل حروف
۲۳	ث	—	—	—	ܬ	ת	ما	ம
۲۴	خ	—	—	—	ܟ	כ	یا	ய
۲۵	ذ	—	—	—	ܕ	ד	را	ர
۲۶	غ	—	—	—	ܓ	—	لآ	ல
							وا	வ
۲۷	پ	—	—	—	ܦ	פ	ڑا	ழ
۲۸	گ	—	—	—	ܓ	—	لا	ள
							را	ற
۲۹	ض	—	—	—	—	—	نا	ன
۳۰	ظ	—	—	—	—	—		
۳۱	ٹ	—	—	—	—	—		
۳۲	چ	—	—	—	—	—		
۳۳	ڈ	—	—	—	—	—		
۳۴	ز	—	—	—	—	—		
۳۵	ژ	—	—	—	—	—		

ان حروف کا بعد میں اضافہ ہوا ......

ان زبانوں میں یہ حروف بالکل نہیں پائے جاتے

ہندی حروف کے نام	ہندی حروف	ہندی حروف کے نام	ہندی حروف	ہندی حروف کے نام	ہندی حروف
اَ	अ - अ	ٹا	ट	شا	श
آ	आ - आ	ٹھا	ठ	کشا (کھا)	ष

ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف
اِ	इ	ترَ	ञ	وا	व
اِی	ई	ٹا	ट	سا	स
اُ	उ	ٹھا	ठ	ہا	ह
اُو	ऊ	ڈا	ड		
اِے	ए	ڈھا	ढ		
اَے	ऐ	ڑاں	ण		
اُو	ओ	تا	त		
اَو	औ	تھا	थ		
اَن	अं	دا	द		
اَہ	अः	دھا	ध		
کا	क	نا	न		
کھا	ख	پا	प		
گا	ग	پھا	फ		
گھا	घ	با	ब		
ڑاں	ङ	بھا	भ		
چا	च	ما	म		
چھا	छ	یا	य		
جا	ज	را	र		
جھا	झ	لا	ल		

ہیروگلیفی	فینیقی	یونانی
(آوا) بیل	(الف) بیل	(الفا)
ہیروگلیفی میں بیل کا پورا چہرہ بنا کر (آوا) کا پہلا حرف (آ) مراد لیا جاتا ہے۔	اس کی شکل ایک مثلث نما کی سی رہ گئی جس کو وسط سے کاٹ کر بائیں کا مثلث منہ اور داہنی طرف کی شاخیں سینگ فرض کی گئیں یہ بیل کی تصویر بگڑ کر پہلی حرفی شکل تیار ہوئی	فینیقی شکل کو اس طرح گھمایا گیا کہ دونوں سینگ نیچے آ گئے اور منہ اوپر ہو گیا۔ یہ یورپی زبانوں کے حرف (اے) کی ابتدا ہے
سامری	قدیم انگریزی	رومی
	(اے)	(اے)
اس میں درمیان سے خط قاطع غائب ہو گیا۔	یونانی شکل سامری حرف کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر قدیم انگریزی (اے) کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔	(اے) کی سہل نگاری کے لیے ایک طاوی شخص نے یہ شکل وضع کی جو خوبصورت ہونے کے علاوہ سہل بھی ہے اور اب تک اکثر یورپی خطوط میں رائج ہے۔
عبرانی	جرمنی	تامل
(آلیف) بیل		(اَ)
یہ شکل بھی کافی حد تک سامری حرف کی خوب صورتی سے متاثر ہوئی۔ سامری حرف میں داہنی طرف دو شاخیں ہیں اور اس میں ایک۔	یونانی حرف (الفا) کا منہ اوپر سے کھل گیا اور خوب صورتی پیدا کرنے کے لئے عبرانی حرف (آلیف) کی اتباع کی گئی۔	جرمنی حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ عبرانی سے بھی۔

ہندی	آرامی	نبطی قدیم
अ (اَ)		
براہ راست تامل حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ جرمنی اور عبرانی سے بھی۔	آرامی میں یہ دونو شکلیں رائج تھیں۔	بیل کے سر (مثلث) پر صرف ایک لکیر سینگوں کی یادگار باقی رہ گئی۔

نبطی جدید	عربی	سریانی
	ا	ابتدائی — ابتدائی
اس میں مثلث بھی مٹ گیا لیکن نیچے کی لکیر سے مثلث کی کچھ یادگار سی رہ گئی۔	اس میں نبطی جدید کے حرف کی اوپری لکیر بالکل سیدھی ہوگئی (ہندی میں آ ممدود بھی یوں ہی سیدھا "آ" بنتا ہے۔ جیسے आ میں ہے)	یہ عربی الف کی طرح لمبائی میں لکھا جاتا ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں ایک ابتدائی جس میں ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے کیونکہ اوپر سے نیچے کی طرف کشش میں لہر پیدا کرنا آسان ہے۔ دوسری انتہائی جو عربی الف کی طرح بالکل سیدھی ہے اس کی کشش نیچے سے اوپر کو ہوگی۔

(سلسلہ کے لئے صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو)

یعنی وہ تختہ جو معن بن عمرن نے سلم دیوتا کو اپنی زندگی کے لئے پیش کیا۔ اس میں (ر۔ ب۔ اور ع) کے منہ اوپر سے کھل گئے ہیں جس کا فینیقی خط میں کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔
خط آرامی ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلا اور ہر گروہ میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کی جس کی وجہ

سے مذکور بالا شاخیں پیدا ہوئیں۔ مندرجہ بالا نقشہ یہ بتاتا ہے کہ شکلوں نے کس طرح ارتقائی مدارج طے کئے اور اپنی اصل سے بتدریج دور ہوتی چلی گئیں اسی نمونہ پر دوسرے حروف کو بھی قیاس کرلینا چاہیئے۔

خط نبطی بھی آرامی ہی کی ایک شاخ ہے جس سے عربی خط نسخ پیدا ہوا۔ یہ رسم الخط بصریٰ اور صرخدین بسنے والی قوم انباط میں مستعمل تھا۔ اسی نواح میں اس طرز تحریر کے کچھ نمونے دستیاب ہوئے جن کی دو مختلف قسمیں ہیں۔ ایک جو قدیم ہے، اپنی وضع قطع میں آرامی رسم الخط سے قریب تر ہے۔ اس کی ان کتبوں کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو حوران کے قرب وجوار میں دستیاب ہوئے۔

نفشہ دی ہمرت دی بنہ لہ ادینت بعلہ

یعنی ہمرت کا اسٹیچو جسے اس کے آقا ادینت نے بنایا۔

خط نبطی کی دوسری قسم جدید ہے جو عربی رسم الخط سے مشابہ ہے۔ ایک ایسا ہی کتبہ دستیاب ہوا جس پر عبارت اسی رسم الخط میں کندہ ہے۔ غالباً یہ اتصال حروف کی سب سے پہلی مثال ہے۔

دنخ قبرا دی عبد عیدو بن کھیلو بن

یعنی یہ قبر عیدو بن کھیلو بن ...... کی بنوائی ہوئی ہے۔

(۲) خط حبشی۔ حبشی ایک پرانی قوم تھی جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان عہد قدیم میں آباد تھی۔ اس کی لڑائیاں فراعنۂ مصر اور آشوریوں سے ہوئیں۔ بعد ازاں تباہ و برباد ہوگئی اور اس کے آثار ہزاروں برس پیشتر معدوم ہوگئے تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی میں

میں ماہرین آثار قدیمہ نے ایک نئی کتبہ ڈھونڈ نکالا جس پر ہیروگلیفی جیسے تصویری حروف کندہ ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ طرز تحریر ہیروگلیفی کی طرح خود ایک اصل ہے۔ یہ پتھر محلہ وھان۔ حماۃ (شام) میں پایا گیا۔
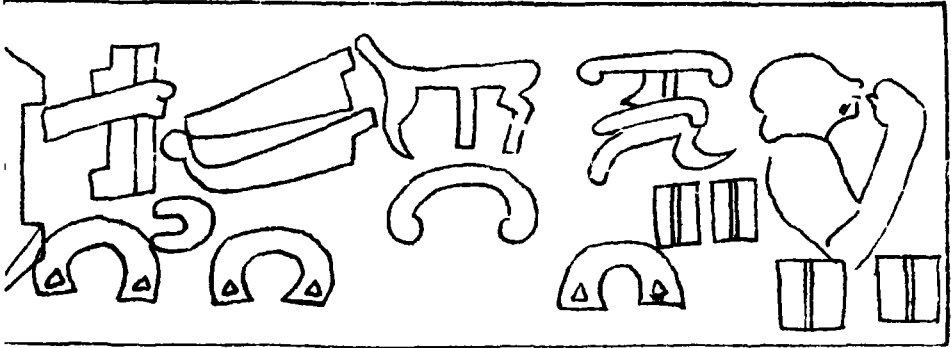
منہ میں ہاتھ دکھا کر بات کرنا مراد لیا گیا ہے۔ اس کے نیچے دو چوکور شکلوں سے (م۔ ا × ما) سمجھا جائے گا۔ گھوڑے کی نعل جیسی تین شکلیں ہیں جن میں ہر ایک سے (ا۔ س × اس) مراد ہے اور فاعلیت کی علامت ہے۔ اسی پر بقیہ دلالتوں کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے جو ابھی تک حل نہیں کی جاسکیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حبشی طرز تحریر سے کچھ رسم الخط پیدا ہوئے تھے جو بھلاوے میں پڑ گئے کیونکہ حبشی اور حمیری دو ایسے رسم الخط ہیں جو ہمارے نزدیک حبشی سے پیدا ہوئے۔ ان میں اور خط حبشی میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ابھی تک ان کی اصل کا بھی پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مشابہ تر خط حبشی ہے۔ خط حمیری مندرجہ ذیل ہے۔

(ا)	(ب)	(ت)	(ث)
(ج)	(ح)	(خ)	(د)
(ذ)	(ر)	(ز)	(س)

(ش) ... (ص) ... (ض) ... (ط) ...

(ظ) ... (ع) ... (غ) ... (ف) ...

(ق) ... (ک) ... (ل) ... (م) ...

(ن) ... (و) ... (ہ) ... (ی) ...

(د) یہ خط حبشی ہے:-

ان میں اور حمیری خط میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے بجز اس کے کہ حمیری داہنے سے بائیں کو اور حبشی بائیں سے داہنے کو لکھا جاتا ہے۔ بائیں طرف سے پہلا حرف (الف) کس قدر حمیری الف سے مشابہ ہے۔ دوسرا (جیم) اور تیسرا (زے) ہے جو حمیری کی ذال سے ملتا ہوا ہے۔ چوتھا (الف) پانچواں (بے) چھٹا (ط) اور ساتواں (ر) ہے۔ اسی پر باقی حروف کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

(۳) خط میخی۔ اس طرز تحریر کو آشوری اور بابلی قومیں اس وقت تک استعمال کرتی رہیں جب تک فینیقیوں کے حروف تہجی ان کو نہیں پہنچ گئے۔ اس کو خط میخی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے حروف کی شکلیں کیلوں جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان کا لفظ (کالو) اس طرح لکھا جائے گا۔

... جس کے معنی ہیں (جلانا) بابل اور آشور (عراق) کے کھنڈروں میں یہ رسم الخط اینٹوں پر کندہ پایا جاتا ہے۔ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ مٹی کی اینٹوں پر کسی نوک دار چیز سے حروف کھود کر خشک کر لی جاتی تھیں۔ پہلی نظر میں خط میخی کو دیکھ کر بھی خیال ہوتا ہے کہ اس کو تصویر نویسی سے کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل تصویر نویسی ہی کی ایک شاخ ہے۔ اگر اس کی پرانی نشانیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے حروف تصویروں جیسے ہیں۔

(۴) چینی خط۔ یہ طرز تحریر بہت پرانا ہے۔ اس کی شکلیں پورے پورے الفاظ کو ادا کرتی ہیں جیسے کہ قدیم تحریریں ہوتی تھیں۔ اسی بنا پر اس کی شکلوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

جرجی زیدان اور بعض دیگر علما کا خیال ہے کہ غور کرنے سے اس کی شکلیں تصویروں جیسی

معلوم ہوتی ہیں اگرچہ امتداد زمانہ سے ان میں تغیر واقع ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہو اور چینی تحریر خط میخی اور خط تصویری کی درمیانی کڑی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خط میخی کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

⊠ ▭ ▭ ⊓ ⊓ ▢۔ اگر غور کیا جائے تو خط میخی کی مشابہت صاف نظر آتی ہے۔
مندرجہ بالا نمونہ میں داہنی طرف سے شکل نمبر (۲) شکل نمبر (۳) اور شکل نمبر (۴) بالکل صاف مشابہ ہیں۔ اب رہیں پہلی اور پانچویں شکلیں تو ان میں کیلیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے میں سرسے جڑے ہوئے ہیں۔ ہیرو گلیفی اور میخی کی شاخیں داہنے سے بائیں یا بائیں سے داہنے کو لکھی جاتی ہیں لیکن چینی کی سطریں اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔ خط میخی میں بھی ہر لفظ کے لئے ایک شکل تھی۔ ایسی شکلوں کی تعداد اس زمانہ کے محدود ضروریات کے مطابق ۶۰۰ تھی۔ ممکن ہے کہ چین نے اس کو قبول کر کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق دیگر شکلوں کا اضافہ کر لیا ہو جن کی موجودہ تعداد میں ۲۱۴ مفرد آوازوں کی اور ۸۶۰۹ الفاظ کی علامتیں ہیں۔

نوٹ:۔ فاضل مضمون نگار نے اس موضوع پر اور بھی بہت کافی مواد جمع کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس مضمون سے استفادہ حاصل کرنا چاہیں تو وہ جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل لکھنؤ سے براہ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

جمہوریت جدید اور اسلام

(محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے)

(اس موضوع پر اگر کوئی اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے تو ہم ان کو رسالہ جامعہ میں ضرور شائع کریں گے۔ مدیر)

تمہید| آج دنیا میں ہر جگہ جمہوریت اور آمریت برسرِ پیکار ہیں۔ اکیسویں صدی تک یہ خیال عام تھا کہ جمہوریت سیاسی ارتقار کی آخری منزل ہے اور حکومتوں کا مستقبل اسی طرز فرماں روائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ آئندہ جو کچھ ترقی ہوگی اس کی بنیاد عمومیت ہی ہو سکتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جو کچھ تغیرات ہوں گے وہ اسی طرز حکومت کے ردوبدل اور توسیع و اصلاح سے متعلق ہوں گے۔ سیاسی ارتقار کی کوئی نئی راہ اور نظم مملکت کی کوئی نئی شکل انیسویں صدی کے ماہرانِ سیاست کے تصور میں بھی نہ آتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ان خیالات تعلیقات کو غلط ثابت کر دکھایا اور جمہوری طرز حکومت کے نقائص جو ابھی تک منظر عام پر نہ آئے تھے اب بے نقاب ہونے لگے۔ اطالیہ اور جرمنی میں جو انقلاب پیش آئے انھوں نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا کہ شخصی حکومت بشرطیکہ اس کا مقصد ملک کی فلاح اور جمہور کی بہبود ہو کارکردگی اور منفعت کے لحاظ سے جمہوری حکومت سے کہیں فائق و برتر ہے۔

ان دو ملکوں میں جمہوری حکومت کی ناکامی کے کیا اسباب تھے ان سے ہمیں بحث نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ناکامی سے سیاسی تصورات میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور آمریت کے اثرات دور دور تک پھیلنا شروع ہو گئے۔ ہمارے ملک میں بھی جہاں ابھی عمومیت کا پودا لگایا ہی جا رہا تھا اس کی مخالف کی ہوائیں چلنے لگیں اور آمریت کسی نہ کسی بھیس میں جلوہ نما ہونے لگی۔ واقعات کی دنیا سے ہٹ کر خیالات و افکار کی دنیا میں بھی ان دونوں تصورات کی آویزش و پیکار جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس کے حق میں مستقبل بالآخر فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ اور زیادہ نازک اور پیچیدہ ہے کیونکہ جس وقت سے ہندوستان میں عمومی حکومت اور نیابتی ادارہ جات کا قیام شروع ہوا انہیں روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نظام حکومت میں ان کی ترقی کے امکانات تو ایک طرف ان کے وجود بقا کے لئے بھی کوئی تحفظ موجود نہیں ہے۔ یہ احساس درجہ بدرجہ قوی تر ہوتا گیا تا آنکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ سے بالآخر عمومیت کے خلاف صدائیں اٹھنے لگیں لیکن اس جذبہ مخالفت میں لوگوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ اصل قصور نفس عمومیت کا نہیں ہے بلکہ خرابی کی اصل جڑ عمومیت اور جمہوری ادارہ جات کی وہ خاص شکل ہے جسے ہمارے سر تھوپا جا رہا ہے اور جس کا قبول کر لینا اپنے امتیازی وجود کو مٹانے کے مترادف ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس امر کی جانچ کی جائے کہ حکومت و سیاست کا اسلامی تصور کہاں تک جمہوریت جدیدہ سے مطابقت رکھتا ہے اور کس حد تک اس میں آمریت کے عناصر داخل ہیں۔

جمہوریت کا مفہوم | لیکن سب سے پہلے ہمیں جمہوریت یا عمومیت کا مفہوم متعین کر لینا چاہیئے کیونکہ اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جمہوریت کی ایک عام تعریف یہ ہے کہ یہ وہ حکومت ہے جو جمہور کی ہو جمہور ہی کے لئے ہو اور جس کے چلانے والے خود جمہور ہوں (Government of the people, for the people and by the people) لیکن غور کیجئے تو یہ ایک نصب العین ہے جس کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ حکومت جمہور کی ہو اور جمہور کے لئے ہو لیکن یہ تو صریحاً غیر ممکن ہے کہ کسی ریاست کی ساری آبادی حکومت کو چلائے اور اس میں براہ راست شرکت کر سکے۔ ہاں اگر یونان قدیم کی طرح ہر شہر ایک خود مختار ریاست بنا دیا جائے تو یہ خیال شاید عملی شکل اختیار کر سکے۔ لیکن یونان قدیم کی مثال دیتے وقت اس واقعہ کو فراموش نہ کر دینا چاہیئے کہ شہر ایتھنز (Athens) میں اس قسم کی حکومت میں عوام کی براہ راست شرکت صرف اس لئے ممکن ہوئی کہ وہاں غلاموں کا ایک کثیر التعداد طبقہ موجود تھا جو ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم تھا اور جس کی زندگی کا صرف یہی مقصد تھا کہ وہ یونانیوں کے لئے ضروریات زندگی فراہم کرے تاکہ انھیں سیاسیات کی ہنگا

آرائیوں میں شرکت کے لئے فرصت مل سکے۔

چونکہ جمہوریت کا مذکورہ بالا تصور عملی دنیا کے لئے یکسر بے سود ہے اس لئے حصول مقصد کا بہترین طریقہ یہ قرار پایا کہ نیابتی ادارہ جات قائم کئے جائیں اور حکومت کا دروبست جمہور کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔ عرف عام میں جمہوریت سے اس کی یہی خاص شکل مراد لی جاتی ہے جس کا نام نیابتی حکومت (Representative Government) خود نیابتی حکومت کی ایک سے زیادہ شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں جو تصور مشترک ہے وہ یہ حکومت کو جمہور کی مرضی کا تابع ہونا چاہیئے دوسرے الفاظ میں حکومت رائے عامہ (pnbiic opinion) کی پابند ہو۔ یہی خیال درحقیقت جمہوریت کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہے کہ ریاست کے قوانین اور مملکت کا انتظام جمہور کی اکثریت کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہیں سے حاکمیت (Sovereignty) کا مابہ النزاع مسئلہ پیدا ہوتا ہے یعنی حکومت کے اقتدار کا اصل سرچشمہ کہاں ہے۔ آیا حاکم یا فرمانروا اپنی ذات میں اس اقتدار کا حامل ہے یا اس کی حیثیت صرف ایک نائب کی ہے اور اقتدار کا اصل سرچشمہ جمہور کی ذات ہے۔ جمہوریت آخر الذکر نقطۂ نظر کی حامی ہے اس کے نزدیک حاکمیت جمہور کی ہے اور قانون اس وقت تک قانون نہیں کہلایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس کے برخلاف آمریت جمہور کی یہ حق نہیں دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اقتدار کا منبع خود آمر کی ذات ہے اور قانون اس کی مرضی کا نام ہے۔

اسلامی نظریہ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دونوں نظریات کہاں تک قرین صواب ہیں۔ اس کے لئے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی ہے کہ قرآن ان دونوں میں سے کسی نظریہ کو بھی قبول نہیں کرتا ہے۔ قرآن نہ کسی ایک انسان کو اور نہ انسانوں کے کسی گروہ یا جماعت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لئے جو قانون چاہے بنالے اسلامی نقطۂ نظر سے حاکمیت (Sovereignty) نہ آمر کو حاصل ہے اور نہ جمہور کو۔ حاکمیت ساری کی ساری خدا کے لئے ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکومت تو بس اللہ کی ہے) یہی توحید کی بنیاد

ہے کہ ہر معاملہ میں اصل مرضی خدا کی ہے۔ کوئی قانون جسے کسی ایک انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بنایا ہو اور جو انسان کی مرضی پر مبنی ہو، اسلامی حکومت کا قانون نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ یا تو قرآن وحدیث کی تائید اپنے پیچھے نہ رکھتا ہو یا بصورت دیگر وہ ان کی اسپرٹ اور منشا کے خلاف نہ ہو۔ یہاں نہ آمریت کا گذر ہے اور نہ جمہوریت کا دخل۔ حاکم اور جمہور دونوں خدا کی مرضی کے تابع اور منشائے ایزدی کے محکوم ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑا قانون یہی ہے کہ وہ اپنے مصالح اور اپنی آرار کو اس کے فیصلوں میں دخیل نہ کریں۔ اسلامی حکومت میں قوانین کا بنانا یا منسوخ کرنا حاکم یا فرمانروا کا کام نہیں ہے اور نہ اس میں جمہور کا کوئی دخل ہے۔ اس حکومت کے تمام قوانین کا ماخذ و منبع مرضی خداوندی ہے جس نے خود کو تمام و کمال کتاب اللہ میں ظاہر فرما دیا ہے۔ البتہ ذیلی قوانین کی ترتیب و تدوین جو قرآن وحدیث کے احکام سے معارض نہ ہوں یا جن امور کی بابت قرآن وحدیث ساکت ہیں ان کی نسبت قوانین کا بنانا یہ اختیارات بے شک امیر کو حاصل ہیں جن کو وہ اپنی مجلس شوریٰ کی مدد اور مشورہ سے عمل میں لا سکتا ہے۔ یہاں صرف عمومیت کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس امر کے فیصلہ کا حق کہ آیا زیر بحث قانون قرآن وحدیث کی اسپرٹ اور ان کے منشا کے مطابق ہے یا نہیں جمہور کو دیا گیا ہے لیکن یہاں بھی جمہوریت جدیدہ اور اسلامی نظام حکومت میں یہ فرق ہے کہ یہ حق عامۃ الناس کے ہر فرد کو حاصل نہیں ہے بلکہ صرف انہیں افراد (خواہ وہ اصطلاحی معنوں میں علمار کے زمرہ میں داخل نہ ہوں) جو علم دین رکھتے ہوں اور اپنے فیصلہ پر قرآن وحدیث سے استدلال لا سکتے ہوں۔ جب اس قسم کا کوئی اختلاف ہو گا تو آخری فیصلہ اجماع امت کے مطابق کیا جائے گا۔ ایک دوسرے نقطہ نظر سے اسلامی حکومت آمریت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اگرچہ اسلامی حکومت کا آج تک کوئی دستور مرتب نہیں ہوا ہے لیکن ایک ایسے دستور کے خدوخال اس قدر واضح ہیں کہ اس میں شک واشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عملاً اسلامی حکومت کا قیام صرف خلافت راشدہ تک رہا اس لئے اگر ہم ایک اسلامی حکومت کا دستور مرتب کرنا چاہیں جو حقیقی معنوں میں اسلامی حکومت کہلائی جا سکے تو وہ خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہونا چاہیئے۔ اس خلافت کا ایک پہلو ضرور آمریت

سے قریب تر تھا وہ یہ کہ خلیفہ یا امیر اپنے فیصلوں میں مجلس شوریٰ یا جمہور کی رائے کا لازمی طور سے پابند نہ تھا اگرچہ اکثر و بیشتر ان کی رائے کے مطابق ہی کام کرتا تھا لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بحیثیت صدر عالم (Head of the Executive) خلیفہ نے مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کے خلاف عمل کیا ہے۔ لیکن خود خلیفہ کا انتخاب نیم جمہوری طرز پر ہوتا تھا یعنی خلیفہ اپنے جانشینوں کی ایک فہرست چھوڑ جاتا تھا یا جدید اصطلاح میں وہ چند اشخاص کو خلافت کے لئے نامزد کر دیتا تھا جو اس کے تجربہ میں منصب خلافت کے اہل ہوتے تھے۔ ان نامزد شدہ اشخاص میں جس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل ہو جاتی تھی وہ خلیفہ منتخب ہو جاتا تھا۔ اسلامی حکومت کا ایک جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ خلیفہ کو معزول کر دینے کا حق جمہور کو حاصل ہے اگر جمہور کو یہ محسوس ہو کہ خلیفہ یا امیر عدل و انصاف سے حکومت نہیں کر رہا ہے یا وہ حکومت خدا اور رسول کے احکام اور قرآن کی رہنمائی کے مطابق نہیں کرتا ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔

اس تمام تحریر سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مسلمانوں کو خالص اسلامی نقطہ نظر سے نہ جمہوریت کا شیدا ہونا چاہیئے اور نہ آمریت کا دلدادہ۔ اسلامی نظام حکومت ایک نرالا نظام حکومت ہے جس میں جمہوریت اور آمریت دونوں کے عناصر کا ایک عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے اور نظری حیثیت سے وہ ان دونوں پر فوقیت رکھتا ہے عملی حیثیت سے بھی جب تک یہ طرز حکومت قائم رہا اس سے زیادہ کامیاب اور مبنی بر انصاف طرز حکومت کا تصور ذرا مشکل سے کیا جا سکتا ہے اب رہا یہ سوال کہ اس قسم کی حکومت زیادہ عرصہ تک کیوں نہ قائم رہ سکی اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اس میں اس قدر جلد زوال آ گیا نیز یہ کہ اگر موجودہ زمانہ میں اس قسم کی حکومت قائم کی جائے تو اس کے دستور کی کیا شکل ہوگی اس کے لئے زیادہ گہری نظر اور زیادہ غائر مطالعہ درکار ہے اور محل کی تنگنائی بھی اطناب کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ
قرول باغ۔ نئی دہلی
شاخیں
مکتبہ جامعہ
جامع مسجد۔ دہلی
مکتبہ جامعہ
لوہاری دروازہ۔ لاہور
مکتبہ جامعہ
امین آباد۔ لکھنؤ
مکتبہ جامعہ
پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم، اے

سیاست کی پہلی کتاب قیمت ۳؍

اجتماعی زندگی کی ابتدار ...... " ... ۸؍

ہندوستان کا دیہی قرض ..... " ... ۳؍

مسئلہ آبادی ...... " .... ۴؍

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے (علیگ)

جلد ۳۲ | نومبر ۱۹۳۹ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

۱۔ ذاکر صاحب کا خط ۴۷۴
۲۔ کریٹو ۴۷۹
۳۔ کاروباری تعلیم ۴۹۹
۴۔ اشتراکیت ۵۰۶
۵۔ یہودی ۵۱۶

۶۔ بنیادی قومی تعلیم میں سیر کی اہمیت ۵۲۸

۷۔ ارشادات جگر ۵۴۳

۸۔ تنقید و تبصرہ ۵۴۵

ذاکر صاحب کا خط

(جب سے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یورپ تشریف لے گئے آخر ستمبر تک ان کے صرف دو تین پوسٹ کارڈ آئے تھے جس سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ جہاز سے اتر کر کچھ دن وینس ٹھیرے پھر ویناّ اور بوڈاپیسٹ گئے اور وسط اگست میں جرمنی جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی خط نہیں آیا۔ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کی صحت کا کیا حال ہے اور علاج کیسا ہو رہا ہے۔ لڑائی چھڑ جانے کے بعد یہ فکر پیدا ہو گئی کہ اگر وہ اعلان جنگ کے وقت جرمنی میں موجود ہوئے اور فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے تو نظر بند کر لئے جائیں گے۔ سخت پریشانی اور انتظار کی حالت میں ۲۰ ستمبر کو یہ خط پہنچا جس سے بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔

بعض حضرات کی رائے ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب کے احباب اور ہمدردان جامعہ کی اطلاع کے لئے رسالہ جامعہ میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مختصر خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ موصوف وسط نومبر تک ہندوستان واپس آئیں گے)

HOTEL DES FAMILLES

GENEVE

۱۱ ستمبر ۳۹ء

برادرم عابد صاحب تسلیم   آپ کا خط مجھے اس دن ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط میم صاحبہ کا ملا۔ ان خطوط سے ادھر کا حال تو اتنا معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گذار سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی

بندۂ خدا نے خبر نہ لی۔ شفیق صاحب نے مجیب صاحب، اکبر صاحب اور سعید صاحب کے مفصل، خطوط کا حوالہ دیا ہے جو مجھے نہیں ملے!

میری کہانی سنئے۔ ۳؍ جولائی کو وینس پہنچا۔ شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا۔ دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا۔ بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں۔ واقعی سیکھتا بھی تھا۔ لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸؍ جولائی کو وینا پہنچا۔ وہاں امتیاز آگئے۔ ان کے ساتھ ایک ہفتہ کے لئے بوڈاپیسٹ چلا گیا۔ بڑا ہی "گتھا ہوا" شہر ہے۔ واقعی خوبصورت۔ تقریباً ہر شخص جرمن بھی جانتا ہے۔ وہاں سے پھر وینا واپس آئے۔ مگر ہوائی جہاز پر۔ یا یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا۔ وینا سے پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معلوم کئے کہ معاذ اللہ۔ در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں۔ احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا۔ آنتیں البتہ بہت خراب ہیں۔ پرانی پیچش ہے اور خوب ہے۔ اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں۔ زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیئے تھی لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لئے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے۔ خون کی جو حالت ہونی چاہیئے تھی اس سے بہت بہتر ہے۔ اس لئے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (رستم ظریفی ملاحظہ ہو!) برچا ہے۔ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا۔ علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی۔ سات انجکشن تجویز کئے گئے اور حکم ملا کہ کسنجن چلے جاؤ، وہاں ۳ ہفتہ رہو۔ انجکشن لو، پرہیز کرو۔ اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آگئی ہو تو ۴ - ۵ ہفتہ کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا ورنہ ۳ ہفتہ کا وقفہ کافی ہوگا۔ چنانچہ میں ۱۵؍ اگست کو KISSINGEN پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی، اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ وینا سے ڈاکٹر نے ایک مفصل وصیت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک اور ڈاکٹر کے نام تعارفی خط۔ انھوں نے اسی دن سے علاج شروع کر دیا۔ ایک مکان میں رکھ دیا جہاں بٹھیارن خود ڈاکٹر تھی اور ایک

ڈاکٹر کی بیوہ اور بڑھی! یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا۔ چند ہی روز میں بین فائدہ محسوس ہونے لگا۔ لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہئے، لڑائی کی خبریں آنے لگیں۔ آدمی، گھوڑے، گاڑیاں، موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ ۲۵ اگست کو سب تیاری ہو چکی تھی۔ ہمارے نوکر سب فوج میں جا چکے تھے۔ ہمارے ساتھی سب بھاگ نکلے تھے۔ ریلیں کم ہو گئی تھیں۔ مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے۔ اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے۔ طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی۔ ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہوگی۔ اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ اگست کو خاکسار کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولد ہوا! یعنی) ایک عدد عظیم الشان کیڑا، طول جس کا کوئی ۹ انچ تھا، برآمد ہوا، پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا بہت اچھا ہوا کہ یہ نکل گئے۔ بہت پرانا ہے۔" خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب ہو رہا ہے۔ اور جمے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہو گئے۔ غسل جو تجویز کئے گئے تھے وہ بھی پورے ہو گئے۔ اور دو تاریخ کو اعلان جنگ برطانیہ نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک بس یہ معلوم ہوا تھا کہ صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اور پوری امید تھی کہ پرامن طریقہ پر معاملہ یکسو ہو جائے گا۔ حالت جنگ کا اعلان ہمیں ۲ کو سہ پہر میں سنایا گیا۔ اتوار کا دن تھا اسی وقت اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے وہ صبح ۵ بجے ہے۔ واپس آکر حساب چکایا سامان باندھا۔ رات کو دس بجے جا کر سامان اسٹیشن پر دیا۔ اور ٹکٹ خریدا۔ صبح ۵ بجے روانہ ہو گیا۔ ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا کہ ایک حلقہ والا دوسرے حلقہ کی کوئی خبر نہ دیتا تھا۔ بس اس حلقہ میں گاڑیوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا وہ بھی غیر معین طور پر (stuttgart) میں نے سوئزرلینڈ کا قصد کیا۔ کہا گیا کہ STUTTGART تک جا سکتے ہو، آگے معلوم نہیں۔ خیر STUTTGART کا ٹکٹ لیا۔ راستہ میں تین جگہ گاڑی بدلتی تھی۔ دو دفعہ بدل چکا تھا۔ تیسری جگہ پہنچنے سے پہلے ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی، سب مسافر اتر جائیں

اتر گئے ۔ ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے ۔ چھوٹا سا اسٹیشن ۔ ہوائی جہازوں کے ڈر سے تاریک ۔
بس ہر گھنٹہ دو گھنٹہ میں ایک گاڑی گذر جاتی تھی جس میں سرحدی مقامات کے بڈھے بچے
ہوتے تھے جنھیں اندرون ملک بھیجا جا رہا تھا ۔ خیر یہ وقت بھی گذر گیا اور ہم STUTTGART
پہنچے ۔ وہاں کہا کہ ZURICH جانا ہے ۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جا رہی ہے سامان
پوچھا ، معلوم ہوا ساتھ نہیں آیا ۔ اسی دریافت کرنے میں ZURICH کی گاڑی روانہ ہو گئی
رات وہیں قیام فرمایا ۔ قاعدہ سے سرکاری مہمان ہو جانا چاہیئے تھا ، مگر مہمان نوازی نہ معلوم
کیوں نہیں کی گئی دوسرے دن ZURICH کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا ۔ جرمن علاقہ میں
LAKE CONSTANCE کے کنارے فریدرش ہافن پر اترا وہاں سے اسٹیمر لینا ہوتا ہے رات کو پہنچا تھا دوسرے دن
۸ بجے دن کے اسٹیمر جانے والا تھا ۔ راستہ میں معلوم ہوا تھا کہ اسٹیمر پھر چلنا بند ہو گئے آگے
نہ جا سکو گے ۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسٹیمر پھر چلنے لگے ہیں ۔ سہ پہر میں اسٹیمر پر پہنچا ۔ جرمن
پولیس نے کہا کہ تم کو سوئٹزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ دیں گے ، صبح ہی ۵۰ آدمی
اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں ! میں نے کہا آپ تو جانے دیں میں قسمت آزمائی کروں
گا ۔ مسکرائے ، کندھے اچکائے ، اور پاسپورٹ پر مہر لگا دی میں اسٹیمر پر بیٹھ ROMANSHORN
پہنچا ۔ اسٹیمر جس میں ۴۰۰ آدمیوں کی جگہ تھی اس پر عملہ کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے ۔ میں
اور دو سوئس جو فوجی خدمت کے لئے جرمن سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے ۔ کپتان نے
پوچھا کہ تم نے سوئس VISA لے لیا ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ کہا پھر کیسے چلتے ہو ۔ یہ جہاز اسی
لئے تو خالی جا رہا ہے ۔ کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری حکومت نے باہر سے
آنے والوں کے لئے بلا استثنا VISA کی قید لگا دی ہے اور اس کی سختی سے پابندی
ہو رہی ہے ۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی کہ جہاز چل چکا تھا ۔ میں نے کہا اب میں تو چل کھڑا ہوا ہوں
فرمایا کہ نہیں واپس جا سکتے ہو ۔ پھر اس جہاز پر واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر
جا کر VISA کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ۔ میں نے کہا کہ حضرت اب یہ تو ہوتا نہیں ۔ ایک دفعہ

جرمنی سے نکل آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمائش کروں: خیر اسی گفتگو میں ROMANSHOM پہنچے وہاں وہی پیش آیا جو کپتان نے کہا تھا۔ سرحدی پولیس نے کہا واپس جاؤ۔ میں نے کہا ناممکن۔ یہیں قید کرلو۔ کچھ دیر تو وہ اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے واپس جانا ہی ہوگا مگر جب میری طرف سے بھی انکار ہوتا رہا تو کہنے لگا کہ تم بات تو ٹھیک کہتے ہو جرمنی واپس جاؤگے تو تمھیں وہاں قید کرلیں گے تمھیں واپس بھیجنا تو ناانصافی ہے۔ میں کیا آپ ہی سمجھئے۔ چنانچہ اس نے (برن) کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے مجھے اجازت مل گئی۔ اور میں (ZURICH) پہنچا۔ وہاں برطانوی کاتسل نے مشورہ دیا کہ جینیوا جاؤ۔ انگلستان جانے یا اٹلی سے ہندوستان واپس جانے کے متعلق وہیں سے زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ میں ۹، کو یہاں پہنچ گیا۔ یہاں ڈاکٹر گکول سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اتفاق سے اسی ہوٹل میں تھے جس میں میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اب یہاں اطمینان ہے۔ چند روز کی اس دوڑ بھاگ میں ذرا رنگ روغن ویسا نہیں رہا جیسا KISSINGEN میں ہوگیا تھا۔ مگر فی الجملہ اچھا ہوں، خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں، اور ہضم کرتا ہوں۔ اور کیا چاہئے۔ وقفہ گذار کر پھر یہیں کہیں انجکشن لینے کا انتظام کروں گا۔ اور اگر اٹلی غیر جانبدار رہا تو انشاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آملوں گا مجھے امید ہے کہ روپیہ کی اور ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن آپ اگر ۲۰۔۲۰ پونڈ کا انتظام رکھیں تو اچھا ہے۔ شاید ضرورت پڑ جائے تو مرا تار ملنے پر آپ بھیج سکیں۔

اس خط کے مضمون سے سب احباب کو مطلع کردیجئیگا۔ اور یوسف اور محمود کو بھی۔

مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ دیکھئے۔ یہ قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں +

مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی' ایچ' ڈی)

(انجمن ترقی اردو ہند سقراط کے چند منتخب مکالمات کا ترجمہ کرا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ آئندہ سال شائع ہو جائے گا۔ ہم جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی اجازت سے شکریے کے ساتھ اس چھوٹے سے مکالمے کا ترجمہ قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں)

اشخاص مکالمہ

سقراط — کریٹو

مقام۔ سقراط کا قید خانہ

سقراط تم اس وقت کیوں آئے، کریٹو؟ ابھی تو بہت سویرا ہوگا؟

کریٹو ہاں، بے شک۔

س ٹھیک وقت کیا ہے؟

ک پو پھٹ رہی ہے

س تعجب ہے کہ قید خانہ کے محافظ نے تمہیں آنے دیا

ک وہ مجھے جانتا ہے کیونکہ میں اکثر آتا رہتا ہوں، سقراط۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ کچھ سلوک بھی کیا ہے۔

س کیا تم ابھی پہنچے ہو۔

ک نہیں، مجھے آئے تھوڑی دیر ہوئی۔

س تو پھر تم چپ کیوں بیٹھے رہے۔ فوراً جگا دیا ہوتا۔

ک سقراط، مجھ سے تمہاری طرح یہ تکلیف اور پریشانی نہ اٹھائی جاتی ہرگز نہ اٹھائی جاتی۔ میں تمہاری پرسکون نیند کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تمہیں اسی وجہ سے نہیں جگایا کہ میں چاہتا تھا، جہاں تک ہو سکے تمہاری تکلیف میں کمی ہو یوں تو میں تمہیں ہمیشہ سے خوش مزاج سمجھتا تھا مگر جس اطمینان سے تم یہ مصیبت برداشت کر رہے ہو اس کی مثال میری نظر سے آج تک نہیں گذری۔

س بھئی کریٹو، جب انسان میری عمر کو پہنچ جائے تو اسے اس خیال سے کڑھنا نہیں چاہیئے کہ موت قریب آ رہی ہے۔

ک مگر اور بوڑھے بھی تو ہیں جو اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں ان کا بڑھاپا انھیں کڑھنے سے نہیں روکتا۔

س یہ سچ ہے، مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ اتنے سویرے کیوں آتے ہو؟

ک میں تمہارے پاس ایک پیام لے کر آیا ہوں جو افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے غالباً تمہارے لئے تو نہیں مگر تمہارے دوستوں کے لئے خصوصاً میرے لئے نہایت افسوس ناک ہے۔

س ہائیں؟ کیا وہ جہاز ڈیلوس سے آگیا جس کی واپسی پر میں مارا جاؤں گا۔

ک نہیں ابھی آیا تو نہیں مگر غالباً آج آ جائے گا۔ جو لوگ سینم سے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے وہاں چھوڑا تھا۔ لہذا سقراط کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔

س اچھا کریٹو اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو میں بھی راضی ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن کی دیر ہو جائے گی۔

ک تم یہ کیوں سمجھتے ہو؟

س میں بتاتا ہوں۔ مجھے جہاز کے پہنچنے کے دوسرے دن مرنا ہے نہ؟

ک ہاں حکام یہی کہتے ہیں

س مگر میرے خیال میں جہاز کل سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ یہ مجھے ایک خواب سے معلوم ہوا جو میں نے کل رات کو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ابھی سویرے دیکھا تھا جب کہ خوش قسمتی سے تم نے مجھے سونے دیا۔

ک اور یہ خواب تھا کیا؟

س مجھے ایک حسین و جمیل عورت کی صورت زرق برق لباس میں نظر آئی جس نے مجھے مخاطب کرکے کہا سن اے سقراط،

"آج سے تیسرے دن تو فتیا کے زرخیز خطے کو جائے گا"

ک کیا عجیب خواب ہے سقراط،

س میرے خیال میں کرٹو، اس کی تعبیر کے بارے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

ک ہاں افسوس، تعبیر تو بالکل صاف ہے۔ مگر میرے پیارے سقراط، میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ میری بات مانو اور یہاں سے نکل بھاگو اگر تم مر گئے، تو صرف یہی نہیں کہ میرا ایک دوست جاتا رہے گا جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک اور خرابی ہے جو لوگ تم کو اور مجھ کو نہیں جانتے وہ سمجھیں گے کہ اگر میں روپیہ خرچ کرنے پر تیار ہوتا تو تمہیں بچا سکتا تھا مگر میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اب بتاؤ اس سے بڑھ کر کوئی ذلت ہو سکتی ہے ـــــ کہ میرے متعلق یہ سمجھا جائے کہ میں روپیہ کو ایک دوست کی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں؟ لوگ تو یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ میں چاہتا تھا تم بھاگ جاؤ مگر تم نے انکار کر دیا۔

س مگر پیارے کرٹو، ہم عام لوگوں کی رائے کی پرواہ ہی کیوں کریں؟ ہمیں تو صرف اچھے آدمیوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور یہ ان معاملات کو اسی طرح دیکھیں جس طرح حقیقت میں پیش آئے۔

ب مگر سقراط عوام کی رائے کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اس لئے کہ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ جس شخص سے بدظن ہو جائیں اسے انتہائی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

س کاش ایسا ہوتا، کرٹو کہ عوام انتہائی نقصان پہنچا سکتے، کیونکہ وہ اس صورت میں انتہائی فائدہ پہنچانے کے قابل بھی ہوتے۔ اور اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے تھی، لیکن حقیقت میں وہ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ کسی شخص کو دانش مند بنا سکتے ہیں اور نہ بے وقوف ان کے سارے کام محض اتفاقی ہوتے ہیں۔

ل خیر میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو کہو سقراط کہیں تم میرے اور اپنے دوسری دوستوں کے خیال سے تو ایسا نہیں کر رہے ہو؟ تمہیں یہ خوف تو نہیں کہ اگر تم قید خانے سے بھاگ گئے تو جاسوس ہمیں دق کریں گے کہ ہم تمہیں اڑا لے گئے اور ہماری ساری املاک یا اس کا کچھ حصہ چھن جائے گا یا اس سے بھی برا انجام ہوگا؟ اگر تم ہماری وجہ سے ڈرتے ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو کیونکہ تمہیں بچانے کے لئے ہمیں یقیناً یہ اور اس سے بڑھ کر خطرہ برداشت کرنا چاہیئے۔ تو پھر مان جاؤ اور جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔

س ہاں کرٹو، ایک خوف یہ بھی ہے جس کا تم نے ذکر کیا مگر صرف یہی نہیں ہے۔

ل تم اطمینان رکھو —— ایسے لوگ موجود ہیں جو بہت کم خرچ پر تمہیں قید خانہ سے نکال لے جانے کو تیار ہیں۔ اب رہے جاسوس تو ان کا معاملہ بھی کچھ زیادہ نہیں —— تھوڑی سی رقم میں خوش ہو جائیں گے۔ میری دولت جو حقیقت میں بہت ہے تمہارے لئے حاضر ہے اور اگر تمہیں میری ساری پونجی صرف کرنے میں تامل ہو تو بعض اجنبی اپنا سرمایہ پیش کرتے ہیں کہ تم اسے کام میں لاؤ ان میں سے ایک سمیاس

تھیبی خاص اسی غرض سے ایک بہت بڑی رقم اپنے ساتھ لایا ہے سیبن وغیرہ بہت سے لوگ تمہیں بھاگنے میں مدد دینے کے لئے اپنا روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تم ہمارے خیال سے تامل نہ کرو اور وہ بات نہ کہو جو تم نے عدالت میں کہی تھی کہ دوسری جگہ جاکر میری سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ کیا شغل اختیار کروں تم جہاں کہیں جاؤ گے لوگ تمہیں عزیز رکھیں گے کچھ اتھینس پر موقوف نہیں۔ تھیسلی میں میرے دوست موجود ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جانا چاہو تو تمہاری قدر اور حفاظت کریں گے اور کوئی تھیسلی والا تمہیں نہیں ستائے گا اور میں نہیں سمجھتا سقراط تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ جب تمہاری جان بچ سکتی ہے تو تم خود اسے ہلاکت میں ڈالو۔ تم تو اپنے دشمنوں کا مقصد پورا کر رہے ہو جو تمہیں جلد سے جلد برباد کرنا چاہتے ہیں اور پھر میں یہ بھی کہہ دوں کہ تم اپنے بچوں سے بے وفائی کر رہے ہو بجائے اس کے کہ تم ان کی پرورش کرتے اور انھیں تعلیم دلاتے انھیں چھوڑ کر جا رہے ہو اور اب انھیں خود ہی قسمت آزمائی کرنی پڑے گی اگر وہ اس انجام سے بچ گئے جو عموماً یتیموں کا ہوا کرتا ہے تو اس میں تمہاری کوئی کارگذاری نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کو دنیا میں بچے پیدا ہی نہیں کرنے چاہئیں جو آخر تک ان کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم وہ راہ اختیار کر رہے ہو جس میں زیادہ آسانی ہے وہ نہیں جس میں زیادہ خوبی اور مردانگی ہے اور جو تم جیسے شخص کے لئے مناسب ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات میں نیکی کا لحاظ رکھتا ہے۔ مجھے سچ مچ شرم آتی ہے نہ صرف تم پر بلکہ ہم سب پر جو تمہارے دوست کہلاتے ہیں، جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارا قصہ محض ہماری کم ہمتی سے منسوب کیا جائے گا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ اس مقدمے کو دائر ہی نہ ہونے دیتے یا کچھ اور انتظام کرتے، یہ آخری حرکت یہ انتہائی حماقت تو سراسر ہم لوگوں کی غفلت اور بزدلی کا نتیجہ سمجھی جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ اگر ہم کسی کام کے ہوتے

تو تمہیں بچا لیتے اور تم خود بھی بچ سکتے تھے اس لئے کہ کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ دیکھو سقراط اس کے نتائج ہمارے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی کس قدر افسوس ناک اور شرم ناک ہیں تو پھر فیصلہ کر ڈالو بلکہ یہ سمجھو کہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو اس لئے کہ سوچنے کا وقت گذر گیا۔ اب صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے اور وہ آج رات کو ہو جانی چاہئے اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو اس کی کوئی صورت یا امکان نہیں رہے گا۔ اس لئے میری التجا ہے سقراط کہ تم راضی ہو جاؤ اور جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔

س پیارے کریٹو، تمہارا یہ جوش اگر صحیح ہو تو نہایت قابل قدر ہے لیکن اگر غلط ہو تو جتنا زیادہ شدید ہو گا اتنا ہی زیادہ خطرناک ہو گا۔ لہذا ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ میں تمہارے کہنے پر عمل کروں یا نہ کروں۔ اس لئے کہ میری طبیعت ہمیشہ سے عقل کی راہ پر چلتی ہے جو غور کرنے کے بعد مجھے سب سے بہتر معلوم ہو۔ اس مصیبت کے پیش آنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے قول سے پھر جاؤں۔ جن اصولوں کی میں اب تک قدر اور عزت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں اور بجز اس صورت کے کہ ہمیں فوراً کوئی دوسرے ان سے بہتر اصول ہاتھ آجائیں مجھے ہرگز تمہارے ساتھ اتفاق نہیں ہو سکتا چاہے جمہور کی طاقت مجھے کتنی ہی بار قید، ضبط املاک اور موت کی سزا دے جس طرح بچوں کو ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کا سب سے معقول طریقہ کیا ہوتا ہے؟ کیا میں پھر لوگوں کی رائے کے بارے میں تمہاری پرانی بحث کی طرف رجوع کروں؟ —— ہم یہ کہہ رہے تھے کہ بعض کی رائے کا لحاظ کرنا چاہئے اور بعض کا نہ کرنا چاہیئے۔ اب بتاؤ کہ یہ بات جو میری سزا کا حکم سنائے جانے سے پہلے کہی گئی تھی، ٹھیک ہے یا نہیں؟ کیا وہ بحث جو پہلے معقول تھی اب محض بکواس ثابت ہوئی —— محض بچوں کی سی مہمل گفتگو؟ یہ وہ سوال ہے کریٹو، جس پر میں تمہاری مدد سے غور کرنا چاہتا ہوں:۔ آیا موجودہ حالات میں ہمیں اپنا استدلال

کچھ مختلف نظر آتا ہے یا نہیں اور میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں؟ اس کا خلاصہ جس پر میرے خیال میں بہت سے مستند اشخاص متفق ہیں یہ تھا کہ جیسا میں ابھی کہہ رہا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے کا لحاظ کیا جائے اور بعض کی رائے کا نہ کیا جائے اب سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں تو کل مرنا نہیں ——— کم سے کم انسانی عقل کو اس کا کوئی احتمال نظر نہیں آتا ——— لہٰذا تمہاری رائے بے لوث ہوگی اور تم گردوپیش کے حالات سے دھوکا نہیں کھاؤ گے۔ تمہیں بتاؤ میری یہ بات صحیح ہے یا نہیں کہ بعض رائیں اور صرف بعض اشخاص کی رائیں قابل قدر ہیں اور باقی رائیں اور باقی لوگوں کی رائیں قابل قدر نہیں ہیں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

ک یقیناً

س اچھوں کا لحاظ کرنا چاہیے، بروں کا نہیں کرنا چاہیے؟

ک اور کیا

س اور دانش مندوں کی رائے اچھی اور بے وقوفوں کی رائے بری ہوتی ہے؟

ک یقیناً

س اچھا ایک اور مسئلے میں ہم لوگوں نے کیا کہا تھا؟ کیا وہ شخص جو ورزش کا شغل اختیار کرتا ہے ہر ایک کی تعریف اور مذمت اور رائے کی پروا کرتا ہے یا صرف ایک شخص کی، خواہ وہ اس کا معالج ہو یا استاد۔

ک صرف ایک شخص کی۔

س اور اسے بہت سے لوگوں کی نہیں بلکہ صرف ایک شخص کی مذمت سے ڈرنا چاہیے اور تعریف سے خوش ہونا چاہیے؟

ک ظاہر ہے

س اور اسے اس طریقے سے کام کرنا، ورزش کرنا، کھانا پینا چاہیے، جسے ایک فرد

واحد یعنی اس کا استاد جو صاحب فہم ہے، مناسب سمجھتا ہے نہ کہ اور سب لوگوں کی رائے کے مطابق۔

ک سچ ہے۔

س اور اگر وہ ایک شخص کی رائے کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی کرے اور ان بہت سے لوگوں کی رائے مان لے جو بالکل نافہم ہیں تو نقصان اٹھائے گا یا نہیں؟

ک یقیناً نقصان اٹھائے گا۔

س اور وہ نقصان کیا ہوگا کس طرف رخ کرے گا اور خلاف ورزی کرنے والے کی کس چیز پر اثر ڈالے گا؟

ک ظاہر ہے اس کے جسم پر اثر ڈالے گا۔ یہی چیز ہے جسے یہ نقصان برباد کر دیتا ہے

س بہت ٹھیک۔ اب بتاؤ کریٹو، کیا یہ بات دوسری چیزوں پر صادق نہیں آتی جنھیں ایک ایک کر کے گنوانے کی ضرورت نہیں؟ کیا عدل و ظلم، حسن و قبح، نیک و بد کے مسائل میں جن پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں ہمیں بہت سے لوگوں کی رائے پر عمل کرنا اور ان سے ڈرنا چاہیئے یا ایک شخص کی رائے پر جو صاحب فہم ہے؟ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ تمام دنیا سے زیادہ اس سے ڈریں اور اس کا احترام کریں؟ اور اگر ہم اس کا ساتھ دیں تو کیا اپنے نفس کے اس جوہر کو برباد نہ کر دیں گے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے؟ آخر یہ جوہر وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

ک یقیناً سقراط۔

س ایسی ایک اور مثال لے لو:۔ اگر ہم نافہم لوگوں کے مشورے پر عمل کر کے اس چیز کو برباد کر دیں جو تندرستی سے بنتی اور بیماری سے بگڑتی ہے تو زندگی کا لطف باقی رہے گا؟ اور یہ چیز جو برباد ہوتی ہے جسم ہی ہے نہ؟

ک ہاں۔

س اگر ہمارا جسم خراب اور فاسد ہو تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟

ک ہرگز نہیں۔

س اور کیا اس صورت میں زندگی کا لطف باقی رہے گا اگر انسان کا وہ اعلیٰ جوہر برباد ہو جائے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے؟ کیا ہم انسان کے اس جوہر کو' خواہ وہ کچھ بھی ہو' جس کا تعلق اور ظلم سے ہے' جسم سے کم تر سمجھتے ہیں؟

ک ہرگز نہیں۔

س پھر کیا اسے جسم سے برتر سمجھتے ہیں؟

ک بدرجہا برتر۔

س تو میرے دوست' ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ عام لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں بلکہ یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک شخص جو عدل اور ظلم کی ماہیت کو سمجھتا ہے کیا کہے گا اور حق کیا کہے گا۔ اس لئے جب تم نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں عدل و ظلم بد و نیک' عزت و ذلت کے بارے میں عام لوگوں کی رائے کا لحاظ رکھنا چاہیئے تو گویا بسم اللہ ہی غلط کر دی ——— مگر ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ "عام لوگ ہمیں قتل جو کر دیں گے"

ک ہاں سقراط' ظاہر ہے کہ یہی جواب دیا جائے گا۔

س اور یہ ٹھیک ہے۔ پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارا پرانا دعویٰ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مگر کیا میں ایک اور دعوے کے متعلق بھی یہی بات کہہ سکتا ہوں ——— کہ اصل میں زندگی کی نہیں بلکہ اچھی زندگی کی قدر کرنی چاہیئے۔

ک ہاں یہ بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔

س اچھی زندگی با عدل اور باعزت زندگی کا نام ہے۔ یہ دعویٰ بھی صحیح ہے؟

ک ہاں صحیح ہے۔

س ان مقدمات کی بنا پر میں اس لیۓ پر بحث کروں گا کہ مجھے بغیر اہل ایتھنس کی اجازت کے قید خانہ سے نکل بھاگنا چاہیۓ یا نہیں۔ اگر میرے لیۓ بھاگنا صریحًا جائز ہے تو میں اس کی کوشش کروں گا ورنہ نہیں اور چیزیں جن کا تم ذکر کرتے ہو یعنی روپے کا سوال، بے عزتی کا ڈر اور بچوں کی تعلیم کا خیال میرے خیال میں محض عوام کے نظریات ہیں۔ وہ تو، اگر ان کے امکان میں ہو، لوگوں کو زندہ کرنے پر اسی طرح مستعد ہو جائیں جس طرح قتل کرنے پر مستعد رہتے ہیں —— بغیر کسی معقول وجہ کے۔ اب چونکہ یہاں تک ہمارا سارا استدلال تسلیم کیا جا چکا ہے اسکے بعد صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے آیا ہمارے لیۓ جائز ہے کہ ہم بھاگیں یا دوسروں سے اپنے بھاگنے میں مدد لیں اور انھیں روپے کی یا شکریے کی شکل میں اس کا معاوضہ دیں یا در اصل یہ ناجائز ہے۔

اگر دوسری صورت ہے تو موت یا کسی اور مصیبت کو جو میرے نہ بھاگنے سے واقع ہو گی بحث میں لانا ہی نہ چاہیۓ۔

ک میرے خیال میں تم ٹھیک کہتے ہو سقراط، تو پھر ہم کس طرح آگے بڑھیں۔

س آؤ ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں۔ ممکن ہو تو تم میرے دعوے کو غلط ثابت کردو میں قائل ہو جاؤں گا۔ ورنہ میرے پیارے دوست، اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ مجھے اہل ایتھنس کی مرضی کے خلاف بھاگ جانا چاہیۓ، تم جو مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہو اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن اتنی بہتر راۓ کے مقابلے میں تمہاری بات نہیں مان سکتا تو اب مہربانی کر کے میرے پہلے دعوے پر غور کرو اور جس طرح مناسب سمجھو جواب دو،

ک اچھی بات ہے۔

س کیا ہم یہ کہیں کہ ہمیں کبھی جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کرنا چاہیۓ یا یہ کہ ایک طرح سے بے انصافی کرنا جائز ہے اور دوسری طرح سے ناجائز ہے یا بے انصافی کرنا ہر حالت میں برا اور باعث ذلت ہے جیسا میں نے ابھی کہا تھا اور تم نے مان لیا تھا؟ کیا ان

سب باتوں کو جو ہم پچھلے چند روز میں تسلیم کر چکے ہیں رد کر دیں ؟ کیا اس عمر میں زندگی بھر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ ہم میں اور بچوں میں کوئی فرق نہیں ؟ یا عام لوگوں کی رائے کے باوجود چاہے نتیجہ اچھا ہو یا برا ہم اس پر زور دیں کہ جو ہم نے اس وقت کہا تھا وہ سچ تھا یعنی ظلم یا بے انصافی کا کام کرنے والے کے لئے برا اور باعث ذلت ہے ؟ ہم یہ کہیں یا نہ کہیں ؟

ک ضرور کہیں ؟

س تو ہمیں کبھی بے انصافی نہیں کرنی چاہیئے ۔

ک کبھی نہیں ۔

س اور جب ہمیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے بدلے اسے نقصان نہ پہنچائیں ۔ جیسا کہ عوام کا خیال ہے ۔ اس لئے کہ نقصان تو کسی کو پہنچانا ہی نہ چاہیئے ؟

ک ظاہر ہے ۔

س اور کریٹو ، کیا ہم کسی کے ساتھ برائی بھی نہ کریں ؟

ک ہرگز نہیں ۔

س اور برائی کے بدلے برائی کرنا جو عوام کا اخلاقی اصول ہے ـــــ یہ انصاف ہے یا بے انصافی ؟

ک بے انصافی ۔

س اس لئے کہ کسی کے ساتھ برائی کرنا اور اسے نقصان پہنچانا ایک ہی بات ہے ؟

ک بالکل ٹھیک ہے ۔

س تو پھر ہمیں انتقام نہیں لینا چاہیئے یعنی کسی کے ساتھ برائی کے بدلے برائی نہیں کرنی چاہیئے خواہ اس نے ہمارے ساتھ کتنی ہی بدسلوکی کی ہو ۔ مگر ذرا سوچ لو ، کریٹو ، کیا تمہارا واقعی یہی خیال ہے جو تم کہہ رہے ہو ۔ اس لئے کہ یہ رائے زیادہ آدمیوں کی نہ کبھی تھی اور نہ

ہوگی اور اس کے مخالفوں اور موافقوں میں کوئی بناستے اشتراک نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں کس قدر شدید اختلاف ہے تو لامحالہ ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ تو اب بتاؤ کیا تم میرے پہلے اصول سے متفق ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو کہ نقصان پہنچانا، یا انتقام لینا یا برائی کو برائی سے رد کرنا کسی صورت میں جائز نہیں؟ کیا ہم اسے اپنے استدلال کا مقدمہ قرار دیں؟ یا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں لیکن اگر تمہاری کچھ اور رائے ہوگئی ہو تو مجھے بتاؤ۔ اور جو تم اس سے پہلے خیال پر قائم ہو تو میں ایک قدم آگے بڑھوں۔

ک تم شوق سے آگے بڑھو اس کے لئے میں نے اپنی رائے نہیں بدلی ہے۔

س تو پھر میں ان کی بات کو لیتا ہوں جو ایک سوال کی شکل میں ظاہر کی جاسکتی ہے — کیا انسان کو وہی کرنا چاہیئے جسے وہ حق مانتا ہے یا حق کو چھوڑ دینا چاہیئے؟

ک اسے وہی کرنا چاہیئے جسے وہ حق سمجھتا ہے۔

س اگر یہ صحیح ہے تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ میں اہل ایتھنس کی رائے کے خلاف قید خانے سے چلا جاؤں تو کسی کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں جن کے ساتھ مجھے خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیئے کیا یہ ان اصولوں سے غداری نہیں ہے جنھیں ہم قرین انصاف تسلیم کر چکے ہیں بتاؤ کیا کہتے ہو؟

ک میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سقراط، اس لئے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

س تو پھر مسئلے پر اس پہلو سے غور کرو:۔ فرض کرو کہ میں فرار ہونے پر تیار ہوں (تمہیں اختیار ہے اس عمل کو جو چاہو کہو) اور قوانین اور حکومت اگر مجھ سے باز پرس کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔ "بتاؤ سقراط یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟ کیا تم اپنے ایک فعل سے ہم سب کو تباہ نہیں کر رہے ہو۔ کل قوانین کو اور ساری ریاست کو۔ جہاں تک تمہارے اختیار

میں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ریاست قائم رہے گی اور برباد نہ ہو جائے گی جس میں قانون کے فیصلے کوئی قوت نہیں رکھتے اور افراد انھیں پیروں تلے روند ڈالتے ہیں؟" ہم کیا جواب دیں گے، کریٹو، اس بات کا یا اسی قسم کی اور باتوں کا؟ ہر شخص، خصوصاً وہ جو فن خطابت میں ماہر ہو، تعزیری قانون کی حمایت میں بہت کچھ کہہ ڈالے گا۔ وہ ہدایت کرے گا کہ اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا ہم یہ جواب دیں "یہ تو ٹھیک ہے لیکن ریاست نے ہمارے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور خلاف انصاف سزا دی ہے؟"

ک بہت مناسب ہے، سقراط۔

س اس پر قانون پوچھے گا "کیا ہمارا تمہارا یہی معاہدہ تھا یا تم اس کے پابند تھے کہ ریاست جو سزا دی گی اسے برداشت کرو گے؟ اور اگر میں نے الفاظ کو سن کر حسرت کا اظہار کیا تو غالباً قانون یہ کہے گا "سقراط، آنکھیں پھیلا کر نہ رہ جاؤ، بلکہ جواب دو۔ تمہیں تو سوال کرنے اور جواب دینے کی عادت ہے تباؤ تم کو ہم سے کون سی شکایت ہے جس کی وجہ سے تمہیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ ہمیں اور ریاست کو تباہ کرنے کی کوشش کرو؟ کیا ہم تمہارے وجود میں آنے کا باعث نہیں ہوئے؟ تمہارے باپ نے ہماری مدد سے تمہاری ماں سے شادی کی اور اس طرح تم پیدا ہوئے کیا تمہیں ہم میں سے ان قوانین پر اعتراض ہے جو شادی سے متعلق ہیں؟ مجھے جواب دینا پڑے گا کہ نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یا ان قوانین پر جو بچوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں اور جو تم نے بھی حاصل کی ہے؟ کیا تعلیم کے قوانین نے تمہارے والد کو جو حکم دیا کہ تمہیں علوم موسیقی اور ورزش سکھائے جائیں وہ بے جا تھا" ؟ میں جواب دوں گا بالکل بجا تھا۔ تو پھر جب ہم تمہیں وجود میں لائے اور ہم ہی نے تمہاری پرورش کی، تمہیں تعلیم و تربیت دی تو کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم ہمارے بچے اور ہمارے غلام ہو جیسے کہ تم سے

پہلے تمہارے آبا و اجداد تھے؟ اور اگر یہ سچ ہے تو تم ہمارے برابر کے نہیں ہو اور
تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمہیں ہمارے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنے کا حق ہے جیسا
ہم تمہارے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر تمہارا استاد یا باپ ہی ہوتا اور وہ تمہیں مارتا یا برا بھلا
کہتا یا تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتا تو کیا تمہیں یہ حق تھا کہ تم بھی اسے مارو یا برا بھلا
کہو یا اس کے ساتھ اور کسی قسم کی بدسلوکی کرو؟ ظاہر ہے کہ تم یہ کبھی نہیں کہو گے۔ کیا
اس وجہ سے کہ ہم تمہیں ہلاک کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تمہیں اپنے خیال میں یہ حق
حاصل ہے کہ تم اس کے بدلے ہمیں اور اپنے ملک کو برباد کر دو جہاں تک تمہارے
امکان میں ہے؟ اے حقیقی نیکی کا دعویٰ کرنے والے کیا تم بناوٹ سے یہ کہو گے کہ تمہارا
یہ فعل جائز ہے؟ کیا تم جیسے فلسفی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا ملک ماں باپ اور سب
بزرگوں سے زیادہ قابل قدر ہے اُن سے زیادہ مقدس اور محترم اور دیوتاؤں اور ذی فہم
انسانوں کی نظر میں زیادہ عزیز ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جب وہ خفا ہو تو اس کے غصے
کو ٹھنڈا کریں، اس کی منتیں کریں اس سے بھی زیادہ نرمی اور ادب سے جتنی اپنے
باپ کی کرتے ہیں، اسے سمجھا بجھا کر قائل کریں یا اگر وہ قائل نہ ہو تو اس کے حکم کی تعمیل
کریں، جب وہ ہمیں قید کی یا تازیانے کی سزا دے تو اسے چپ چاپ برداشت
کرلیں، اگر وہ ہمیں میدان جنگ میں زخم کھا کر یا جان دینے کے لئے بھیجے تو ہم وہاں
چلے جائیں جیسا کہ ہمارا فرض ہے کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ دشمن کے آگے
سر جھکا دے یا پیچھے ہٹ جائے یا اپنی صف کو چھوڑ دے بلکہ خواہ میدان جنگ ہو
خواہ عدالت یا کوئی اور جگہ اس پر لازم ہے کہ وہی کرے جو اس کے ملک یا شہر کا حکم
ہے، ورنہ پھر نیکی کے بارے میں ان کا جو نظریہ ہے اسے بدل دے اگر اسے اپنے باپ
یا ماں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہیئے تو اپنے ملک کے ساتھ تو اور بھی نہیں کرنی
چاہیئے" ہم اس کا کیا جواب دیں کہ قوانین کا قول سچ ہے یا نہیں میرے خیال میں

سچ ہے۔

ک میرے خیال میں سچ ہے۔

س قوانین یہ کہیں گے" ذرا سوچو تو سقراط، کیا ہمارا کہنا ٹھیک نہیں کہ جو کوشش تم کر رہے ہو، اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اس لئے کہ جب ہم تمہیں دنیا میں لا کر تعلیم و تربیت دے چکے اور تم کو اور دوسرے شہریوں کو ہر اچھی چیز جو ہمارے اختیار میں تھی تقسیم کر چکے اس کے بعد اسی آزادی کی صورت میں جو ہم نے ہر باشندۂ ایتھنس کو دے رکھی ہے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے شہر کے طور طریق کو دیکھنے اور ہم سے واقف ہونے کے بعد وہ ہمیں پسند نہ کرے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں جی چاہے چلا جائے اور اپنی املاک ساتھ لے جائے۔ ہم میں سے کوئی قانون نہ اسے منع کرے گا اور نہ اس کی راہ میں حائل ہوگا، ہر وہ شخص جو ہمیں اور ہمارے شہر کو پسند نہیں کرتا اور کسی اور شہر یا نوآبادی میں جا کر رہنا چاہتا ہے اسے اس کی اجازت ہے اور وہ اپنی املاک پر بدستور قابض رہے گا۔ لیکن جس شخص کو اس کا تجربہ ہے کہ ہم کس طرح عدالت اور ملک کا انتظام کرتے ہیں اور پھر بھی وہ ہماری ریاست میں رہتا ہے اس سے گویا ہم نے بالکنایہ یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ کرے گا اور جو ہماری نافرمانی کرے وہ تہرے جرم کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ ہماری نافرمانی گویا والدین کی نافرمانی ہے، دوسرے اس لئے کہ ہم اس کے مربی ہیں، تیسرے اس لئے کہ اس نے ہم سے معاہدہ کیا ہے کہ ہمارے احکام کی تعمیل کرے گا نہ تو وہ ہمارے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور نہ ہمیں قائل کرتا ہے کہ یہ احکام خلاف انصاف ہیں۔ ہم اس پر زبردستی نہیں کرتے بلکہ یہ اختیار دیتے ہیں کہ یا تو ہمارا حکم مانے ورنہ ہمیں قائل کر دے ——— ہماری طرف سے یہ موقع دیا جاتا ہے مگر وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا۔

اس طرح کے الزام تم پر لگائے جائیں گے سقراط، جیساکہ ہم نے کہا ہے اگر تم اپنے ارادے کو عمل میں لائے۔ تم ایتھنس کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مورد الزام قرار پاؤ گے۔" اب فرض کرو میں ان سے پوچھوں کہ آخر میں اوروں سے زیادہ مورد الزام کیوں ٹھہروں گا تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ تم نے اوروں سے زیادہ اس معاہدہ کو تسلیم کیا ہے۔ وہ کہیں گے" اس بات کا صریحی ثبوت موجود ہے، سقراط، کہ تم ہم کو اور شہر کو پسند نہیں کرتے ایتھنس کے باشندوں میں تم سب سے زیادہ شہر میں رہے ہو اور چونکہ تم یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتے اس لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ نہ تم ایک بار کے سوا کبھی کھیل دیکھنے استھمس گئے اور نہ کہیں اور بجز ان موقعوں کے جب قومی خدمت انجام دے رہے تھے۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح سفر نہیں کرتے۔ تمہیں دوسری ریاستوں اور ان کے قوانین کو دیکھنے کا شوق نہیں۔ تمہاری محبت کا دائرہ تو بس ہم تک اور ہماری ریاست تک محدود ہے۔ تم ہمیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے ہماری حکومت سے راضی تھے۔ اسی شہر میں تم نے بچے پیدا کئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اس سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں تم چاہتے تو اپنے لئے جلاوطنی کی سزا تجویز کر دیتے۔ ریاست اب تمہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی مگر اس وقت دے دیتی۔ مگر تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم موت کو جلاوطنی پر ترجیح دیتے ہو اور مرنے کے لئے تیار ہو۔ اب تم ان سب اعلیٰ جذبات کو بھول گئے ہمارے قوانین کا ادب کرنے کے بجائے ہمیں ستانے کے درپے ہو، اور وہ حرکت کر رہے ہو جو صرف ایک ادنیٰ غلام ہی کر سکتا ہے یعنی بھاگ کر جا رہے ہو اور ان سب معاہدوں سے پھرے جاتے ہو جو تم نے شہری کی حیثیت سے کئے تھے سب سے پہلے تو اسی سوال کا جواب دو:۔ کیا ہمارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے ہمارے زیر حکومت رہنے کا معاہدہ کیا تھا؟ بتاؤ یہ

بات سچ ہے یا نہیں ؟" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو ؟ کیا ہم اس پر مجبور نہیں کہ اس کی تصدیق کریں ؟

ک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں سقراط ۔

س تو پھر کیا وہ یہ نہیں کہیں گے" سقراط تم ان معاہدوں کو توڑ رہے ہو جو تم نے فرصت سے سمجھ بوجھ کر کئے تھے، عجلت یا جبر یا فریب کی حالت میں نہیں بلکہ ستر سال تک غور کرنے کے بعد ۔ اس اثنا میں تمہیں یہ آزادی تھی کہ اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے یا ہمارے معاہدوں کو خلاف انصاف سمجھتے ہو تو شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ ۔ تمہیں انتخاب کا موقع حاصل ہے خواہ لیکڈیمون چلے جاتے یا کریٹ جن دونوں ریاستوں کے نظم حکومت کی تم نے اکثر تعریف کی ہے یا کسی اور یونانی یا غیر ملکی ریاست میں ۔ مگر تم اور سب اہل ایتھنس سے زیادہ ریاست سے، یا دوسرے الفاظ میں ان کے قوانین سے (اس لئے کہ بغیر قوانین کے ریاست کو کون پوچھتا ہے) اتنے خوش معلوم ہوتے تھے کہ تم نے اس کی حد سے باہر قدم نہیں رکھا ۔ لولے لنگڑے اور اندھے بھی اس طرح جسم کو ایک جگہ نہ رہتے ہوں گے جیسے تم رہے اور اب تم بھاگنے پر آمادہ ہو اور اپنے معاہدے سے پھرے جاتے ہو ۔ ہماری بات مانو تو یہ ہرگز نہ کرو سقراط کیوں شہر سے فرار ہو کر اپنے کو ہنسواتے ہو ؟

ذرا سوچو تو کہ اگر تم اس طرح کی غلطی کرو گے تو تمہارا یا تمہارے دوستوں کا اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟ یہ بات کہ تمہارے دوست جلا وطن کر دئے جائیں گے اور حق شہریت سے محروم ہو جائیں گے یا اپنی املاک کھو بیٹھیں گے قریب قریب یقینی ہے اور خود تم سقراط، کسی ہمسایہ ریاست مثلاً تھیبس ۔ یا میگارا میں چلے جاؤ جن دونوں کا نظم حکومت بہت اچھا ہے ۔ دشمن کی حیثیت سے وہاں پہنچو گے ان کی حکومت تمہارے خلاف ہوگی اور سب وطن دوست شہری تمہیں قانون کی جڑ کھودنے

والا سمجھ کر بری نظر سے دیکھیں گے اور ججوں کے دل میں اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی
کہ ان کا تمہیں سزا دینا بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص قوانین کا بگاڑنے والا ہے
اغلب ہے کہ وہ انسانوں کے نوجوان اور ناسمجھ طبقے کا بگاڑنے والا بھی ہوگا تو پھر کیا
تم خوش آئین شہروں سے اور خوش خصلت انسانوں سے دور رہو گے؛ کیا
ان شرائط پر زندگی قابل قبول ہوگی؛ یا تم ان کے پاس جا کر بے باکی سے گفتگو کرو گے
مگر تم ان سے کہو گے کیا؛ وہی جو تم یہاں کہا کرتے ہو کہ نیکی اور عدل اور رسوم و قوانین
انسانوں میں بہترین چیزیں ہیں؛ کیا یہ بات مناسب ہوگی؛ ہرگز نہیں لیکن اگر تم خوش
آئین ریاستوں کو چھوڑ کر کریٹو کے دوستوں کے پاس تھسلی چلے گئے جہاں بدنظمی اور بے
اصولی کا دور دورہ ہے تو وہ لوگ تمہارے قید خانے سے فرار ہونے کا قصہ سن کر
بہت محظوظ ہوں گے اور اس میں زیب داستان کے لئے بہت سی مضحک باتوں
کا اضافہ کر دیں گے کہ تم کس طرح بکری کی کھال اوڑھ رکھی تھی یا کوئی اور بہروپ اختیار
کر رکھا تھا جیسا کہ مفرور شکل بدلنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص یہ پوچھنے
والا نہ ہوگا کہ تھوڑے دن اور زندہ رہنے کی حقیر خواہش کی بنا پر تمہیں اس بڑھاپے
میں مقدس ترین قوانین کو توڑتے ہوئے شرم نہیں آئی؛ شاید کوئی نہ پوچھے اگر تم
نے ان سب کو خوش رکھا لیکن اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو تمہیں بہت سی ذلت آمیز
باتیں سننی پڑیں گی۔ تم زندہ تو رہو گے مگر کس حالت میں؟ ——— سب لوگوں
کے خوشامدی اور خدمت گار بن کر اور تمہارا شغل کیا ہوگا؟ ——— تھسلی میں رہنا
اور کھانا پینا گویا تم نے محض پیٹ بھرنے کی خاطر پردیس کا سفر اختیار کیا اور یہ تمہارے
عدل وغیرہ کے اعلیٰ خیالات کہاں چلے جائیں گے؟ اگر تم یہ کہو کہ میں اپنے بچوں کی
خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں ——— ان کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہوں ———
تو کیا تم انھیں اپنے ساتھ تھسلی لے جاؤ گے اور انھیں کی شہرت سے محروم

کر دو گے؟ یہی وہ احسان ہے جو تم ان پر کرو گے؟ یا تم اس خیال میں ہو کہ اگر تم زندہ رہتے خواہ ان سے دور ہی کیوں نہ ہو، تو ان کی تعلیم و تربیت بہتر ہو گی اس لئے کہ تمہارے دوست ان کی خبر گیری کریں گے؟ تم سمجھتے ہو کہ اگر تم تھسلی کے باشندے ہو گے وہ تمہارے بچوں کی خبر لیں گے اور اگر دوسری دنیا کے باشندے ہو گے تو وہ ان کی خبر نہیں لیں گے؟ حالانکہ اگر وہ لوگ جو اپنے آپ کو تمہارا دوست کہتے ہیں کسی کام کے ہیں تو وہ ان کی مدد کریں گے ——— یقیناً کریں گے۔

"لہٰذا سقراط، ہم جنھوں نے تمہاری پرورش کی ہے جو کچھ کہتے ہیں کان دھر کر سنو'۔ زندگی اور بچوں کو مقدم اور عدل کو موخر نہ سمجھو بلکہ عدل کو سب سے مقدم سمجھو تاکہ عالم زیریں کے حاکموں کی نظر میں تمہارا عمل صحیح ٹھہرے۔ اس لئے اگر تم نے کریٹو کی بات مان لی تو نہ تم کو اور تمہارے متعلقین کو اس دنیا میں زیادہ خوشی اور پاکی اور نیکی میسر ہو گی اور نہ دوسری دنیا میں زیادہ سعادت حاصل ہو گی۔ اب تم بے گناہ دنیا سے جا رہے ہو مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ظالم کی۔ تمہیں انسانوں نے سزا دی ہے نہ کہ قوانین نے۔ لیکن اگر تم بدی کے عوض بدی کرو اور نقصان کے بدلے نقصان پہنچاؤ ان معاہدوں کو جو ہم سے کئے ہیں توڑ دو اور ان لوگوں کے ساتھ برا سلوک کرو جن سے تمہیں خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیئے، یعنی اپنے، اپنے دوستوں کے، اپنے ملک کے اور ہمارے ساتھ، تو جب تک تم زندہ ہو ہم تم سے بیزار رہیں گے اور ہمارے بھائی یعنی عالم زیریں کے قوانین تمہیں دشمن سمجھیں گے اس لئے کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے ہمیں برباد کرنے کی پوری کوشش کی ہے اس لئے تم ہماری بات مانو اور کریٹو کی نہ مانو۔"

یہ ہے پیارے کریٹو وہ آواز جو میرے کانوں میں آ رہی ہے جس طرح نے کی آواز صوفی کے کانوں میں آتی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ صدا میرے کان میں اس طرح گونج رہی ہے کہ میں اور کوئی صدا سن ہی نہیں سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اگر تم اور کچھ کہو گے تو بالکل بے کار

ہوگا۔ پھر بھی اگر کچھ کہنا ہو تو کہو۔

ک مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، سقراط۔

س تو پھر مجھے چھوڑ دو کریٹو کہ میں خدا کی مشیت کو پورا کروں اور جدھر وہ لے جائے چلا جاؤں۔

"کاروباری" تعلیم کے خطرات

(سید وقار عظیم صاحب ایم اے - بی ٹی)

مضمون شروع کرنے سے پہلے ہی مجھے اس بات کا احساس ہے کہ مضمون میں کاروباری تعلیم کے جن خطرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ان سے کہیں زیادہ خطرناک میرے مضمون کی سرخی ہے اس لئے کہ پڑھنے والے مضمون کو پڑھنا شروع کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر چکے ہوں گے کہ میں کاروباری تعلیم کے خلاف ہوں اور اس جگہ ایک ایک اس کی خرابیاں بیان کروں گا۔ اس لئے ناظرین سے سب سے پہلے تو یہ استدعا ہے کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ اس لئے کہ میرے خیال میں تعلیم کی نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی، تمدّنی اور اقتصادی اور ہر اس قسم کی ضرورت کا حل اگر ہمارے پاس ہے تو صرف اسی قسم کی تعلیم ہے جس میں بچے مدرسوں سے اپنی نمایاں خصوصیات و ضروریات کے مطابق، زندگی کے مختلف کاموں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو کر نکلیں۔

کاروباری تعلیم صرف اس لئے سب سے اچھی نہیں کہ وہ بچوں کی ہر نفسیاتی اور فطری ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوقِ تعمیر کی تکمیل کرتی ہے۔ انھیں ایک آزاد فضا میں رہ کر اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پلنے اور بڑھنے کا موقع دیتی ہے۔ ان میں شرکتِ عمل، ہمدردی، رواداری، محبت، کے جذبات کا صحیح احساس پیدا کرتی ہے۔ انھیں زندگی کے صحیح مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔ ان کی سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی قوتوں کو بیدار کر کے، ان پر جلا کرتی ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے سب سے اچھی ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے صحیح راستے پر چلاتی ہے۔ اس کے تجربات میں عملی اضافہ کرتی ہے۔ اور انھیں اس کی زندگی کا جزو بناتی ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق کاروباری تعلیم حاصل کرنے کے بعد، جو نوجوان زندگی کی راہوں میں قدم رکھیں گے اور اپنے مخصوص کاموں میں حصہ لیں گے، انھیں ایک تو اس لئے خوشی ہوگی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے انھیں حقیقی دلچسپی اور فطری لگاؤ ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ انھیں زندگی میں اپنے مرتبے کا صحیح اندازہ ہوگا۔ وہ یہ سوچیں گے کہ نظامِ حیات کو مکمل

بنانے میں ان کا بھی تھوڑا بہت حصہ ہے۔ اور زندگی کا پہیہ اس وقت تک روانی کے ساتھ حرکت نہیں کر سکتا، جب تک اس میں ان کا بھی ہاتھ نہ لگے۔ "خود آگاہی" اور "خود اعتمادی" کا یہ جذبہ اس کی انفرادیت کی تکمیل ہے۔ اور ہر سوسائٹی کے ہر فرد کی تکمیل کا لازمی نتیجہ ہے خود سوسائٹی اور اس کے نظام کی ترقی، تکمیل اور معراج۔

موجودہ زمانہ میں زندگی کی دوڑ بے حد دشوار ہے۔ اس کے ہر قدم پر ایک کانٹا، اور ہر منزل پر ایک نئی رکاوٹ ہے۔ اس لئے کوئی سوسائٹی اس وقت تک تیز رو قوموں کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک اس کے افراد میں خود اعتمادی کے ساتھ اس آگ دوڑ میں شریک ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو کچھ ہو رہا ہو تصور کے نزدیک اس سے بہتر ممکن نہ ہو۔ جب تک ہر شعبہ میں تکمیل نہیں، مکمل سوسائٹی کی تکمیل بھی غیر ممکن ہے لیکن ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں ہر شخص صرف وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے تو ہر شعبہ اتنی ہی ترقی کرتا ہے، جتنی تصور کے نزدیک ممکن ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے سوسائٹی کی ترقی اور بہبودی، زندگی کی دشوار دوڑ میں شرکت اور کامیابی کا امکان۔ اس لحاظ سے بھی "کاروباری" تعلیم کا تصور بہترین ہے۔

انفرادی اور مجموعی حیثیت سے، یا یوں کہئے کہ افراد کی ترقی اور قوم کی ترقی دونوں کے لحاظ سے "کاروباری تعلیم" تعلیم کے دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں کہیں اچھی ہے۔ لیکن حقیقت میں تعلیم کو "کاروباری" نقطۂ نظر سے دیکھتے وقت تعلیمی رہنماؤں کے سامنے نہ تو شخصی تکمیل کا تصور ہوتا ہے اور نہ قومی۔ نہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ تعلیم فطرت کے اصول کے مطابق ہے، نہ انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں نفسیات کے نکات پوشیدہ ہیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے افراد اس قابل ہو سکیں کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ان لوگوں کو سہارا دے سکیں جو سوسائٹی کے موجودہ نظام میں ان کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کے رشتے ان کے دم کے ساتھ ہیں۔ تعلیم کا عموماً یہی مقصد رہا ہے کہ قوم کا ہر شخص اسے حاصل کرنے کے بعد اپنی روزی کما سکے اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مقصد بہت اچھا ہے۔ اور ہم اپنے گرد و پیش زندگی کے دن پورے کرنے والوں کے ان گنتی ڈھانچوں کو دیکھ کر اس مقصد کے افادی پہلو کو اور بھی زیادہ قابل قدر سمجھنے لگے ہیں۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس صاحب درد کے ہم آواز بن کر جو زندگی کے غمناک پہلوؤں اور افسردگیوں کو تعلیم کی خرابیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے، پورے جوش کے ساتھ اس کے علم انقلاب کے نیچے آجاتے ہیں۔ لیکن کسی انقلابی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مانا کہ ہماری زندگی کی تمام تر خرابیوں کی ذمہ داری ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم پر ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کا ڈھانچہ بھی شروع سے آخر تک "کاروباری" تصورات پر بنایا گیا ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے تعلیم کے ان بلند مقاصد سے بالکل محروم ہیں، جو قدیم زمانے میں تعلیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان کی "انفرادی" صلاحتیں مردہ، ان کی شخصی قوتوں کا سرچشمہ خشک اور قوت فکر و عمل پابہ زنجیر۔ تعلیم ان میں فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے، نہ انھیں زمانہ کی ترقیوں کا ہمسفر ہونے کے قابل بناتی ہے، اور نہ ان میں قومی اور ملکی روایات کی جھلک باقی رکھتی ہے۔ یہ اس لئے کہ "تعلیم" یا "علم" میں بذات خود کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ خرابی ہے صرف مقصد کی۔ ہمارے موجودہ مدرسوں کی تعلیم کا مقصد صرف "کاروباری" ہے اور بے حد محدود حد تک "کاروباری" ہے۔ اسے زندگی کی حقیقتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، اور اسی لئے وہ بچے کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے دنیا "بیکاروں" اور "ناموزوں" انسانوں سے بھرتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے صرف اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ دفتروں کے بابو بن سکیں۔ "دفتر کا بابو" کوئی حقیر چیز نہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ دفتر کے بابوؤں کی تعداد بھی تھوڑی ہی سی ہے۔ اور خدا نے ہر شخص میں "دفتر کا بابو" ہونے کی صلاحتیں تو نہیں پیدا کیں۔

اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بیکاروں کی تعداد کم ہو اور کم ہوتے ہوتے بالکل باقی نہ رہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ

دنیا میں ایسے آدمی نہ دکھائی دیں جو اپنے ماحول کے لئے "ناموزوں" ہیں یا جو اپنے آپ کو دنیا سے بالکل بیگانہ اور بے واسطہ سمجھتے ہیں۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر شخص وہ کام کرے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ ہر شخص دفتر کا بابو نہ بنے۔ بلکہ اپنی فطری دلچسپی کے مطابق زندگی کے دوسرے مشاغل میں حصہ لے۔ اور دوسروں کا ہاتھ بٹا کر، زندگی کے نظام کو مکمل بنانے میں مدد دے۔ یہ ہے سب سے اہم مقصد جسکی بنا پر ہم اپنے مدرسوں کو "کاروباری" بنانا چاہتے ہیں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ نفسیات، اور فطرت کے اصول مختلف حیثیتوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔

ہر حساس دل چاہتا ہے کہ جلد وہ دن آئے جب ملک بھر میں اس طرح کے مدرسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھل جائیں۔ اور ملک کا ہر بچہ ان میں جاکر آزادی کی فضا میں پروان چڑھے۔ کھیل کھیل کر زندگی کی ضرورتوں میں حصہ لینے کے قابل ہو۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دے اور جوان ہوکر زندگی کے سفر میں گامزن ہو۔ بے شک بڑا مبارک وقت ہوگا جب ہمارے ملک کی فضا اس طرح بارونق نظر آئے گی ——— لیکن زیادہ حساس دل یہی سمجھتے ہیں کہ اس مبارک وقت کا پیش خیمہ کچھ بدشگونیاں بھی ہوں گی۔ تصور کو ان پھولوں میں کانٹے چھپے ہوئے نظر آرہے ہیں اور ہمیں انھیں کانٹوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ انھیں خطروں کی روک ضروری ہے۔

سب سے پہلا خطرہ تو یہی ہے جس کا ہم آج شکار ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ بچے انگریزی پڑھیں اور نوکریاں حاصل کرنے کے قابل ہوں بچوں نے انگریزی پڑھی انھیں نوکری ملی قوم کو ایک سیدھا راستہ مل گیا۔ ایک بھیڑ ادھر گئی تھی اس لئے سب ادھر گئیں۔ اور یہ مرض ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہوا ہم تک آیا۔ "جب سب نے انگریزی پڑھ لی" تو ہر ایک کو نوکری ملنی بند ہوگئی۔ بظاہر یہی انجام مہلک ہے لیکن اس سے زیادہ یہ ہوا کہ جب مشرق کے دماغوں میں مغرب کے اصول ٹھونسے گئے ۔ مشرق کی تاریخ کے بجائے مغرب کی تاریخ پڑھائی گئی۔ کالیداس، انیس اور غالب سے زیادہ شیکسپیر کی پرستش ہونے لگی۔ ہندوستان کے قدیم فلسفے کی جگہ برگساں، ہیگل اور سوپنہار کے فلسفیانہ نظریوں نے لے لی تو تعلیم کا اخلاقی، تعمیری اور تمدنی

مقصد فوت ہوگیا۔ اور قوم کے بچے اپنے ملک کی معاشرتی اور تمدنی روایات سے بیگانہ ہوکر ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جو ان کی فطرتوں کے منافی تھیں۔ انفرادی اور شخصی ترقی کا خاتمہ ہوگیا اور اس سے قوم اور ملک کی ترقی کو بہت بڑا دھکا لگا۔

اس لئے اپنے مدرسوں کو افادی پہلو سے "کاروباری" بنانے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے بلند مقاصد بھی سامنے رہیں۔ زندگی صرف اس کا نام نہیں کہ انسان کچھ کما کر کھانے کے قابل ہو جائے بمقررہ وقتوں پر کام و دہن کی لذت سیرابی کو اپنا مقصد سمجھے۔ سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اسکی کہ وہ زندگی کے تنوع کے مفہوم کو سمجھے۔ اسے اپنے گردوپیش کی چیزوں میں حیات کی روح افزا کیفیتیں نظر آئیں۔ فطرت کی رنگینیاں اس کی زندگی کو زیادہ قابل رشک بنا سکیں وہ اپنی قومی اور ملکی روایات کا آئینہ دار ہو ان کا تصور اسے زندگی کو زیادہ قیمتی سمجھنے پر مجبور کرے۔

اس نقطۂ نظر کو چھوڑ کر بھی اگر ہم صرف افادی پہلو سے دیکھیں تو کاروباری تعلیم کا مقصد اتنا محدود نہیں ہونا چاہئے کہ مدرسوں سے نکلنے والے نوجوان ایک خاص قسم کا کام کرنے کی مشین بن کر نکلیں انھیں اپنے اوزاروں اور مشینوں کا غلام نہیں بن جانا چاہیئے۔ اوزار اور مشینیں ان کے لئے ہیں وہ اوزاروں اور مشینوں کے لئے نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ جو کام وہ سیکھ کر نکلے ہیں، اس کے قومی پہلو سے بھی واقف ہوں۔ انھیں صرف یہ خیال نہ ہو کہ وہ ایک کام صرف روپے کمانے کے لئے کر رہے ہیں، بلکہ ان کے پیش نظر یہ خیال ہونا چاہیئے کہ انسانی زندگی میں ہمارے کام کی یہ اہمیت ہے اور اس لئے ہم یہ کام کرکے قوم، ملک اور انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص قسم کے چکر کا شکار نہیں ہو جانا چاہیئے اس ترقی کرتے ہوئے زمانہ کو ضرورت ہے ایسے لوگوں کی جن میں اپنے مخصوص کام کی مہارت کے علاوہ، آزادیٔ عمل، جدت، قوت فیصلہ، خود اعتمادی اور سب سے زیادہ اپنے آپ کو بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زمانہ آگے بڑھ جائے اور وہ ایک پرانی لکیر کے فقیر بن کر ایک خاص گھیرے میں محدود رہ کر کام کرتے رہیں۔ زمانے

کی ضرورتیں ہر چیز کو تیزی کے ساتھ بدل رہی ہیں۔ خصوصاً مشین اور سائنس کے اس عہد میں زمانہ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ سست فکر آدمی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جن میں ہر نئی ضرورت اور تبدیلی کا احساس اور اس کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہی اس زمانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس لئے بھی تعلیم کے نقطۂ نظر کو محدود بنانے سے کام نہیں چل سکتا۔ صرف اس لئے کہ سڑک پر لگا بجلی کا کھمبا ہماری ضرورتوں سے، آسمان کے تارے کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے، اگر ہم بجلی کے قمقمے کے حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنالیں گے تو ہماری ہر قوت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے تعلیم میں مقصد کی بلندی کا پیش نظر رہنا ضروری ہے "ہر کاروباری" تعلیم میں کم و بیش یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خطرہ سے بچنا بہت سخت ضروری ہے۔

"ہماری تعلیم اس مقصد میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟" اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ مدرسوں میں بچوں کو مادری زبان، قومی ادب، قومی تاریخ اور ملک کی قدیم روایات سے اچھی طرح واقف کرنے کے علاوہ، انھیں برابر فکر و عمل کا موقع دینا ضروری ہے۔ ان میں مختلف قسم کی اخلاقی قدروں کا صحیح احساس بے حد اہم چیز ہے۔ ان سب چیزوں سے سب اچھے مدرس واقف ہیں اور جو واقف نہیں بھی ہیں، وہ ان طریقوں پر عمل کریں گے جو ہمارے تعلیمی مفکر اس مقصد کی تکمیل کے لئے بتا رہے ہیں۔ لیکن مدرسے کے علاوہ، ایک دوسری چیز ہے جس کی مدد سے تعلیم کے بلند مقاصد کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہے یونیورسٹی۔

مدرسے کا مقصد بہت بڑی حد تک یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کو ان کی فطری ضرورتوں اور صلاحیتوں کے مطابق، زندگی کی کشمکش اور جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیار کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے بلند مقاصد کو بھی جاری رکھے۔ لیکن "کاروباری" تعلیم مدرسے میں ختم ہو جانی ضروری ہے۔ اتنے دن میں قوم کے بچوں کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے جو کہ وہ قوم کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے میں شریک ہو سکیں۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی ہوں گے جو فطرتاً فنون لطیفہ ادب و شعر تاریخ

فلسفہ کے لئے زیادہ موزوں ہیں، انھیں بھی "کاروباری" تعلیم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا ایک دوسری مہلک غلطی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع ملنے چاہئیں۔ تاکہ وہ مدرسے سے نکل کر کالج اور یونیورسٹی کی زیادہ آزاد فضا میں اپنی فطری دلچسپیوں کو سیراب ہونے کا موقع دیں۔ یونیورسٹی کو "کاروباری" زندگی سے الگ رکھ کر اسے صرف علم و فن، ادب و شعر، فلسفہ و تاریخ کے نکات کا سرچشمہ بنانا چاہیئے۔

اجتماعیت کے ربط خاص کے ساتھ

(مترجمہ مولوی برکت علی فراق - بی اے جامعہ)

یہ مسٹر جوڈ کی کتاب An Introduction to Modern Political Theory کے ترجمے کا ایک باب ہے۔ یہ سیاسیات پر ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ عام مطالعے کیلئے مختلف سیاسی نظریے سلیس عبارت میں پیش کر دیں اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ اپنی جامعیت اور اسلوب بیان کی بابت بہت مقبول ہوا ہے۔

تمہید :-

ایک چھوٹے سے رسالے میں اشتراکیت کا پورا پورا بیان جو اس کے سارے نظام پر حاوی ہو، ذرا مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول لفظ اشتراکیت سے جہاں نظریات کا ایک نظام مراد ہے وہاں اس سے ایک سیاسی تحریک کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ گو ہمارا خاص موضوعِ بحث اشتراکیت کا نظریہ ہی ہوگا مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس بحث میں اشتراکیت کی متعدد تحریکوں کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو۔ دوسرے نظریات کا یہ نظام جسے صحیح یا غلط، اشتراکیت کہا جا سکتا ہے کلیتہً سیاسی نہیں ہے اور کلیتہً کیا خصوصی طور پر بھی نہیں۔ یہ نظام بڑی حد تک معاشی ہے۔ پھر معاشی اور سیاسی نظریات باہم کچھ اس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں کہ عملی طور پر ہمارے امکان سے یہ چیز باہر ہے کہ ہماری بحث اشتراکیت کے سیاسی پہلوؤں ہی تک محدود رہے۔

ایک تیسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اشتراکیوں کے متعدد مذاہب میں جو آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، ہر مذہب ایک دوسرے سے مقاصد اور طریق

میں نہایت خفیف اختلاف کی وجہ سے الگ رہتا ہے۔ان مذاہب کی بعض حالات میں کافی اہمیت بھی ہے اور وہ نظریات جن کی یہ وکالت کرتے ہیں، بڑی خوبی سے واضح کر دئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ان کے حامیوں کے ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز القاب قائم ہو گئے ہیں، وہ اشتراکی نہیں ہوتے، بلکہ سنڈیکلسٹ، پنچایتی اشتراکی یا استمالی کہلانے لگتے ہیں۔اشتراکیت کے ان ارتقائی مذاہب کا ذکر الگ الگ ابواب میں ہوگا۔ اشتراکیت کی بحث اس لحاظ سے بھی مختلف ہوگی کہ اس نظرئے تک پہنچنے کے لئے کیا راہیں اختیار کی گئی ہیں۔مثال کے طور پر ہم اشتراکیت پر اس معنی میں بحث کر سکتے ہیں کہ یہ انفرادیت کے ردعمل کا ایک نتیجہ ہے یا اس معنی میں کہ یہ کارل مارکس کے نظریات کی ایک تفسیر ہے۔غرض بحث کا ہر طریقہ جو اختیار کیا جائے گا، اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت پر دال ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طریق بحث ایک مختلف تصویر پیش کرے گا۔یہ بات غالباً ہر نظرئے کی بہ نسبت اشتراکیت میں سب سے زیادہ ہے کہ جو بھی اس کا حامی ہے، اس کے ذہن میں اشتراکیت کا ایک سب سے الگ مفہوم ہوتا ہے اور ہر مفہوم مطابق ہوتا ہے اس کے حامیوں کی افتاد طبیعت اور موجودہ نظام کی افراط و تفریط کے متعلق اس زاویۂ نگاہ کے جس کے ماتحت وہ حمایت کرتے ہیں۔چونکہ اشتراکیت کے حامیوں کی تعداد کثیر ہے، اور ان میں بعض چھوٹے چھوٹے سیاسی رسالوں کے ملند پایہ مصنف ہوئے ہیں اس لئے اس موضوع پر تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ ہو گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ اشتراکیت کے صحیح اجزا کیا ہیں۔مختصراً یہ کہ اشتراکیت اس حسن کی مانند ہے جو ہر بوالہوس کی پرستش کی وجہ سے اپنی اصلیت کو کھو بیٹھا ہے۔

پھر چند ایسے مقاصد قائم کر لئے گئے ہیں جو بیشتر اشتراکیوں کے نزدیک خاطر خواہ ہیں، خواہ ان ذرائع کی نوعیت سے وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں جن سے ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔اشتراکی تصورات کا ایک اور مذہب بھی ہے جسے اجتماعیت یا ریاستی

اشتراکیت (State Socialism) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس مذہب کا ابھی زیادہ زمانہ نہیں ہوا زوال ہو چکا ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ ایک مرکزی نظریہ بھی ہے اور دوسرے نظریات کے لئے ایک مرکزِ آغاز بھی۔

بہرحال ہم اس عام اشتراک خیال کو جو اشتراکیت کے ہر مذہب میں یکساں پایا جاتا ہے۔ بنیاد بنا کر اس باب میں اشتراکیت پر بحث کریں گے۔ یہ اشتراکِ خیال جس حد تک ریاستی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے، ہماری بحث میں بیشتر اسی سے تعلق رہے گا۔

سب سے پہلے اشتراکیت کے ان مقدمات پر غور کیا جائے گا جن پر نظام اشتراکیت کا انحصار ہے، پھر اس کے اجتماعی اور سیاسی فلسفے کا ایک خاکہ دیا جائے گا اور آخر میں چند تجاویز کو بیان کیا جائے گا جن سے اشتراکیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ حتی الوسع ہم اپنی بحث کے لئے انہی تجاویز کا انتخاب کریں گے جو خفیف تبدیلیوں کے ساتھ ہر مذہب کے نزدیک قابل قبول ہیں۔

۱۔ اجتماعی اشتراکیت کے مقدمات :-

(الف)۔ کارل مارکس کی تصانیف۔ کارل مارکس حقیقت میں اشتراکیت کا بابا آدم ہے (برطانوی اشتراکیت کے معاملہ میں یہ دعویٰ کسی قدر تبدیلی کا محتاج ہے۔ مارکس یورپ کے لگ بھگ تمام اشتراکیین اور چند برطانوی اشتراکیین کے لئے مرکزِ ہدایات ضرور ہے۔ مگر دوسرے مذاہب اور خاص طور پر فیبین اشتراکیوں کے لئے ہاکِن، اووین، اور رسکن بہ حیثیت ماخذ کے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں)

مارکس سے پہلے، واقعہ یہ ہے، بے شمار نظریہ ساز مفکر تھے جو جماعت کی موجودہ حالت سے بیزار ہو کر معاشرت کے مثالی نظامات گڑھا کرتے تھے جس میں ملکیت مشترک سمجھی جاتی تھی اور بے انصافی کا نام تک نہ تھا۔ یہ لوگ انھی ذہنی تعمیروں کے ذریعے اپنی بھڑاس نکالا کرتے تھے۔ افلاطون کی "ریاست" (Republic) بھی انہی مثالی معاشرتوں میں سے

ایک ہی جا سکتی ہے۔ رابرٹ اووین کی طرح کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے تصورات کو جامد شکل میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ نمونے کی بستیاں بساتے تھے جن کے بسنے والوں کو اسی خاص قسم کی زندگی گذارنے کی ترغیب دی جاتی تھی جو ان کے بانیوں کے نزدیک انسانی زندگی کا بہتر سے بہتر نمونہ تھی اس قسم کے تجربے بلا استثناء ناکام رہے۔ اووین کو کسی حد تک مستثنیٰ کر کے مارکس سے پہلے اس قسم کے اشتراکی مصنفوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا کہ جماعت کا جو معیاری نظام وہ پیش کرتے ہیں وہ وجود پذیر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ نہ اس مسئلے کو سلجھایا گیا کہ اگر وہ نظام قائم ہو جائے تو اسے باقی رکھنے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جانا چاہیئے۔ بیشتر مفکر جن میں اووین اور فارئے بھی تھے اسی اعتماد کے ساتھ جو ایک الہامی صاحب نظریہ کو اپنے اوپر ہو سکتا ہے' یہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلا دیں کہ جب تمام بنی نوع انسان ان کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود بخود اپنی مرضی سے مجبور ہو جائیں گے' اس وقت ان کی اسکیمیں اپنی مکمل صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ ان تصوری معاشرت کے بانیوں میں سے بیشتر کی زندگیاں ناکامیوں اور نامرادیوں سے پر ہیں۔

غرض مارکس پہلا اشتراکی مصنف ہے جس کی تصنیف کو علمی کہا جا سکتا ہے۔ جس قسم کی جماعت کی اسے تمنا تھی' اس کا اس نے صرف خاکہ ہی نہیں تیار کیا ہے بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ ان مراحل کا بھی ذکر کیا ہے جن سے گذر کر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

مارکس کی تصانیف عام اس سے کہ مزدور پیشہ طبقے پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا' پیچیدگی سے خالی نہیں ہیں اور ان کی صحیح تعبیر کے مسئلے پر بہت شدید اختلاف رائے ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ مختلف تعبیرات جن کے لئے' ان تصانیف میں گنجائش نکل سکتی ہے' اشتراکیت میں مختلف مذاہب کے قیام کا باعث ہوئی ہیں۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لئے صرف یہ کافی ہوگا کہ مارکس کے دو نمایاں اور اہم نظریات کی

تشریح کردی جائے۔ اوران پر جو حاشیہ آرائیاں اور تعبیریں ہوئی ہیں، ان کو دوسرے ابواب کے لئے اٹھا رکھا جائے۔ ان میں سے ایک ہے نظریۂ قدر (Theory of Value) اور دوسرا تاریخ کا مادی تصور (Materialistic Conception of History)

ا۔ نظریہ قدر زاید :۔

مارکس انیسویں صدی کی جامد معاشیات کے اس نظریے کو کہ "قدر کا ماخذ محنت ہے" مسلمہ طور پر تسلیم کرتا ہے۔ وہ اسی نظریے پر تحقیق کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو قدیم معاشیین کے نتائج کے بالکل برعکس پڑتے ہیں مارکس کی تعبیر کے مطابق یہ نظریہ حسب ذیل ہے

سرمایہ دار جماعتوں کی دولت اصل میں اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ اشیاء قدر رکھتی ہیں اور یہ قدر اسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے وہ اشیاء انسانی ضروریات کی تکمیل کی اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ان کی قدر ان کے افادہ کے تناسب سے ہوتی ہے۔ ہم کسی چیز کے افادے کی مقدار اس کی صلاحیت مبادلہ کے مطابق متعین کرتے ہیں، چنانچہ مارکس اسی اصول کے مطابق ایک دوسرے کے مقابلے میں اشیاء کی قدر کو وضع کرنے کے لئے قدر مبادلہ (Exchange Value) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ قدر مبادلہ جسے عام طور پر قیمت کہا جاتا ہے، بازار کے حالات کے مطابق چڑھتی اترتی رہتی ہے لیکن یہ اتار چڑھاؤ اتفاقی ہوتا ہے خود اشیاء کی صلاحیت کو جس سے اس کی قدر یا یوں کہئے اس کی قدر مبادلہ متعین ہوتی ہے کو ختم کرنا تو کیا، کم بھی نہیں کرتا۔ یہ صلاحیت نام ہے اس محنت کی اوسط مقدار وقت کا جو اس چیز کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ گویا محنت کے وقت کی مقدار جو اشیاء کی پیدائش کے لئے اجتماعی حیثیت سے لازمی ہے، قدر مبادلہ کا اصلی معیار یا پیمانہ ہے اور قدر ہائے مبادلہ کے غیر اہم تغیرات کے باوجود اپنی جگہ اسی طرح مستحکم اور اٹل ہے جس طرح "فطرت کا کوئی مستحکم قانون۔"

مگر انسان کی محنت آپ سے آپ کوئی قدر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے اسے آلات

و اوزار استعمال کرنے ہوں گے جن کے بغیر محنت اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔ ان آلات و اوزار میں مشینیں ہیں، کارخانے ہیں، بھاپ کی طاقت ہے، بجلی ہے اور اسی طرح کے بے شمار اور آلات۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں بے شمار ایجادیں ہوئیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قدر کی پیدائش کے لئے ان آلات میں کام کردگی اور تعداد دونوں اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور ان پر ایک نسبتاً چھوٹے سے طبقے کا جسے سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے، قبضہ ہے۔ سرمایہ دار ننگے بھوکے مزدوروں کی محنت کو خریدتا ہے اور اسے اپنی مشین اور خام اشیاء پر لگا کر ایسی اشیا تیار کرتا ہے جن میں مبادلہ کی قدر موجود ہوتی ہے۔ یعنی ایسی اشیاء جنھیں اتنی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے جو مزدور کی اجرت اور کارخانے کے مصارف کے مجموعے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اشیاء کی اس قدر مبادلہ اور مزدور کی محنت کی قیمت میں جو فرق ہوتا ہے، اسے قدر زائد (Surplus Value) کہتے ہیں۔ یہ قدر زاید مزدور کی محنت سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا فائدہ اٹھاتا ہے سرمایہ دار آجر۔ یہ حقیقت میں وہ دولت ہے جو مفت کی محنت کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔

قدر زائد پر سرمایہ دار کا یہی غاصبانہ قبضہ ہے جو موجودہ صنعتی نظام کی صاف و صریح بے انصافی ہے اور جسے اشتراکیت کا ہر مذہب دور کرنا چاہتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام حقیقت میں یک غلامانہ نظام جماعت ہے جو صرف صورت ہی میں مختلف ہے۔ غلام بھی اپنے آقاؤں کے لئے قدر زائد پیدا کرتے تھے لیکن جبر کے ساتھ۔ موجودہ زمانے کا مزدور قدر زائد ایک آزادانہ معاہدے کے ماتحت پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ مزدور کے پاس دولت آفرینی کا اپنا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے اس کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ سرمایہ دار کے ہاتھ اپنی "شے" یعنی محنت بیچ دے۔ سرمایہ دار اس کے بدلے میں اسے سد رمق کے لئے تھوڑی سی اجرت دے دیتا ہے اور اس کی محنت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے، اسے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔

(۳) تاریخ کا مادّی تصوّر :-

اس کے بعد مارکس تاریخ سے اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ جماعت کس طرح ایک ایسے نہج پر منظم ہوئی جس میں ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ نہایت استقلال کے ساتھ قانون کی پشت پناہی کے ذریعے قدر زائد کو غصب کر رہا ہے جو نتیجہ ہے مزدوروں کی محنت کا۔ اس سوال کا جواب تاریخ کے مادی تصور کے ذریعے ملتا ہے۔ مارکس پہلا مفکر ہے جس نے اس بات کو غیر معمولی اہمیت دی کہ تاریخ میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کا تنہا محرک معاشی حقائق ہوتے ہیں۔ دوسرے مفکرین ان واقعات کا محرک شخصی حوصلوں، شاہی درباروں کے اثرات، یا سیاسی غصب واقتدار کو ٹھہراتے ہیں، لیکن مارکس کا دعویٰ یہ تھا کہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جایئے تو آخر تمام سیاسی رجحانات کے پیچھے معاشی مصالح نظر آئیں گے جو ان تاریخی واقعات کا سبب بنے۔ گویا تاریخ کی اس تعبیر کی رو سے مینلا کا یونانیوں کو ٹرائے لے جاکر پاریس سے جو ہیلن کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا تھا، بدلہ لینا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے رومیوں کا یہ مقصد تھا کہ مشرق سے تجارت کرنے کے لئے ایک نیا راستہ دریافت کیا جائے۔ ہاں تو تاریخ کا تعین آخری مرحلے پر معاشی محرکات سے ہوتا ہے۔ اور انسانی جماعت کے ارتقا کی ہر منزل میں مادی ارتقا کی ایک منزل نظر آئے گی جس پر وہ ایک خارجی دنیا میں ہو کر پہنچی ہے۔

اس طرح ہر منزل جو معاشی محرکات کے زیر اثر آئی، اس میں ساتھ ہی ساتھ ایک مناسبِ وقت سیاسی نظام اور ایک طبقہ وارانہ ڈھچر بھی موجود تھا۔ انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کے ذریعے معاشیات کو جو غیر معمولی فروغ ہوا، اس کے زیر اثر (۱) ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ الگ پیدا ہو گیا جو ذرائع دولت آفرینی پر قابض تھا اور (۲) ایک محروم الملک مزدوروں کا طبقہ الگ پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی انقلاب سے پہلے بھی آجر اور مزدور تھے اور چھوٹے پیمانہ کے سرمایہ دار بھی تھے، مگر جدید جماعت کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ ہے سرمایہ دار کا بہ حیثیت ایک طبقے کے اقتدار، ریاست کی ایسی ساخت جو اس اقتدار کو مؤثر بنا سکے، اور

مزدوروں کا پورے معاشی نظام میں سرمایہ داروں سے مقابلہ۔ یہ مہلک مقابلہ اور دونوں طبقوں کے مفادات کا تضاد جو اس مقابلے کا سبب ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان اس کشمکش اور جھگڑے کو آگے بڑھاتا جارہا ہے جسے عرف عام میں "طبقہ وارانہ جنگ" کہتے ہیں۔

لیکن جماعت کوئی قائم اور جامد چیز نہیں ہے۔ یہ ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ جماعت کے ارتقا کی سرمایہ دارانہ منزل اسی تبدیلی اور گردش کے ماتحت جب وقت آجائے گا، ختم ہوجائے گی اور دوسری منزل آجائے گی۔ سرمایہ داری نظام کی مستقبل میں یہ شکل ہوگی کہ سرمایہ چند سے چند ہاتھوں میں مجتمع ہوجائے گا اور ایک طرف چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار بتدریج ختم ہوجائیں گے اور دوسری طرف محروم الملک مزدور روز افزوں بڑے پیمانہ پر منظم اور ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ جب یہ صورت حال عروج پر پہنچ جائے گی تو مزدور طبقہ آگے بڑھے گا اور سرمایہ دار طبقے کو ختم کردے گا، اور جس طرح سرمایہ دار نے حقوق یافتہ خاندانی طبقوں کو جو پہلے صاحب اختیار رہتے الگ کردیا یا اپنے اندر جذب کرلیا، اسی طرح یہ مزدور طبقہ سرمایہ داروں کو ذرائع دولت آفرینی سے محروم کردے گا۔

• اس نظریے کے مطابق کہ سیاسی واقعات کے پردے میں معاشی تغیرات کا عکس نظر آتا ہے، مزدوروں کا غلبہ اپنے ساتھ ساتھ جماعتی نظام میں بھی ایک تبدیلی لائے گا اور طبقات کے باہمی امتیاز کے خاتمے کا باعث ہوگا۔

اس نظریے کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اس نے مزدور پیشہ طبقے کے خیالات پر نہایت غیر معمولی اثر ڈالا، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مارکس کو اشتراکیت کے "باوا آدم" کا پیغمبرانہ خطاب اس کے جس اثر کے پیش نظر دیا جاتا ہے اس کو قائم کرنے میں اس کے نظریۂ قدرِ زائد کی بہ نسبت اس نظریے (تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ) کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کی جاذبیت کا راز یہ ہے کہ یہ مزدور پیشہ طبقے کو اس جدوجہد میں ان کی فتح مندی کی بشارت دیتا ہے۔ تاریخ کا تجزیہ اگر اجتماعی ارتقار

کے اٹل اصول کے مطابق کیا جائے جس کے زیر اثر سیاسی تغیرات (جن کے پیچھے معاشی تبدیلیاں کارفرما ہوتی ہیں) رونما ہوتے ہیں، تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وقت آنے پر سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار سے محروم ہو جائے گا۔ پھر اس تمام کشمکش، طبقہ وارانہ جنگ، اور مزدور پیشہ طبقے کی تحریک کے کیا معنی؟ کیا یہ باتیں لازمی اور ناگزیر ہیں؟ کیا ارتقا تشدد آمیز اور ناگہانی تغیرات کے ذریعے واقع ہوتا ہے، یا کیا ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے کہ فطری ارتقا کی تدریجی رفتار ہی سے وہ جماعتی انقلاب جس کی ہمیں تمنا ہے آ جائے گا؟

ان سوالات کے جو مختلف جوابات دئے گئے ہیں، ان کی بنیاد پر اشتراکیت کے دو مذہب، انقلابی اشتراکیت اور ارتقائی اشتراکیت قائم ہو گئے ہیں۔ یہ دوسرا مذہب جسے بہ حیثیت مجموعی برطانیہ عظمیٰ میں اقتدار حاصل ہے، مارکس کی تصانیف کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتا ہے۔ جماعت چونکہ ارتقا پذیر اور حامل ارتقا ہے، اس لئے وہ ایک جان دار ہستی ہے، ایک با روح جسم جو ہر جان دار ہستی کی طرح پیدا اور فنا ہوتا ہے۔ (حیات و ممات دونوں تدریجی رفتار کے پابند ہیں۔ انسان کے تدبر کے ذریعے انھیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے، سہارا دیا جا سکتا ہے اور ان میں انسان کی کوششوں سے تازہ روح پیدا کی جا سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی فطرت بدل دی جائے یا ان کے دھارے میں رکاوٹ پیدا کر دیا جائے اور نہ یہی ممکن ہے کہ ان کی رفتار تیز کر کے ان میں ناگہانی طور پر ہولناک قسم کے تغیرات پیدا کئے جا سکیں)۔

غرض رفتار ارتقا نام ہے اصلاحات کے ایک سلسلہ کا جو جماعت کی تدریجی رفتار کو آنے والے انقلاب کی طرف لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ انقلاب انھی اصلاحات کے مجموعے کا ایک مرکب ہوگا وہ کسی ناگہانی تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہوگا جو ان اصلاحات کی بنیاد پر رونما ہوگی۔ ارتقائی اشتراکیت کا یہی مذہب جسے اجتماعی یا ریاستی اشتراکیت بھی کہتے ہیں، اس باب کے بقیہ حصے کا موضوع بحث ہوگا۔

بہت سے اشتراکی ایسے بھی ہیں جو مارکس کے نظریوں کی ایک بالکل مختلف تعبیر کرتے

ہیں مستقبل میں صورت حال جو کچھ بھی ہو وہ بہرحال اس حقیقت کو اہمیت دیتے ہیں کہ موجودہ جماعت
دو باہم متضاد طبقوں سے مرکب ہے، ایک صاحب ملک طبقہ اور ایک محروم الملک طبقہ جن میں
آپس میں کوئی اشتراکیت مفاد نہیں ہے۔ ان کے درمیان ایک بہت گہری خلیج حائل ہے جسے
صرف ایک ایسا انقلاب جو جماعت کی مکمل طور پر قلب ماہیت کر دے، پاٹ سکتا ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ جماعت میں واقعات کی قدرتی رفتار رہنا کے ذریعے تبدیلی اور ارتقا ممکن ہو، مگر اس اثنا میں
مظلوم مزدوروں کی زندگیاں مصیبت و فلاکت میں بسر ہوتی ہیں اور ان میں انتظار کا یارا نہیں
ہے۔ لہٰذا جماعت کے آنے والے انقلاب کو جلد از جلد بروئے کار لانے کے لئے ہر ممکن طریقے
اختیار کئے جانے چاہئیں۔ یہ انقلاب سیاسی اور معاشی نظام کو سرے سے بدل دے گا۔ اسے
ایک ایسی جنگ کے ذریعے بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس میں جنگ آزما مزدور پیشہ طبقہ
تشدد اختیار کرے گا تاکہ سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔

مارکس کے نظریات کی یہ تعبیر جو اشتمالیت اور کسی حد تک سنڈیکلزم کی بنیاد ہے آئندہ
کسی باب میں زیر بحث لائے جائے گی۔

یہودی

(پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب پاٹھک)

ا۔ یہودی دنیا میں کب اور کس طرح پھیلے

بنی اسرائیل کا قومی وطن فلسطین ہے مگر آج وہ دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا یا اس کے ثبوت میں کچھ خامہ فرسائی کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے کب اور کن حالات میں نکلے۔ یہودیوں کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جبراً وطن سے نکالا گیا' یا ان کو کسی بات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا' اور یہ کہ پہلے تو وہ مشرق میں بابل کی طرف گئے بعد ازاں مغرب میں روم کی طرف چلے گئے' حقیقت یہ ہے کہ وہ وطن سے نکلے' اور کچھ تو مشرقی ممالک کی طرف چلے گئے باقی روم وغیرہ مغربی ممالک کی طرف۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یروشلم کی تباہی بلکہ مسیح کی پیدائش سے بھی بہت عرصہ پہلے یہودی ہر ملک میں موجود تھے' "ہجرت" سے پہلے بھی ان کے "بیاج گھر" میسوپوٹیمیا کے علاقے میں پائے جاتے تھے بابل سے رفتہ رفتہ وہ مشرقی ممالک میں بڑھتے گئے۔ مغرب کی طرف اس زمانے میں ان کا سراغ یونان کے جنوب مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر آئیونیا میں ایشیائے کوچک میں' اور اگر مذہبی کتب پر یقین کیا جائے تو ہسپانیہ میں بھی' جہاں کہ وہ فنیقی جہاز رانوں کی معیت میں چلے گئے تھے۔ ملتا ہے۔

اس زمانے کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے ذرا بعد کے زمانے کے متعلق متعدد ذرائع سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہزار ہا یہودیوں نے اس بنا پر وطن چھوڑنے کا ارادہ کیا کہ وہاں کھیتی باڑی اور انگور کی کاشت میں بڑی مشقت درکار ہے اور فیصلہ کیا کہ آسان آسان

اور منفعت بخش پیشے اختیار کیے جائیں۔ اس موضوع پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔

ملک شام میں سٹیدن اور طارڈس کے مقاموں پر فینیقیوں کے پہلو بہ پہلو سب سے پہلے یہودیوں نے بستیاں بسائیں اور رفتہ رفتہ شام کے دوسرے شہروں بالخصوص انطاکیہ سلوشیا، لاؤڈیشیا اور دمشق میں بھی پھیل گئے۔ وہاں سے آگے چل کر وہ ایشیا ئے کوچک میں جا پہنچے اور کاروانی راستوں پر یا ساحلی شہروں میں قیام پذیر ہوئے۔ مثلاً کاپے ڈوشیا فرجیا ترسوس اور طرآس میں ـــ آیونیا میں وہ سمرنا افیس ملٹ ہالی کارنیس اور کنیڈس کے مقامات پر بالخصوص پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی نوآبادیاں سائپرس، روڈس ڈیلوس، پروس، کرتیا، تھیسےلونیا، کورنتھ، سپارٹا اور ایٹی کا میں بھی پھیل چکی تھیں۔

اٹلی میں روم کے مقام پر یہودیوں کے قیام کے متعلق سب سے پہلی قابل وثوق خبر ۱۳۹ قبل مسیح کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہر روم میں اس سے بھی کافی مدت پہلے سے آباد ہوں گے۔ کیونکہ وہاں ان کی ایک بہت بڑی مذہبی مجلس قائم تھی۔

شمالی افریقہ خصوصاً مصر کے شہروں میں بھی یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، اسکندریہ کی آبادی میں یہودیوں کی اقلیت سب سے زبردست تھی۔ اور یہ بطلیموس لاگی کی ہی روادار حکومت کا نتیجہ تھا کہ مصر میں یہودیوں نے جس جگہ چاہا بلا مزاحمت آباد ہوتے چلے گئے۔

اس طرح بحیرہ روم کے گرداگرد یہودی بستیوں کا دائرہ مکمل ہوا۔ یہ بستیاں باقاعدہ تجارتی شاہ راہوں سے ایک دوسری کے ساتھ مربوط تھیں گاہے بگاہے فلسطین سے یہودیوں کی ایک نئی لہر اٹھتی تھی اور ان نئی بستیوں میں پھیل جاتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہودی ساحلی علاقوں کے علاوہ اندرونی تجارتی شاہراہوں پر بھی آباد ہوتے گئے۔ سٹرابو لکھتا ہے کہ "مسیح کی پیدائش کے وقت شاذونادر ہی کوئی مقام ایسا ہوگا جہاں یہودیوں کی آبادی اور ان کا اقتدار نہ ہو" یہ الفاظ حرف بحرف صحیح ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ یہودی اپنے آبائی وطن فلسطین

سے نہایت قدیم زمانے میں نکلے، دوسری یہ کہ یہ ہجرت ان کی اپنی ہی رضا و رغبت سے واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ کسی قوم نے ان کو اس بات پر بھی مجبور نہیں کیا کہ وہ آئیں اور ان کے وطن میں آباد ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو گویا جنوں سا سوار تھا جو پہلے تو ان کو ملک بہ ملک لئے پھرتا رہا پھر چند صدیوں کے بعد اس امر کا موجب ہوا کہ یہودی مورخ ہرزفیلڈ کے قول کے مطابق وہ میڈیا سے لے کر روم تک، پونٹس سے لے کر خلیج فارس تک، اور مقدونیہ سے لے کر زنگ و حبش تک سارے ممالک میں آباد ہو گئے۔ اور اس وسیع خطہ میں کوئی علاقہ کوئی تجارتی شہر ایسا نہ رہا جس میں یہودی نہ جا پہنچے ہوں،

۲۔ تجارت اور ساہوکارہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دوسری اقوام نے کچھ اچھا سلوک نہ کیا، وہ جہاں جہاں گئے ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو لوگوں سے ملنے جلنے نہ دیا گیا لہٰذا ان کے پاس کسب معاش تجارت اور سود خواری کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ رہا مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہوس زر اور طمع منفعت کی وجہ سے وہ سود خوار رہے، جہاں گئے لوگوں کا خون چوسنے لگے، لہٰذا لوگوں نے ان کا مقاطعہ کیا تجارت بذات خود کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ موجودہ تمدن کا ایک جزو اہم ہے، ہمیں اگر ہم کوئی کلام ہے تو یہودیوں کی مخصوص طرز تجارت سے ہے۔

تاریخی حقائق یہ ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بلکہ اس سے بھی پیشتر فلسطین اور بابل کے درمیان تجارتی قافلوں کے راستے موجود تھے، حضرت سلیمانؑ آنے جانے والے سوداگروں سے ٹیکس وصول کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے ان سوداگروں کی سہولت کے واسطے دمشق اور دیگر مقامات میں منڈیاں اور بازار تعمیر کروائے تھے، ان کے زمانے میں مصر کے ساتھ گھوڑوں کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، نیز انہی کے زمانے میں فنیقیوں کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل نے مشرق بعید کے پراسرار اور دولت مند شہر اوفر کا مشہور سفر

اختیار کیا۔

اس شاہراہ کے علاوہ، جو دمشق سے چل کر صحرائی کنعان میں سے ہوتی ہوئی، خلیج ایکو تک پہنچتی تھی، اور بھی تجارتی راستے موجود تھے، ایک سوئٹو پولس سے سخم تک جاتا تھا، دوسرا بھی جنیا میں ہوکر سخم اور پھر وہاں سے یروشلم پہنچتا تھا۔ یروشلم اور ایلات کی بندرگاہ کے درمیان بڑی آمد و رفت رہتی تھی، تیسرا راستہ بندرگاہ ایاپ کو جاتا تھا، یہودی ان ہی تجارتی راستوں پر آباد تھے اور از منۂ قدیم سے قافلوں کے ساتھ لین دین اور بیوپار کرتے تھے، ممکن یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہت سے فلسطین کے اندرونی علاقے میں زراعتی اور صنعتی پیشوں میں مشغول ہوں گے ورنہ بصورت دیگر ان کے لئے ضروریات زندگی اور سامان خورد و نوش حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔

یہ جب وطن کو خیرباد کہہ کر باہر نکلے تو ان کی حریص نگاہوں کو جابجا حصول زر و مال کے زرین مواقع نظر آئے۔ ایران میں گئے، وہاں کے زراعت پیشہ باشندے بڑے سادہ طبع تھے، بس وہیں ساہوکارہ جما کر بیٹھ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مالا مال ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد وطن کو واپس جانے کی تحریک شروع ہوئی۔ بڑی بڑی پرجوش نظمیں لکھی گئیں۔ کہ اجڑے ہوئے وطن کو پھر سے بسانا چاہیئے۔ ایک طرف مال و دولت کے انبار، دوسری طرف فلسطین کا حوصلہ شکن ریگستان، جاتا کون؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ماسوائے چند کنگلوں اور چند ناکارہ بوڑھے ربیوں کے، جن پر ہر شخص دباؤ ڈال سکتا تھا اور کسی نے "اجڑے وطن" کا رخ نہ کیا، اور ان کی تجارت اور ساہوکارہ مشرق کی طرف بڑھنے لگا، اور وہ لوگ وہیں آباد ہوتے گئے۔ اب جو جو ان میں سے واپس وطن پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ویران سا، غیر آباد سا ملک ہے، جس میں اناج کی کاشت کرنے کے لئے بڑی محنت اور بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ سارا جوش وہیں بیٹھ گیا۔ وطن کی محبت پر طمع زر غالب آئی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جلد ہی وطن سے واپسی کی تحریک بھی شروع ہو گئی۔

بعض لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اطراف و جوانب کے ممالک میں بکھر گئے جہاں ان سے کچھ روادارانہ سلوک نہ ہوا بلکہ الٹے ان کے خلاف متعصبانہ قوانین وضع کئے گئے۔ لہٰذا ان کے لئے سوائے ساہوکارے کے کسب معاش کا اور کوئی ذریعہ نہ رہا۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، یہود دوسرے ممالک میں گئے کیونکہ وہاں ان پیشوں کے لئے ان کو کافی گنجائش نظر آئی۔ یہ محض ایک اتفاقیہ امر ہی نہیں تھا کہ یہودی مشہور شہور تجارتی مرکزوں میں ہی آباد ہوئے۔ اگر ان کو یہ خواہش ہوتی کہ محنت مزدوری کرکے روزی پیدا کی جائے، تو اول تو وہ اپنے وطن کو ہی نہ چھوڑتے اور اگر چھوڑا بھی تھا تو بجائے پہاڑی جزیروں، ساحلی چٹانوں اور صحرائی قصبوں کے وہ کسی زرخیز خطے میں آباد ہوتے۔ مگر ہوس زر نے ان کو ایسا نہ کرنے دیا۔ یہ حقائق ناقابل تردید ہیں، اور ان کے جواز میں ہم جس قدر اور جس زمانے کے چاہیں ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی اسپین کا پہاڑی علاقہ جہاں باسک قوم آباد ہے شہروں سے بالکل عاری تھا۔ سانچو بانگو دانشمند (۱۱۵۰ء) نے چاہا۔ کہ اس علاقے میں آمد و رفت سے رونق ہو جائے، اس غرض سے اس نے قدیم گشٹائز کو ایک شہر بنا دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ بیرونی ممالک کے جو لوگ اس شہر میں اپنی اشیا و اجناس فروخت کرنا چاہیں گے ان پر کوئی محصول یا ٹیکس نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کے تمام علاقہ جات سے یہودی جوق در جوق اس شہر میں آنے لگے تاکہ اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایران میں عباس صفوی مسند آرا سلطنت ہوئے تو دیکھا کہ پیہم خانہ جنگیوں نے مملکت کو ویران کر دیا ہے۔ چاہا کہ اس کی مالی حالت کو بہتر بنائے۔ اس غرض سے اس نے بیرونی ممالک کے سوداگروں کو وسیع مراعات دیں نتیجہ یہ ہوا کہ اوروں کے علاوہ یہودی بھی بے شمار تعداد میں آن وارد ہوئے۔ یہی حال پولینڈ، بوہیمیا اور دیگر ممالک میں ہوا۔ ان حقائق سے یا تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے دل جذبۂ حب وطن سے عاری ہیں۔ یا یہ کہ ہوس زر نے

اس جذبہ کو کمل کر نفس کے کسی تنگ و تاریک کونے میں چھپا دیا ہے اور ان کی سرشت میں آوارگی بھردی ہے کہ جہاں سود خواری اور تجارتی ہیر پھیر کا داؤ لگتا نظر آئے اسی طرف کو کھچ جائیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ لت ان کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہے، یہ کہنا کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے انھوں نے یہ عادات اختیار کیں محض بے بنیاد ہے۔ اینگلو سیکسن، سکینڈنیوین اور جرمن قوم کے لوگ بھی بیرونی ممالک میں گئے۔ عرق جبیں اور محنت بازو سے غیر آباد علاقوں کو آباد کیا، قابل زراعت بنایا اور انھیں اپنا وطن سمجھ کر لوگوں میں مخلوط ہو گئے۔ ان کے دوسرے بھائی جو وطن میں رہ گئے، حقائق ارضی و سماوی کے مشاہدات میں مصروف، کائنات کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے۔ مگر بنی اسرائیل اس اثنا میں عمدہ عمدہ تجارت خانوں اور منڈیوں کے انتخاب میں مصروف رہے۔

قرونِ اولیٰ میں بابل کا علاقہ، جسے آج کل عراق کہتے ہیں، تجارت کا مشہور مرکز تھا جہاں پر ہندوستان، چین اور دیگر دور دراز ممالک سے سوداگروں کے قافلے آتے تھے اور اپنے مال کے تبادلہ میں بابل والوں سے بحیرۂ روم کی منڈیوں کا مال لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ اسی طرح بابل والے، ہندوستانی، چینی، ایرانی، کشمیری، ترکستانی مال بحیرۂ روم کی منڈیوں کو بھیجتے تھے اور خود اس عوض معاوضہ سے خوب نفع اٹھاتے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بابل میں بھی یہودی ساہوکاروں اور آڑھتیوں کا زور تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے سوداگر بھی انہی امراض میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ بھی یہود کی طرح بدنام ہو گئے تھے۔ فنیقی جہاز راں بھی سوداگری کرتے تھے۔ یہودی اور فنیقی نسلی لحاظ سے ایک ہی اصل سے تھے۔ مگر جب کبھی لین دین یا بیوپار کے معاملہ میں مقابلہ آ پڑتا۔ یہودی مغلوب الحسد ہو کر ان سے بھی برسرِ پیکار ہو جاتے۔

اسکندریہ میں بھی یہودی ساہوکار بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔ ملکی محاصل کے اجارہ دار ہونے کے علاوہ چونکہ وہ بادشاہ کو بھی سود پر قرض دیتے تھے اس وجہ سے دربارِ شاہی میں بھی بڑی بڑی اسامیوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اس بڑھتے ہوئے

اسرائیلی اقتدار کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ان کے خلاف جذبہ پھیل گیا۔ فسادات ہوئے جن میں یہودیوں کو بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ یہ حال ۱۱۶ء میں تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ پھر اپنی پیشوں کی بدولت امیر کبیر ہو جاتے تھے۔

اسکندریہ کی طرح حبش میں بھی وہ بڑے مال دار و صاحب اقتدار رہتے تھے، اعمالِ رسل ۸۔۲۷ کے مطابق ملکہ کنادکی کا میر خزانہ ایک یہودی تھا، عرب میں، بحیرہ اسود کے گرد، اور یونان میں بھی ان کا بڑا زور تھا۔ یونان میں وہ غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔

تالمود کا مقولہ ہے "ایک سو فلورنس تجارت میں لگانے والا گوشت کھاتا اور شراب پیتا ہے۔ مگر ایک سو فلورنس زراعت میں لگانے والا ترکاری اور نمک" یہودی ابتدا سے اس مشورے پر کاربند تھے۔

جب ربی الیازر نے گوبھی اور چقندر کے کھیت کو دیکھا تو اس نے کہا "اے ترکاری چاہے تیری کتنی کاشت کی جائے تجارت کا رتبہ تجھ سے کہیں بلند ہے" جب وہ گیہوں کے کھیت میں سے گذرا اور لہلہاتی ہوئی بالیں دیکھیں تو وہ بولا "چاہے کتنا لہلہاؤ بیوپار تم سے افضل ہے"۔

اس فن و فریب، اس تاجرانہ ہیر پھیر کے خلاف خدائے بزرگ کے نبیوں نے بار بار آوازیں اٹھادیں (اس سلسلہ میں رسولِ عربی نے سب سے زیادہ اور موثر کام کیا۔ مولف) تالمود میں بھی جا بجا اس قسم کی تلقین موجود ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے ان ہدایات پر کبھی غور نہ کیا۔ ایک دفعہ بنی اسرائیل کو مشورہ دیا گیا کہ بجائے دھات کے وہ پتھر یا آبگینہ کے اوزان اور بٹے استعمال کریں۔ کیونکہ دھات گھس جاتی ہے اور نہ ہی ان کو نمک میں ڈالیں کیونکہ نمک ان کو کھا جاتا ہے۔ یہ حکم یا مشورہ ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں مگر یہودیوں کی ایمان داری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کیا گیا۔ ہوزیا نے بھی لکھا ہے "کنعان کے ہاتھوں میں جعلی اوزان ہیں، کنعان ایک دولت پرست ملک ہے" دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ جا بجا یہی بات ملتی ہے۔ جن جن قوموں میں یہود جا کر آباد ہوئے مظلو

ونادار ہوگئیں اور جب تک انھوں نے شور شر برپا نہ کیا یا وطن کو خیرباد نہ کہا اس بے رحم ساہوکار نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزامات دشمنی یا حسد کی وجہ سے لگائے جاتے تھے مگر بیسویں صدی کی دنیا ان طفل تسلیوں میں کب آتی ہے جب یہودیوں کے قیام کا ہر جگہ ایک ہی سا نتیجہ نکلتا ہے۔ تو کیا ہم یہ فرض کریں کہ ہر قوم ان کی دشمن یا حاسد ہے؟ ہرگز نہیں۔ لازمی طور پر اس کی دیگر وجوہات ہیں' تاریخ عالم کے جاننے والے ہر قوم' ہر ملک' ہر شہر میں موجود ہیں' اور وہ جان سکتے ہیں' کہ یہ وجوہات کیا ہیں۔

جب سائچو دانشمند کے اعلان کے بموجب یہودی باسک قوم کے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ تو انھوں نے سیدھی سادھی تجارت کی تجارت کی بجائے وہی روپے کا لین دین بھی شروع کر دیا ضرورت مند کسان اور شہری قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ان کی جائدادیں اور زمینیں سب یہودیوں کے پاس رہن ہوگئیں اور ان کی حالت بہت خستہ و خراب ہوگئی۔ مگر اس بات پر پیچ و تاب کھا کر کہ باہر سے آئی ہوئی ایک چھوٹی سی قوم ہمیں یوں تباہ کرتی چلی جائے' ان کی غیرت نے جوش مارا اور وہ آمادۂ فساد ہوئے۔ شہر وکٹوریہ کے بلدیہ نے شاہ کے پاس جا کر داد و فریاد کی' کہ لوگوں میں یہودیوں کے خلاف جذبۂ نفرت پھیل رہا ہے ممکن ہے کشت و خون تک نوبت جا پہنچے۔ حفاظتی پیش بندی کر لینی چاہیئے۔ شاہ نے فوراً فوج بھیج دی اور اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی یہودی ساہوکارہ نہ کرے' ورنہ "سارے شہری برباد ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ہمارے محنت سے بسائے ہوئے شہر کو چھوڑ کر کہیں ہجرت کر جائیں۔" یہ واقعہ ۱۳۳۲ء کا ہے' عباس صفوی کے اعلان کے بعد ایران میں جا کر بھی بنی اسرائیل نے یہی وتیرہ اختیار کیا اور ایرانیوں کے خون کو اس طرح چوسا کہ وہ سخت قلاش ہو گئے۔ اس غاصبانہ لوٹ کھسوٹ اور رعایا کی داد و فریاد کا آوازہ شاہ کے کانوں میں بھی پڑا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم بے چارہ مدت تک اس الجھن میں پھنسا رہا کہ یہودیوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ تاکہ دوسرے غیر ملکوں کو ضعف نہ پہنچے" قسطنطنیہ میں بھی وہ

اسی طرح مال دار ہو گئے تھے" ناورنیر لکھتا ہے " دولت یا تو قیصر کے ہاتھ میں ہے یا یہودیوں کے خصوصًا ان یہودیوں کے جو قسطنطنیہ میں رہتے ہیں، کیونکہ جہاں تک بیرونجات کا تعلق ہے، یہ کمبخت لوگ، عیسائیوں سے بھی نکمے ہیں۔ کھیتی باڑی سے ان کو سخت عار ہے اور چونکہ ان کی معاش کا مدار ہی سود خواری پر ہے، قسطنطنیہ سے باہر ان کا گذارہ مشکل ہے" پاشا کو بھی یہودی قرض دیتے تھے۔ مگر اکثر جعلی سکوں میں۔ صیغۂ محصول کی بھی وہی مہتمم تھے، اور عیسائیوں سے بڑی سختی سے محصول وصول کرتے تھے، شام و مصر و فلسطین میں بھی محصولات کے اجارہ دار وہی تھے۔ سارگریدو اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے " طمع زر قسطنطنیہ کے اندر ایک پیشہ ور عورت ہے جس کے دلال یہودی ہیں۔"

فرانس اور پرتگال کے متعلق ہم آئندہ لکھیں گے، جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، وہاں یہ حالت تھی کہ یہودی" بے رحم غلام فروش" کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ چونکہ وہ بہت امیر تھے اس لئے جہاں جاتے تھے لوگوں کو دبا لیتے تھے۔ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح وہ قوانین جو عیسائیوں کی محافظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں ٹوٹ جائیں یا کم از کم سپرد طاقِ نسیان رہیں اور استعمال میں نہ آئیں۔ حتیٰ کہ آخر کار حکومت کو سخت گیرانہ پالیسی اختیار کرنی پڑی، بہت سوں کو عیسائی بنا یا گیا، بہت سوں کو ملک بدر کیا گیا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا اور صدیوں تک جائز شہری حقوق، اور ساہوکارے کے درمیان کشمکش جاری رہی، اور ایک مدت تک دونوں فریق ایک دوسرے کی مذہبی تنگ نظریوں اور تعصبات کا شکار ہوتے رہے۔ مشہور یہودی مورخ کیسر لنگ لکھتا ہے " بنی اسرائیل ازمنۂ قدیم سے دلالی، آڑھت، اور ساہوکارے کا کام کرتے ہیں، وہ مورخین جو یہودیوں کے خلاف ہیں اسے سودخواری (WUCHER) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔" یہی مورخ اپنی تاریخ کے آغاز میں اس بات کا اقرار کرتا ہے " کہ یہودیوں کو دوسرے شہریوں کے برابر حقوق حاصل تھے بلکہ ان کو زیادہ مراعات حاصل تھیں"

"مندرجہ بالا تاریخی حقائق اس بات کو اچھی طرح سے ثابت کر دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے دوسروں کی دشمنی یا جبر کی وجہ سے سود خواری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کی سود خواری نے دوسروں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ ایک اور جگہ یہی یہودی مورخ فخر سے لکھتا ہے" ازمنہ وسطی میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی تجارت کہاں ہوتی تھی؟ اسپین کے یہودی قدیم زمانے سے غلاموں کی تجارت کرتے تھے، جزیرہ نمائے آئبیریا کے اندر کوئی مقام ایسا نہیں تھا جس میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی منڈی ہو۔ یہ منڈی بہت مدت تک قائم رہی اور جب تک کہ موروں نے آکر اس ملک پر اچھی طرح سے تسلط نہ جما لیا۔ اس منڈی میں یہودیوں کا بول بالا رہا۔ بعد ازاں یہ تجارت موروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اب روم کو لیجئے۔ یہ شہر صدیوں تک سیاسی اور مذہبی مناقشات اور فسادات کا مرکز رہا۔ کئی فاتح آئے اور لوٹ مار کر کے واپس لوٹ گئے، یہاں بھی بنی اسرائیل نے اپنے گھناؤنے لچھنوں کو نہ چھوڑا، قیصر اور پوپ سبھی یہودیوں کے ہی بکھیڑوں میں پھنسے رہے۔ بالآخر انھیں مجبوراً یا تو یہودیوں کے حقوق و مراعات چھیننے پڑے یا سود خواری کے خلاف قوانین وضع کرنے پڑے، یا ان سے وہ بلا جسے دینے سے وہ انکاری تھے جبراً وصول کرنی پڑی اور ان کو اس بات سے منع کرنا پڑا کہ وہ عیسائی قوم کے بزرگوں کی ہتک کریں۔ یا کبھی ان کے تیوہاروں اور قومی رسوم کی ادائگی کے لئے ایک مجلس نگراں قائم کرنی پڑی، وغیرہ وغیرہ۔ روم کے اندر مالدار یہودیوں کے پاس بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ جن میں وہ خود کام نہیں کرتے تھے بلکہ جیسا کہ فاگل تستائن رگر لکھتا ہے"۔ ان کی جاگیروں پر کھیتی باڑی کرنے کے لئے گالیائی اضلاع (موجودہ فرانس) سے غلام درآمد کئے جاتے تھے، چنانچہ غلاموں کی خوب تجارت ہوتی تھی" اٹلی کے دوسرے شہروں میں بھی یہودی بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔

کیسینیہ کے باشندگان کو خوف لاحق ہوا کہ مبادا سرمایہ کے زور سے یہود سارے شہر پر قابض ہو جائیں انھوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف جد وجہد کی جس کا نتیجہ

ہوا کہ "یہودی سود خوار اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ ۲/۱ ۲ بیس فی صدی سے زیادہ سود نہ
ں گے، شہر کا منصف اس فیصلہ سے اپنی کامیابی پر بڑا خوش ہوا" لوآر لو میں بنی اسرائیل
تنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ عیسائیوں کو ان کی وجہ سے بجائے اتوار کے ہفتہ کے روز
ٹی منانی پڑتی تھی، یہی حال بہت سے دوسرے شہروں کا بھی تھا،

وینس، جنوا، اور فلورنس ان باتوں سے مستثنٰی رہے کیونکہ وہاں کے باشندے
یہودیوں سے زیادہ چالاک اور سود خوار تھے۔ چنانچہ لمبارڈون کے خلاف بھی اسی قسم
کے الزام لگائے جاتے تھے فرانس میں ان کے خلاف بھی قوانین وضع کئے گئے، یورپ
کے رہنے والے بھی بسا اوقات عیسائیوں کی سی نہیں بلکہ "بتپسمہ یافتہ" یہودیوں کی سی زندگی بسر
تے تھے۔ (لمبارڈون کو نفرت کی وجہ سے "بتپسمہ یافتہ یہودی" کہا جاتا تھا۔ اب یہ بات کہ ان
کے خلاف بھی اسی طرح نفرت پھیلی جس طرح کہ یہودیوں کے خلاف، صاف ظاہر کرتی ہے کہ نفرت
ی قوم سے نہیں تھی بلکہ سود خواری، اور بیوپاری ہیر پھیر سے تھی، جو قوم یا فرقہ ساہوکارے
پیشہ اختیار کرتا تھا، لوگوں میں اسی کے خلاف جذبہ نفرت پھیل جاتا تھا اور یہ ایک قدرتی امر ہے)
بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف یہود کا رویہ یہ تھا۔ کہ جنگ و جدال کے واسطے ان کو قرضہ دیتے
رہتے تھے۔ ان کی دیگر جائز و ناجائز ضروریات و خواہشات کو پورا کرتے رہتے تھے، ان کو فضول
خرچی اور عشرت پسندی پر اکساتے رہتے تھے اور اچھی طرح سے گمراہ اور مقروض کر دینے کے بعد
ان کو ایسا بنا لیتے تھے کہ بغیر یہودیوں کے ان کا گذارہ مشکل ہو جاتا تھا۔ ان "خدمات" کے
عوض بھاری سود کے علاوہ جا و بے جا مراعات بھی حاصل کر لیتے تھے۔ ایسے حکمران بھی قدرتی طور
یہود کی حمایت کرتے تھے۔ ان حالات میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باشندگان ملک کو
اپنے حقوق منوانے کے لئے کس قدر جد و جہد کرنی پڑتی ہو گی۔ اس زمانے میں یہود کے خلاف
حکمرانوں سے کوئی بات منوا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ضرورت پڑنے پر لاؤ لشکر سے بھی یہودیوں
کی محافظت کی جاتی تھی۔ لوآرا کے مقام پر یہودیوں کی ہتک کرنے والوں کو اس سختی سے سزا

جاتی تھی گویا اس نے کسی معزز شخص کی عزت پر ہاتھ اٹھایا ہو' وہاں یہودی ساہوکاروں کو گرفتار نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں ان کے تجارتی مال پر کوئی محصول نہیں تھا۔ ٹوڈیلا میں تو شاہ سانچو دانشمند نے ایک قلعہ یہودیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ کہ اس میں حفاظت سے رہیں' اس کے علاوہ جائداد یہودیوں کے ورثہ میں ملتی تھی اس میں سے دسوند نہیں لی جاتی تھی۔ جب کوئی یہودی کسی عیسائی مقروض ہوتا تو مؤخر الذکر کے لئے لازمی تھا کہ وہ شہادتیں پیش کرے جن میں سے ایک یہودی ۱۲۳۳ء میں ٹوڈیلا میں یہود کے خلاف سخت فساد برپا ہوگیا' لوگوں کو نیا آئین حکومت ور نئے حقوق دیئے گئے تب کہیں یہ فتنہ فرو ہوا۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وہی حال ہوگیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ نوارا کا شاہی خاندان بھی اس قدر مفلس ہوگیا۔ کہ ایک دفعہ انھیں شام کا کھانا بھی میسر نہ آیا اور انھوں نے یہودیوں سے غلہ ادھار لے کر گذارہ چلایا۔ اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ بنی اسرائیل کو اپنے محسنوں کے حال زار پر رحم آیا ہوگا۔ تو ہم سخت غلطی کریں گے' انھوں نے الٹا اپنی شرح سود کو اور تیز کر دیا۔ یہودی مورخ کیسر لنگ اس امر کا اعتراف کرتا ہے" ہم اس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس وقت یہودیوں کی شرح سود انتہا کو پہنچ گئی' لوگوں نے سب کچھ گروی رکھ دیا۔ کسان نے اپنا ہل' جاگیردار نے اپنی جاگیر' بادشاہ نے جواہرات' پشب نئے خاتم و نگین'

تمام ممالک میں یہی حال تھا۔ شاہانہ فضول خرچیاں اور بیرونی شان و شوکت ایک طرف' اور یہودیوں کی ناقابل تسکین حرص و آز دوسری طرف' لازم و ملزوم چیزیں ہوگئیں۔ بالآخر سوائے جبر و تشدد کے اور کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کرسکی' مگر اس کی قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑی' مارٹن لوتھر لکھتا ہے" لوگ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے بغیر حکومت کو چارہ اس لئے نہیں کہ وہ بڑی بڑی رقمیں قرض دے سکتے ہیں۔ مگر یہ رقمیں آتی کہاں سے ہیں؟ اپنی گرہ سے؛ ہرگز نہیں۔ بلکہ خود لوگوں اور ان کے حکمرانوں کی جیب سے۔ روپیہ رعایا کا ہے مگر یہودی مفت ہی میں لوگوں کا خون چوستے ہیں۔ کیا وہ ہماری سادہ لوحی پر ہماری پیٹھ پیچھے ہنستے نہ ہوں گے"

بنیادی قومی تعلیم میں سیر کی اہمیت

(محمد نذیر صاحب - استاد تعلیمی مرکز - جامعہ)

(یہ مضمون گذشتہ مضمون (نمبر ۱) کی فہرست کے نمبر ۱ کی تشریح میں لکھا گیا ہے۔
اس میں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بچوں نے مشاہدے کے لئے خود سوالات
قائم کئے ہیں اور ان کا مشاہدہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے بہت
غور و فکر کے بعد پروگرام بنایا ہے۔)

بنیادی قومی تعلیم میں بنیادی اور ضمنی حرفے کرانے کے سلسلے میں بچوں کو کئی مرتبہ تعلیمی مشاہدہ
اور تعلیمی سیر کے لئے لے جانے کا موقع پیدا ہوگا۔ اس سے حرفوں کے کرانے اور سیر سے متعلق
مضامین کے مطالعہ کرانے میں کافی مدد مل سکے گی۔

چھوٹے بڑے بچے سیر یا تفریح کا نام سنتے ہی ایک خاص دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فطرتی طور
پر اس کے شوقین ہوتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کی کئی ایک جبلتیں تسکین حاصل کرتی اور
نشو و نما پاتی ہیں۔ گو ہمیں بچوں کی سیر کے فطری جذبے میں بظاہر کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا لیکن
ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر بہت سی باتیں سوچ لیتے ہیں اور دوران سیر میں انھیں عملی
جامہ پہناتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر کرنے کے وقت جس قدر باتیں وہ سیکھتے ہیں ان کا اندازہ
ہم کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن پڑھائی کے دوران میں جب بچے اپنے کئے ہوئے مشاہدہ کا اعادہ
کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ باتیں بچے کے مشاہدہ میں آگئی ہیں۔ بچوں کے اس
قسم کے مشاہدے گو بے ترتیب اور بے مقصد ہوتے ہیں لیکن مدرسہ میں بامقصد پڑھائی کے
دوران میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ جماعت کے کئی بچوں کی بیان کی ہوئی باتیں جب جمع کی جاتی ہیں تو
استاد کی رہنمائی میں وہ باترتیب اور بامقصد بیان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور اس طرح بچوں کی

تجسس اور راز جوئی کی فطری صلاحیتیں اپنے کئے ہوئے مشاہدے کے بعد استاد کی رہنمائی سے صحیح راستہ پر لائی جا سکتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک صحیح واقفیت میں اضافہ اچھے مشاہدے اور کامیاب تجربات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بچے کی قوت مشاہدہ کی جتنی اچھی تربیت کی گئی ہوگی اور جتنے کامیاب اور تخلیقی تجربات کئے گئے ہوں گے واقفیت اتنی ہی ٹھوس، وسیع اور پراز صحیح معلومات ہوگی۔ بچے سیر کرنے کے دوران میں جن دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں انھیں تعلیمی مفاد کے لئے استعمال کرنا بہترین طریقہ تعلیم ہے۔ اس دلچسپی کو بامقصد بنانا اور بچوں کی آمادگی کا بغور مطالعہ کرتے رہنا اور مناسب وقت پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا بنیادی قومی تعلیم کے استاد کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بچہ ہر آنے والے مہمان سے پیار کرنے لگتا ہے اور مراجعت کے وقت اس کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کیا ایک دو دن میں اس کو مہمان سے اتنی ہی محبت ہو گئی تھی جس کا اس نے اظہار کیا؟ نہیں بلکہ فوری دلچسپیوں کے ماتحت اسے تو اسٹیشن کا ہنگامہ۔ ریل کا سفر اور انواع واقسام کے لوگ دیکھنے مقصود ہیں۔ کیونکہ وہ فطری طور پر ایسا کرنے کے لئے مجبور رہے بچے کی اس قسم کی اپج اور فوری دلچسپیوں کو ایک خاص سلسلے میں منسلک کر کے اور بامقصد بنا کر زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں ذیل میں اس بات کو درج کرتا ہوں کہ گتے کے کام میں کیونکر اکثر سیر کے لئے مواقع پیدا ہوتے رہے اور ان سے کس طرح تعلیمی فائدہ حاصل کیا گیا۔

جہاں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ بخوبی جانتے ہوں گے کہ بچوں کو عملی کام میں کتنی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کہاں تک تخلیقی اور تعمیری سرگرمیوں میں مشغول نظر آتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اپنی قوت تجسس کی بنا پر سوالوں کی کس قدر بوچھار کرتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی جبلتوں کو سیر کے ذریعے بہترین طور پر تسکین دی جا سکتی ہے۔

ان ضمنی کاموں یا بنیادی حرفوں کے لئے دو قسم کی سیر کرائی جا سکتی ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق

کسی گذشتہ سبق یا کام سے ہے اور دوسری وہ جو بچوں میں کسی کام کے لئے تحریک پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہو۔ گویا کبھی سیر کام کے سلسلہ میں اور کبھی کام سیر کے ماتحت کرائے جاتے ہیں۔

گتے کے کام میں سیر کے لئے مواقع اور ان کی تیاری:۔

استاد کام شروع کرانے سے پہلے بچوں کی تجاویز طلب کرکے سال بھر کا پروگرام مرتب کرے یعنی کون کون سے ماڈل تیار کئے جائیں۔ کون سا پہلے ہوا اور کون کون سا بعد میں؟ اور اس کی تکمیل کے لئے کون کون سی اشیا درکار ہیں؟ اس طرح ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔ بچے کاموں کی فہرست مرتب کرانے کے دوران میں عملی طور پر سوچنے اور لکھائی وغیرہ کی کافی مشق کریں گے۔

مثال کے طور پر ابتدائی چہارم کے طلباء نے کثرت رائے سے فائل بنانا پسند کیا۔ اب استاد بچوں کی توجہ اس طرف مبذول کرواسکتا ہے کہ ہم اس کا سائز ایسا رکھیں جس میں نہ تو گتا ہی ضائع ہو۔ نہ ابری اور نہ کاغذ۔ اس کام کے لئے بچوں کو گتے اور ابری وغیرہ کی پیمائش کی ضرورت ہے۔ لیکن فل اسکیپ کاغذ کی ابری اور گتا کسی صورت میں بھی ایسا نہیں کاٹا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی چیز ضائع بھی نہ ہو اور دیگر کاغذات اس میں بآسانی رکھے جاسکیں۔ اس وقت استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہے، فرض کر لیجئے اس نے تحریک کے طور پر تبلا دیا کہ اخباروں، رسالوں اور رجسٹروں کے کاغذوں اور سائزوں میں فرق ہوتا ہے۔ بچے فوراً سمجھ جائیں گے کہ کاغذ محض ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی کئی ایک قسمیں ہیں اور کئی ایک سائز ہیں، اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کے متعلق مزید واقفیت حاصل کی جائے۔ لہذا فوراً کاغذی کی دکان کا خیال آتا ہے۔ اس وقت اگر سیر کا پروگرام مرتب کیا جائے تو ایک لفظ سیر کی خوشی دوسرے حصول مقصد بچوں کے لئے بے حد دلچسپی اور خوشی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ لیکن یوں ہی کاغذی کی دکان پر چلے جانا اور کاغذ کے مختلف سائز دریافت کرکے لوٹ آنا زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ دیہاتی مدارس کے لئے تو ایسا ممکن بھی نہیں کہ بات بات پر سیر کا پروگرام مرتب کرتے رہیں اور آئے دن شہر آنے جانے کی

زحمت برداشت کریں۔ سیر کے لئے ایک دن نہیں بلکہ ہفتوں پہلے تیاری شروع ہونی چاہیئے سیر کے نام اور اس کی امید کی جو دلچسپی بچوں میں موجود ہے اس سے اس اثنا میں بے حد فائدہ اٹھایا جائے۔ کاغذ کے متعلق مختلف سوالات کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہاں بنتا ہے؟ کس چیز سے بنتا ہے؟ کیسے بنتا ہے؟ اس کے مختلف اوزان کا کیا حساب ہے؟ مختلف کاغذوں کے نام کیا ہیں؟ مختلف کاغذوں کے رنگ کیا ہیں؟ کاغذ کس کس کام میں لایا جاتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

جب بچوں کے سامنے بہت سی چیزیں ہو جائیں تو ان کو یادداشت کے طور پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت ان مختلف عنوانوں کو ایک فارم کی شکل دی جا سکتی ہے جو ہر حال میں مفید ہے۔ اس سے تھوڑے وقت میں زیادہ واقفیت مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے دکان دار۔ کاریگر اور دیگر لوگ ابھی اس بات کو نہیں سمجھتے کہ بچوں کی اس قسم کی تعلیمی مشاہدہ میں مدد کریں۔ ان کی حسب ضرورت اور حسب استعداد واقفیت بہم پہنچا سکیں مختلف جگہوں پر اس قسم کی معلومات حاصل کرنے میں اگر دکان دار یا کارخانے والے کسی وجہ سے پوری واقفیت نہ بھی دیں تو اس قسم کی خانہ پری بنیاد کا کام دے سکتی ہے اور استاد جماعت واپس لاکر بچوں کو ان کے متعلق مفصل معلومات دے سکتا ہے۔

ذیل میں تعلیمی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا رکی کاپیوں کا ایک ورق نقل کیا جاتا ہے۔ جو انھوں نے اپنی سیر کے ضمن میں کاغذ کے لئے تیار کیا تھا۔

اخباروں اور رسالوں کا کاغذ

نمبر شمار	نام کاغذ	وزن	سائز	قیمت فی پونڈ	تعداد کاغذ فی رم	کہاں کہاں سے آتا ہے	کس چیز سے بنتا ہے	کیفیت
(۱)	رف	۱۰ پونڈ	۲۲ × ۱۸	۲ر سے ۳ر تک	۴۸۰	ناروے سویڈن جرمنی زیکوسلواکیہ	بانس	
(۲)	"	" ۱۸	۲۰ × ۲۶	"	"		"	
(۳)	"	" ۲۱	۲۰ × ۳۰	"	"	"	"	کاغذ نمبر ۵ تا ۸ کاغذ نمبر ۱ تا ۴ کا دگنا سائز ہے
(۴)	"	" ۲۴	۲۲ × ۲۹	"	"	"	"	
(۵)	"	" ۲۸	۲۲ × ۳۶	"	"	"	"	
(۶)	"	" ۳۸	۲۶ × ۴۰	"	"	"	"	
(۷)	"	" ۴۸	۲۹ × ۴۶	"	"	"	"	

اس نقشہ کی مانند کاغذ کے سلسلے میں بچوں نے کئی ایک دوسرے نقشے بھی تیار کئے تھے
مثلاً فل اسکیپ کاغذ۔ ماؤنٹ پیپر۔ ڈرائنگ پیپر۔ رنگ دار کاغذ۔ رائٹنگ پیڈ پیپر۔ خاکی کاغذ
موی کاغذ۔ باریک کاغذ وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق مندرجہ بالا عنوانوں کے ماتحت
معلومات حاصل کی تھیں۔ اس قسم کی واقفیت مضامین کی مربوط پڑھائی میں بے حد مفید ثابت ہوسکتی ہے
خصوصاً حساب میں اس قسم کے خاکوں کو دوران سیر میں پُر کرانے کے بعد اس پر ایک طویل گفتگو کی
ضرورت ہے۔ بچوں کی انفرادی۔ ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری واقفیت کو جماعتی حیثیت دے کر مکمل کیا
جاسکتا ہے اور اس کے بعد ایک مضمون مرتب ہوسکتا ہے۔ جس میں مقابلہ کی صورت پیدا کر دینے
سے نتائج بہترین۔ خوشگوار اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کاغذ کے متعلق بہترین واقفیت بہم پہنچانے
کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ لہذا کاغذ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد تاریخ اور جغرافیہ
کے کئی ایک اسباق بچوں کو پڑھائے جا سکتے ہیں۔

آئیے ایک اور مثال پر غور کریں۔ بچہ چاقو سے گنا کاٹتا ہے لیکن برسات کا موسم ہونے
کی وجہ سے چاقو زنگ آلود ہوکر کام کا نہیں رہتا۔ اس وقت اسے تیز کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی
ہے۔ بچے اس کو پتھری پر رگڑ رگڑ کر تیز کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ پورے طور پر
کام نہیں دیتا۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سان پر چڑھا کر صاف اور تیز کیا جائے۔ استاد
اس وقت چاقو کے متعلق زیادہ سے زیادہ گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً اسے کون بناتا ہے؟ جب
لوہار نے چاقو بنایا تو کیا اس نے سان پر چڑھایا ہوگا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ چاقو بنانے میں اور کس کس
کاریگر نے مدد دی ہے؟ لوہار اور بڑھئی ہمارے لئے اور کون کون سی چیزیں بناتے ہیں؟ ہاتھ اور
مشین کے کام میں کیا فرق ہے؟ لوہا کتنی قسم کا ہوتا ہے؟ چاقو کس طرح بنایا جاتا ہے؟ لوہے کی
دیگر چیزیں کس طرح تیار کی جاتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس قسم کی گفتگو کے دوران میں بچے اپنے مشاہدے
میں آئی ہوئی باتیں پیش کرتے ہیں اور سب کی بات اور استاد کا مشورہ مل کر ایک مکمل واقفیت کی
صورت اختیار کر لیتا ہے اس وقت بچوں میں خواہ مخواہ یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود کاریگروں

کی دکانوں کا بغور مشاہدہ کریں۔ چنانچہ کئی ایک سمجھ دار طالب علم ایسا کرتے بھی ہیں لیکن جماعت کو اگر بحیثیت مجموعی دوران سیر میں ان باتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دلچسپی کے ساتھ ساتھ حصول مقصد ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے یعنی سیر کا پروگرام مرتب کرنا اور بآسانی معلومات حاصل کرنے کے لئے خاکے تیار کرنا وغیرہ اس قسم کے ایک سلسلے میں مرکز ہذا کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا نے جو سیر کا پروگرام مرتب کیا تھا اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) بڑھئی کی دکان
(۲) لکڑی کا کارخانہ
(۳) لوہار کی دکان
(۴) ڈھلائی کا کارخانہ
(۵) لوہے کا سامان فروخت کرنیوالی دکان
(۶) لوہے کی کان
(۷) لوہے کی خراد
(۸) لکڑی کی خراد
(۹) گتے کا سامان تیار کرنے والا کارخانہ
(۱۰) چاقو اور قینچی تیز کرنے والے کی مشین
(۱۱) کاغذی کی دکان

پروگرام مرتب کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی اور دو باتیں نکال دی گئیں جن کا اس وقت عمل میں لایا جانا مشکل تھا مثلاً لوہے کی کان، گو بچوں کی دلچسپی زیادہ تھی لیکن جب روپے کی فراہمی کا سوال ان کے سامنے آیا تو انھوں نے معمولی غور و فکر کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔ باقی جگہیں دیکھنے کے لئے باری باری ہر ایک مد پر غور ہونے لگا۔ ہر ایک مد کے لئے کاپی کے الگ الگ صفحوں پر بچوں کے مشورے سے خاکے تیار کئے گئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں صرف عنوانات کو درج کیا گیا ہے۔ پُر کرنے کا طریقہ تو آپ "اخباروں اور رسالوں کا کاغذ" کے خاکے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

بڑھئی کی دکان کا مشاہدہ:-

(۱) کس قسم کا لکڑی کا کام ہوتا ہے؟

(۲) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟

(۳) کس قسم کی لکڑی استعمال کرتے ہیں ؟

(۴) وہ لکڑی کہاں سے منگواتے ہیں ؟

(۵) کاریگر کتنے ہیں اور ان سے کیا کام لیتے ہیں ؟

لوہار کی دکان کا مشاہدہ :-

(۱) لوہے کا کس قسم کا کام ہوتا ہے ؟

(۲) کون سے اوزار کس کام کے لئے استعمال کرتے ہیں ؟

(۳) لوہا کہاں سے منگاتے ہیں ؟

(۴) کاریگروں کی تعداد کتنی ہے ؟

(۵) کونسا کاریگر کیا کام کرتا ہے ؟

(۶) کاریگروں کی مزدوری روزانہ کیا ہے ؟

لکڑی کا کارخانہ :-

(۱) کارخانے میں کون کون سی لکڑی موجود تھی ؟

(۲) یہ لکڑی کہاں کہاں سے آتی ہے ؟

(۳) مختلف لکڑیوں سے کون کون سی چیزیں بنتی ہیں ؟

(۴) پہاڑوں یا جنگلوں سے لکڑی کس طرح لائی جاتی ہے ؟

ڈھلائی کا کارخانہ :-

(۱) مشینیں کس سے چلتی ہیں ؟

(۲) لوہا کس چیز میں پگھلایا جاتا ہے ۔ اور پگھلانے کے لئے کیا کیا چیزیں استعمال کرتے ہیں ؟

(۳) پگھلے ہوئے لوہے سے کون کون سی چیزیں ڈھلتی ہیں ؟

(۴) لوہے کو کیسے پگھلاتے ہیں ؟

(۵) لوہا کہاں سے لاتے ہیں ؟

لوہے کا سامان فروخت کرنے والی دکان کا مشاہدہ :۔

(۱) اس کی دکان میں کون کون سی چیزیں موجود تھیں ؟

(۲) کون کون سی دیسی اور کون کون سی ولایتی چیزیں بک رہی تھیں ؟

(۳) مختلف چیزوں کے نرخ کیا تھے ؟

(۴) کارڈبورڈ کے لئے کوئی اور کارآمد چیز جو اس کے ہاں موجود ہو ؟

لوہے کی خراد کا مشاہدہ :۔

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی ؟

(۲) کتنے کاریگر کام کر رہے تھے ؟

(۳) ہر ایک کو اجرت یومیہ کیا ملتی تھی ؟

(۴) یہ مشین کس ملک سے منگوائی گئی تھی ؟

(۵) اس مشین کی قیمت کیا تھی ؟

لکڑی کی خراد کا مشاہدہ :۔

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی ؟

(۲) کتنے کاری گر کام کرتے تھے ؟

(۳) ہر ایک کی اجرت یومیہ کیا تھی ؟

(۴) مشین کی بناوٹ کیا تھی ؟

(۵) کیا چیز بنائی جا رہی تھی ؟

(۶) مشین کی قیمت کیا تھی ؟

کارڈبورڈ کا کارخانہ :۔

(۱) کس کس وزن کا کارڈبورڈ استعمال کرتے ہیں ؟

(۲) کس وزن کے گتے سے کون سی چیز بناتے ہیں ؟

(۳) گتا کہاں کہاں سے منگاتے ہیں ؟

(۴) کیا کیا چیزیں بناتے ہیں ؟

(۵) کس کس سائز کی بناتے ہیں ؟

(۶) کون سی چیز کس حساب سے بیچتے ہیں ؟

(۷) کس کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں ؟

(۸) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟

(۹) کاری گروں کی تعداد اور ان کے کام۔

(۱۰) کاری گروں کو کیا مزدوری دیتے ہیں ؟

چاقو اور قینچی تیز کرنے والی مشین کا مشاہدہ :۔

(۱) مشین کس سے چلتی تھی ؟

(۲) اس کو زمین پر کس طرح لگایا گیا تھا ؟

(۳) اس کی بناوٹ کیا تھی ؟

(۴) کتنے آدمی کام کرتے تھے ؟

(۵) ان کی اجرت یومیہ کیا تھی ؟

(۶) کون سی چیز تیز کی جا رہی تھی ؟

ان نقشوں کے پیش کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہر جگہ ایسے ہی مواقع پیش آئیں گے۔ بلکہ یہ ہے کہ پیدا ہونے والے موقعوں کو کس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے تعلیمی سیر کی تیاری پر روشنی ڈالی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کو بھی کمرۂ جماعت ہی میں طے کر لینا چاہیئے اس قسم کی بامقصد گفتگو بچوں میں آزادی کی روح اور

قوت استدلال کی تربیت کا باعث ہوتی ہے ۔مثال کے طور پر بڑھئی کی دکان کو لے لیجیے ۔ہر شہر کے بازاروں یا تنگ گلیوں میں تمام جماعت کا بیک وقت گزرنا اور پھر اس کی چھوٹی سی دکان پر جمع ہو کر واقفیت حاصل کرنا کس قدر دقت طلب کام ہے ۔البتہ گاؤں میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی ۔نیز ہمارے ملک کے کاری گر جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں چونکہ ناخواندہ ہیں لہذا وہ بچوں کی حسب استعداد واقفیت بہم پہنچانے سے بھی قاصر ہیں ۔اس کے علاوہ وہ بچوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ تمام باتیں لکھ کر نہ معلوم کیا کریں گے ۔کہیں پولس میں ان تمام باتوں کی رپورٹ نہ کر دیں یا تمام واقفیت حاصل کر کے کہیں خود کارخانہ نہ کھول لیں ۔جانے سے پہلے دوکان داروں اور کارخانہ داروں سے کسی با اثر آدمی کے ذریعہ بچوں کو ان باتوں کے متعلق دکھلانے کا مسئلہ طے کر لینا چاہیے ۔

اس قسم کی مشکلات پر اگر بچے پہلے ہی سے غور کر لیں تو ان کے لئے اس قسم کے مشاہدہ کے لئے جانا عملی طور پر مفید ثابت ہوگا ۔درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا نے جانے سے پہلے جو تجاویز بورڈ پر لکھوائیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بچوں کو اگر کسی با مقصد کام کے ماتحت سوچنے کا موقع دیا جائے تو ان کے لئے کس قدر مفید ہوتا ہے ۔

" آئیے بچوں کی ان تجاویز پر غور کریں جو انھوں نے مشاہدہ کرنے کے متعلق مرتب کیں ۔

(۱) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں ۔ہر ایک گروپ ایک ہی قسم کی مختلف دکانوں پر جا کر معلومات حاصل کرے ۔ان میں سے ایک لکھنے والا ہو ایک پوچھنے والا اور باقی غور سے سنیں ۔

(۲) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں ۔ایک لوہار کی دکان پر ایک بڑھئی کی دکان پر اور ایک ڈھلائی کے کارخانے وغیرہ وغیرہ میں بھیج دیا جائے ۔ان میں ایک سوال کرنے والا ہو ایک لکھنے والا اور باقی سننے والے ہوں ۔سیر کے بعد سب لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کر کے جماعت کو سنائیں ان رپورٹوں کی مدد سے ہر ایک طالب علم اپنی اپنی کاپی مکمل کر سکتا ہے ۔

(۳) جماعت چھ گروپ پر مشتمل کر لی جائے ۔ہر ایک گروپ تجویز کردہ پروگرام کے مطابق بڑھئی

لوہار وغیرہ کی دکان پر پہنچ جائے اور مشاہدہ کرے۔ اس کے بعد لوہار کی دکان والا بڑھئی کی دکان پر بڑھئی کی دکان والا ڈھلائی کے کارخانے میں اور کارخانے والا فرنیچر ہاؤس میں علی ہذا القیاس پہنچ جائے۔ گویا دائرہ بن جائے جو کمل ہونے کی صورت میں تمام جگہوں سے معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

(۴) ساری جماعت کو بیک وقت ہر ایک چیز دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔

اس وقت جماعت میں چار تجاویز تھیں اور ہر خیال کا طالب علم اپنی تجویز کو اہمیت دے رہا تھا۔ چونکہ اس جماعت کو میں اور نگراں صاحب سیر کرانے والے تھے لہذا نگراں صاحب نے میری موجودگی میں ان چاروں تجویزوں کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر تبصرہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نمبر اکثرت رائے سے منظور ہوئی۔ کیونکہ دہلی میں ایک ہی قسم کی اور ایک ہی جگہ پر کئی ایک دکانوں کا مل جانا نہایت آسان تھا اس لئے تجویز میں تھوڑی سی ترمیم کرکے تجویز نمبر ۳ کو بھی داخل کرلیا گیا۔ یعنی ڈھلائی کے کارخانے یا لوہے کا سامان بیچنے والی دکان کا مشاہدہ ساری جماعت ایک ہی وقت میں کرسکتی تھی۔ پروگرام مکمل ہونے کی صورت میں اگلے دن کے لئے سیر کا اعلان ہوگیا۔

یہاں پہنچ کر استاد پر ایک اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی اگلے دن بچوں کو پیدل یا لاری میں سوار کرا کے سیر کی غرض سے جانا مناسب نہیں۔ بلکہ مجوزہ مقامات پر پہلے ہی سے پہنچ کر طے کرلینا استاد کا فرض ہے۔ ایسا کرنے سے ایک تو کام باآسانی ہوگا۔ دوسرے پروگرام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوگی۔ بچے پابندیٔ وقت جیسی نیک عادت کی مشق کریں گے۔ یہ کام استاد کے لئے بھی ذاتی طور پر سرانجام دینا مشکل ہے۔ ممکن ہوسکتا ہے کہ استاد اس مقام ماحول یا اس علاقہ سے واقف نہ ہو۔ لہذا اسے کسی بارسوخ آدمی کی مدد حاصل کرنی چاہیئے۔ گاؤں کا استاد تو اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ اس جماعت کے پروگرام کی تکمیل میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ ہم لوگوں نے اپنے طور پر پہلے سے ہی ایک علیحدہ پروگرام تیار کرلیا تھا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ

وقت مقررہ پر اسکول سے چلے اور عین چھٹی کے وقت اسکول میں واپس پہنچ گئے۔
سیر کے ذریعے بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ سیر کے متعلق کوئی خاص تیاری عمل میں لائی گئی ہو لیکن کیا سیر کے خاتے پر استاد کا مقصد پورا ہوگیا؟ نہیں بلکہ اب وہ وقت ہے جب استاد اس حاصل کردہ واقفیت کو کسی کام میں لا سکتا ہے۔ بچوں کی حاصل کردہ واقفیت گو دیرپا اور مضبوط ہے لیکن کسی خاص سلسلے میں منسلک نہیں وہ ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط واقفیت ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک طالب علم یکساں واقفیت نہیں رکھتا۔ اس واقفیت کو متقل اور باترتیب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کمرۂ جماعت میں اس قسم کے سوال کئے جائیں جن سے ان کی واقفیت کا اعادہ ہو۔ اور اسی تکرار میں وہ کوئی منطقی صورت اختیار کرلے۔ یا یوں بھی ہوسکتا ہے کہ بچوں سے انفرادی طور پر سیر کا حال سنا جائے، سنانے والا بچہ استاد کی میز کے پاس کھڑا ہوکر اور جماعت سے مخاطب ہوکر گفتگو کرے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے جملے یا بھولی ہوئی باتیں استاد پوری کرتا جائے۔ اس طرح جماعت کے سامنے چند بچوں کی مدد سے سیر کی تمام کیفیت دوبارہ پیش کی جاسکتی ہے تیسرا طریقہ ڈرامہ ہے اگر وقت ہو تو اسی سیر کے اعادہ کے لئے کوئی ڈرامہ دیا سکتا ہے جس سے سیر اور سیر کے متعلقات اچھی طرح بچوں کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔

ہم نے اپنے پروگرام کے اختتام پر جو طرز عمل اختیار کیا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔
میں نے اور نگراں صاحب نے مل کر یہ اسکیم تیار کی کہ بچوں سے دو قسم کے مضامین لکھوائے جائیں یعنی ایک تو وہ ہوں جو ہر ایک پیشہ ور اور مقام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں اور دوسرے وہ جو سرسری طور پر سیر کے متعلق ہوں۔ چنانچہ ذیل کے مضامین لکھوائے گئے۔

مضامین خصوصی:۔ بڑھئی۔ لوہار۔ لوہے کا کارخانہ۔ فرنیچر ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔

مضامین عمومی:۔ سیر کی تیاری۔ دوران سیر میں کیا کیا دیکھا۔ سیر میں ہماری شرارتیں۔

چھوٹے بچوں کا ذخیرۂ الفاظ تو کم ہوتا ہی ہے لہٰذا ابتدائی چہارم کے طلبا سے مکمل طور پر اظہار خیال کی توقع کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان کی واقفیت کو ترتیب دیتے وقت مختلف مضامین کے لئے

اشارات تجویز کرلئے گئے۔ تاکہ بچے ان کی مدد سے باآسانی مضامین لکھ سکیں۔ ذیل میں چند ایک مضامین کے اشاروں کے خاکے تحریر ہیں۔

I لوہے کا کارخانہ:۔

(۱) تیاری:۔ ا۔ موقع۔ ب۔ گفتگو۔ ج۔ پروگرام میں اس کو کس طرح شامل کیا گیا۔
د۔ تیاری (خاکے وغیرہ)
(۲) سیر کے قوانین۔
(۳) پروگرام کی تقسیم۔

II سیر:۔

ا۔ روانگی۔ ب۔ جو جو مقامات دیکھے گئے۔ ج۔ مختصر حال۔ د۔ شرارتیں۔ ہ۔ واپسی۔

مندرجہ بالا مضامین ہر ایک طالب علم نے لکھے۔ بچوں کی تحریر کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ قارئین سمجھ سکیں۔ کہ بچے اس قسم کی رہنمائی میں کتنی آسانی سے اظہار خیالات اور برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لوہے کا کارخانہ:۔" ہماری جماعت کارڈ بورڈ کا کام کرتی ہے۔ ہم چاقو سے گتے کو کاٹتے ہیں ایک دن ہماری جماعت میں ذکر آیا کہ چاقو بنانے میں کن کن کاری گروں نے ہماری مدد کی ہے۔ ماسٹر صاحب نے بڑھئی اور لوہار کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ دوران گفتگو میں یہ ذکر آگیا کہ یہ دونوں کاری گر ہمارے لئے اور کیا کیا بناتے ہیں تو ہماری جماعت نے بورڈ پر ایک لمبی فہرست لکھ ادی۔ جب ہماری جماعت میں سیر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ہم نے مناسب خیال کیا کہ لوہے کے کارخانے کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ چنانچہ ہم نے اسے بھی پروگرام میں شامل کرلیا۔ سیر کے روز پونے نو بجے لاری میں بیٹھ کر باڑے ہوتے ہوئے پہاڑی دھیرج پہنچے جہاں لوہے کا کارخانہ تھا اور اس کا نام خراد کی مشین بھی ہے جو کہ بجلی کے ذریعہ چلتی ہے وہاں ایک سان کا پتھر تھا۔ وہ پرزوں اور اوزاروں کو تیز کرتا تھا۔ وہ پتھر بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ مشین

لوہے کو چھیلتی تھی۔ کارخانہ کے ایک طرف لوہے کا کام اور دوسری طرف لکڑی کا کام ہوتا تھا۔"

سیر:-

دوران سیر میں ہماری شرارتیں:۔ (۱) سڑک پر دوڑتے تھے۔ (۲) دکانوں پر سے چیزیں خرید کر سڑک پر کھاتے تھے۔ (۳) لالہ سری رام کی دکان پر جب گئے تو لڑکوں نے چنے لاکر جگالی شروع کر دی۔ (۴) بغیر اجازت لوگوں کی چارپائیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ (۵) چاروں طرف گھومتے تھے (۶) لاری میں شور مچاتے تھے۔ (۷)۔ ماسٹر صاحب کا کہنا نہیں مانتے تھے۔

ہماری تیاری اور تجاویز جہاں تک تعلیمی لحاظ سے کامیاب رہیں وہ تو آپ ملاحظہ فرما چکے اب آخر میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ بچوں نے اس قسم کے مشاغل کو جاری رکھنے کے لئے قدرتی طور پر استاد کو مزید تعلیم کے لئے کتنے مواقع فراہم کر دئے۔ ذیل میں محض ان موقعوں کو قلم بند کرتا ہوں جن سے با آسانی تعلیمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی تشریح اور تفصیل اگر پھر کبھی موقعہ ہوا تو ہدیہ ناظرین کروں گا۔

(۱) جب لاری پہاڑی پر سے گزر رہی تھی تو ایک بچے نے کہا "آپا جی! اب تو ڈرائیور صاحب کو بہت سا پٹرول پھونکنا ہوگا۔

(۲) ڈرائیور صاحب نے سڑک کے موڑ پر لاری آہستہ کر کے موڑی۔ فوراً ایک طالب علم نے کہا" ماسٹر صاجب!" ایک دن ڈرائیور صاحب نے جو تیز لاری موڑ دی تو ہم سب لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔"

(۳) ماسٹر صاحب! لاری میں زیادہ پٹرول خرچ ہوتا ہے یا کار میں؟

(۴) بچے موٹر میں رفتار بتانے والی سوئی کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جونہی لاری تیز یا ہلکی ہوتی وہیں ایک دوسرے کو رفتار بتانے لگتے۔

(۵) لاری کی اگلی سیٹ سپرنگ دار تھی۔ میں اس پر بیٹھا ہوا موٹر کی معمولی حرکت پر اچھل جاتا تھا۔ لڑکے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ دیکھو! ماسٹر صاحب خوش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سپرنگ سے واقف ضرور تھے ۔

(۶) ایک بچے نے بتایا کہ ایک دن ہم لاری میں سو گئے ۔ جب ڈرائیور صاحب کو کسی نے اطلاع دی تو انھوں نے چلتی لاری ایک دم روک لی زور کا جھٹکا لگا اور ہم دھم سے دو سیٹوں کے درمیان آرہے ۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ ہوا ہم ندامت سے سر نہ اٹھا سکتے تھے ۔

(۷) لوہے کے کارخانوں کا مشاہدہ کراتے وقت مستری صاحب نے بتایا کہ ہمارا انجن ایک ہارس پاور کا ہے ۔

(۸) کاغذ کی دکان پر منیم نے بتایا کہ فلاں کاغذ ناروے اور سوئیڈن سے بن کر آتا ہے ۔ کیونکہ وہاں جنگلات پائے جاتے ہیں ۔ یہ کاغذ ایک قسم کی لکڑی سے بنایا جاتا ہے ۔

(۹) ایک بچے نے دریافت کیا کہ ہماری لاری سے چنگی کیوں نہیں لی جاتی ؟

(۱۰) اسکول کی لاری پر اگر لڑکے زیادہ ہوں تو چالان کیوں نہیں ہوتا ؟

(۱۱) ماسٹر صاحب برف کا کارخانہ دکھا دیجئے ۔

ارشادات جگر

(۱)

فتنہ روزگار میں امن ہے کیا قرار کیا
حاصل زیست غم سہی غم کا بھی اعتبار کیا

عشق کمال ہوش ہے، ہوش سے ننگ و عار کیا
سینۂ چاک چاک کیوں، دامن تار تار کیا

جان ہے کس شمار میں، جان پہ اختیار کیا
ہو چکے ان کے جب ہمیں، ان پہ کریں نثار کیا

فطرت شوق کی قسم، غیرت عشق کی قسم
دولت دو جہاں سہی، دولت مستعار کیا

تیری نصیحتیں بجا۔ یہ تو بتا کہ ناصحا
اور ہے عشق کے سوا مقصد حسن یار کیا

عشق خزاں مزاج سے، لطف جمال پوچھئے
جس کی نظر ہو خود بہار اسکے لئے بہار کیا

ناز سے مسکرا کے دیکھ چشم حیا اٹھا کے دیکھ
دل سے حریف کے لئے نیچی نظر کا وار کیا

سوز تمام چاہئے رنگ دوام چاہئے
شمع تہ مزار ہو، شمع سر مزار کیا

میں نے کیا ہی جرم عشق مجھ سے ہوئی خطائے شوق
خواہش عفو کس لئے بخشش حسن یار کیا

منزل عشق میں جگر غیر تو پھر بھی غیر ہیں
دل کا بھی اعتماد کیوں، اپنا بھی اعتبار کیا

۱۸ اکتوبر سنہ ۳۹ء

(۲)

وہی اس نظر میں ہیں کھپ جانے والے
جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے کوئی جبیں پر
پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں
مرے حال پر رحم فرمانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں
سلامت رہیں ان کو بہکانے والے

مری طاقت ضبط کی خیر یا رب
کرم پر تلے ہیں ستم ڈھانے والے

جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

ترے اک اشارے پہ ساکن کھڑے ہیں
نہیں کہہ کے سب سے گذر جانے والے

ترے حسن کا راز کیوں کر چھپاؤں
مرے دیدہ و دل پہ چھا جانے والے

محبت سے انکار کب تک کہاں تک
مرا نام بھی سن کے شرمانے والے

۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

تنقید و تبصرہ

(تنقید و تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہئیں)

ابو الخمر: ٹالسٹائے کی مشہور تمثیل (The First Distiller) کا ترجمہ ہے، جسے حضرت مجنوں گورکھپوری نے کیا ہے۔

کتاب میں ٹالسٹائے نے اپنی مخصوص انداز میں شراب کے مہلک اثرات دکھائے ہیں ڈرامے کو شروع اس طرح کیا ہے کہ شیطانوں کا سردار۔ اپنے ماتحتوں سے ان کی کارروائیوں کی تفصیل دریافت کر رہا ہے۔ تمام شیطان اپنی اپنی کامیابی کی تفصیل سے بیان کرتے ہیں لیکن جس شیطان کے سپرد کسانوں کو ورغلانا ہے وہ نہایت مایوسی سے جواب دیتا ہے کہ میں ان کے پاک دلوں پر قبضہ نہیں کر سکا۔ سردار اسے سخت سزائیں دیتا ہے، تو وہ آئندہ اپنے فرائض کو زیادہ تن دہی سے انجام دینے کا وعدہ کرتا ہے اور اپنے سردار سے اجازت لے کر کسانوں کی دنیا میں جاتا ہے۔ اپنی عیاری سے انھیں شراب کا غلام بنالیتا ہے۔ ان کی زندگی بہشت سے دوزخ بن جاتی ہے۔

حضرت مجنوں نے ترجمہ بھی بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے، زبان ستھری، بامحاورہ اور ادبی ہے۔

کتاب انوار بک ڈپو لکھنؤ سے ۶ر میں مل سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی قیمت ۴ر ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔

زندگی کے کھیل۔ حضرت ل۔ احمد اکبرآبادی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کتاب عظیم اطہر، منٹولہ، آگرہ اور آرمی پریس شملہ سے عہ میں مل سکتی ہے اس مجموعہ میں، بارہ افسانے ہیں، اور ان سب میں ہماری سماجی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ل۔ احمد صاحب ایک کہنہ مشق ادیب اور افسانہ نگار ہیں اور ایک خاص قسم کے رنگین

طرزِ انشار کے مالک۔ اسی رنگینی کی جھلک افسانوں کے زیرِ نظر مجموعہ میں بھی جا بجا ہے۔
افسانے بعض بہت دلچسپ ہیں لیکن بعض میں انداز بیان کی طوالت کی وجہ سے دلچسپی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حفیظ جونپوری:۔ یہ ایک ۲۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے۔ جسے کاملؔ جونپوری نے مرتب کیا ہے شروع میں حفیظ جونپوری کا عکس تحریر ہے۔ دس صفحوں میں حفیظؔ مرحوم کے مختصر حالات ہیں اور کلام پر تھوڑا سا تبصرہ۔ لیکن دونوں کاموں میں تحقیق اور ذمہ داری سے کام نہیں لیا گیا ہے
کوئی ۱۴ صفحات میں حفیظؔ کے کلام کا انتخاب ہے۔ انتخاب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں حفیظؔ اچھے شاعر تھے اور ضرورت ہے کہ ان کے حالات اور ان کا کلام عام طور پر لوگوں کے سامنے آئے، کامل صاحب کو چاہئے کہ اس کام کو ذرا اور محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

حفیظ کا جو انتخاب اس رسالہ میں ہے اس میں بعض شعر اچھے ہیں ؎

وہ سخی ہے جو اہل حاجت کا
بھر دے دامن سوال سے پہلے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

یہی جی چاہتا ہے منہ چھپا کر روئیے برسوں طبیعت خود بخود ایسی کبھی مغموم ہوتی ہے

پس پردہ:۔ منشی چندر بھوشن سنگھ کے افسانوں کا مجموعہ ہے، لکھائی اور چھپائی اچھی ہے کتاب پر جلد بھی بندھی ہوئی ہے، کتاب کی قیمت ۱۴ر ہے اور آزاد آفس کانپور مل سکتی ہے۔
مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں، جن میں سے اکثر پر پریم چندر اور سدرشن کے رنگ کی جھلک ہے، لیکن پلاٹ اور فن کی دوسری نزاکتوں کے لحاظ سے وہ ان کے ہم پلہ

نہیں۔ کسی کی تمہید دلچسپ ہے تو کسی کا خاتمہ۔ طرزِ بیاں البتہ جگہ جگہ دلکش ہے اور رسدرشن کا انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً

"گھمنڈی لال چپ تھے۔ راج رانی بڑبڑا رہی تھی۔ پتھر برا و لے پڑ رہے تھے۔"

" اتنے دنوں تک وہ پتھر کے نیچے دبی ہوئی دوب تھی۔ اب اس کی چھاتی سے پتھر ہٹ گیا تھا اور آزادی کی ہوا نے اس کا رنگ نکھار دیا تھا۔"

"جنگل کی آگ پانی سے نہیں بجھتی"

سلسلۂ عصمت کے دو نمبر پیش نظر ہیں ۱۴۹ اور ۱۵۰

کپڑے کی چھپائی ۔ مصنفہ اقبال احمد صاحب ۱۷ صفحات، لکھائی چھپائی معمولی، کپڑا چھاپنے کی صنعت کا حال اور اس کی مختلف ترکیبیں بیان کی گئی ہیں۔ چھاپنے کے طریقے رنگوں کے اقسام وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب ماہرین فن اور مبتدیوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ بڑے پیمانہ پر اس صنعت کو جاری کیا جائے۔ قیمت ۱۰ر۔ ملنے کا پتہ۔ عصمت بک ڈپو دہلی۔

دیہاتی گیت:۔ مصنفہ ڈاکٹر اعظم کریوی۔ تعداد صفحات ۸۲۔ چھ مختلف عنوانات کے ماتحت دیہاتی گیت جمع کئے گئے ہیں، اصل کے ساتھ صحیح اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے یہ گیت دیہاتی زندگی کی کیفیات نمایاں کرنے کے لئے نہایت اچھا ذریعہ ہیں، اگر اس قسم کے گیت وغیرہ بہت زیادہ جمع کئے جائیں تو نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ تمدنی تاریخ کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوں گے۔ نیز اہل نظر کے لئے ان میں دلچسپی کا سامان بھی کافی موجود ہے۔ کیونکہ وہ فطرت انسانی کو بے نقاب حالت میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم صاحب کی یہ دلچسپ کوشش ضرور قابل داد ہے ایک بہت بڑی کمی کو انہوں نے پورا کیا ہے لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت آٹھ آنہ

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے آنرز فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں ان کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست، چند اور بند

۲۔ مسائل ملّی: سنت بالویہ اور سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت

۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند

۴۔ مسلمان اور کانگرس

۵۔ انگریز اور ان کی سیاست

۶۔ مسلم یونیورسٹی

۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس

۹۔ مسلمان اور آزادی۔

۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت

۱۱۔ آخری تقریر

۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت .. ٠ صفحات مجلد قیمت ۱۲

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرول باغ ۔ نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ

جامع مسجد ۔ دہلی

مکتبہ جامعہ

لوہاری دروازہ ۔ لاہور

مکتبہ جامعہ

امین آباد ۔ لکھنؤ

مکتبہ جامعہ

پرنسس بلڈنگ ۔ جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم ۔ اے

سیاست کی پہلی کتاب   قیمت   ۳ر

اجتماعی زندگی کی ابتدا ۔ ۔ ۔ ۔ 〃 ۔ ۔ ۔ ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض ۔ ۔ ۔ ۔ 〃 ۔ ۔ ۔ ۳ر

مسئلہ آبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 〃 ۔ ۔ ۔ ۴ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ

دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت:- نورالحسن صاحب ہاشمی ایم اے (علیگ)

جلد ۳۳ - نمبر ۶	دسمبر ۱۹۳۹ء سنہ ۶	چندۂ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرستِ مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱- نظریۂ انقلاب کے چند اہم پہلو	محمد عبدالقادر صاحب- لکچرر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ	۵۴۸
۲- واقعاتِ حاضرہ کی تعلیم	خواجہ احمد فاروقی صاحب	۵۵۶
۳- ملکۂ بہار (افسانہ)	صدیق احمد صاحب صدیقی	۵۶۲
۴- سرمایہ داری کارل مارکس کی نظر میں	ایم- ایم- جوہر صاحب	۵۷۸
۵- ملک الشعرا ذوق	... ...	۵۹۶
۶- تازہ کلام جگر	... ...	۶۱۰
۷- تنقید و تبصرہ	... ...	۶۱۱

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

نظریۂ انقلاب کے چند اہم پہلو

(محمد عبدالقادر صاحب. بی. ایس. سی (آنرز) لندن لکچرار شعبۂ معاشیات. جامعہ عثمانیہ)

دنیا ایک آزمائشی دور سے گزر رہی ہے۔ سماج اب تک جن بنیادوں پر قائم رہا ہے انھیں ڈھایا جا رہا ہے اور نئی بنیادوں پر تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے۔ آج کل ایک ایسا طبقہ موجود ہے (اور روز بروز لاکھوں اس طبقہ کے ہم خیال بنتے جا رہے ہیں) جو اس بات کی شدّ مد کے ساتھ تلقین کر رہا ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سماجی نظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے باہمی گفت و شنید اور اصلاحی تدابیر کے طریقوں کو بحال رکھا جائے۔ کیونکہ تبدیل شدہ حالات کے تحت یہ طریقے از بس غیر موثر اور فرسودہ ہیں اور انقلاب ہی موجودہ دور کی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے۔ دنیا میں جب اس خیال کے حامی کافی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ انقلاب کے سیاسی اور معاشی فلسفہ اور اس کے چند اہم جدید تاویلات کا جائزہ لیا جائے چنانچہ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف انقلاب کے چند بنیادی اصولوں پر مختصراً نظری بحث کی جائے بلکہ موزوں مثالوں کے ساتھ اس کے خاص خاص علمی پہلوؤں کو بھی واضح کر دیا جائے۔ یہاں میرا یہ منشا نہیں ہے کہ کسی ایک انقلاب کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ البتہ میں نے چند اہم انقلابوں کی طرف اشارے کئے ہیں تاکہ میرے موضوع کے ضروری عنوانات کی تفہیم میں آسانی ہو۔ انقلاب کے پیدا کرنے کے بعد ہی انقلابی جماعت کو اپنی قوت مستحکم بنانے کے سلسلہ میں جن پیچیدہ۔ دشوار گذار اور صبر آزما مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ان کا بھی ایک چھوٹا سا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع میں صرف سیاسی اور معاشی عناصر سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مجھے مذہبی حکمیاتی اور فلسفیانہ محرکات کی اہمیت سے انکار ہے۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ انقلاب کے پیدا کرنے میں مذہبی تحریکات

حکیاتی ایجادات اور فلسفیانہ تخیلات کا خاصہ حصّہ ہوتا ہے۔ محض مضمون کی حد بندی کے خیال سے میں نے چند مقررہ عنوانات پر اکتفا کیا ہے۔

انقلاب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے اس کے اور چند دیگر متجانس اصطلاحات کے درمیان تفریق ضروری ہے ورنہ ذہنی انتشار دپراگندگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے عام بول چال میں ہمیں لفظ انقلاب کے علاوہ دو تین اور لفظوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے مثلاً بغاوت۔ بلوہ۔ شورش وغیرہ۔ گو ان سب میں چند مشترک عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر ایک میں جداگانہ خصوصیات موجود ہیں۔ بغاوت (Rebellion) کا لفظ ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ارضی خود مختاری یا خطہ واری آزادی حاصل کرنے کی غرض سے رعایا کا ایک طبقہ شدّومد کے ساتھ حکومت کے خلاف اقدام کرے۔ چنانچہ بعض مصنفین نے سلطنت روما کے زوال کو صوبجاتی بغاوتوں کا ایک پیہم سلسلہ قرار دیا ہے یہ بغاوتیں مختلف اسباب کے تحت اور مختلف شدّت کے ساتھ جاری رہیں۔ جن میں سے کچھ تو فوجی استبداد کی مخالفت میں تھیں اور کچھ انتظامی اور مالیاتی خرابیوں کو رفع کرنے کی غرض سے۔ جہاں تک دورِ جدید کا تعلق ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی بغاوتوں کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان میں بیشتر جذبۂ قومیت اور نظریہ قومی خود اختیاری (National Self Determination) کا اثر کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بغاوت کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مروجہ حکومت کے بنیادی نظام کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

بلوہ یا دنگا (Riot) ایک عارضی لیکن تشدّد آمیز اجتماعی فتنہ وفساد بپا ہونے کا نام ہے۔ خواہ یہ کسی خانگی فرد یا سرکاری حکام یا حکومتی اداروں کے خلاف ہو۔ لیکن اس مخالفت کا مقصد حکومت کی پائمالی یا مغلوبی نہیں ہوتا۔ یورپ میں پادریوں بادشاہوں۔ خاص خاص معاشی اور سیاسی اداروں کے خلاف اکثر و بیشتر ایسے بلوے ہوتے رہے ہیں۔

شورش (Insurrection) بھی اسی قسم کی تشدد آمیز تحریک کا نام ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وسعت کے لحاظ سے مقابلتہً یہ ایک محدود چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق زیادہ تر مخالفت حکومت کی ابتدائی منازل سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی حیثیت ایک مقامی انقلابی تحریک کی ہوتی ہے جو بہت ممکن ہے بعد میں چل کر مکمل اور باقاعدہ انقلاب کی شکل اختیار کرلے لیکن فی الوقت اس کا مقصد اسی قدر ہوتا ہے کہ حکومتی مسلک میں چند ترمیمیں کروالی جائیں۔ یا چند حکام کی برطرفی عمل میں لائی جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی نہیں ہوتی کہ مروجہ حکومت کو تہ و بالا کردیا جائے۔

مذکورۂ بالا بحث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مندرجہ بالا تینوں قسم کی مخالفتوں (بغاوت بلوہ۔ اور شورش) میں ایک اہم مشترک عنصر یہ ہے کہ ان سب کا مقصد سماج کے سیاسی اور معاشی بنیادوں کو ڈھانا نہیں بلکہ ان کو برقرار رکھتے ہوئے چند تبدیلیوں کے لئے حکومت کو مجبور کرنا ہے۔ انقلاب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں رائج الوقت سیاسی اور معاشی نظام کو تہ و بالا کرنے اور نئی بنیادوں پر ایک نئی عمارت قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر انقلاب ایک تشدد آمیز اور مسلح کوشش ہے جو برسراقتدار حکومت کے خلاف کی جاتی ہے تاکہ مملکت کے مسلمہ اور مروجہ مقاصد کا خاتمہ کردیا جائے اور ان کے عوض مملکت کی بنیادیں انقلابی جماعت کے سیاسی اور معاشی فلسفہ پر قائم ہوں۔ یہ ایک ایسی تحریک ہوتی ہے جو نہ صرف ایک عظیم الشان اور سنسنی خیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی اہم اور دیرپا اثرات کی حامل ہے۔

فطری طور پر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس قسم کی تحریک کوئی آسان چیز ہے جسے جب جی میں آئے شروع کردیا جائے یا اس کے بھی کوئی خاص لوازم ہوتے ہیں جن کی عدم موجودگی میں انقلاب کا پیدا کرنا غیر ممکن بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انقلاب چند خاص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب تک کہ یہ بدرجہ اتم موجود نہ ہوں انقلاب پیدا ہو نہیں سکتا۔ بہت

ممکن ہے کہ کچھ حالات ایسے پائے جائیں کہ ملک میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو لیکن جب تک کہ سماج کی برائیاں پرامن اور اصلاحی طریقوں کے ذریعہ ناقابل علاج نہ بن جائیں اس وقت تک نہ انقلابی تحریک پنپ سکتی ہے اور نہ کامیاب انقلاب کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی قبل از وقت تحریکات زیادہ سے زیادہ بغاوت۔ بلوہ۔ یا شورش کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتیں پس انقلاب کے پیدا کرنے میں صحیح موقع کی تلاش اور اس کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

انقلاب اسی صورت میں ناگزیر ثابت ہوتا ہے جب سماج میں دو علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے کے مخالف طبقے موجود ہوں یعنی ایک طرف تو قلیل التعداد لیکن ذرائع پیدائش پر قابض طبقہ اور دوسری طرف ایک کثیر التعداد لیکن مفلس اور نادار طبقہ اور پھر یہ کہ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج تفریق حائل ہو چنانچہ انقلاب روس میں "پرولتیاری" طبقہ نے اصل شاہی نظام کا خاتمہ کیا اور اپنے اغراض کے مطابق مملکت کی از سر نو تشکیل کر لی۔ اسی سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات بنیادی ہونے کے بجائے محض سطحی اور فروعی ہوں تو انقلاب کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی صورت میں مخالف گروہوں کے مابین مصالحت قائم ہونے کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

انقلاب کے پیدا ہونے کے لئے اختلافات کا محض موجود رہنا ہی کافی نہیں۔ بلکہ مظلوم اور زیر بار طبقہ کو اس کا بڑھتا ہوا احساس ہونا چاہیئے۔ یہی سبب ہے کہ کارل مارکس نے طبقہ واری شعور (Class Consciousness) پر بہت ہی زور دیا ہے لیکن ضروری ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ مجوزہ علاج کے سوا کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تاریخ شاہد ہے کہ اقوام کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات رائج الوقت معاشرتی نظام کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسی صورتوں میں معاشرتی نظام میں مقابلہ کی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے اور بالآخر ترقی پذیر قوتوں کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ انقلاب ایسی چیز نہیں جو دفعتہً نمودار ہو جائے۔ بلکہ یہ متعدد اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے پیدا ہونے اور رنگ لانے کے لئے بالعموم سالہا سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاگیری نظام کے زوال اور "بورژوا" طبقہ کے آغاز ونشوونما کے لئے ایک مدت درکار ہوئی۔ اسی طرح "پرولتیاری" جماعت میں طبقہ واری شعور جو پیدا ہوا وہ نتیجہ ہے کئی سالوں کے مظالم اور مصائب کا جو مزدوروں کو اٹھانے پڑے۔

ایک اور اہم عنصر جو کامیاب انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ وہ فوج کے طرز عمل سے متعلق ہے۔ مقتدر جماعت اپنی فوج کے ذریعہ انقلابیوں کے منصوبوں کو شکست دینے کی حتی الوسع کوشش کرے گی اور تاوقتیکہ خود فوج کا طرزِ عمل اپنے فرماں رواؤں کے ساتھ نہ بدل جائے انقلاب کی کامیابی کے بہت کم امکانات ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے فوج میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہونی چاہیئے جو انقلابیوں کے ہم خیال ہوں اور جو حسب موقع مقتدر جماعت سے لڑنے کے لئے تیار رہوں۔ فوج کو بغاوت پر اسی وقت آمادہ کیا جا سکتا ہے جب خود فوج کو فرماں رواؤں سے سخت شکایتیں ہوں یہ چیز بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ بعض موقعوں پر فوج کی ذہنیت اور رجحانات کے متعلق غلط اندازے قائم کر لینے کی وجہ سے انقلابی جماعت کو ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موافق صورت حال کا پیدا کرنا دراصل اس چیز پر مبنی ہے کہ پہلے سے ہی فوج کو حکومت سے حقیقی شکایتیں ہوں اور اس سے انقلابی جماعت بروقت اور صحیح فائدہ اٹھائے۔

فوج کے متعلق بحث کے ساتھ ہی "تشدد" کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کوئی مقتدر جماعت اپنے ان اصولوں کو (جو کہ اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئے ہوں) خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ ان کو بحال رکھنے کی کوشش نہ کر لے۔ اور اس غرض سے وہ ہمیشہ مسلح طاقت کو کام میں لاتی ہے۔ ایسی حالت میں مخالف جماعت بھی "ترکی بہ جواب ترکی" پر عمل کرتے ہوئے قوت کا جواب قوت سے دیتی ہے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ "تشدد"

اور قوت" کے استعمال کو بذاتہٖ غیر اخلاقی سمجھنا نہایت ہی غلط ہے۔ تشدد کا استعمال اس حد تک جائز ہے کہ اس کے ذریعہ مظلوموں کو پنجۂ استبداد سے آزاد کر کے ایک بہتر نظام قائم کیا جاسکے۔ " قوت" اور " تشدد" سے متعلق اصلی مسئلہ ان کے استعمال یا غیر استعمال کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کو کس وقت استعمال کیا جائے اور کس حد تک۔

مذکورۂ بالا حالات کے علاوہ کچھ ایسے سامان بھی ہو سکتے ہیں جو انقلابی جماعت کے مقاصد میں مزید اعانت کا باعث بنیں۔ لیکن یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ لوازم انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناکام جنگ یا سخت اور تباہ کن قحط کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہوسکتی ہے اور نتیجۃً انقلابی عمل میں آسانی ہوسکتی ہے۔ خصوصًا ان واقعات سے متوسط طبقہ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے جذبات متزلزل ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ طبقہ انقلابی جماعت کی مدد نہ کرے تو بھی اس کے غیر جانبدار رہنے کے زیادہ قرائن ہوجاتے ہیں۔ عوام کی بے چینی اور اضطراری کیفیت مقامی شورشیں اور دنگے عمارات عامہ پر بمبازی سرکاری دستاویزات کا جلا دینا۔ ہڑتالوں کی کثرت احتجاجی جلوس وغیرہ طوفان انقلاب کی دیگر علامتیں ہوتی ہیں۔

" انقلابیوں کا اصلی کمال مواقع کے صحیح استعمال اور پھر حکومت کی کل (جس کے ذریعہ حقوق قائم محفوظ رہتے ہیں) پر قبضہ جما لینے میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی ماحول سے صحیح فائدہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ اس لیے لینن نے بولشوک جماعت کو نومبر کی شورش کے وقت لکھا تھا کہ انقلابی ایسے موقع پر تاخیر سے کام لیں تو تاریخ ان کے فعل کو ہرگز معاف نہ کرے گی۔ انقلاب روس کے واقعہ میں ہمیں مواقع کے بروقت استفادہ کی ایک بین مثال ملتی ہے۔ اس کے برعکس جنگ عظیم کے بعد انقلاب جرمنی موقعوں کو کھو دینے کی ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ "سوشل ڈیموکراٹس" (Social Democrats) نے اصلی مسئلہ کو نظر انداز کر دیا اور نظام قدیم کے ساتھ مصالحت کر لینا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جمہوریت جو جرمنی میں قائم

ہوئی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ پروفیسر لاسکی نے لکھا ہے کہ جرمانی جمہوریت کی شکست ہٹلر کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں نہیں ہوئی بلکہ اس سے پندرہ سال قبل "دستور ویمر" کے بنانے والوں کے ہاتھوں ہوئی یعنی جنگ کے بعد جو دستور جرمنی کے لئے مرتب ہوا اس میں جمہوریت کی آئندہ تباہی کے جراثیم موجود تھے۔

انقلاب کے اسباب کی تشریح کے بعد خود ان مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہے جو دوران انقلاب میں پیش آتے ہیں۔ انقلاب کے آغاز پر جب مقتدر جماعت اپنی کمزور حالت کو محسوس کرلی تی ہے تو عوام کو چند رعایتیں عطا کرنے لگتی ہے۔ یہ چیز انقلابی محاذ میں تفرقہ اندازی کا باعث بنتی ہے۔ اس جماعت کا ایک حصہ ان عطا کردہ رعایتوں سے خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے اور برسر پیکار فریق سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے اور اب ایک ایسی جماعت قائم کرلیتا ہے جو آئینی طریقوں پر اور "امن عامہ" پر زور دیتا ہے لیکن انتہا پسند انقلابیوں اور اس نئی رجعت پسند فریق میں برابر کشمکش جاری رہتی ہے۔ اگر آخر الذکر زیادہ طاقتور بنتی جائے تو ہر ایک مخالف انقلاب ـــــ (Counter Revolution) کے لئے راہ صاف ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اول الذکر اگر زیادہ طاقتور ثابت ہو تو پھر انقلابی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن انقلابیوں کے مسائل یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ درحقیقت دشواریوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس وقت جب انقلابی اپنی طاقت کو مستحکم بنانے میں مصروف رہتے ہیں رجعت پسند جماعت دوبارہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کرتی ہے۔ شاکی اور غیر قانع انقلابیوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے اور ان کی مدد حاصل ہو جانے پر ملک میں دوبارہ ایک ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس کے تحت بعض موقعوں پر انھیں ایک ایسا نظام قائم کرنے میں کامیابی ہو جاتی ہے جو قدیم نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا بلکہ جو ایک ترمیم شدہ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں انھیں انتہا پسند انقلابیوں کے حملہ آور ہونے کا خدشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان انقلابیوں کو

جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی اہمیت اصلی جنگ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے یعنی انھیں ایک ایسے محاذ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس میں رجعت پسند اعتدال پسند اور ابن الوقت انقلابی ——— (Revolutionaries by Adoption) سب شامل رہتے ہیں طرفہ تماشا یہ کہ بیرونی حکومتوں کی مداخلت اور ان ملکی جماعتوں سے ان کا رشتہ قائم ہونے کا اندیشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اسی لئے انقلاب فرانس کے دوران میں ایک مجلس تحفظ عامہ ——— (Committee of Public Safety) قائم ہوئی تاکہ ملکی اور بیرونی رجعت پسند طاقتوں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔

انقلاب کے بعد ہی ان مشکلات کا زمانہ ایک دور عبوری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فتوحات کو مستحکم بنانے کی خاطر" آمریت " کی ضرورت بھی پیش آتی ہے اور کسی قسم کی مخالفت روا نہیں رکھی جاتی۔ یہ دور آزمائش گزر جانے کے بعد خود اندرون ملک زندگی کے جملہ شعبہ جات کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اور تھوڑی بہت رواداری سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ روس میں گو انقلاب ۱۹۱۷ء میں ہوا لیکن " معاشی نظم جدید" ——— (New Economic Planning) بعد میں قائم کیا گیا اور مخالفین کے ساتھ روادارانہ برتاؤ تو بہت بعد میں شروع ہوا۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم

(از جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب)

مسز سروجنی نائیڈو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ:-

"ہندوستان کے عہد گزشتہ کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو ماضی ہی میں محدود رکھا اور کبھی مستقبل کی طرف نظر نہیں دوڑائی۔ عہد موجودہ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے ماضی اور مستقبل دونوں ہی کے اوپر نظر دوڑانے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلہ میں حال کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کو سمجھے بغیر ماضی و مستقبل کے واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا محال ہے۔ اس میں ہمیں گزشتہ اور آئندہ حادثات کی جھلک نظر آتی ہے، ارتقا کی تمام داستانیں اسی میں پوشیدہ ہیں بلکہ یہ ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں اگلے پچھلے سب واقعات نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں جب ماضی و مستقبل دونوں حال میں غرق ہوکر رہ گئے ہیں۔ ہماری بڑی سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے ماحول اور گردوپیش کے حالات سے قطعاً بے خبر رہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک لوگوں کو ان تبدیلیوں کا مکمل احساس نہیں ہوا تھا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا کو احاطہ کرتی جارہی تھیں، اور ہم ہندوستانیوں کو تو شاید آج تک ان تغیرات کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ اب دوری و نزدیکی کا سوال ہمیشہ کے لئے مٹ چکا ہے تمام ممالک ایک دوسرے کے ہمسایہ اور ایک بڑے کل کا جزو بن چکے ہیں اور یہ رشتہ اس قدر استوار ہوگیا ہے کہ اگر پیرس، وائنا یا ٹارنٹو میں کوئی طبی ایجاد ہوتی ہے تو وہ دو ماہ بعد ہندوستان میں بھی عام ہوجاتی ہے۔ آسٹریلیا یا کناڈا میں اگر گیہوں کا نرخ بڑھ جاتا ہے تو لائل پور کی ایک

بڑی آبادی بھوکوں مرنے لگتی ہے۔ روئی کی قیمت اگر بڑھ جاتی ہے تو المونڑہ اور آسام میں اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آج چین و فلسطین کا معاملہ ہندوستان کا معاملہ ہے اور پولینڈ کا معاملہ تمام دنیا کا معاملہ۔ غرض اب گوشہ نشینی ناممکن ہو چکی ہے اور اپنے آپ کو دنیا کے معاشیاتی اور سیاسی بھنور سے نکالنا محال ہو گیا ہے۔ اب پیداوار کی تعداد اور اس کے طریقے بدل گئے ہیں مشین نے "بڑی" تجارتوں کے فروغ میں امداد دی ہے۔ نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم نے انسانی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اور موجودہ تباہ کن جنگ کا اثر جانبدار اور غیر جانبدار سب ہی پر یکساں پڑ رہا ہے ـــــ لیکن ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ ہمیں دنیا کی ان پیہم تبدیلیوں اور اس میں اپنے فرائض کا صحیح علم ہی نہیں۔ ہمیں "ہر دم رواں دواں" زندگی کا احساس ہی نہیں پیدا ہوا۔ ہماری زندگی کے ادارے اب بھی اسی جگہ پر ہیں' جہاں پہلے تھے' اور ہمارا تمام نظام معاشرت و سیاست پچھلی ہی منزل پر ٹھہرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور ہماری ضرورتوں کے قدم بقدم نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اب اس میں گدلے اور رُکے ہوئے پانی کی سی بد بو آنے لگی ہے۔

ضرورت ہے کہ معاشرتی ورثہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ زمانہ کے تغیرات کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ زندگی کی دوبارہ تنظیم کی جائے اور نظریات میں ضروری تبدیلیاں پیدا کی جائیں دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہمیں ماضی کی صحیح تعبیر' حال کی صحیح تفسیر اور مستقبل کی صحیح تیاری کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام سب سے بہتر اسکولوں میں ہو سکتا ہے جہاں کہ نئی قوم تیار کی جا رہی ہے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام اس ضرورت کو پورا کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ آپ کسی ہندوستانی اسکول کے طالب علم کو لے لیجئے اور اس سے پوچھئے کہ جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ یہ کیوں ناگزیر تھی؟ ورسائی کی صلح کیوں ناکام کوشش اور "صلح نما جنگ" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی؟ موجودہ جنگ کے اسباب کیا ہیں؟ صلح کس کا نام ہے اور جنگ

کس کو کہتے ہیں؟ تو وہ حیرت سے آپ کا منھ تکنے لگے گا۔ پھر یہ تو بڑے سوالات ہیں۔ ذرا اس سے اس گیہوں اور جو کے بارے میں پوچھیے جو وہ روز کھاتا ہے یا بینک کے بارے میں جو اسے روپیہ کے عوض چیک بک دے دیتا ہے یا دوکان دار کے بارے میں جو اس کی ضرورتیں فراہم کرتا ہے یا اسی پولیسمین کے بارے میں پوچھیے جو حفاظت وامن کا ضامن ہے تو شاید وہ ان سوالوں کے "غیر اہم" ہونے پر ہنس پڑے! لیکن اس کا الزام بچوں پر رکھنا بےکار ہے اس لیے کہ وہ ہمارے ہی آغوشِ تربیت کے پلے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ جو پڑھے لکھے کہلاتے ہیں، ان سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔

ہمارے بہت سے اسکولوں میں ابھی تک شہریات کورس میں داخل نہیں ہے تاریخ بھی ۱۸۵۷ء یا ۱۹۱۴ء سے آگے نہیں پڑھائی جاتی، اسکول کا ماحول بھی عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ طالب علم واقعات حاضرہ کے متعلق معلومات فراہم کر سکے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ علاءالدین اور اکبر کی فتوحات کے بارے میں بڑی تفصیل سے جانتا ہے لیکن گاندھی، جواہر لال، جناح، ہٹلر، مسولینی، اسٹالن، رزوولٹ اور چمبرلین کے بارے میں بالکل ناواقف ہوتا ہے اسی طرح وہ ریگولیٹنگ ایکٹ کے بارے میں زیادہ جانتا ہے لیکن ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور "میثاقِ میونک" سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جب اسکولوں سے نکلتے ہیں تو انھیں باہر کی فضا بالکل دگرگوں نظر آتی ہے۔ وہ ذہنی بے مائگی کی وجہ سے اپنے آپ کو اسی ماحول میں بالکل اجنبی محسوس کرتے ہیں ہر چیز کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں، یہ حال کی صحیح تعلیم نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سے بھی بےخبر ہوتے ہیں اور فرداً کی طرف سے بھی بے نیاز۔

واقعاتِ عالم کا تسلسل اور ان کا ارتقائی پہلو ذہن نشین کرانے کے لیے شہریات اور تواریخ دونوں کو سائنٹفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے پڑھانے کی ضرورت ہے لیکن اسی کے

ساتھ ساتھ "واقعات حاضرہ" کا ایک کورس بھی اگر داخل نصاب کر دیا جائے تو وہ بے حد مفید ہوگا۔ اس کو پڑھاتے وقت اگر استاد تحقیق و تجسس کے جذبہ کو فروغ دے، طالب علموں کو کد و کاوش اور رد و قدح کے مواقع بہم پہنچائے اور ایمان داری کے ساتھ موافق اور مخالف رائیں پیش کر دے اور خود لڑکوں کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع دے تو وہ بہت اچھے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ علت و معلول کو پیش کر دے اور ماضی، حال اور مستقبل کے ربط کو ظاہر کرتا جائے اور اس طریقہ سے طالب علموں کی سائنٹیفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے واقعات کو سوچنے اور پرکھنے کی عادت ڈلوائے ۔۲

واقعات حاضرہ کی تعلیم جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ حال کی پیچیدگی طالب علموں کے لئے کافی دقت کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی الجھاؤ کی وجہ سے اس تمام مواد کو باقاعدہ ترتیب بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ لڑکے ہنگامہ خیز اور غیر اہم باتوں کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو جائیں اور ان کے نسلی، مذہبی اور سیاسی تعصبات واقعات کی تہ تک پہنچنے میں حائل نہ ہوں۔ لیکن "واقعات حاضرہ" کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان تمام دقتوں کو دور کرنا ضروری ہے اس لئے کہ ترقی کا انحصار ان شہریوں پر ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے کماحقہٗ باخبر ہیں اور ان کا عقلی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

۳ واقعات حاضرہ کی تعلیم میں حسب ذیل تجاویز مفید ثابت ہوں گی:۔ بچوں کے اندر مختلف اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور ان کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کئے جائیں تاکہ وہ مختلف شہادتوں اور روایتوں کو جانچ سکیں اور ان کی تحلیلی قوتوں کو فروغ حاصل ہو سکے۔

بچوں کو اخبارات کے مختلف صفحات کی اہمیت بھی تبلائی جائے اور ان کو دیکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔ طالب علموں کی فعالیت اور عملیت کو بھی کام میں لایا جائے اور بعض وقت انھیں کچھ کام کرنے کو دیے جائیں۔ کبھی کبھی اخبارات کے کچھ نقشے بڑے

پیمانہ پر بنائیں یا انھیں کاٹ کر اپنی کاپی پر چپکا ئیں۔ ابھی حال میں اسٹیسمین کی ۸ اور ۱۵ ستمبر کی اشاعتوں میں جو یورپ کے نقشے شائع ہوئے وہ طالب علموں کے لیئے بڑے کار آمد تھے۔ بچوں میں اخبارات کی تصویریں بھی جمع کرنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس کام کو تقسیم کر دینا بہت مناسب ہوگا کچھ لڑکے بڑے آدمیوں یا نئی ایجادات کے بارے میں اور کچھ ہندوستان کی خبروں یا بین الاقوامی سیاسیات سے متعلق تصاویر فراہم کریں۔

اخبارات کی تعلیم اور دیگر علوم میں تعلق باہمی بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات لڑکوں سے خبروں کا ایک کالم یا مقالہ افتتاحیہ لکھوایا جائے یا کسی کتاب پر تبصرہ کروایا جائے۔ اس سے لکھنے کے نئے ڈھنگ معلوم ہوں گے اور ان کے طرز تحریر پر "کتابی" رنگ غالب نہیں ہوگا۔

کبھی کبھی واقعات حاضرہ پر مباحثے منعقد کیئے جائیں اور ریڈیو اور سینما کے ذریعہ جو خبریں حاصل ہوں ان پر تبصرے کیئے جائیں۔ کچھ لڑکوں سے مقالے بھی پڑھوائے جائیں اور انھیں اس سلسلہ میں اخبارات کے تراشے رکھنے کا شوق دلایا جائے۔ ان تراشوں اور رسائل کی امداد سے مضامین بھی لکھوائے جائیں لیکن تحریروں اور تقریروں، دونوں میں اس پر زور دیا جائے کہ طالب علم باقاعدہ سند پیش کریں۔ محض یہ کہہ دینا کہ "ہم نے اخبار میں دیکھا ہے" کافی نہیں ہے۔ اخبار، تاریخ، صفحہ اور مضمون نگار کے نام اور عنوان کا حوالہ ضروری ہے۔ کبھی کبھی اساتذہ اور باہر کے لوگوں کو بھی تقریروں کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ واقعاتِ حاضرہ کی تعلیم میں اسکول میگزین بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بہت سے اسکول قلمی رسالے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے نکال سکتے ہیں اور اگر ان کا کام لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے تو ان کے ذریعہ بھی گرد و پیش کے حالات سے بہت کچھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

لڑکوں میں مہارت خصوصی کا بھی شوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تمام کلاس کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک گروہ کے سپرد ایک خاص حلقۂ عمل کر دیا جائے۔ مثلاً ایک کے

سپر دیورپ کی خبریں کر دی جائیں دوسرے کے سپر د ہندوستان کی اور تیسرے کے مقامی۔ اس سے بھی بہت مفید نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم کے لئے اسکول میں بلیٹن بورڈ بھی ضروری ہے اسی کے ذریعہ لڑکوں میں مختلف رسائل اور اخبارات کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے ہر لڑکے کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے نام کے آگے اسی مضمون اور رسالہ کا نام لکھ دے جو اس نے پڑھا ہے اور جس کو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی پڑھیں۔ اس سے لڑکوں کو مختلف اخبارات کے نام بھی معلوم ہوں گے اور انکیں پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔ ہفتہ کے مباحثہ کے لئے طالب علم مختلف موضوعات بھی تجویز کر سکتے ہیں اور ان کی اطلاع وہ معہ اپنے نام کے بورڈ کے ذریعہ دے سکتے ہیں۔ ان مباحث میں تنوع ضروری ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ دو لڑکے ایک ہی مضمون کو منتخب کرلیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم میں استاد کو حتی الوسع غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے بیانات تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوں۔ اسے چاہیئے کہ واقعہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ ایک بڑے قصہ کا جزو معلوم ہو، تاریخ ارتقا کی ایک داستان نظر آئے، اور ماضی اور حال کا ربط خوب واضح ہو جائے۔ اسباب وعلل، نتائج واثرات پر زور دیا جائے لیکن واقعات حاضرہ کی تعلیم دیتے وقت کسی بات کو بھی "لفظ آخر" کے طور پر نہ پیش کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ دائمی حقیقت ہے اور اس میں چوں وچرا کا امکان ہی نہیں۔

ملکۂ بہار

(صدیق احمد صاحب صدیقی۔ بی اے۔ آنرز (علیگ)

انگلستان کے مختلف قریوں اور دیہاتوں میں گھومنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیاحت کے سلسلے میں آوارہ گردی کرتا ہوا میں ایک ایسے گاؤں میں جا پہنچا جو پختہ سڑک سے کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں کے باشندوں کی سادہ تہذیب، ستھری اور قدیم معاشرت اُن دیہاتوں کے تمدن سے مختلف معلوم ہوتی تھی جو عین شاہ راہ پر واقع تھے۔ یہ غالباً اس وجہ سے کہ یہاں کے ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ جی چاہا کہ رات وہیں بسر کی جائے چنانچہ ایک چھوٹی سی دیہاتی سرائے میں جا کر میں نے قیام کیا۔ موسم کی خاموش سنجیدگی اور میرا آوارہ گردی کا شوق! چائے پی کر نکل کھڑا ہوا۔ چند قدم چل کر سامنے گاؤں کا گرجا گھر نظر آیا۔ یہ مکانات سے ہٹ کر میدان میں واقع ہوا تھا۔ اس کا مینار جس پر کائی کی ایک موٹی تہ جم گئی تھی اور جو قرب و جوار کی سبز پوش وادیوں کے درمیان ایک شان امتیاز کے ساتھ کھڑا تھا میرے لئے نہ صرف کافی جاذب توجہ ثابت ہوا بلکہ میرے احساسات نے بھی اس کی خاموش دعوت قبول کی اور میں بے تکلف اس کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

عموماً وہ دن جن کی صبح بارش میں غسل کر چکی ہو، شام کے وقت بہت دلفریب ہو جاتے ہیں اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ موسم بہت نکھرا ہوا اور صاف تھا۔ سپید بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے غیر محسوس رفتار سے ہوا میں تیر رہے تھے۔ گویا کوشش کر رہے تھے کہ آسمان کی خون فشانیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں۔

آفتاب کی ترچھی کرنیں ایک الم انگیز خاموشی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے

ایک مقدس عیسائی دنیا کی گناہ پروری پر اپنے آخری لمحات میں مسکراتا ہے اور اپنے خاموش زوال سے یقین دلاتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے قدس کی تابانیوں کے ساتھ واپس آئے گا۔

موسم کے اس "موت آگیں" سناٹے نے میرے قدم پکڑ لئے اور میں ایک قبر کے پتھر پر جو نصف کے قریب دھنس چکا تھا بیٹھ گیا۔ شام کا وقت۔ قبرستان کی ویرانی اور آفتاب کی ڈوبتی ہوئی نبضیں! ماضی کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

بچپن کے معصوم احباب۔ دور افتادہ اعزا اور قبر میں سونے والے متعلقین ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور میں اس روح فرسا تخیل میں گم ہو گیا جس میں غم کی تلخی بھی مسرتِ چند روزہ کی حلاوت سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گرجا کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا۔ اس کی کرخت لیکن جھنکار پیدا کرنے والی سنجیدہ آواز میرے خیالات کی ہمنوائی کر رہی تھی۔ یہ غالباً کسی نئے مہمان کی آمد کا اعلان تھا جو یہاں کی برادری میں شریک ہونے والا تھا۔

فوراً ہی میری نظر ایک جنازہ کے جلوس پر پڑی جو گاؤں سے قبرستان کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میت کے چوبی صندوق کو چند نوجوان لڑکیاں سنبھالے ہوئے تھیں اور ان کے آگے آگے ایک خوب صورت دہقانی دوشیزہ سادہ فراک پہنے سفید پھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لٹکائے متانت کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی ناکتخدا لڑکی کا جنازہ ہے۔ سوگوار والدین جو بظاہر گاؤں کے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، میت کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ باپ کی ساکت نگاہیں، کھنچے ہوئے ابرو اور ستا ہوا چہرہ اس کی قلبی کش مکش کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ "رنج اگر دل کی گہرائیوں میں محبوس ہو جائے تو خطرناک حد تک تکلیف دہ ہو جاتا ہے"۔ اس کی بیوی ایک ضعیف عورت۔ شوہر کے داہنے بازو کو پکڑے زور زور سے کراہتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی تڑپا دینے والی چیخیں، اندرونی کرب دبے چینی کی علامت ماں کی بے ہوشی اور معصوم محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں۔

میں بھی جنازہ کے ہمراہ گرجا میں چلا گیا۔ صفوں کے درمیان میں صندوق رکھ دیا گیا۔ دو سفید ہار اور سفید داستانے اس جگہ پر لٹکا دیے گئے جہاں وہ موت کی آغوش میں پناہ لینے والی لڑکی اپنی زندگی میں بیٹھا کرتی تھی۔

جنازہ کی دعا! موت کا روح شکن راگ!! والدین کی سوگوار محویت!!! کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر تڑپ نہ اٹھا ہو؟ کون خوش قسمت ہستی ایسی تھی جو اپنے کسی عزیز محبوب یا محبت کرنے والے دوست کو سپرد خاک نہ کر چکی ہو؟ اور پھر اس دعا کی اندوہناکی کا کیا ٹھکانا جو اس مجسمۂ حسن و معصومیت کے لیے کی جائے جس نے اپنی زندگی کے لہلہاتے ہوئے شباب میں دنیا سے منھ پھیر لیا ہو!

ان مسرت بھرے لمحات میں جب جسم کو انتہائی خاموشی کے ساتھ قبر کے سپرد کیا جا رہا تھا اور عناصر دنیا سے عاریتہً مانگے ہوئے حسین ذرات پھر واپس کیے جا رہے تھے اس لڑکی کی ہمجولیوں کا سسک سسک کر رونا: معاذاللہ۔ کتنا دلگداز سین تھا۔ ضعیف باپ اب بھی اپنے جذبات غم کو اس یقین سے دبانے کی کوشش میں تھا کہ جو لوگ دربار ایزدی میں پہنچ جاتے ہیں ان پر رحمت کی بارش زیادہ ہونے لگتی ہے۔ لیکن غم نصیب ماں جس کی نظروں میں صرف اپنی لڑکی کی آخری تصویر تھی اور جس کی نگاہیں محبت کے ظاہری حدود سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتیں، مسلسل آنسوؤں کی بارش کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ایک غنچۂ ناشگفتہ جس کی ہر ہر پنکھڑی سے ہزاروں آرزوئیں لپٹی ہوئی ہیں، موت کی تیز و تند ہوا سے مرجھا رہا ہے۔ اس کے غم آلود بشرے اور گریۂ پیہم کو دیکھ کر مجھے راحیل کے قلبی اضطراب اور روحانی اندوہ کا اندازہ ہو گیا۔

سرائے میں واپس آکر میں نے اس کے متعلق تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ ایک معمولی حادثہ تھا جو آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔

وہ ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ حسین اور معصوم۔ شاید قدرت نے حسن کا انتہائی

بلند معیار مقرر کر کے اس کو بھیجا ہو۔ گاؤں کے باشندوں کو اس پر ناز تھا تو کیا بے جا تھا؛ اس کا باپ گاؤں کا ایک کھاتا پیتا کاشتکار تھا لیکن قسمت کے چکر میں پھنس کر اس کی دولت مفلسی میں تحلیل ہو چکی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو گھر میں رکھ کر بہترین قسم کی تربیت دی تھی گاؤں کی سادہ زندگی اور قدرت کی مشاطگی! گویا گلاب کی ایک کلی تھی کہ باغبان کے مصنوعی آلات سے بے نیاز! کسی ویران پہاڑ کے خوشنما دامن میں پروان چڑھ رہی تھی گاؤں کا مقدس پادری اس کو بچپن میں تعلیم دیتا تھا اور وہ اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور سادہ ہونے کی وجہ سے اس کی شفقت کا خاص مرجع رہ چکی تھی۔ مہربان استاد ایک پدرانہ محبت کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتا تھا گو اس کی تعلیم بہت وسیع نہ تھی لیکن پھر بھی گاؤں کی ایک چھوٹی سی محدود سوسائٹی میں خاموش اور ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے بالکل کافی تھی۔ وہ اس کو بجائے "شمع انجمن" بنانے کے "چراغ خانہ" بنانا زیادہ مناسب خیال کرتا تھا۔ اس کے والدین کی محبت نے گھر کے سخت اور گرانبار کاموں میں حصہ لینے کی اجازت اس کو کبھی نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سنجیدہ حسن اور مزاج کی لطافت آزادی سے ترقی کرتی گئی اور وہ اس نوخیز پودے کی طرح شاداب ہونے لگی جو اتفاق سے کسی سخت قسم کے جنگلی درختوں کے درمیان اُگ آیا ہو۔

اس کی سہیلیاں بھی اس کے حسن کی غیر معمولی فوقیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں لیکن ان کے جذبات ستائش میں رشک و حسد کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے کہ اس کی دل کش معصومیت، اور سادہ ادائیں، اس کی پرخلوص محبت اور سچی ملنساری تصنع اور بناوٹ سے پاک تھی۔

یہ گاؤں ایک چھوٹی اور قدیم بستی ہونے کی وجہ سے اب تک پرانے انگریزی چلن کا علمبردار تھا۔ دیہاتی رقص، موسم سرما کی محفلیں اور موسم بہار کے طرب آمیز جلسے ابھی تک پرانے رسم و رواج کے مطابق ادا کئے جاتے تھے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک گاؤں کے اس

کھیا پر بھی عائد ہوتی تھی جو تہذیب قدیم کا عاشق اور ان چند نیک سیرت سادہ لوح عیسائیوں میں سے تھا جو دنیا میں انسانی زندگی کی رگ رگ کو مسرت کی لہروں سے متلاطم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی کے زیرِ نگرانی "جلسۂ بہار" کے عالیشان انتظامات ہوتے تھے۔ گاؤں کے بڑے سبزہ زار میں ایک آراستہ اور خوبصورت جھنڈا عین وسط میں نصب کیا جاتا تھا اور خاص "یوم بہار" کے دن ایک بڑا پنڈال بنا کر اس کو پھولوں اور جھنڈیوں سے سجایا جاتا تھا۔ گاؤں کی سب سے زیادہ حسین اور دوشیزہ لڑکی "ملکۂ بہار" کے نام سے منتخب کی جاتی اور وہی جلسے کی صدر ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے دلچسپ مقابلوں میں کامیاب ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کو انعامات تقسیم کرنا اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

بستی کا دلفریب محل وقوع اور اس کی شعر آفریں، فضا، جلسۂ بہار کی پرخلوص اور سادہ رنگ صحبتوں میں مل جل کر کچھ اس درجہ دل کشش ہو جاتی تھی کہ کوئی سنگ دل سے سنگ دل مسافر بھی ان حیات افروز مشاغل کو نظر انداز کر کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

چنانچہ ایک نوجوان فوجی افسر جس کا دستہ قریب کے ایک گاؤں میں مقیم تھا، ان خوش فعلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گاؤں والوں کی ستھری اور خوش مذاق زندگی...... ابتدائے بہار کی نوخیز انگڑائیاں اور پھر ملکۂ بہار کی ساحرانہ شخصیت گویا اس فوجی کی خشک زندگی کو یکسر شباب وشعر میں تبدیل کر دینا ہی ان کا مقصد تھا۔

یہ ملکۂ بہار، جسے اگر میں "فتنۂ بہار" کہوں تو روا ہے، گاؤں والوں کا عزیز ترین سرمایۂ حسن سر پر پھولوں کا تاج رکھے، عنفوان شباب کی گھبراہٹ میں شرماتی اور مسکراتی، خزاں اور بہار کو زیرِ وزبر کرتی بادہ بچشم لڑکی اپنی معصوم سیرت اور سادہ خوش طبعی سے اس فوجی افسر کو اتنی جرأت دلا چکی تھی کہ وہ اس سے اپنا تعارف کرا سکے۔ اس نے رفتہ رفتہ اس بارگاہ حسن میں رسوخ حاصل کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نوجوان فوجی افسر کی غیر محسوس محبت پاشیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں صداقت کی بو بھی تھی کیونکہ بظاہر اس کا "طریقۂ کمند اندازی" بالکل

وہی تھا جو اکثر شہری حضرات گاؤں کی بھولی لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں اس کے انداز دوستی میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس معصوم لڑکی کو چونکا سکے۔ حتیٰ کہ کبھی اس نے محبت کے عنوان پر گفتگو بھی نہ کی تھی لیکن بایں ہمہ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خاموش اعلانات، محبت کے ان بلند بانگ دعووں سے زیادہ دل نشین ہوتے ہیں جو زبان سے کئے جائیں اور غالباً کیوپڈ کا یہی وہ کاری تیر ہے جو نشانہ پر پہونچنے کے بعد بھی بے قرار رہتا ہے۔ آنکھوں کی چمک! آواز کی لچک اور وہ ہزاروں لطافتیں جو ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرکت سے نمایاں تھیں، اس کی محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں اور محبت کی یہی وہ خاموش جادو بیانیاں ہیں جو صرف محسوس کی جا سکتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔

پھر اگر ان اداؤں نے ایک معصوم اور نوجوان دل کو شکست دے دی ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؛ چنانچہ جہاں تک اس لڑکی کا تعلق تھا، وہ بغیر یہ سوچے کہ کل کیا ہوگا؟ محبت کر رہی تھی۔ اس نے کبھی غور ہی نہ کیا کہ جس جذبہ کی وہ پرورش کر رہی ہے وہ کہاں تک اس کے دوسرے خیالات اور احساسات پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل کے مبہم نتائج اس کی نظر سے بالکل پوشیدہ تھے۔ نوجوان افسر کی موجودگی میں اس کی محبت پاش نظروں اور روح پرور الفاظ نے کبھی غریب لڑکی کے خیالات کو اپنے مرکز سے ہٹنے ہی نہ دیا اور اگر کبھی وہ نظروں سے اوجھل ہوا بھی تو ماضی قریب کے حسین لمحات نے اپنا سکہ جما کر اس کو مستقبل سے پھر بے نیاز کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ قریب کے سبزہ زاروں اور باغات میں روزانہ ٹہلنے جاتی تھی اس دوران میں وہ اس کو فطرت کی رنگینیوں پر درس دیا کرتا تھا اور کبھی کبھی شباب اور شعر کی سحر کاریوں سے بھی آشنا کراتا جاتا تھا۔

صنف لطیف کے کسی فرد کے احساسات محبت شاید ہی کبھی اتنے بے لوث رہے ہوں جتنے کہ اس حسین لڑکی کے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدائی ملاقات میں اس فوجی افسر کے ورزشی جسم اور مردانہ قد و قامت کے اثرات اس کے لئے جاذب نظر ثابت ہوئے

ہوں لیکن درحقیقت یہی وہ چیز نہ تھی جس نے اس کو مسحور کر رکھا تھا! اس کے جذبات محبت میں پرستش کا عنصر غالب تھا۔ اس کے نزدیک وہ ایک مافوق الفطرت شخصیت کا حامل تھا اس کی عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ ایک حسین اور با اخلاق آدمی کی دوستی نے اس کے خفتہ احساسات کو بیدار کر دیا۔ مرتبہ اور دولت کے ذلیل امتیازات نے نہیں، بلکہ اخلاق اور طرز گفتگو، فہم اور شرافت کی خوبو نے جو ایک دیہاتی اور شہری میں حد فاصل قائم کرتی ہیں اس لڑکی کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سامنے سر نیائش خم کر دے۔ اس کے ہر ہر لفظ پر وہ اس طرح کان دھرتی گویا جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، الہام خداوندی سے کم نہیں!

دوران گفتگو میں اگر کبھی اس کی شرمائی ہوئی آنکھ اس کے چہرہ پر پڑ بھی جاتی تو کچھ اس طرح گھبرا کر وہ نظریں چرا لیتی گویا اس کی فرد مائگی اس فوجی افسر کے علوئے خیال کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت کی محبت مرد کی برتری ہی پر مرکوز ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مرد اپنے اس ہتھیار سے کام لے کر محبت کے نازک ریشمین لباس کو بوالہوسی کے کانٹوں سے تار تار کر ڈالتا ہے۔

بہرکیف وہ حسین لڑکی اس فوجی افسر کی خاموش پرستش میں محو تھی اور اس کو وہ بھی محسوس کر چکا تھا۔ اس کے قلب کی گہرائیاں بھی جذبات سے لبریز تھیں لیکن یہ اتنے بے لوث اور لطیف نہ تھے۔ اس کی محبت کی سنجیدگی صرف وقتی تھی، وہ اپنے ہم عمر افسروں سے "دیہاتی فتوحات" کے ہیجان پیدا کر دینے والے واقعات سن سن کر اپنے ضمیر کا توازن اخلاقی درہم برہم کر چکا تھا اور اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر اپنے مردانہ 'پندار' کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تمام تر محبت فی الحقیقت یہیں تک محدود تھی یا اپنے نفس کو دھوکا دینے کی غرض سے وہ یہ سوچ رہا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی عکس پذیر شیشے پر کیمرہ کا سیاہ پردہ پڑا ہو تو جو شخص بھی اس کو اٹھائے گا اسی کی تصویر نقش اول بن کر اس پر ثبت ہو جائے گی۔ بعینہ یہی کیفیت اس افسر کے قلب کی ہوئی۔ اس کے احباب کی گفتگو اور ان کے عشق و محبت کے

انسانے اس کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا کر چکے تھے کہ وہ جلد از جلد اس ذات کی تصویر لے لے جو پہلی مرتبہ تکلف کو برطرف کرکے اس کی نقاب کشائی پر آمادہ ہو ——————
اس مہم کو اس معصوم لڑکی نے غیر اختیاری طور پر انجام دیا۔

ابتدا میں اس کی خواہش تھی کہ وہ اس لڑکی سے چند روز تک دلچسپی لے اور پھر جب یہاں سے کوچ ہوکر دوسری جگہ فوج کا قیام ہو تو وہاں کسی نئے شکار کی تلاش کرے لیکن چند ہی روز میں اس باعصمت لڑکی کی بے لوث محبت نے اس کے دل کو تسخیر کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شعلہ ریزی اب اسی کے جیب و دامن کو خاکستر بنانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ جی تو چاہتا تھا کہ شادی کرے لیکن وہی رکاوٹیں جو اس قسم کی واقعات میں عام طور پر پیش آتی ہیں، یہاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اس کا بلند رتبہ، زندگی کا روشن مستقبل، خاندانی اعزاز اور پھر ایک خود دار باپ کی دولت پر آئندہ کامیابی کا انحصار۔ یہ سب فریب دینے والی حقیقتیں یکے بعد دیگرے اس کو مجبور کرنے لگیں کہ وہ شادی سے اپنا دامن بچائے۔ لیکن فریق ثانی کا مرکز ثقل بھی معمولی نہ تھا۔ ایک معصوم لڑکی کی الفت، اس کی نسوانی لطافتوں کی پاک سپردگی، اس کی پریشان کن نگاہوں میں تلاش محبت کا نظارہ اور پھر سونے پر سہاگہ اس کی فطری حیا! کون شخص ہے جو ان بے پناہ قوتوں سے مغلوب ہوکر کثافت روح کا ادنیٰ ترین نمونہ بھی پیش کر سکے؟ گو اکثر یہ اتفاق ہوا کہ اس کے احباب کی مکروہ گفتگو اور ان کی بد اخلاقی کی بدترین مثالوں نے اس کی نیت کو ڈانواں ڈول کر دیا لیکن پھر بھی ان تاریکیوں کو کبھی جرأت نہ ہو سکی کہ اس لڑکی کی پرنور محبت کے سامنے ایک لحہ بھی ٹھیر سکیں۔ چنانچہ جب کبھی شام کو ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو وہ محسوس کرتا کہ دوشیزگی کی عفت ایک روشن اور مقدس فضا ہے جس میں گناہ کا تخیل اڑ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کے متضاد ارادے اور اس کے ضمیر اور نفس کی مختلف قوتیں

آپس میں ٹکرا کر تھک جاتی ہیں تو فطرت کی طرف سے ایک ناطق فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اس کے حق میں مفید ہو یا مضر۔ چنانچہ یہی واقعہ اس فوجی نوعمر افسر کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ابھی وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ ایک روز اس کے دستے کے متعلق یہ حکم آیا کہ وہ انگلستان چھوڑ کر فوراً براعظم یورپ کی طرف روانہ ہو جائے۔ یہ حکم کیا تھا گویا اس کی اندرونی کش مکش کی تکمیل تھی۔ چند منٹ تک اس کی تمام دماغی اور ذہنی قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ لیکن بہرحال اس کو یہ اندوہ ناک خبر معصوم لڑکی تک پہنچانی تھی کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ بتا دے لیکن نفسیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جب محبت کا زمانہ اپنے شباب پر ہو، اور پھر شباب بھی کیسا؟ —— موت کے اندوہگین لمحوں کو اپنے دامن میں پوشیدہ کئے ہوئے —— ایک خبرِ بد سے عیش کی صحبتوں کو برباد کر دینا، قبل از وقت اعترافِ شکست سے کم نہیں ہوتا۔

معاملہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ ہی گیا جب ان کی محبت پر در صحبتوں پر مرگِ ناگہانی کا حملہ ہونے والا تھا۔ مجبوراً شام کو ٹہلتے وقت اس افسر نے چند ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنی داستانِ محبت اور ساتھ ہی خبرِ جدائی بھی کہہ ڈالی۔

لڑکی کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کبھی اس کو اپنے محبوب سے جدا ہونا پڑے گا ظاہر ہے کہ ایسی خوش خیالی میں جب محبت کی دیوی اپنی تمام رنگینیوں سمیت ان کی پاکیزہ صحبتوں پر مسکرا رہی ہو، اس خطرناک اور اچانک خبر نے اس کے دل و دماغ کے ساتھ کیا کام کیا ہوگا۔ پہلے لمحے میں تو سکوتِ حیرت تھا لیکن فوراً ہی تمام صورتِ حالات اس کی نظر کے سامنے پھر گئی۔ ایک لرزتی ہوئی نگاہ سے اس نے اپنے رخصت ہونے والے دوست کو دیکھا اور پھر ایک معصوم بچے کی طرح سسک سسک کر رونے لگی۔ بہت ممکن ہے آپ اس اشکباری کو عورت کا آخری حملہ قرار دیں لیکن اس وقت وہ آنسو صرف قلبی راز کے آئینہ دار تھے اور بس!

نوجوان افسر اس تباہ کن منظر کی تاب نہ لاکر بے چین ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے نمناک صحیفۂ محبت پر اپنے کانپتے ہوئے لبوں سے چند مہریں ثبت کر دیں۔ لڑکی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس قسم کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں محبت کے کثیف اجزا غم کی دہکتی ہوئی بھٹی میں پڑ کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ ممکن ہے کبھی کبھی صحیح بھی ہو جاتا ہو لیکن کم از کم اس وقت تو یہ اس کی معصومیت کا فریب ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے چہرہ کا تمتماتا ہوا حسن اور پھر اس کی بے اختیار سپردگی!! ایک فریب خوردہ انسان کو مغالطہ میں ڈال دینے کے لئے کم نہ تھیں۔ اس کو یہ یقین تھا کہ اس کی فوقیت کا سکہ لڑکی پر جم چکا ہے اور اب اس سے فائدہ نہ اٹھانا گویا قدرت کی عطا کی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دینا ہے چنانچہ فوراً اس نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چل کھڑی ہو اور اس کے غم و راحت میں برابر کی حصہ دار رہے۔

کہنے کو تو وہ کہہ گیا لیکن اس گاؤں میں اپنی اجنبیت محسوس کر کے اور اپنی اس خود غرض تجویز کی رکاکت کا خیال کر کے وہ اس درجہ خجل ہوا کہ پھر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا وہ خاموش تھا اور اس کا دماغ، قلب کی تنگ ظرفی پر نالاں! لڑکی نے جب یہ الفاظ سنے تو پہلے تو وہ قطعاً یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ اپنا گھر کیوں چھوڑ دے؟ اپنے شفیق والدین کی معیت سے کیوں بھاگ کھڑی ہو؟ کیا صرف اس لئے کہ اس کو فوجی افسر سے محبت تھی؟ لیکن محبت تو زمان و مکاں کی قیود سے بالاتر ہوا کرتی ہے اور پھر محبت تو اس کو اپنے والدین سے بھی تھی۔ وہ بھی ایک معصوم محبت تھی اور یہ بھی ایک معصوم محبت!! پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح کی وجہ؟

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس کی نسوانی فراست نے اصل معاملے سے اس کو آگاہ کر دیا کہ فوجی افسر کی محبت "آرزوئے خام" سے بے نیاز نہیں۔ وہ زہر کی ایک تلخ گولی تھی جس پر شکر چڑھا کر وہ اس کو پیش کر رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کا ہر قطرہ جہاں تھا وہیں منجمد ہو کر

رہ گیا۔ وہ جوشِ الم میں ایک حرف بھی اپنی زبان سے نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس کا دماغ رنج اور غصہ سے کھول رہا تھا۔ اس کی محبت نے اپنا رخ تبدیل کیا اور وہ اس طرح جھجک کر پیچھے ہٹی گویا اس کے سامنے ایک خطرناک زہریلا سانپ پڑا ہو۔ وہ اپنی روحانی کوفت میں دونوں ہاتھ ملنے لگی اور ایک نفرت آمیز نگاہ اس فوجی کے چہرہ پر ڈال کر اپنے گھر کی طرف اس طرح بھاگی گویا کہہ رہی ہو ؎

کہ عنقا را بلند ست آشیانہ!

افسر اپنی اس ذلیل حرکت پر پشیمان، حیرت میں غرق کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ چند لمحات اس کی زندگی کی وہ خطرناک اور پریشان کن گھڑیاں تھیں جن میں مستقل مزاج سے مستقل مزاج اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی بھی گھبرا کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک نوآموز اور غیرت مند شخص جس نے سوسائٹی کی اخلاق کُش لیکن دلفریب ترغیب سے متاثر ہو کر اپنے ضمیر کو پہلی مرتبہ اتنا سخت دھچکا پہنچایا ہو۔ وہ جو کچھ بھی کر گزرتا وہ کم تھا لیکن روانگی کی ہلچل اور یار دوستوں کے ہنگامے نے اس کو بڑی حد تک باز رکھا اور وہ نہ طے کر سکا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ بہرکیف وہ اپنی فوج کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نئی سرزمین کے دلکش مناظر، نت نئے واقعات جدید احباب اور حالات کی تبدیلی نے اس کے حال پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا اور وہ حال، کی سرگرمیوں میں ماضی کے روح فرسا واقعے کو رفتہ رفتہ فراموش کرنے لگا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی گزشتہ صحبتوں کی یاد، سپاہیوں کی نقل و حرکت سے بے نیاز ہو کر فوجی زندگی کی ہنگامہ خیز مصروفیت کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی اُس کے دل و دماغ تک پہنچ ہی جاتی۔ گاؤں کی ستھری، معاشرت، جلسہ بہار کے رنگینیاں، ایک حسین لڑکی کی دوستی، اس کا شام کو نہر کے کنارے کسی کے بازو کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ٹہلنا، اپنی لطیف محبت کا مرکز ایک مسافر کو بنانا اور پھر اس کی غلط فہمی، اپنی تنگ ظرفی کا ایک ناگوار پیرایہ میں اظہار، یہ سب خیالات

مل جل کر کچھ اس بُری طرح اس کو متاثر کرتے کہ وہ گھنٹوں شرم اور ندامت سے اپنا سر نہ اٹھا سکتا!

غریب لڑکی کو جو صدمہ اپنی محبت کی تباہی سے پہنچا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے دل و دماغ کی تمام قوتیں جو ایک مرکز کی طرف مائل ہو چکی تھیں، اب اس طرح ہچکولے کھانے لگیں جیسے ایک ڈوبتا ہوا جہاز سمندر کی بے پناہ موجوں پر زیر و زبر ہوتا ہے۔ ابتدا میں غشی اور بے ہوشی کے دورے پڑے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ ان مسلسل حملوں کی تاب نہ لاکر صاحبِ فراش ہو گئی۔

اس نے اپنی کھڑکی سے فوج کو کوچ کرتے ہوئے دیکھا جس میں اس کا بے وفا دوست اپنی شاندار وردی پہنے ایک ہاتھ سے کرچ اور دوسرے سے باگ سنبھالے بینڈ کی آواز پر گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بڑی زبردست فتح حاصل کر کے لوٹ رہا ہو! معصوم لڑکی نے ایک درد آمیز نگاہ سے اس کے چمکتے ہوئے خود اور لہراتے ہوئی کلغی کو دیکھا اور دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بس ایک بجلی تھی کہ چمکی اور اس کے دل میں پیوست ہو گئی!!

یہ بیان کرنا کہ اس حادثہ کے بعد اس لڑکی کی کیا حالت ہوئی، ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ اس قسم کے اندوہناک واقعات جن میں ایک پاک محبت کا جذبہ آخر میں صرف فریبِ نفس ثابت ہو، اکثر 'المیہ' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

نظرتاً یہی کیفیت اس کی بھی ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سوسائٹی اس کی خوش و خرم زندگی میں کوئی ناگہانی تبدیلی محسوس کرے۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں کی نظر بچا کر جنگل میں تنہا نکل جاتی اور ایک مجروح ہرنی کی طرح گھنٹوں اپنی بدبختی پر آنسو بہاتی رہتی۔ اس کا سفید اور ستا ہوا چہرہ صاف بتاتا تھا کہ اس کی شکستہ محبت دل کی ہر ہر رگ سے خون چوس چکی ہے۔ اکثر شام کو دودھ بیچنے والی لڑکیوں نے اس کو گرجا گھر کی تاریک برساتی میں کوئی غمگین راگ الاپتے ہوئے سنا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ دنیا کی تکالیف سے تنگ آجاتا ہے تو ان سے پناہ حاصل کرنے کے لئے کسی

مافوق الفطرت ہستی کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب بتوں کی بے نیازی اس کو خدا کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے ـــــ اس لڑکی کی دنیوی مصروفیتیں بھی گرجا کی چہار دیواری میں محدود ہونے لگیں۔ عبادت میں اس کا استغراق بڑھنے لگا اور وہ رفتہ رفتہ مریم کی ایک مقدس چیلی معلوم ہونے لگی۔ جب گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کو گرجا میں آتے دیکھتے ـــــ اس طرح کہ پوست و استخوان کا ایک نازک ڈھانچہ تقدس کے ہالے میں آسمانی پیکر بنا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس کو راستہ دیدیتے اور درمیان سے گذر جانے کے بعد اس پر اس طرح نظر ڈالتے گویا وہ ایک مایوسی و حسرت کا مرمریں مجسمہ ہے کہ دنیا میں عبرت دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اس کو اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ بہت تیزی سے اپنی موت کی طرف جا رہی ہے لیکن وہ سمجھتی تھی کہ قبر کا تاریک گوشہ ہی اس کو دوامی آرام پہنچا سکتا ہے ـــــ محبت کا وہ سیمیں رشتہ جو اس کی زندگی کا وزن سنبھالے تھا اب ڈھیلا ہو چکا تھا۔ وہ محبت کی بلند چوٹی سے ایک بار گر پڑنے کے بعد چاہتی تھی کہ اجل کی عمیق ظلمتوں میں گم ہو جائے۔ لیکن داد دیجئے اس کی شرافتِ نفس کی کہ اپنے دوست کے فریبِ محبت سے واقف ہو جانے پر بھی اس کے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ یا ممکن ہے کہ چند لمحوں کے احساس کے بعد اس کی تمام چنگاریاں خاکستر ہو چکی ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس کے دل میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ نفرت یا غصہ کا کوئی جذبہ اس میں پرورش پا سکے۔

ایک روز جب اس کی حالت بہت نازک ہو گئی، تو اس نے ایک وداعی خط بہت ہی سادہ اور مختصر الفاظ میں اپنے دوست کے نام لکھا لیکن اس کی سادگی بھی بلا کا اثر رکھتی تھی۔ یہ تحریر اس کے دل کی فریاد تھی جس میں کوئی لے نہیں ہوتی: اس نے لکھا کہ وہ مرنے والی ہے اور اس کی موت کا باعث صرف اس کی ذات ہے۔ اس نے اپنی تمام جسمانی اور روحانی اذیتوں کا ذکر نہایت سادہ پیرایہ میں کیا جو اسے اس دوران میں جھیلنا پڑیں۔ اختتام میں اس نے جو جملے

لکھے وہ یہ تھے کہ :۔

"میں نے محسوس کیا کہ اس وقت تک میں آرام سے جان نہیں دے سکی جب تک میں تمہاری فریب دہی کو معاف نہ کر دوں اور اپنی پُر خلوص دعائیں تم تک نہ پہنچا دوں"

شباب کی قوتیں پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اب رفتہ رفتہ اس کی کمزوریاں بھی جواب دینے لگیں حتیٰ کہ وہ اپنے گھر سے باہر بھی نہ نکل سکتی تھی۔ اب اس کا مشغلہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر کھڑکی تک پہنچ جائے اور وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر سامنے کے میدان کا نظارہ کیا کرے ——— وہی میدان جو چند روز قبل اس کی محبت کا جولانگاہ رہ چکا تھا۔

کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ نہ اس نے کبھی اس راز کا ذکر کیا جو اس کی روح کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے محبوب افسر کا نام بھی کسی کو نہ بتایا البتہ کبھی کبھی تنہائی میں، جب جوشِ غم کی فراوانی ہوتی، وہ اپنی ضعیفہ ماں کی گود میں سر ڈال کر خاموشی سے رو لیا کرتی!

اس کے غریب والدین اس صدمے کو جس خاموشی سے برداشت کر رہے تھے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ اپنی امیدوں کے لہلہاتے ہوئے باغ کو مرجھاتا ہوا دیکھتے لیکن زبان سے اُف نہ کر سکتے تھے۔ اب بھی ان کو کبھی کبھی یہ امید ہوتی کہ شاید یہ غنچۂ پژمردہ از سرِ نو شاداب ہو جائے اور اس کے چہرہ کی وہ دمک جو کبھی محبت کی تنویر سے مالا مال تھی منتقل ہو کر اس کی آئندہ صحت کا یقین دلا دے۔ لیکن محبت کرنے والے امیدوں کی چار دیواریاں کھینچا ہی کرتے ہیں اور موت اپنا شکار چپکے سے دبوچ کر غائب ہو جاتی ہے۔

اسی دوران میں ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت وہ اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی ماں کی گردن میں حائل تھے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ہوا ہلکے ہلکے ہلکورے

لیتی ہوئی کمرے کو اس بھینی خوشبو سے مہکا رہی تھی جو دروازے پر لٹکے ہوئے گملوں میں سے نکل رہی تھی۔ اس کا باپ انجیل مقدس کا وہ باب سنا رہا تھا جس میں دنیا کی ناپائداری اور آخرت کی ان راحتوں کا ذکر تھا جو نیک بندوں کے لئے دائمی طور پر مہیا کی گئی ہیں۔

مضمون کی نوعیت اور اس کا ملہمانہ انداز بیان، پھر خود اس کے موجودہ حالات کی نفس مضمون کے ساتھ ہم آہنگی! یہ سب چیزیں کچھ اس قدر موثر ثابت ہوئیں کہ اس کا قلب ایک ابدی اطمینان محسوس کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں اپنے دیہاتی گرجا گھر کی چوٹی پر لگی تھیں۔ شام کی عبادت کے لئے گھنٹی بج رہی تھی اور عبادت کرنے والے سادہ لوح دیہاتی ایک قلبی عقیدت کے ساتھ خاموش گردن جھکائے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ فضا کا ذرہ ذرہ اس مقدس سکوت میں غرق ہے جو صرف اتوار ہی کو گاؤں بھر پر طاری ہوتا ہے۔ اس کے والدین لڑکی کے سنجیدہ چہرہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بیماری اور غم نے جو بعض چہروں کی توانائی اور تازگی زائل کر دیتے ہیں اس کے چہرہ کو ایک لاہوتی حسن بخش دیا تھا۔ اس کی ناتواں، نیلگوں آنکھوں میں دو آنسو تھرتھرا رہے تھے —— کیا اسے اپنے فراموشکار کی یاد آئی؟ یا اس کے خیالات گرجا کی اس سرزمین پر منڈلا رہے تھے جس کے مقدس سینے میں وہ سما جانے والی تھی؟؟ یکایک ٹاپوں کی آواز آئی۔ ایک سوار مکان پر آکر رکا۔ وہ کھڑکی کے سامنے اتر پڑا —— بے چاری لڑکی نے ایک ہلکی چیخ ماری اور اپنی کرسی میں گر گئی —— یہ اس کا منفعل دوست تھا —— وہ جلدی سے گھر میں داخل ہوا اور اسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بڑھا لیکن اس کا لاغر جسم، اس کا پژمردہ چہرہ! اتنا حقیر مگر کتنا دلکش!! اس کے دل میں ایک دھچکا سا لگا اور وہ غم کا مارا اس کے قدموں میں گر پڑا —— وہ کمزوری کی وجہ سے اٹھ نہ سکی —— اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس نے بڑھانا چاہا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی جیسے اس نے کچھ کہا مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس بے چاری نے کوشش کی کہ اٹھ کھڑی ہو لیکن نقاہت نے ہلنے بھی

نہ دیا۔ اس نے کوشش کی ـــــ ایک آخری کوشش ـــ کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو اٹھالے لیکن وہ اپنی نصف درازی تک بھی نہ پھیلے تھے کہ گر گئے ـــــ اس کے خشک لبوں نے ہل کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بے سود! اس کی کمزور نگاہیں ایک سوگوار شیفتگی کے ساتھ اپنے دوست کے اشک آلود چہرہ پر مسکرائیں اور مسکرا کر ہمیشہ کے لئے اس میں جذب ہوگئیں!!

یہ ہیں وہ تفصیلات جو اس دیہاتی قصہ کے متعلق میں جمع کر سکا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی ایسی جدت بھی نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ آپ کو مجبور کر کے سناؤں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ اپنی تباہ کاریوں سمیت آپ کو فراموش کر دینے کے قابل معلوم ہو لیکن کم از کم میرے دل و دماغ پر اس کا اثر اس وقت بہت پڑا اور پھر خصوصاً اس لئے کہ ڈرامہ کا وہ آخری منظر جو غم کی تکمیل کر رہا تھا، میری نظروں کے سامنے گزرا ہے ــ
بہرحال! بھول جائیے کہ یہ لوگ بھول جانے ہی کے قابل ہیں:۔
ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

(تلخیص از واشنگٹن ارونگ)

سرمایہ داری کارل مارکس کی نظر میں

(ایم - ایم - جوہر صاحب)

عوام کے لئے اقتصادیات میں وہ دلچسپی نہیں ہوسکتی جو شاعری یا افسانہ میں ہے لیکن قحط کے زمانے میں عاشق عشق فراموش کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ بھوک کی شدت رُخ زیبا کا کل مشکیں، نگاہِ بدمست کو بھلادیتی ہے اور انسان کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقتصادی دنیا میں داخل ہوکر قحط کی وجوہات سمجھے اور اس کے رفع کرنے کی کوشش کرے۔

عام گھرانوں کی یہ اقتصادی الجھنیں کہ صاحب زادے کی تعلیم کے لئے سرمایہ نہیں۔ بھائی کو معقول عہدہ نہیں ملتا، خاوند کی تنخواہ کم ہے، بہن اور بیٹی کی شادی نہیں ہوتی، رشتہ آتا ہے تو لڑکے والے منہ پھاڑ کر مانگتے ہیں، اور اسی قسم کی خانگی مشکلات کا سبب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ انسان اپنی سماج کے اقتصادی حالات نہ سمجھے۔ لیکن فی زمانہ ہر سماج کی اقتصادی حالت تمام دنیا کی اقتصادی حالت سے منسلک ہے۔ اپنی سماجی حالت کو دنیا کی عام حالت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ خانگی زندگی کی کش مکش سماجی زندگی کا عکس ہوتی ہے اور کسی سماج کی زندگی تمام دنیا کی کش مکش کا پرتو ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کرسکتے۔ کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح گھر کی چار دیواری کو اپنی دنیا خیال کرنا موجودہ دور میں حماقت ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام دنیا کی اقتصادی حالت پر جس کو سرمایہ داری کہتے ہیں، ایک نظر ڈالی جائے۔ بیسویں صدی میں جہاں اور بہت سی متضاد باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں قحط اور فراوانی اجناس بہ یک وقت موجود ہیں اور اس تضاد نے ایک مستقل شکل اختیار کرلی ہے۔ لیکن سرمایہ دار مصنفین اقتصادیات سرمایہ دارانہ نظام کو بہترین نظام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر دنیا کی اقتصادی زندگی کی سطح

پر کچھ بدحالی دکھائی بھی دے رہی ہے تو وہ وقتی چیز ہے، کچھ عرصے کے بعد آپ جاتی رہے گی
نظام سرمایہ داری میں کوئی ایسی اصولی خامی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ یہ
اوپری بیماری ایسی مہلک ہے کہ سرمایہ داری کی جان کے لئے خطرہ ثابت ہوگی۔ جیسے انسان
کو نزلہ زکام ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں خود سرمایہ داروں کی کوتاہ اندیشی سے
کبھی کبھی تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے گھبرا کر سرمایہ دارانہ نظام ہی
کو دفن کر دیا جائے۔

لیکن کسی حقیقت سے انکار کرنے سے وہ حقیقت بدل نہیں جاتی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب
نفع کی شرح گری، کام کاج بند ہوئے اور دنیا کی تجارت موت کے کنارے آ لگی۔ انسان
بے کاری اور بھوک سے بدحال ہو گیا۔ سرمایہ دار اور مزدور طریق پیداوار کے دو کناروں پر
جمع ہو گئے لیکن ایک جگہ مل کر کام نہ کر سکے۔ میانوں میں تلواریں کھڑکنے لگیں تب سرمایہ دار
مفکرین چونکے اور چند نے اعتراف کر لیا کہ سرمایہ داری میں آشوب (CRISIS) ہوتا
ہے اور ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد سب ماہرین آشوب کی موجودگی کا اقرار، اس کے سبب
نوعیت اور نتائج پر غور و فکر کرنے لگے۔

لیکن کارل مارکس نے آج سے ایک صدی قبل سرمایہ داری کی ہر ارتقائی منزل کی تحلیل
کر دی تھی۔ اس نے ان تمام منازل کا مفصل ذکر کیا ہے جن میں سے سرمایہ داری گذرتی ہے
جہاں اُس نے سرمایہ داری کے بچپن اور نمو کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی پیری کی درماندگیوں
نزع کی حالت اور موت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

مارکس کا تخیل روشن اور واضح ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ اقتصادی دور
اس کے پیش نظر تھا اور وہ آج کل کے حالات کو دیکھ کر اپنے اقتصادی نظریے تراش رہا
تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ سو سال قبل کے حالات موجودہ زمانے سے بالکل مختلف تھے لیکن چونکہ
مارکس نے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے صحیح قانون دریافت کر لئے تھے اس وجہ سے ان

قوانین کی بنا پر جو نتیجے نکالے وہ بھی درست ہیں۔ اس نے ان قوانین کی بنا پر پیشین گوئیاں کی ہیں جن کی صحت کا ثبوت موجودہ اقتصادی حالات دے رہے ہیں۔ مارکسٹ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ان نظریوں کی بنا پر نہ صرف سماجی زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکتے ہیں بلکہ پیشنگوئیاں کر سکتے ہیں کہ آیندہ کیا ہوگا؟

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دعوے کہاں تک ٹھیک ہیں اور مارکس کا قیمت کا نظریہ کہ سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے کس حد تک آشوب کی علت و اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں ہم مارکس کے مختلف نظریوں سے بحث نہیں کریں گے۔ ان کی صحت وغیرہ کے متعلق ہم اپنے دوسرے مضامین میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اُن کو درست مان کر یہ بتائیں گے کہ وہ سرمایہ داری کے موجودہ دور کی کس خوبی سے تحلیل کرتے ہیں۔

یہ بہتر ہوگا کہ یہاں اجمالاً مارکس کے ان اقتصادی نظریوں کا ذکر کر دیا جائے جو نفسِ مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

مارکس نے سرمایے کی دو قسمیں کی ہیں:۔

(۱) زندہ سرمایہ

(۲) مردہ سرمایہ

(۱) زندہ سرمایہ کل سرمایے کا وہ جز ہے جو مزدور کو بطور اُجرت دیا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ جنس میں قیمت پیدا کرتا ہے۔ جیسے جیسے کسی طریق پیداوار میں زندہ سرمایہ کم ہوتا جاتا ہے جنس کی قیمت گرتی جاتی ہے۔ اور نفع کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے تو ہمارا یہ مطلب ہوگا کہ مشین مزدور کی جگہ لے رہی ہے۔

(۲) مردہ سرمایہ: یہ سرمایہ کا وہ جز ہے جو زندہ سرمایے کے علاوہ طریق پیداوار میں صرف ہوتا ہے۔ مثلاً مشین، خام اجناس، عمارت وغیرہ۔ مردہ سرمایہ جنس میں قیمت کا اضافہ

نہیں کرتا بلکہ جنس میں صرف اپنی قیمت منتقل کرتا ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ "م" بڑھ رہا ہے۔ تو ہمارا یہ مطلب ہوگا کہ طریق پیداوار آلاتی ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں ہم یہ بھی بیان کر دیں کہ مارکس کے نفع اور قدرِ زائد کے نظریے کیا ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔

(۱) قدرِ زائد :- مزدور قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ جب مزدور سے چھ گھنٹے کی اُجرت دے کر بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے تو گویا دوسرے چھ گھنٹے مزدور مفت میں کام کرتا ہے۔

اس بیگار کے وقت میں جو قیمت پیدا ہوتی ہے وہ قدر زائد کہلاتی ہے۔ سرمایہ دار جماعت اسی قدر زائد کے مختلف نام رکھتی ہے۔ ایک جز کو سود کا نام دے کر ہضم کر جاتی ہے۔ دوسرے جز کو نفع کہہ کر کھا لیتی ہے۔ تیسرے جز کو خطرے کا معاوضہ کہہ کر صاف کر جاتی ہے۔ ہم اس مضمون میں قدر زائد کی شرح سو فی صدی مانیں گے ہم یہ فرض کریں گے کہ مزدور کو چھ گھنٹے کی اُجرت دی جاتی ہے اور اس سے بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کارخانے میں مزدوری کا بل سو روپے ہے تو سو روپئے قدر زائد ہوگی۔

(۲) نفع :- نفع کی شرح کا دار و مدار اس پر ہوگا کہ کارخانے میں کل کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ مثلاً اگر زندہ سرمایہ دس لاکھ روپئے ہے اور مُردہ سرمایہ تیس لاکھ روپئے ہے تو کل سرمایہ چالیس لاکھ ہوا۔ فرض کیجئے کہ دس لاکھ کی رقم بطور قدر زائد ملی تو کل چالیس لاکھ پر شرح نفع پچیس فی صدی ہوئی۔ لیکن اگر کسی کارخانے یا سماج میں زندہ سرمایہ دس لاکھ ہو اور مردہ سرمایہ نوے لاکھ ہو تو قدر زائد تو وہی دس لاکھ رہی۔ لیکن نفع کی شرح میں فرق آگیا۔ وہ دس فی صدی رہ گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی سماج میں مردہ سرمایے کی مقدار زندہ سرمایے سے زیادہ ہو جائے تو اس سماج میں (اگر اور اقتصادی حالات بدستور رہیں) نفع کی شرح

کم ہو جائے گی۔

آئندہ آسانی کے لئے ہم اس مضمون میں زندہ سرمایے کو 'ز' کہیں گے اور مردہ سرمائے کو 'م' اور جب یہ کہنا مقصود ہوگا کہ کسی سماج یا ملک میں سرمایہ داروں میں آپس میں بڑے شدّومد سے مقابلہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے طریق پیداوار کو آلاتی بنایا جا رہا ہے۔ مشین مزدور کو برطرف کر رہی ہے، آلات و مشین کے ذریعے جنس سستی کی جا رہی ہے، مزدوری گھٹائی جا رہی ہے تاکہ جنس سستی ہو اور نفع کی شرح بھی نہ گرنے پائے تو ہم صرف یہ کہیں گے کہ طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے۔

اب ہم کارل مارکس کے دعوے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار ترقی کرتا جائے گا نفع کی شرح گرتی جائے گی اور طریق پیداوار کی ترقی اور انفرادی نفع میں تضاد واقع ہوتا جائے گا۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ 'ز' کے گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون (جو مارکس کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے) اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی (جس کو کرائسس کہتے ہیں) کے اسباب علل بتائے۔ اب ہم مارکس کے دعوے کی صحت پر نظر ڈالتے ہیں۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے دنیا کی صنعت و حرفت بہت تیزی سے آلاتی ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی 'ز' گھٹ رہی ہے 'م' بڑھ رہا ہے۔ در اصل صنعتی و حرفتی ترقی نام ہی اس کا ہے کہ 'ز' گھٹے اور 'م' بڑھے۔ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی انسانی ترقی کے مترادف ہے۔ انسانی ترقی اس کے سوا کیا ہے کہ انسان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ فرصت حاصل ہو جس میں وہ اپنی جسمانی دماغی اور روحانی ترقی کی راہیں دریافت کر سکے۔

مارکس کا دعویٰ ہے کہ طریق پیداوار میں 'ز' کا گھٹنا اور 'م' کا بڑھنا نفع کی شرح کم کر دیتا ہے۔ البتہ کچھ عرصے کے لئے یہ ممکن ہے کہ باوجود 'ز' گھٹ جانے کے نفع کی شرح نہ گھٹے۔

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ مزدور کو خوب نچوڑ کر اس سے قدر زائد زیادہ وصول کی جائے۔ فرض کیجئے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے نفع کی شرح ۵۰ فی صدی کم ہوگئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ جنس کے دام بڑھائے جائیں لیکن وہ مقابلے کی وجہ سے نہیں بڑھ سکتے) دوسرے یہ کہ مزدور کی مزدوری کم کی جائے اور کام زیادہ لیا جائے۔ مزدوری کم کرنے سے کساد بازاری پھیلتی ہے اس لئے مزدور سے زیادہ کام کرا کے نقصان کو پورا کیا جاتا ہے۔ ایسی تیز کار مشینیں بنائی جاتی ہیں کہ ان پر ایک گھنٹہ کام کرنے سے مزدور کی اتنی قوت عمل صرف ہو جاتی ہے جو سست رفتار مشین پر تین گھنٹے میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن مارکس کا خیال ہے کہ مشین مزدور کو نچوڑ کر قدر زائد میں اتنا اضافہ نہیں کر سکتی کہ 'ز' کی کمی سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے' اس کو پورا کر دے۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے' مارکس کا اقتصادی اصول یہ ہے کہ 'ز' اور 'م' کی نسبت پر نفع کی شرح کا انحصار ہوتا ہے 'ز' کے نسبتاً گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے سے نفع کی شرح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کا گھٹنا تین طریقوں پر ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ 'ز' واقعی گھٹ جائے۔ دوسرے یہ کہ 'ز' تو اسی قدر رہے لیکن 'م' بڑھ جائے۔ جس نسبت سے 'م' بڑھے گا اسی نسبت سے 'ز' گھٹ جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طریق پیداوار میں 'ز' بڑھ رہی ہو لیکن 'م' اس سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہو تو بھی 'ز' نسبتاً گھٹ جائے گی اور چونکہ 'ز' قدر زائد پیدا کرتی ہے اور نفع کی شرح قدر زائد کی کل سرمائے سے نسبت کا نام ہے۔ اس لئے جب 'ز' کے گھٹنے سے قدر زائد گھٹے گی تو نفع کی شرح یقیناً کم ہو جائے گی۔ مثلاً کسی سماج کا زندہ سرمایہ ... ۲۰۰۰ سے ... ۳۰۰۰ ہو جاتا ہے اور اسی عرصے میں اس کا مردہ سرمایہ ... ۴۰۰۰ سے ... ۱۵۰۰۰ ہو جاتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ

پہلے سماج کا کل سرمایہ

'م' مردہ سرمایہ	'ز' زندہ سرمایہ	کل سرمایہ
(۱) ... ... ۴ روپئے +	... ... ۲ روپئے =	... ... ۶ روپئے تھا

قدر زائد ... ... ۲ روپئے نفع کی شرح ۳۳ ⅓ فی صدی ہوئی۔

اب 'م' مردہ سرمایہ	'ز' زندہ سرمایہ	کل سرمایہ
(۲) ... ... ۱۵ روپئے +	... ... ۳ روپئے =	... ... ۱۸ روپئے ہوگیا

قدر زائد ... ... ۳ روپئے ۔ نفع کی شرح ۱۶ ⅔ فی صدی ہوئی۔

نمبر ۱ میں 'ز' اور 'م' میں ½ کی نسبت ہے مگر نمبر ۲ میں ⅕ کی نسبت ہے ۔ اگر مان لیں کہ 'ز' اپنے برابر قدر زائد پیدا کرتی ہے تو جب نمبر ۱ میں زندہ سرمایہ ۲۰ لاکھ تھا تو اسی قدر زائد بھی ۲۰ لاکھ ہوئی اور ۶۰ لاکھ پر نفع کی شرح ۳۳ ⅓ فی صدی ہوئی۔ طریق پر نمبر ۲ میں نفع کی شرح صرف ۱۶ ⅔ فی صدی ہوئی۔ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح گھٹ گئی۔ لیکن یہاں ایک اور امر غور طلب ہے وہ یہ کہ نمبر ۲ میں نفع کی شرح میں ۵۰ فی صدی کی کمی واقع ہوگئی۔ لیکن مجموعی نفع ... ... ۲ روپئے سے ... ... ۳ روپئے ہوگیا مارکس کہتا ہے کہ یہ سرمایہ داری کا ایک نہایت اہم پہلو ہے کہ سرمایہ داری میں یہ ممکن ہے کہ نفع کی شرح گرتی جائے۔ لیکن اس کی کل مقدار بڑھتی جائے۔ جیسے جیسے نفع کی شرح گرتی جاتی ہے سرمایہ دار کل سرمایے کو بڑھا کر مجموعی نفع زیادہ کرتا جاتا ہے ۔ جوں ہی نفع کی شرح ۳۳ ⅓ فیصدی سے ۱۶ ⅔ فی صدی ہوئی۔ سرمایہ دار نے فوراً ... ... ۱۲ روپئے زیادہ لگا کر نفع کی مقدار کو ... ... ۲ روپئے سے ... ... ۳ روپئے کرلیا۔ نفع کی شرح تو کم ہوگئی لیکن مقدار میں اضافہ ہوگیا۔ اگر یہ صورت حالات برابر قائم رہے تو سرمایہ دارانہ نظام قائم رہ سکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ صورت قائم نہیں رہتی اس شکل میں سرمایہ دار صنعت و حرفت میں برابر روپیہ لگاتا رہے گا اور مزدوروں کے لئے روزگار مہیا کرتا رہے گا سرمایہ دار کا مطمح نظر صرف نفع کی شرح ہی نہیں ہے بلکہ اس کی کل مقدار بھی ہے ۔ سرمایہ دار

اپنا نفع بڑھانے کے لیے اس پر مجبور ہے کہ طریق پیداوار کو ترقی دے۔
لیکن فرض کیجئے کہ کل سرمایہ ۶۰۰۰۰ سے صرف ۸۰۰۰۰ ہوا لیکن 'ز' اور 'م' کی نسبت ۱/۵ ہوگئی یعنی ۱۶۰۰۰ (ز) ۶۴۰۰۰ (م) (ز) نے حسب قاعدہ اپنے برابر ۱۶۰۰۰ روپے قدر زائد پیدا کی یعنی

نمبر (۳) مردہ سرمایہ		زندہ سرمایہ		کل سرمایہ
۶۴۰۰۰	+	۱۶۰۰۰	=	۸۰۰۰۰

قدر زائد ۱۶۰۰۰ ہوئی نفع کی شرح ۲۰ فی صدی ہوئی نمبر ۱ اور نمبر ۳ کے مقابلے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۳ میں کل سرمایہ بڑھ گیا۔ لیکن نفع کی شرح اور مجموعی نفع کم ہوگیا۔ نمبر ۱ میں ۶۰۰۰۰ روپے لگا کر ۲۰۰۰۰ روپے قدر زائد ملی تھی اور شرح نفع ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہوئی تھی۔ نمبر ۳ میں کل سرمایہ تو زیادہ لگا۔ لیکن قدر زائد نفع کی شرح کم رہی۔ کون سا ایسا سرمایہ دار ہے جو ۲۰۰۰۰ روپے زیادہ لگا کر اپنے نفع میں ۴۰۰۰ روپے کی کمی کرے گا۔ جب کسی سرمایہ دار سماج میں زندہ اور مردہ سرمایے کی نسبت مثال نمبر ۳ کی سی ہوجائے گی تو اس سماج کا طریق پیداوار فوراً مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ اس مثال سے یہ اظہار مقصود ہے کہ طریق پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع کی شرح کا کم ہونا لازمی ہے اور سرمایہ دار کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھائے تاکہ مجموعی طور پر نفع بڑھے۔ ۶۰۰۰۰ روپے کو بڑھا کر صرف ۸۰۰۰۰ روپے کرنے سے مقصد حل نہیں ہوتا۔ نمبر ۲ کی طرح مردہ سرمایہ ۱۵۰۰۰۰ روپے بڑھانا ہوگا تب کہیں مجموعی نفع بڑھ سکے گا۔

اب مارکس یہ بتاتا ہے کہ سرمایے کے بڑھنے کی کیا شرح ہونی چاہئے کہ طریق پیداوار مفلوج ہو کر نہ رہ جائے۔ مارکس یہ کہتا ہے کہ سرمایہ اتنی تیزی سے بڑھنا چاہئے تاکہ 'ر' بڑھ سکے۔ دوسرے الفاظ میں جس تیزی سے ز/م میں ز گرے اس نسبت سے تھوڑی زیادہ تیزی

کو سرمایہ بڑھنا چاہیئے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار زیادہ رہے اگر 'ز' آہستہ آہستہ گر رہی ہے تو کل سرمایے کی تھوڑی سی زیادتی نفع کی شرح کو سنبھالے رکھے گی۔ لیکن اگر 'ز' تیزی سے گر رہی ہے تو کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھنا ہوگا۔ مارکس وہ شرح بیان کرتا ہے جس تیزی سے سرمایے کا بڑھانا لازمی ہے' اگر سرمایہ اس تیزی سے نہ بڑھے تو سرمایہ داری ترقی نہیں کرسکتی۔ فرض کیجئے کہ کسی سماج میں (ز کے گھٹنے سے) نفع کی شرح (ہر سال) آدھی رہ جاتی ہے۔ مثلاً پہلے سال نفع کی شرح چالیس فی صدی تھی، دوسرے سال بیس فی صدی ہوئی، تیسرے سال دس فی صدی ہوئی اور چوتھے سال پانچ فی صدی رہ گئی۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ اگر مجموعی نفع کو پہلے کے برابر رکھنا ہو تو ہر سال سرمایے کو دُگنا کرنا ہوگا۔ اگر پہلے سال سرمایہ ۱۰۰ روپئے تھا تو دوسرے سال ۲۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ چوتھے سال ۸۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ اس مثال میں نفع کی شرح ہر سال ½ رہ جاتی ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ہر سال سرمایے کو دُگنا کرنا پڑتا ہے یعنی نفع کی شرح کا مقسوم سرمایے کا مضروب فیہ ہونا چاہیئے تب یہ مشکل حل ہوگی کہ مجموعی نفع کی مقدار برابر رہے۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگر سرمایہ داری کو قائم رکھنا ہے تو سرمایے کو اسی نسبت سے بڑھانا ہوگا جس نسبت سے نفع کی شرح گر رہی ہو۔ ورنہ طریق پیداوار کی ترقی رُک جائے گی۔

اگر سرمایہ اتنی تیزی سے نہ بڑھے گا تو نفع کم ہو جائے گا جیسا ہم نمبر ۳ میں ظاہر کر چکے ہیں اور سرمایہ دار کو کوئی لالچ نہ رہے گا کہ طریق پیداوار کو ترقی دے۔ مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانے میں ایک خاص رفتار سے سرمایہ جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی وجہ سے اس رفتار سے سرمایہ جمع نہ ہوسکے تو نفع میں کمی ہونی لازمی ہے اور ایسا ہوتے ہی طریق پیداوار کا رُک جانا لازمی ہے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں سرمایہ جمع کرنا طریق پیداوار کو آلاتی بنانا اور نفع کی مجموعی مقدار کو بڑھانا لازمی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ لازمی باتیں

سرمایہ داری کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ اُن کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مشین انسان کی جگہ لے لیتی ہے۔ سرمایہ سمٹ کر چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ سماج میں جنس خریدنے کی استطاعت نہیں رہتی۔ بازار میں اجناس کی بھیڑ ہو جاتی ہے، نفع غائب ہونے لگتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ اس تیزی سے جمع نہیں ہو سکتا جس کی طریق پیداوار کو ضرورت ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طریق پیداوار میں آشوب ہو جاتا ہے۔

جس نے ۱۹۲۹ء سے آج تک کی اقتصادی بدحالی کا مطالعہ کیا ہے (جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا عطیہ ہے) اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ آشوب جنس کے بھیڑ ہو جانے اور نہ فروخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ مفکرین اس آشوب کو رفع کرنے کی کیا صورت بتاتے ہیں۔ وہ اس آشوب کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ عوام کی خرید کی طاقت سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن دے کر بڑھانی چاہیئے تاکہ اس میں جنس خریدنے کی اہلیت پیدا ہو اور پھر طریق پیداوار نفع بخش ہو جائے لیکن یہاں سرمایہ دار مفکرین یہ بھول جاتے ہیں کہ جب نفع کی شرح گرتی ہے اس وقت سرمایہ دار کو خود سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار بڑھا سکے۔ اس وقت وہ غریب کی کب مدد کر سکتا ہے۔

آج کل سرمایہ دار کو سرمایہ جمع کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ز، م کی نسبت بہت تیزی سے گر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری بجائے اس کے کہ عوام کی جنس خریدنے کی طاقت بڑھائے، مزدوری کو کم کرتا ہے اور جنسوں کی قیمت بڑھاتا ہے۔ ہر آشوب میں یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مزدوری گھٹا دیتا ہے اور سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن وغیرہ بند کر دیتا ہے تاکہ سرمایہ جمع کرنے کی رفتار میں کمی واقع نہ ہو۔ ہم اس رفتار کا اوپر ذکر کر آئے ہیں نفع کی شرح کا مقسوم سرمائے کا مضروب فیہ ہونا چاہیئے۔ اگر سرمایہ اس رفتار سے جمع نہ ہو تو یہ سرمایہ داری کے لئے بہت ہی مہلک شکل ہے

مزدور کی اُجرت میں اضافہ اس فنڈ ہی کو ختم کر دیتا ہے جو نفع کی شرح گرنے پر صنعت میں لگایا جاتا ہے تاکہ نفع کی کل مقدار کو بڑھایا جا سکے۔

یہاں ہم نے سرمایہ داری کی دکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی اگر سرمایہ دار عوام کو مالی امداد نہیں دیتے تو بازاروں میں جنسوں کی بھیڑ ہو جاتی ہے قیمت گر جاتی ہے نفع کی شرح کم ہو جاتی ہے اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر امداد دیتے ہیں تو نفع کی شرح گر جاتی ہے۔ سرمایہ ضروری رفتار سے جمع نہیں ہو سکتا طریق پیداوار رک جاتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ دار کو طریق پیداوار کے چلانے کا کم لالچ رہ جاتا ہے۔ وہ طریق پیداوار سے روپیہ کھینچ لیتا ہے اور دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طریق پیداوار اور منڈیاں سکڑ جاتی ہیں، مزدور بیکار ہو جاتا ہے، جنس فروخت نہیں ہوتی اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔

دراصل سرمایہ داری اسی وقت چل سکتی ہے جب سماج کا زیادہ حصّہ افلاس زدہ رہے اور سرمایہ دار کوڑی کوڑی جمع کرتا رہے تاکہ 'ز' کی گرتی ہوئی نسبت سے جو نقصان ہو اس کو کل سرمایہ بڑھا کر پورا کر سکے۔ جب سرمایہ دار مفکروں کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ آشوب کو رفع کرنے کے لئے سماج میں جنس کے خریدنے کی طاقت تقسیم کرنی چاہیے تو سرمایہ دار بہت ہراساں ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے سرمایہ داری کے چلنے کے لئے جو دوسری شرط ہے (کہ سرمایہ تیزی سے بڑھے) پوری نہیں ہو سکتی۔ ان کا ہراس درست ہے کیونکہ اگر ان ماہرین اقتصادیات کی رائے پر جو سماج کی خرید کی طاقت بڑھا کر آشوب کو رفع کرنا چاہتے ہیں کبھی بھی بڑے پیمانے پر عمل کیا گیا تو یہ کوشش سرمایہ دارانہ نظام کو فوراً درہم برہم کر دے گی۔

سرمایہ داری کے لئے دو متضاد باتیں ضروری ہیں:۔

(۱) سرمایہ داروں کا انفرادی نفع کا تخیل اور آپس کا مقابلہ ان کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ طریق پیداوار کو آلاتی بنائیں۔ یعنی 'ز' کو کم کریں اور 'م' کو بڑھائیں۔

(۲) طریق پیداوار کو آلاتی بنانے سے جنس کی بھیڑ ہو جاتی ہے، آدمی غریب ہو جاتا ہے

سرمایہ دار کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ 'زر' بڑھے۔

سرمایہ داری بیک وقت یہ چاہتی ہے کہ 'زر' گھٹے بھی اور بڑھے بھی۔ یہ متضاد باتیں کیسے ہو سکتی ہیں؟

آج کل سرمایہ داری نظام کا یہ پہلو کہ اس میں پیسہ پیسہ جمع کرنا پڑتا ہے' ایک بھیانک حقیقت ہوگئی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے میں یہی وہ خصوصیت تھی جو اس کو بام ترقی پر لے گئی تھی۔ شروع میں سرمایہ دارانہ مقابلہ کے قانون اور نفع کی شرح کے گرنے کے قانون نے سرمایہ دار کو مجبور کیا کہ سائنس آلات اور مشین صنعت و حرفت کو ترقی دے' دُنیا کے چپہ چپہ میں جا کر صنعت و حرفت جاری کرے اور اس کو آلاتی بنائے۔ سرمایہ داری دنیا کے ہر گوشے میں نہ صرف کلیں اور مشینیں لے کر پہنچی بلکہ اس تہذیب و تمدن کو بھی لے گئی جو ان آلات اور مشینوں کا پیدا کردہ تھا۔ بادی النظر میں عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ تہذیب و تمدن بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کو مشین پیدا کرے۔ مگر کسی زمانے کا تمدن، تہذیب اور مذہب ہمیشہ اس زمانے کے طریق پیداوار کا عکس ہوتا ہے۔ سرمایہ داری ایک ایسا طریق پیداوار تھا جو دنیا نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس طریق پیداوار کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ انسان کو مجبور کرتا تھا کہ قدرت کی طاقتوں پر قابو پائے۔ کیونکہ اس طریق میں ان طاقتوں کے پھیلنے کے لئے بہت وسیع فضا تھی۔

اقتصادی مقابلے میں نفع کی شرح گرنے اور سرمایہ بڑھانے کے قانون ہی تھے جنھوں نے ذرائع رسد و رسائل کو اتنا عام کر دیا۔ کروڑوں فیکٹریاں جاری کر دیں۔ دلدلوں کو شہروں میں تبدیل کر دیا۔ مارکس نے بارہا سرمایہ دار جماعت کا تشکر سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے "یہ سرمایہ داری ہی کی برکت تھی کہ اس نے بڑی تیزی مگر بے رحمی کے ساتھ قدرت کی سوئی ہوئی طاقتوں کو انسانی خدمت کے لئے لا کھڑا کیا' وہ سرمایہ دار جماعت کو TRUSTEES OF SOCIETY کے نام سے پکارتا ہے کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جس کے خزانوں میں وہ تمام دولت جاتی ہے جو انسانوں

کے آپس کے تعاون سے کام کرنے کا نتیجہ ہے۔

لیکن آج سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اپنا مشن پورا کر چکا ہے۔ سرمایہ داری نے انسان کی سست دستکاری کو ختم کر دیا ہے اور پیداوار کی طاقتوں کو اتنا وسیع اور طاقتور بنا دیا ہے کہ اب سرمایہ دارانہ نظام ان طاقتوں کے لئے تنگ ہو گیا ہے۔ جب تک سرمایہ داری کی چار دیواری مضبوط ہے اس وقت تک اگرچہ وہ طریق پیداوار کی طاقتوں کو مقید رکھ سکتی ہے لیکن وہ طاقتیں اپنے فطری رجحان کے مطابق وسیع ہونے کی کوشش میں چار دیواری سے ٹکراتی رہیں گی اور تصادم پیدا ہوتا رہے گا۔ جس کی وجہ سے سماج میں ابتری بڑھتی چلی جائیں گی۔

طریق سرمایہ داری میں 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون سرمایہ دار ملکوں کو مجبور کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں جا کر دیکھیں کہ نفع کی شرح کہاں زیادہ ہے تاکہ وہاں فیکٹریاں کھولیں لیکن فی زمانہ یہ ظلم ہے کہ جہاں بھی کوئی کسی سرمایہ دار ملک میں پہنچتا ہے وہیں ایک حریف موجود ہوتا ہے جو اس کی دال گلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس ملک کا سرمایہ بیکار رہے اور کس کا نفع پیدا کرے۔ کیونکہ سرمایہ داری میں نفع کا مسئلہ حیات و موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لئے اس کا حل میدان جنگ پر ہوتا ہے۔

اب ہمیں دنیا کی اقتصادی اور سیاسی حالت کا اندازہ بہت صاف ہو گیا ہو کہ موجودہ ہنگامہ آرائی کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ مارکس کا قیمت کا نظریہ ہی یہ تحلیل ممکن کرتا ہے کہ آج کل دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ مارکس نے عرصہ ہوا یہ کہا تھا کہ جس تیزی سے طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داری ختم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا بادل دنیا پر ابھی تک چھا رہا ہے اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ مارکس کا نظریہ غلط ہو۔ اب اس پر غور کرنا ہے کہ سرمایہ داری اب تک کیوں

ختم نہیں ہوئی اس کی وجوہات ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) "ز" اتنی تیزی سے نہیں گر رہی جتنا کہ مارکس کا خیال تھا۔

اگرچہ سماج میں "ز" عام طور پر کم ہوگئی ہے لیکن اس کی کمی کو مزدور سے زیادہ کام لے کر پورا کیا جا رہا ہے مثلاً اگر دو آدمی چھ گھنٹے کام کرتے تھے تو ان کو برطرف کرکے دونوں کی اجرت سے ذرا کم پر ایک آدمی رکھا جو بارہ گھنٹے کام کرتا ہے یہاں "ز" کی تعداد میں تو فرق آگیا لیکن مقدار میں فرق نہیں آیا۔ محنت وہی بارہ گھنٹے کی رہی۔ البتہ دو مزدور کی بجائے ایک مزدور رہ گیا۔ انگلستان میں اب بھی "ز" کافی ہے اور "م" اس قدر نہیں بڑھا جتنا امریکہ روس اور جرمنی میں بڑھا ہوا ہے؛ اس پر بھی یہ حالت ہے کہ آسٹن کے موٹر کے کارخانے میں ۱۹۲۳ء میں ۵۵ آدمی ایک موٹر کی تیاری کے لئے درکار تھے لیکن ۱۹۳۴ء میں آٹھ آدمی موٹر بنا لیتے ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ کارخانہ کو اور آلاتی بنایا اور ان آٹھ مزدوروں سے تگنا چوگنا کام لیا جانے لگا۔ یہاں اگر مزدوروں کو تعداد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو "ز" بہت گر گئی لیکن اگر محنت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اتنی نہیں گری

(۲) قدر زائد بڑھ گئی ہے۔

• طریقۂ پیداوار جیسے جیسے آلاتی ہوتا جاتا ہے جنسوں کے دام گرتے جاتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدور کو زندہ رکھنے اور بال بچوں کو پرورش کرنے میں جن اجناس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے دام بھی گر جاتے ہیں۔ نتیجتاً مزدور کی قیمت گرتی جاتی ہے

فرض کیجئے سو مزدور ایک ہفتے میں چار سو روپئے کی قیمت پیدا کرتے ہیں ان کی اجرت دو سو روپیہ ہے اور پچاس فی صدی قدرِ زائد پیدا کرتے ہیں مگر صنعت و حرفت کی ترقی سے اور نتیجتاً جنس کے سستا ہونے کے باعث جن مزدوروں کو پہلے دو سو روپئے ملتے تھے اب ایک سو پچاس روپے ملنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اجرت کم ہو جانے پر بھی وہ چار سو روپئے کی جنس پیدا کرتے رہیں گے اس کے یہ معنی ہوئے کہ اجرت گھٹ جانے پر بلا پیدا

کو دو سو پچاس روپئے قدر زائد مل گئی۔ جہاں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہاں نفع کی شرح کے گرنے کا کم اثر محسوس ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی جہاں نفع کی شرح کم کرتی ہے وہاں زیادہ بھی کرتی ہے۔ اس طریق پر سرمایہ داری کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے اور آرام کا سانس لے لے۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو مزدور کو نچوڑ کر اور اس کی اجرت کم کرکے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ شرح کے گرنے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے۔ مزدور کو نچوڑنے کی بھی ایک حد ہے جس کے بعد اس کو نہیں نچوڑا جا سکتا لیکن نفع کی شرح کے گرنے کی کوئی حد نہیں۔

(۳) "م" کی قیمت اور حجم میں فرق ہے۔

'م' کے حجم کی زیادتی اور 'م' کی قیمت کی زیادتی میں فرق ہے۔ 'م' کی قیمت اس نسبت سے نہیں بڑھتی جس نسبت سے حجم بڑھ رہا ہے۔ مشینیں اب مشینوں سے بنتی ہیں اس لئے ان میں قیمت کم ہوتی ہے۔ لیکن بظاہر دنیا کی صنعت و حرفت میں 'م' بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ جب 'م' کی زیادتی اس قدر ہو گئی تو نفع کی شرح صفر ہو جانی چاہئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'م' کا حجم بڑھ رہا ہے اور قیمت کم ہو رہی ہے۔ سماج میں 'م' 'ز' کی نسبت اتنا زیادہ نہیں ہوا کہ نفع کی شرح صفر ہو جائے۔

نفع کی شرح اس طرح بھی بڑھائی جاتی ہے کہ دوسرے ملکوں سے مزدور کے استعمال کی جنسیں غلہ وغیرہ سستے داموں پر منگالی جاتی ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدوری کم ہو جاتی ہے قدر زائد زیادہ پیدا ہونے لگتی ہے۔ سرمایہ دار ملک غیر ترقی یافتہ ملکوں کے بازاروں میں اقتصادی لوٹ مچا کر بھی نفع کی شرح بڑھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں نفع کی شرح کو گرنے سے روک نہیں سکتیں، صرف گرنے کی تیزی کو آہستہ کر سکتی ہیں۔ عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر آشوب کی رفتار آہستہ کی جا سکتی ہے تو کیا اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ مارکس کہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری میں آشوب ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار مفکرین کہتے ہیں

کہ 'ز' اور 'م' کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ بازار میں جنس کی بھیڑ نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار اور امیر طبقے کیلئے ہی جنس بنانی چاہیئے عوام کے لیے جنس بنانے کی ضرورت ہی نہیں لیکن جب جنس چند امیروں کے لئے ہی بنے گی تو ذرائع پیداوار بنانے سے کیا فائدہ اور امیر آخر کتنی جنس خرید لیں گے

دوسری بات سرمایہ دار مفکرین یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ابھی تک اس قدر غیر ترقی یافتہ ممالک موجود ہیں کہ ان میں سرمایہ لگا کر سرمایہ داری کو از سر نو جوان کیا جا سکتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر سرمایہ دار ممالک تحفظ و حفاظت کی پالیسی ترک کر دیں اور ممالک میں آزادی کے ساتھ لین دین ہونے دیں تو سرمایہ داری میں آشوب نہیں ہوگا۔

کارل مارکس کے نزدیک یہ سب تجاویز بے کار ہیں کیونکہ یہ 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کو نہیں روک سکتیں۔ سماج میں تھوڑے ہی عرصے میں اتنا سرمایہ پیدا ہو جائے گا کہ اس کو طریق پیداوار میں لگانے سے نفع کی شرح بجائے بڑھنے کے گھٹنے لگے گی مثلاً ۲۰۰۰ روپئے سے ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا ہے تو شرح نفع ۱۰ فی صدی ہوئی۔ فرض کیجئے کہ سماج نے نفع کو اصل میں جمع کر کے ایک عرصے میں ۳۰۰۰ روپئے کر لئے اور مشین وغیرہ خرید لی یعنی 'م' اب ایک ہزار روپئے زیادہ ہو گیا۔ اور جنس ½ زیادہ پیدا ہونے لگی۔ لیکن 'ز' وہی رہی یعنی سماج میں جنس کی مقدار تو بڑھ گئی لیکن خرید کی استطاعت نہیں بڑھی لامحالہ جنس کو سستا کرنا پڑے گا نفع کی شرح گر جائے گی۔ فرض کیجئے کہ نفع کی شرح ۶٫۶ فیصدی ہو گئی اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۳۰۰۰ روپئے پر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا پہلے ۲۰۰۰ روپے لگا کر ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا تھا اب ۳۰۰۰ روپئے لگا کر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا۔ اس صورت میں کون سی سرمایہ دار سماج ہے جو طریق پیداوار کو بڑھائے گی۔ مارکس کہتا ہے کہ کتنا ہی کچھ کیجئے لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں ایک وقت ایسا آئے گا کہ سرمایے کا ذرا سا بڑھنا کل سماجی سرمایہ کی نفع کی شرح کو گھٹا دے گا۔ مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ اور مزدور دونوں موجود ہوں گے مگر ایک دوسرے کو استعمال نہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ اُن کے ملنے سے نفع کی شرح بجائے

بڑھنے کے گرنے لگے گی جس کو آشوب کہتے ہیں۔ نفع سرمایہ داری کی جان ہے اگر سرمایہ داری
سے نفع کا تخیل مفقود ہو جائے تو وہ سرمایہ داری ہی نہیں رہتی۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری
ہے کہ جنس کی افزائش کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ انسانی ضرورت سے زیادہ بن گئی۔ ممکن
ہے کہ لاکھوں انسان اس جنس کی ضرورت سے مر رہے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جنس
نفع کے لئے بنائی جاتی ہے اور جونہی کہ اس کے لین دین سے نفع غائب ہوا سرمایہ دارانہ اصطلاح
میں وہ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی۔ سرمایہ داری کا مطمح نظر انسانی ضرورت کو پورا کرنا نہیں
ہے بلکہ نفع کو بڑھانا ہے۔ سرمایہ داری کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ہر انسان اپنے نفع کی طرف دیکھے
تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہو گا کہ سب انسانی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی اور سماج بہت ترقی
کر سکے گی۔ سرمایہ داری کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اس نے انسانی خود غرضی کو
طریق پیداوار کے ساتھ منسلک کر کے اس کو ترقی کا ایک سبب بنا دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا مطمح نظر نفع ہے۔ یہ بالکل اتفاقی
امر ہے کہ طریق پیداوار میں حصہ لینے سے نفع پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر بغیر جنس بنائے نفع ہونے
لگتا تو سرمایہ دار کبھی بھی جنس نہ بناتا۔ چنانچہ جب بھی جنس بنانے میں نفع غائب ہوتا ہے سرمایہ دار
جنس بنانی بند کر دیتا ہے اور جب جنس تباہ کرنے میں نفع معلوم ہوتا ہے تو وہ اس کو تلف
کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ آج کل روئی، قہوہ، چائے، نارنگیاں، گیہوں، مچھلی عام
طور پر تباہ کی جاتی ہیں تاکہ نفع کی شرح نہ گرنے پائے۔ ہندوستان میں شکر اور سن کی
پیداوار گھٹائی جا رہی ہے۔ حالانکہ لاکھوں ہندوستانیوں کو شکر دیکھنے کو بھی نصیب نہیں
ہوتی۔ یہ معاملہ خام جنس کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ فیکٹریاں تباہ کر دی جاتی ہیں تاکہ نفع کی
شرح گرنے نہ پائے۔

مارکس مندرجہ بالا تدابیر کو ناپائیدار اور ہنگامی کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح
نفع کی شرح بڑھانے سے نقصان ہوتا ہے کیونکہ جب دوبارہ آشوب ہوتا ہے تو اور زیادہ

سخت ہوتا ہے۔

سرمایہ داری کا نفع بڑھانے کا دوسرا طریقہ جیساکہ ہم بیان کر آئے ہیں قدر زائد کو زیادہ کرنا ہے۔ لیکن یہ سرمایہ دار کی آدھی فتح ہے۔ کیونکہ جب تک سرمایہ دار قدر زائد روپیے میں نہ بدل لے اس وقت تک اس کا مقصد حل نہیں ہوتا۔ لیکن قدر زائد بڑھانے سے سماج میں روپئے کی تقسیم میں کمی آتی ہے۔ یہاں بھی وہی تضاد کی شکل پیدا ہو جاتی ہے سرمایہ داری کی ساری خرابی یہ ہے کہ اس کا مطمع نظر نفع ہے۔ کچھ عرصے نفع کا بڑھنا اور طریق پیداوار کی ترقی دوش بدوش چلتی ہیں۔ طریق پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع بھی بڑھتا ہے۔ لیکن ایک منزل پر پہنچ کر انفرادی نفع اور طریق پیداوار کی ترقی میں تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ نفع کو بڑھائیں تو طریق پیداوار سکڑتا ہے اور اگر طریق پیداوار کو وسیع کریں تو نفع گرتا ہے۔

موجودہ زمانے میں طریق پیداوار میں مستقل تضاد کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اب کوئی ایسا طریق پیداوار تخلیق کرنا پڑے گا جس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشوونما کے لئے وسیع فضا ہو۔ مارکس کہتا ہے کہ کسی طریق پیداوار کو زندہ رہنے کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشوونما کے لئے گنجائش ہے۔ سرمایہ داری اب اس پر مجبور ہو گئی ہے کہ طاقتوں کو بجائے بڑھانے کے گھٹائے۔ لہٰذا اب اس کو حق نہیں کہ پیداوار کی طاقتوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے۔

کارل مارکس کا خیال تھا کہ اگر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو نہیں بدلا گیا تو دنیا میں اس قدر کشت و خون ہوگا کہ عجب نہیں کہ دنیا کا تہذیب و تمدن ختم ہو جائے۔ اگرچہ یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ آیا ہمارا تہذیب و تمدن اس قابل ہے بھی کہ اس کی تباہی پر کف افسوس ملا جائے؟ بہرحال جب انسان ہی فنا ہو گیا تو اچھی بری تہذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں حیوانات کا زندہ رہنا اور نسل انسانی کا ایک غلط سماجی نظام کا شکار ہو جانا قابل افسوس ضرور ہے اس تباہی سے اگر کوئی نظام بچا سکتا ہے تو وہ سوشلسٹ نظام ہے۔

ملک الشعرا ذوق

(۱) غزلیات

ذوق کو آج کل کے معیار سے جانچنا درست نہیں اس لئے کہ وہ بالکل اپنے زمانے کی پیداوار تھے اس لئے انھیں اس عہد سے باہر نکال کے دیکھنا ان کی حق تلفی کرنا ہے۔ موجودہ معیار کے مطابق وہ شاعر نہیں تھے لیکن اپنے عہد کے بہترین شاعر سمجھے جاتے تھے محض اس لئے کہ اس زمانے کا معیار شاعری دوسرا تھا یعنی شعر میں ظاہری خوبیاں پیدا کرنا اور ان پر داد طلب کرنا۔

کچھ تو شاہ نصیر کی دلی سے غیر حاضری اور کچھ معرکوں میں دو بدو کامیاب مقابلوں نے

پیدائش ۱۷۸۹ء۔ وفات ۱۸۵۴ء۔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جن کو شعر گوئی سے شوق تھا۔ ان کے طلبا میں بھی اسی وجہ سے شوق پیدا ہوا ان کے ایک ہم عمر اور ہم سبق میر کاظم حسین بیقرار کی وساطت سے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے ذوق نے غیر معمولی صلاحیت دکھلائی چنانچہ شاہ نصیر نے انھیں ٹلنا شروع کیا یہاں تک کہ شاگردی منقطع ہو گئی۔ خود اپنی غزلوں پر نظرثانی کرنے لگے۔ غزلیں بے انتہا مقبول و معروف ہو گئیں۔ ظفر بادشاہ کی غزل شاہ نصیر ٹھیک کیا کرتے تھے وہ دکن چلے گئے۔ اس کے بعد میر کاظم حسین نے بنانا شروع کیا لیکن وہ بھی الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر باہر چلے گئے۔ چنانچہ بادشاہ کی غزلوں کی اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہوا۔ انھیں دنوں میں نواب الٰہی بخش خاں (غالب کے خسر) بھی ذوق کو اپنی غزلیں دکھلانے لگے ان دونوں کی غزلیں بنانے میں آپ خود بھی بن گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو مشاعروں میں اکثر ان سے معرکے ہوتے رہتے تھوڑے عرصے میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو خاقانیٔ ہند کا خطاب دیا ظفر جب بادشاہ ہوئے تو بھی یہ موقعہ موقعہ پر قصائد کہتے رہے یہاں تک کہ تنخواہ ان کی چار سے سو روپیہ ہوگئی۔ ایک دفعہ گاؤں جاگیر میں ملا اور خطاب خان بہادری دیا تھی مع حوضہ دو سہرے موقوف پر۔ بعمر ٦٠ سال ١٢٧١ھ میں انتقال کیا۔

تصانیف:۔ ظاہر ہے کہ بہت کچھ کہا ہوگا مگر غدر میں سب تباہ ہوگیا۔ ان کے شاگردوں یعنی محمد حسین آزاد اور حافظ غلام رسول ویران وغیرہ نے کچھ کلام فراہم کر کے ١٢٠٠٠ اشعار کا ایک دیوان ترتیب دیا ہے جس میں ان کے ١٥ قصیدے اور ایک ناتمام مثنوی نامۂ جہاں سوز بھی ہے۔

شاگرد:۔ محمد حسین آزاد۔ بہادر شاہ ظفر۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب مرزا خاں داغ۔ حافظ غلام رسول ویران ظہیر الدین ظہیر۔ شجاع الدین انور وغیرہ

ذوق کی شہرت اور شاعری کو چمکا دیا۔ سنگلاخ زمینیں۔ محاوروں کا نگینوں کی طرح بٹھانا اور گرمی کلام نے لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لیا۔ یہاں تک کہ خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز کئے گئے اور کم سنی ہی تھی کہ بوڑھے بوڑھے لوگوں نے اپنے اشعار ان کو دکھلانے شروع کر دئے۔

ذوق اپنے زمانے کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ علوم متداولہ عقلی و نقلی میں ماہر جو اس زمانے کے شاعر کی خصوصیات اور ضروریات میں سے تھا۔ بحور و اوزان پر تکملہ اس کے ساتھ ہی طبیعت میں جدت و اختراعِ بحور کا شوق۔ الفاظ کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ کیونکہ سینکڑوں دیوان نظر سے گذر چکے تھے اور اس قدر کاوش سے مطالعہ کیا تھا کہ مختلف الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف ہو گئے۔ طبیعت میں گرمی تھی اور جو ممکن ہے اگر اس علم و فضل میں نہ گھرے ہوتے اپنا اصلی رنگ زیادہ واضح طور پر دکھاتی مگر جو اس قدر محصور ہو گئی اور اس قدر پابند کہ ذوق کی شعریت مفقود ہو گئی۔ مضامین زبان پر تھے اس لئے کہ اس زمانے تک کے خیالات اپنے گئے تھے۔ خود اپنی طرف سے جدت مضامین اور خیالات میں نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ پیارے کو اصل شئے مانتے تھے نہ کہ اس کے اندر کی شئے کو۔ پابند قیود شاعری تھے نہ کہ شاعر یعنی آزاد۔ اس لئے اگر کبھی واقعات نظم بھی کرتے تھے تو اس قدر صورت بگاڑ کر کرتے کہ وہ خارجی سی چیز ہو کر رہ جاتی [1] ایک نپی تلی چیز حقیقت سے بیگانہ۔ اصلیت سے الگ۔ لیکن قواعد شاعری سے مستحکم۔ اور یہ وقت اس زمانے کے ہر شاعر کو پیش آتی تھی کہ دل کو بڑی مشکل سے چھیڑ پاتے تھے۔ اور محض خارجی دماغی تعریفیں ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اور اسی خارجی و دماغی تعریف کا ہر شاعر متمنی رہتا تھا۔ اگر کسی کے تصور نے قواعد و بادہ و ساغر کے جھرمٹ میں اپنے دل کی بات نکال لی۔ یا شاعر نے اتفاقیہ یا دانستہ کہیں دل لگتی بات کہدی تو صوفی کو محفل میں حال آجاتا تھا ورنہ شعرا عموماً ماجرائے دل سیدھی سیدھی طور پر

---

[1] ملاحظہ ہو وہ غزل جو دوری وطن و جدائی پر شاہ علی شاہ کو سنائی۔ وہ غزل جو فضل حق کے لئے لکھی اور وہ غزل جو لشکریوں کے لئے لکھی وغیرہ وغیرہ۔ یا بارہ ٹوپیوں والے معرکے پر۔

بیان کر دینا ایک بہت آسان بات سمجھ کر اس طرف کبھی مشغول نہ ہوتے تھے۔ تعریف اور طرۂ امتیاز وتمغۂ لیاقت اسی وقت تھا جب کہ اُسے علمیہ طور پر بیان کیا جائے۔ ورنہ یوں رونے کو تو ہر شخص بین کر لیتا ہے اور کہنے کو ہر ایک کے منہ میں زبان ہے۔

ذوق کا زمانہ عموماً قدرت بیان کو سراہتا ہے نہ کہ ماجرائے بیان۔ صورت کلام نہ کہ کلام۔ اور اسی قدرت بیان وصورتِ کلام کی تعریف ہوتی - مشاعرے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے بلکہ کس طرح کہا ہے۔ اور کس صورت وشکل کو لے کر۔ دقیق سے دقیق ردیف و قافیے انمل بے جوڑ قسم کے لیتے ہیں اور استاد وہی سمجھا جاتا ہے جو ان کو نباہ دے۔ خیالات و احساسات وجذبات سے کسی کو تعلق نہیں۔ گویا یہ شاعری کے لوازمات میں نہیں ہے شاعری ان کے نزدیک محض لفظی بازیگری ہے۔ اگر کسی میں جدت وابیچ اور تصور ہے بھی تو طرز ادا کی پیچیدگیاں اختراع کرنے میں صرف کرتا ہے نہ کہ خیالات پیدا کرنے میں۔ خیالات کو یہ طبقہ محدود سمجھتا ہے اور طرز ادا کو لامحدود۔ اسی لئے طرزِ ادا ہی میں محض کاوشیں ہوتی ہیں نہ کہ تخیلات اور تصورات میں۔ خیالات وہی فارسی شعرا سے آئے اور بندھے ٹکے ہیں اس لئے ادھر کاوش غور وفکر کی گنجائش نہیں۔ ذوق کے یہاں یہ سب باتیں انتہائے کمال پر ملتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ان کی گرمی طبع تشکیل میں مصروف رہی نہ کہ تعمیر میں۔ جسم میں نہ کہ روح میں اور یہ اس زمانے کا تقاضا تھا۔

ایک عالم[1] شخص شاعر نہیں ہوا کرتا اور شاعری کے لئے علمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ

---

[1] "فرماتے تھے کہ میں نے ۳۵۰ دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں...... شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں لزبر تھے اور گفتگو کے وقت وہ نہایت برجستہ سند پیش کرتے تھے مجھے اس کا تعجب نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے ہوئے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں ہاں تعجب ہے کہ تاریخ کا ذکر کرتے تو وہ ایک صاحب نظر مورخ تھے تفسیر کا ذکر آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دیکھ کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے ایسی کانٹے کی تول کے کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا" اس کے علاوہ رمل النجوم، طب اور موسیقی کے واقعات کے لئے دیکھو دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔

جو شعر کہہ کر کلیاں کرکے دہن و زبان صاف کر ڈالتا ہو۵۱ اُس کا احترام شاعری معلوم۔ چنانچہ ہم ذوق کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ محض فن شاعری یعنی شعر بنانا جانتا ہے لیکن اپنے فن میں اس قدر استاد ہے کہ اکثر ہم کو دھوکے میں ڈال دیتا اور ڈال سکتا ہے گویا وہ اصلی شاعر ہے۔ اصلی شاعری ان کے یہاں ڈھونڈے سے نہ ملے گی حالانکہ فنی شاعری سے ایک مصرعہ بھی خالی نہیں۔ کمال فن کے دھوکے اکثر اس جگہ نظر آجائیں گے جہاں شعر ایسا صاف بندھا ہو کہ رواں اور آمد معلوم ہوتا ہو۔
فنی ارتقا ان کے کلام سے صاف ہویدا ہے یعنی ابتدائی غزلیں ایسی سانچے میں ڈھلی ہوئی اور چھینی سے تراشی ہوئی نہ ہوتی تھیں جیسی بعد کو ہو گئی تھیں۔ لیکن جو طرز انھوں نے شروع کیا تھا اس سے مرتے دم تک علیحدہ نہ ہو سکے۵۲ وہی الفاظ کی نشست کا خیال۔ محاوروں کو باندھنے کی کاوش اور قوافی و ردیف کا التزام الفاظ سے الگ ہو کر معانی کی طرف آجاتے اس قسم کا انقلاب اُن کے یہاں کبھی نہ ہو سکا۔ جوانی کا طرز رنگینیت کی طرف مائل ہے جو بعد کو پرہیزگاری کے سبب محض گرمی طبع ہو کر رہ جاتا ہے۔
صرف ذوق ہی ایسے شخص ہیں جو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہیں ورنہ اس زمانے کا کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنی کم نصیبی اور ناقدری کا شکوہ نہ کرتا ہو اور بھلا ذوق کر بھی کیسے سکتے تھے۔ ایک تو طبیعت قناعت پسند۔ دوسرے حوصلہ و اُمنگ بوجہ کم حسبی کے محدود۔ تیسرے یہ کہ استاد شاہ تھے اور درحقیقت اپنے عہد کے استاد مانے بھی جاتے تھے۔ محض دلی میں نہیں بلکہ باہر بھی۔ اس کے علاوہ خود پر اعتمادِ فنی تھا۔ اس لئے بے نیازی آگئی اور طبیعت غنی ہو گئی۔ آمدنی و جاگیران

---

۵۱ پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

۵۲ آخری غزل

کیا کہیں اس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا — وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا

بو تا بڑھ بڑھ کے اتنا گیسوں پشر مستِ غرور — گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا

کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر — ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا

آفتاب حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد — پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

کی سی معاش و طبیعت رکھنے والے کے لئے کافی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سوائے ابتدائی ایک دو غزلوں کے کہ جب تک یہ بادشاہ کے نوکر نہیں ہوئے تھے اُن کے یہاں اُن کو اپنے زمانے سے کوئی شکایت معلوم نہیں ہوتی[۱] اور بہادر شاہ محض شاہ شطرنج ہو لیکن اُن کے لئے سلطان سنجر سے کم نہیں اگر کبھی شکایت کی قسم کا کوئی جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس پر قناعت غالب آجاتی اور دلی کی گلیاں زنجیر پا بن جاتیں[۲]

اس کے علاوہ طبیعت پرہیز گاری اور تصوف کی طرف مائل۔ وظیفہ و وظائف میں مشغول رہنے والے دنیا بھر کی بہتری کے لئے دعائیں مانگنے والے۔ منکسر المزاج، قانع اور حلیم الطبع ایسا شخص ناصح بہتر ہو سکتا ہے بہ نسبت شاعر کے۔ شاعر کے لئے ہمیشہ ایک بے چین روح کی ضرورت ہے وہ ذوق کے یہاں مفقود تھی۔ اُن کے جوانی کے ولولے بھی شاعروں کے معرکوں میں صرف ہوئے نہ کہ وارداتِ شعری میں۔ شب ہجر کے مضمون بنانے میں نہ کہ شب ہجر کے تارے گننے میں۔ ان کی جوانی کی غزلیں دیکھئے۔ الفاظ رنگین اور بہت شگفتہ ہیں لیکن مضمون رنگین نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پرہیز گار شاعر کا دیوان کا دیوان الٹ جائیے معاملہ بندی میں بھی ایسا شعر نہ نکلے گا جسے محض الفاظ و محاورہ ہی کے خاطر عریاں کہا جا سکے[۳] اور اپنے عہد میں ذوق اس خصوصیت کے تنہا علمبردار ہیں۔ ورنہ اور سب کبھی نہ کبھی ضرور بہک جاتے ہیں۔ کچھ زمانے کا مذاق اور کچھ ان کا اپنا طریقہ کہ ارباب نشاط کے لئے بھی غزلیں لکھتے ہیں تو مضمون بندی کی نہ کہ ایسی جو گرما دیں اور تڑپا دیں۔ معاملہ بندی بھی کئی جگہ ہے لیکن وہ اُن کی ذاتی چیز نہیں۔

---

[۱] ابتدائی دو غزلوں کے دو شعر

در مضمون میں ترے ذوق زلیں لیے بہا — کم کوئی اُن کا خریدار نظر آتا ہے
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ — سب فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا

[۲] گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں مضموں کی قدر — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

[۳] سوائے ایک آدھ شاذ مثالوں کے وہ بھی محض لفظی رعایت کی خاطر (معاملہ بندی کے اشعار کا انتخاب عام اشعار کے انتخاب میں دیدیا گیا ہے)

گھبرا نہ جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش — گھبرانے لگا سینے میں دم اور زیادہ
کل کے جو وصل کے عالم میں نظر پڑتی تھی — آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ذوق کو الفاظ سے اور نشستِ الفاظ سے بے حد اور بچپن ہی سے شوق تھا[1] کچھ تو یہ کثرتِ مطالعہ کے سبب تھا کچھ یہ کہ اُن کا زورِ طبع یا زورِ جذبات چونکہ خیالات کی طرف جاتا نہیں تھا اس لئے لامحالہ فراوانیِ الفاظ چاہتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جوانی میں نئی نئی اور طویل بحروں میں اپنا زورِ طبع دکھلایا[2]۔ بلکہ لمبی بحروں میں کہنے کا شوق انھیں اخیر تک باقی رہا۔ ابتدا کے قصائد میں بھی فراوانیِ الفاظ کا خاص مظاہرہ اور اہتمام ہے[3]۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشاعروں میں لمبی بحروں والی غزلیں پڑھ کر اور الفاظ و نشستِ الفاظ کی شان دکھا کر اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے اور جما لیتے تھے۔ بلکہ ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قصیدے میں سودا کا تتبع کرنے سے غزل میں بھی لفظی در و بست اور سلیقے میں مدد ملی ہو۔ لیکن دراصل لمبی بحروں ۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں میں کہنے کی عادت انھوں نے شاہ نصیر کی میراث و مقابلے میں پائی۔ اس کے علاوہ خواص اور عالی شعرا کی پہچان اور طغرائے امتیاز یہی دقت پسندی اور مشکل گوئی تھی نہ کہ خیالات کی بلند پروازی جیسی کہ آج کل ہے اس لئے قدرتِ کلام اور قوتِ بیان کی آزمائش اور پہچان اُسی وقت ہوتی اور ہو سکتی تھی جب اُن مل بے جوڑ باتیں ملا دی جائیں۔ عوام اس سے عاری تھے۔ اس لئے وہی شعرا لائقِ ستائش و منزلت سمجھے جاتے جو اس معیار پر آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ذوق کے زمانے میں مصحفی و انشا نہ رہے تھے پھر بھی ناسخ کی غزلیں لکھنؤ سے برابر آیا کرتی تھیں اور ان پر غزلیں نہ کہنا ذوق اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ غرضیکہ قافیہ پیمائیوں کا برا ہو کہ اُن کا تمام دیوان اسی قسم کے دفتر سے بھرا پڑا ہے

---

[1] ابتدا کی غزل ہے

ان سے کچھ وصل کا ذکر اب لانا نہیں اچھا — وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا
تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا — یار ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

بچپن کی غزلوں میں سے

دمِ ذبح تیغِ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو — تو شہیدِ ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعدِ ممات ہو

[2] تمنا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدِ قلق ہو — یہی حق ہے قاتل اگر حق دلائے یہ بسمل ترے پاؤں پر جان بحق ہو
جس ہاتھ میں خاتمِ لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو — پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں انگرِ آتش ہو
کرتی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں — جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہو

[3] سحر جو گھر میں بہ شکلِ آئینہ تھا میں تنہا نظارہ حیراں — تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکلِ بلقیس ماہِ کنعاں (وغیرہ)

اور گویا ایک جسم ہے[۵۱]

رعایت لفظی ذوق کے آرٹ کا خاص جزو ہے۔ کہیں کسی غزل کسی شعر میں اس سے چھٹکارا نہیں[۵۲]۔ اور ذوق کیا یہ بھی اس زمانے کے روایات میں سے ہے اور جس کو خصوصاً نصیر اور ناسخ نے بہت سراہا اور رواج دیا اور جو اتنا مرغوب زمانہ رہا کہ نہ صرف اسی زمانے میں اس کی گرما گرمی رہی (یہاں تک کہ مومن نے بھی بیشتر اور غالب نے اکثر اس کو اختیار کیا۔) بلکہ بیسویں صدی کے ربع اول تک اس کا قبول عام قائم رہا۔ ذوق کی صناعی کی بنیاد بہت کچھ اسی پر قائم ہے۔

---

۵۱ مشکل ردیف اور قافیے کی صرف ردیف الف سے چند مثالیں:۔ سراغ پا۔ چراغ پا۔ باہمدگر دونوں جدا۔ ہم سفر دونوں ہم دونوں جدا۔ تصویر دل میرا۔ شمشیر دل میرا۔ مقدر زیر پا۔ ساغر زیر پا۔ آغوش نقش پا۔ روپوش نقش پا۔ طوفان چڑھا۔ بیابان چڑھا، تھوڑا اٹکا۔ روڑا اٹکا۔ منڈیر کا ٹھینگر کا۔ بغل میں مارا۔ اجل میں مارا وغیرہ۔ ذوق نے ناسخ کی غزل پر غزل کہی۔

شوق نظارہ ہی جب سے اس رخ پر نور کا ہے مرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک صیاد کا خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

لچکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز جنباں ہو جوں نسیم چمن سے سمن کی شاخ

مشہور یہ تھا کہ اس طرز پر کوئی نہیں کہہ سکتا ذوق نے سہ غزلہ کہا۔ ۳۸، ۵، اور ۲۱ اشعار کا

قافیہ پیمائی کی چند مثالیں:۔

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھینگر کا

کوٹھے پہ ان کے خوب بچے آج رات کو تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

یا

جلد آ وعدہ دیدار پہ اے وعدہ خلاف کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا، اٹکا وغیرہ

اور جس غزل میں مشکل ردیف و قوافی نہ ہوتے تو ان کا جی شعر کہنے میں نہ لگتا۔ ایک آسان مصرع طرح پر شکایت کرتے ہیں۔

ذوق بازیچہ طفلاں ہو سراسر یہ زمیں ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

۵۲ چند مثالیں

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

میں وہ شہید ہوں لب خندان یار کا ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

دوسری چیز محاورے کا استعمال ہے[۱] عموماً محاوروں کا استعمال اس لئے کیا جاتا تھا کہ شعر عوام کی زبان پر رواں ہو سکیں جس کی وجہ سے مشہور ہوں۔ دوسرے ان میں خوب صورتی اور روانی پیدا ہو جائے۔ تیسرے اس لئے کہ خود محاورے محفوظ ہو جائیں اور اس طرح زبان کی خدمت ہو سکے اکثر یہ وجہ بھی ہوتی تھی کہ چونکہ عموماً محاوروں کا استعمال اور موزوں کر دینا بوجہ ان کی نثریت کے

(بقیہ صفحہ)

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — کہہ جو تجھے کہنا ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا

تھے دو گھڑی سے شیخ جی۔ شیخی بگھارتے — ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

جب وہ پوچھے کہ ہے عشق کون مری چتون پر — میں کہوں میں! تو کہے "میں کے چھری گردن پر"

قاصد لکھوں لفافے کو خط غبار سے — تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

درد دل سے لوٹتا ہوں کس کو میرا درد ہے — ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

چند لفظی صناعیاں۔

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق — نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہو گیا

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا — ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہر دوں۔ نہ ٹھہرے گا

ہے وہ آزار محبت سے دل زار کو رنج — جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

راحت و رنج زمانے میں ہیں دونوں لیکن — یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو — ہے جو ناکامی فرہاد کا کہسار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج — خط بھیج یا نہ بھیج زبانی خبر تو بھیج

پھر کر اِدھر اُدھر بھی نہ اپنا گیا قلق — لفظ قلق کی طرح سے یونہی رہا قلق

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا — ہے دل سے یاد ساقیِ کوثر لگی ہوئی

بندشِ الفاظ۔

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو — دیتا ہے ایسی کوئی بھی مرد خدا صلاح

یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج — چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا صلاح

اے ذوق جانہ ہوش و خرد کی صلاح پر — جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

[۱] ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا، — سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں ملے گا، — پہن کر وہ جامہ بھی اگر آئے قرآن کا

یار نادان سے ہے دشمن دانا اچھا، — کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

لکھے موسیٰ پڑھے خدا۔ گھنگنیاں بھرے منہ میں بیٹھے رہنا۔ کسی شخص کا منہ دیکھ کر اٹھنا۔ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ حرام زادے کی رسی دراز ہے۔

نہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے — خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے — آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

مال موذی نصیب غازی ہے۔ ماں عرب پیش عرب منہ کالا کرنا۔ رحم کی دار نہیں لقمان کے پاس۔

مشکل اور رقت آمیز ہوتا ہے اس لئے بیان پر قدرت رکھنے والے شاعروں کے تفاخر کو ایک خاص سکون ہوتا جب وہ ایسی ٹھیٹھ نثر کو خوب صورت نظم کی شکل میں پیش کر سکتے۔ چنانچہ ذوق اور داغ اس امر میں خاص طور پر معروف ہیں۔ اُن کے شاگرد محاوروں کی فہرستیں ان کو پیش کرتے تاکہ اُن کو یہ ماہرین فن شعر میں منتقل کر دیں۔ تاکہ محاورے محفوظ ہو جائیں اور ان کے نام و کلام کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں۔ ذوق کے یہاں جذبات عموماً نہیں ملتے لیکن اکثر وہ یہ کرتے ہیں کہ جذبات کی مثال یا مناسبت کے طور پر مناسب محاورہ پیش کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محاورے کا استعمال کلام کو بقائے دوام دینے کا ایک بڑا ذریعہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس طرح شعر میں نبھائے جائیں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ شعر انھی کی خاطر کہا گیا ہے اور وہ محض اوپر سے جما دئے گئے ہیں۔ ذوق کو محاورے استعمال کرنے کا شوق ابتدا سے مرتے دم تک قائم رہا۔[۵]

کچھ تو طبعی مناسبت کی بنا پر اور کچھ اسی محاورہ بندی کے شوق کی طرح کہاوت، مثلوں اور تجربے کی باتوں کو نظم کرنے کی خواہش۔ چنانچہ ذوق کے یہاں خیالات کے ضمن میں یہ ایک اہم خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اکثر وہ اپنے تجربوں کو، چند زندگی کے مسلمات کو، دنیا کے تجربوں کو اور چند سیدھی

---

[۵] حافظ ویران کی اسناد عا پر مرنے سے چند گھنٹے پہلے ذوق نے پاؤں تلے کی زمین نکل جانے کا محاورہ باندھا۔

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے فلک کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے

یا یہ مصرع

۱۔ اسے احسان مانوں سر میں تنکا ڈالنے کا ۲۔ بلی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

۳۔ کس وقت مرا منہ کو کلیجا نہیں آتا ۴۔ وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

۵۔ کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا ۶۔ چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

۷۔ وہ ساری شیخی جھڑی اکی دو گھڑی کے بعد ۸۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

سادھی زندگی کی نصیحتوں اور حقیقتوں کو نظم کر دیتے ہیں اس طرح اور ایسے موزوں سادہ الفاظ میں کہ لوگوں کی زبانوں پر رواں ہو سکے اور ایک کہاوت کی طرح مناسب موقعوں پر مستعمل ہو سکے[1] اور اس طرح ہمیشہ قائم رہے۔ لیکن دراصل اس قسم کی ناصحانہ و بزرگانہ باتوں کو شاعری نہیں کہہ سکتے اور نہ ان میں کوئی شعری لطافت ہے۔ محض چند سیدھی سادھی زندگی کی حقیقتوں کو نظم کر دیتا ہے۔ سیدھی سادھی نثر کی طرح۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی ان میں مثلوں کی طرح عوام کے زباں زد ہو گئی ہیں۔

---

[1] نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا — پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
رہا ٹیڑھا مثال نیش کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
ذوق اس بحر جہاں میں کشتی عمر رواں — جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا — حکم ازلی ذوق یوں ہی ہو چکا تھا
موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں — ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
اے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو — جسے یاں دوست سمجھے اپنا آخر وہ عدو نکلا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر انھیں آ کے خدا ساری خدائی دیتا
کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
اے ذوق ہوش اگر ہے تو دنیا سے دور بھاگ — اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا
• نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم — کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا
حلاوت شرم و پائداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری — مزے سے گذری اگر گذاری کسی نے بے ننگ و نام ہو کر
واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے — یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنا لے کر
برق خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں
اس گلستان جہاں میں کیا گل عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
لیتے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ
صحبت عیسیٰ بنائے کیا گدھے کو آدمی — جس کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے
کہیے نہ تنگ ظرف سے اے ذوق کبھی راز — کہہ کر اسے سنتا ہو ہزار وں سے تو کہیے
ثبات کب ہے زمانے کے عز و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ — ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے — خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

حسن تعلیل[۵] اور ایک مصرعے میں ایک بات کہہ کر یا مسلمہ بنا کر دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت یا شہادت پیش کرنا یہ ایک طرز خاص تھا کہ متاخرین خصوصاً صائب کے مطالعے سے اس زمانے میں پیدا ہوا اور تمام اردو شاعری (کیا دلی و کیا لکھنؤ) پر محیط ہو گیا۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتا تھا تو وہی لطف آتا تھا جو ایک مسئلے کے حل کرنے میں آتا ہے۔ تخئیل کو آزادی تھی کہ جس قسم کے مسئلے یا مسلمے بنا کر پیش کرے اور تعریف کرنے والے یوں کہتے کہ بھئی واہ فلاں بات کا کیا ثبوت پہنچایا ہے۔ غرضکہ یہ طرز عام تھا اور مقبول تھا اور چنانچہ ذوق نے بھی اس کو برتا اور بہت کافی بہتات کے ساتھ۔ ایک شعر بہت مشہور ہے۔

خط بڑھا۔ زلفیں بڑھیں۔ کاکل بڑھے۔ گیسو بڑھے   حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

حسن تعلیل کی خوبی اور خوب صورتی اسی میں ہے کہ ثبوت یا وجہ شاعرانہ طور پر اس قدر لطیف ہو کہ واقعیت ٹپکے اور بالکل صحیح معلوم ہو۔ لیکن اگر تخئیل کی آزادی کی وجہ سے ایسا مسلمہ یا ثبوت پیش کیا جائے جو اصلیت سے بہت ہی دور ہو جائے تو وہ باوجود شاعرانہ لہذا قابل

جس انسان کو سگ دنیا نہ پایا   فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے   لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا
رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق   اولاد سے تو یہی دو پشت چار پشت
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود   اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے
بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے   بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف   لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو   زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا   بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے
جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی   پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا
اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا   دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
میں وہ شہید ہوں لب خنداں یار کا   ہشیار ہے چراغ بھی میرے مزار کا[۵]
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
جہاں باریک بین و ناتواں ہیں اس قدر دیکھا   ہلال انتیسویں کا سب کو منظور نظر دیکھا
حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیئے کان دو   اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو

معانی ہونے کے مرغوب و پسندیدہ نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی سے جو نئے شعراء پیدا ہوئے انھوں نے اس طرز کو چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر وجہ یہ ہے کہ ان کی قوت تخئیل دوسرے میدانوں اور حقیقت کی طرف آزاد ہوگئی ہے۔ برخلاف اس کے متاخرین کی صرف اسی صنعت میں آزاد ہوتی تھی اس لئے گنجلک ہوجاتی تھی۔

بہت کچھ اسی طرح مقبول چیز رعایت لفظی تھی۔ چونکہ قادرالکلامی کے اس عہد میں معنی یہ تھے کہ الفاظ کے استعمال پر کامل قدرت ہو۔ اس لئے اس قدرت کا اظہار اس طریقے پر بہترین ہو سکتا تھا لہذا ہر شاعر اس صنعت سے کافی متاثر تھا اور اس کی بندش معیار لیاقت و لائق ستائش ہنر سمجھا جاتا۔ ذوق کا بیشتر کلام اس صنعت پر وقف ہے اور اپنے عہد کے دیگر شاعروں کے مقابلے میں بہت اکمل طریقے پر۔ لیکن اگر یہ صنعت بغیر کسی خیال کے ہو تو محض لفظی گورکھ دھندا ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے اس قسم کے اشعار اب زیب طاقِ نسیاں ہوتے جا رہے ہیں، بہ نسبت مومن و غالب کے کہ ان کے یہاں یہی چیزیں بوجہ خیال کے زیادہ اجاگر ہیں۔ رعایت لفظی چونکہ لفظی صنعت گری کا بہت بڑا حربہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اکثر موقعوں پر شعر کو خوب صورت بنا دیتا ہے اس لئے ابھی تک اس کا رواج ہے حالانکہ گذشتہ کی فراوانی کے ساتھ نہیں، پھر بھی ہے۔ لیکن اب مقصد اصلی یہی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس کا درجہ

برہم اسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف	اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا
مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا	کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا
نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی	چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق	اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے
چمن میں کہتے ہیں پھر موسم عیش طرب آیا	بہاریں خوب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا
دیکھ گر دیکھنا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں	دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا
سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے	یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔
اس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو	لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو
زبان ریختہ کر دی زباں اہل ولایت کی	محبت ذوق کو ازبسکہ ہے شاہ ولایت سے

دوسرا ہے اور محض اسی کے خاطر خیال کا خون نہیں کیا جاتا۔

روزمرہ[۵۱] بھی اسی طرح اُن اہل زبان کا خاص گُر ہے اور اس میں شک نہیں کہ شعر کی ظاہری خوبی روزمرہ کے مناسب استعمال سے نہایت درجہ بڑھ جاتی ہے۔ روانی الگ آ جاتی ہے اس کے علاوہ عام پسند بھی ہو جاتا ہے۔ ذوق روزمرہ کے استعمال کرنے میں بادشاہ ہیں کبھی شعر کو بغیر اس طرح خوب صورت بنائے نہ چھوڑیں گے۔ ہاں یہ صحیح کہ چونکہ اکثر و بیشتر مقصد محض روزمرہ کا استعمال ہی ہوتا ہے اس لئے خیال کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن اگر کبھی خیال اس طرح کے خوب صورت سانچے میں آکر ڈھل جاتا ہے تو نہایت اچھا اور بامزہ ہو جاتا ہے۔

تشبیہ[۵۲] اور استعارے ذوق کے عموماً بے مزہ، غیر فطری اور بیکار ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی اچھا نکل آیا تو اسے اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ اول تو رعایتِ لفظی سے

---

۵۱ بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
مٹ گئے جوہر وفا کے اُٹھ گئے سب اہل دل اب وفا ہے نام کو اور با وفا کہنے کو ہیں
ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے تمھیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
سمجھ ہی میں نہیں آتی ہو کوئی بات ذوق اس کی کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
کیا مدِ نظر ہے تمھیں یاروں سے تو کہیے گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے
یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
موذن مرحبا بر وقت بولا تری آواز مکے اور مدینے
جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

۵۲ دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارہ ہو گیا
چھوڑا نہ ایک دانۂ اخترِ سحر تلک گردوں کو لگ گیا جو مزا نشّبِ تشنگر کا
جھکائے ہیں سرِ تسلیم ماہِ نو، پروہ غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر عکسِ رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر
اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا
گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ روانی میں
بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

تشبیہ یا استعارے بنانا چاہتے ہیں یا حسن تعلیل سے ثابت کرنا یا کسی اور لفظی صنعت سے حاصل کرنا شاہ نصیر کی طرح۔ ظاہر ہے جب مقصود بالذات صنائع لفظی ہوں گے تو تشبیہ و استعارے کی خوبی معلوم۔ لیکن پھر بھی وہ اس قسم کے تشبیہ اور استعاروں سے پرہیز کرتے تھے۔ مثلاً ع ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا۔ یا ع مینڈھا حلال کرتے ہیں دریائے نیل کا۔ جس سے کلام بالکل ہی بدمزہ ہو جاتا ہے۔

پرانے متروک الفاظ کا استعمال ذوق کے یہاں بہت ہی کم ہے بلکہ صرف ان کے بچپن اور جوانی کے اشعار میں پائے جاتے ہیں اور وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ بول چال میں اپنے بچپن میں سنتے تھے وہی باندھ دیتے تھے مگر آخر کے کلام میں ٹک۔ یارو۔ جانِ من کے الفاظ چھوڑ دئے اور تقریباً تمام تر کلام کی زبان موجودہ کہی جاسکتی ہے اور سوائے بل بے۔ آئے ہے جائے ہے۔ آوے، جاوے، پڑ، کھوئیگے، کیونکہ بمعنی کیونکر۔ چٹ بمعنی جلدی وغیرہ معدودے چند الفاظ کے اور کوئی لفظ ابھی تک گوش پر گراں نہیں گذرتا۔ جملے کی ترکیبیں بھی ایسی ہیں کہ ابھی تک رائج ہیں۔ اور آئے ہے۔ جائے ہے کی ترکیب باوجود اس کے کہ متروک ہو گئی ہے نظم میں اب تک بھلی معلوم ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تازہ کلامِ جگر

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

کوئی اتنا بھی نہ مصروف خود آرائی ہو
کہ تماشا رہے باقی نہ تماشائی ہو

مستیٔ حسن، غمِ عشق پہ یوں چھائی ہو
دل سے جو موج بھی اٹھے تری انگڑائی ہو

کیوں نہ گھر بیٹھے ہی یوں انجمن آرائی ہو
دل کے ہر گوشے میں کونین سمٹ آئی ہو

نالہ یوں کیجیے، یہ اعجاز شکیبائی ہو
جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

پھر وہی رت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر ہر اک چوٹ محبت کی ابھر آئی ہو

حسن و بیچارگیٔ حسن، الٰہی توبہ
میں تو مر جاؤں، جو یوں عشق کی بن آئی ہو

وہ محبت ہی نہیں ہے، وہ قیامت ہی نہیں
جو کسی پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

آج سے ترکِ ملاقات بھی منظور مجھے
توبہ توبہ کہ ترے حسن کی رسوائی ہو

اے غمِ دید، ترا صبر مجھی پر ٹوٹے
بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

ہائے اُس حصۂ گلشن کا مقدر، ہمدم
نہ بہار آئی ہو جس میں نہ خزاں آئی ہو

ہو گئی دل کو تصور سے ترے نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

بھول جاؤں کہ مرا فرضِ محبت کیا ہے
اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

ہائے اُس عاشق و دیوانۂ گلشن کی بہار
کہ جب آئی ہو بہ انداز خزاں آئی ہو

تو بھی جذبِ غمِ عشق کی تاثیر جگر
میں تمنا نہ کروں، خود وہ تمنائی ہو

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندوستان کی صنعت اور تجارت۔ ضخامت ۲۱۴ صفحے تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$ قیمت

ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر بہار

ہندوستان کے صنعتی اور تجارتی حالات کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس ملک کی گذشتہ صنعتی ترقی اور اس کے اسباب زوال کی عبرتناک داستان بیان کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ برطانوی تسلط کے بعد حکومت کے طرز عمل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تباہ کن حکمت عملی سے ہندوستان کی معاشی زندگی کو کیا کیا نقصانات پہنچے اور کس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت کا ایک ترقی یافتہ نظام دیکھتے دیکھتے تباہ ہوگیا سرکاری یادداشتوں سے اور مستند کتابوں سے بکثرت اقتباسات جمع کئے گئے ہیں اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی ، مالی اور صنعتی پستی حکومت برطانیہ کی معاندانہ تجارتی پالسی کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اُردوداں طبقہ کو ملک کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ سے آگاہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور معاشی مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس لئے معاشی مسائل کے سیاسی پہلو کو واضح کرنے پر مصنف نے زیادہ زور دیا ہے۔

اردو زبان میں ایسا بہت کم مواد اس موضوع پر شائع کیا گیا ہے۔ منت اللہ صاحب رحمانی فاضل دیوبند مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی۔ پوری کتاب دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جس کے لئے مصنف نے مواد جمع کر لیا ہے بہت جلد شائع ہوگا۔ اچھا ہوگا اگر دوسرے حصے میں اقتباسات کے ساتھ کتابوں کا حوالہ بھی دے دیا جائے

تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مزید مطالعہ کے لئے اصل کتابوں سے مستفید ہوسکیں۔

(ش)

گیس کا دفاع۔ مرتبہ جناب سید ہادی حسین رضوی صاحب۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ ۶۲ صفحات۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ امیریہ دارالتصنیف والتالیف، محمود آباد ہاؤس قیصر باغ، لکھنؤ

جنگ انسانی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ضرور ہے، مگر ذاتی شجاعت و شہامت کے مظاہرے کی حیثیت سے انسان نے جب انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں قدم رکھا تو اس کی یہ جنگی فطرت بھی اجتماعیت کے رنگ میں رنگ گئی مگر اس کی انتہائی اجتماعی شکل کو لیجے تو بھی قوانین جنگ کا اطلاق صرف لڑنے والوں ہی تک محدود تھا۔ صنعتی تہذیب کی برکت سے اب اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اور جنگ کے معنی اب یہ لئے جانے لگے ہیں کہ اس سے شہری آبادی کس حد تک تباہ اور برباد ہوئی ہے۔ اس تخیل کو جب فروغ ہوا تو اس کی راہیں بھی نکل آئیں۔ چنانچہ آج کل اس مقصد کے لئے زہریلی گیس کا استعمال بہترین طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

زیر نظر رسالے میں اسی زہریلی گیس کے دفاع کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، اور اس مہلک وبا سے بچنے کے لئے ہندوستان میں حفاظتی تعلیم کے فقدان کے پیش نظر" اس ملکی اور قومی خدمت کا احساس سب سے پہلے جناب راجہ صاحب محمود آباد کو ہوا"۔ مصنف نے ممدوح ہی کے ایما سے اس کو ترتیب دیا ہے۔

کتاب کل ۱۶ عنوانات پر ختم ہوئی ہے۔ پہلے جنگ کی مختصر سی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے بعد آلات جنگ کے تدریجی ارتقا کی تاریخ کے سلسلے میں گیس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے چند صفحات میں گیس کے مختلف اقسام اور ان کے استعمال کا بیان ہے، اور بعد کے ابواب میں اس کے حملے کے بچاؤ کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ بیان مختصر ہو اور مطالب جامع۔ ہندوستان کی موجودہ علمی اور تعلیمی کساد بازاری کے پیش نظر یہ سودا سستا بھی ہے

اور اچھا بھی۔ (ب۔ع۔ف)

دور انبساط۔ مولوی عبدالودود صاحب دردؔ بریلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ نظامی پریس بدایوں نے چھاپا ہے کتاب کا کاغذ اور چھپائی اچھی خاصی ہے لیکن کتابت کی بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ قیمت کہیں درج نہیں شروع میں دردؔ صاحب کی تصویر اور پروفیسر عبدالشکور صاحب کا تعارف شامل ہے۔ تعارف میں شکور صاحب نے شاعر کے مختصر حالات بیان کئے ہیں اور لوگوں کو کلام سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مصلحتاً کسی مفصل تنقید اور تبصرہ سے پرہیز کیا ہے اور اپنی ناقدانہ ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے اس کا احساس ہے کہ مولانا کا کلام اغلاط سے پاک نہیں۔ جا بجا لفظی اور فنی نقائص موجود ہیں"۔ آگے چل کر ان نقائص کی وجہ بتائی ہے اور کہتے ہیں "اگر فن شاعری میں اس قدر مطلق العنانی کو کام میں نہ لاتے تو یقیناً ان کے کلام میں اور زیادہ پختگی، سنجیدگی اور پاکیزگی آجاتی۔ ان کے اشہب قلم کی روانی، تیز گامی ان رکاوٹوں کو قطعاً برداشت نہ کر سکتی تھی"۔ اس رائے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تعارف کرانے والے کو خود اپنی رائے پر یقین نہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کرتا ہے اور اسے کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس سے اس کی گرفت ہو سکے۔

اس کی وجہ مجموعہ کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ کم و بیش ۲۰۰ نظمیں ہیں۔ کچھ پر مذہبی عقائد کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ کچھ تاریخی اور قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں کچھ میں اخلاقی درس کی جھلک ہے اور کچھ "نیچرل شاعری" کے عام رجحان کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک شاعرانہ لطف اور حسن کلام کا تعلق ہے، کسی نظم میں نام کو بھی نہیں لیکن اس مجموعہ میں شاعر نے "میری شاعری" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اسے پڑھنے کے بعد شکایت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شاعر کے نزدیک اگر شعر میں "بے ساختہ پن" نہیں تو وہ شعر نہیں لیکن بے ساختہ پن کا جو مفہوم شاعر کے ذہن میں ہے وہ عام مفہوم سے کسی قدر مختلف ہے۔

نگارشات ۔ آغا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزاد مرحوم کے مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے شیخ مبارک علی نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ مجموعہ میں کل ۳۲ مضامین ہیں اور ۶۲۸ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین ہر طرح کے ہیں۔ ادبی، تنقیدی اور اخلاقی۔ ہر مضمون کافی بڑا ہے اور اُنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے ہر مضمون کے لکھنے میں کاوش اور محنت سے کام لیا ہے۔ خصوصاً ادبی، تنقیدی مضامین بہت محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں سے "انشا پردازی" "قومی زبان" "اُردو اخبارات" خاص طور پر اچھے ہیں۔

تنقیدی مضامین میں تو بے شک کاوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن عام طور پر دوسری قسم کے مضامین میں توجہ اور محنت کو لکھنے والے دردسری سمجھتے ہیں۔ لیکن آغا صاحب کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ کسی قسم کے مضامین لکھیں اُنھیں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالے بغیر قرار نہیں آتا۔ اور حقیقت بھی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو شاید اپنے مضامین کو اتنا دل کش نہ بنا سکیں مثال کے طور پر دو ایک مضامین پر سرسری نظر ڈالیے۔

مجموعہ میں ایک مضمون ہے "سیر و سفر" مختصر سی تمہید کے بعد آغا صاحب نے مضمون کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے ——— "سفر سقر کیوں تھا، سفر بعض امراض کا علاج ہے، سفر کی علامات، سفر کا بھُوت، مسافر نوازی، بحری سفر، بحری سفر کی آسائشیں، تعلیم کی برکتیں، جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ، سفر تجربہ سکھاتا ہے، سفر وسیلۂ ظفر ہے، علمی سفر کا شوق، تعلیمی سیر و سیاحت میں اساتذہ کے فرائض، سیاحت کا شوق نہ ہونے سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔"

اسی طرح ایک مضمون "شکار" پر ہے۔ اس میں پہلے شکار کی تدریجی ترقیاں بیان کی ہیں پھر غلیل کا ذکر ہے۔ نشانہ کی مشق، گراں بہا نصیحتیں، اُڑتے پرندوں کا شکار، تیتر کا شکار، مرغابی کا شکار، ہرن کا شکار، رائفل کا شکار، بلّم سے ہرن کا شکار، ٹارچ سے شکار، چکارے کا شکار، جنگل کا شکار، شیر کا شکار، حادثات کے عنوانوں سے شکار کی مختلف تفصیلیں بیان کی ہیں۔ بیچ بیچ میں واقعات اور لطیفے بیان کئے ہیں۔

یہی انداز مختلف مضامین کا ہے۔ طرز بیان کی بے تکلفی کی وجہ سے، ان کی طوالت بھی ایک لطف پیدا کرتی ہے۔

جواہرِ سخن۔ (مرتبہ محمد مبین صاحب چڑیا کوٹی۔ ہندوستانی اکاڈمی۔ الہ آباد۔ قیمت ۶/)

ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد کی طرف سے اب تک جواہر سخن کے نام سے ابتدائی دوروں کے شعرا کے تین انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں ادبی حلقوں میں، بعض معمولی اختلافات کے ساتھ، عام طور پر قدر کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اکاڈمی نے یہ سلسلہ اب تک جاری کر رکھا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔

مؤلف نے اس انتخاب میں جس دور کے شعرا کا حال اور کلام شامل کیا ہے، اسے اس نے دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا اور دہلی کے شعرا۔ موجودہ انتخاب میں صرف لکھنؤ کے شعرا شامل ہیں۔ اس دور کے دہلوی شعرا کو پانچویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اس مجموعہ میں کُل ۲۵ شعرا کا ذکر ہے۔ اور پچھلی جلدوں کی طرح اس میں بھی مؤلف نے پہلے شاعر کے مختلف حالات دئے ہیں، پھر اس کے کلام کا انتخاب۔ جن شعرا کا کلام شامل ہے ان میں گویاؔ، تلقؔ، خنجرؔ، خلیقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، عشقؔ، مونسؔ، نفیسؔ، منیرؔ، عام طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ باقی شعرا سے اُردو داں طبقہ عموماً واقف نہیں۔ اور اس لئے یہ مجموعہ اس لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے کہ ایسے شعرا جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، اس کی مدد سے منظر عام پر آگئے۔ اور اُن کے کلام کا منتخب حصہ ایک جگہ محفوظ ہو گیا۔

انتخابات میں صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ انتخابات کیسے ہیں۔ تو اس چیز میں ہمیشہ سے اختلافات رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہر شخص کا مذاق سخن جداگانہ ہے۔ اس لئے ایک شخص کا انتخاب ضروری نہیں کہ پورا کا پورا دوسرں کو پسند آجائے۔ جواہر سخن کے انتخابات، ان اختلافات کی روشنی میں دیکھنے کے بعد بھی اچھے خاصے معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب بڑے سائز کے ۲۲۷ صفحوں پر چھپی ہے۔ قیمت عہ ہے۔ اور ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

و ۔ ع

سررشتہ تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن نے اپنی مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ سے مندرجہ ذیل کتب تاریخ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے مرتب کرائی ہیں۔

۱۔ تاریخی کہانیاں	تیسری	جماعت کے لئے
۲۔ " "	چوتھی	" "
۳۔ تاریخ دکن	پانچویں	" "
۴۔ ہندوستان کی تاریخ	چھٹی	" "
۵۔ تاریخ ہند حصہ اوّل	ساتویں	" "

یہ سب کتابیں غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، ہر دور کی تہذیبی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، زبان سلیس ہے اور معیار طلبہ کی لیاقت کے مطابق۔

پہلی دو کتابیں ابتدائی جماعتوں کے لئے ہیں۔ ان میں ایسے اشخاص کی زندگی کا حال پیش کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں ہماری ملکی اور قومی زندگی میں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اخلاق، وعادات اور ان کی قومی حوصلہ مندیوں کو قصہ کے پیرایہ میں آسان اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بچوں کی اخلاقی زندگی اُن کی سیرت سے اثر لے۔ صرف ایسے حالات بیان کئے گئے ہیں جن کے ساتھ نوعمر بچوں کو قدرتی طور پر دلچسپی ہو، جو ان کے حافظہ پر بار نہ ہوں اور جو ان کے اندر تاریخی ذوق کی تعمیر کریں۔

تیسری کتاب دکن کی تاریخ پر ہے، اس کتاب میں موجودہ تحقیقات کی روشنی میں تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ انداز بیان دلچسپ ہے اور تاریخ کا تہذیبی پہلو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

چوتھی کتاب میں ہندوستان کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس بات کا خاص طور پر

خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ صرف جنگوں کی داستان نہ بن جاتے یا چند بادشاہوں کے حالات پر ختم نہ کر دی جائے بلکہ ہر دور کے تہذیب اور تمدن کی تصویر طلبہ کے سامنے آجائے۔

ساتویں جماعت کی کتاب میں مغلوں کی آمد تک ہندوستان کی پوری تاریخ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے، سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اشخاص کی سیرت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر دور کے تہذیب، تمدن اور علوم و فنون کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد وارتباط کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تمام کتابوں میں ہر سبق کے ختم پر سوالات اور مشہور تاریخیں دی گئی ہیں۔ سوالات ایسے ہیں جو طلبہ میں بات کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دیں گے۔ مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے وقت میں جب کہ ہماری قومی زندگی کی تشکیل ہو رہی ہے، جدید طرز پر تاریخی تحقیقات کو غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے مدرسوں کے نوعمر طلبہ کے سامنے پیش کر دیا۔ امید ہے کہ یہ کتابیں تمام ہندوستان کے مدرسوں کے لئے مفید ثابت ہوں گی اور یقین ہے کہ اِن کے مطالعہ سے بچوں میں شروع سے رواداری کے جذبات نشو ونما پائیں گے اور وہ مختلف مذہبوں کے اصول کی قدر کرنا سیکھیں گے۔

تاریخ سلطنتِ خداداد (میسور) - یہ کتاب محمود خاں صاحب بنگلوری کی تصنیف ہے، ۶۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا ایڈیشن اب سے چار سال قبل شائع ہوا تھا، اب مزید اضافہ کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بعد کی تاریخ سے عام ہندوستانی بڑی حد تک بے خبر رہے خصوصاً گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی تاریخ اوروں کے قلم سے لکھی گئی، وہی ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی گئی اور وہی ہمارے سامنے آئی۔ ظاہر ہے کہ اِن لکھنے والوں کو ہماری قومی اور ملکی تاریخ کی خوبیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور ان کے اپنے اغراض و مقاصد اس کی اجازت کب دے سکتے تھے کہ تعصب سے دور ہو کر واقعات کو سچائی کے ساتھ پیش کر دیں۔

ان کی تو یہ کوشش رہی کہ بدصورتی اور بدوضعی کے جتنے لوازمات ہیں سب ہی بھر دیے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدنما کارٹون کو ہم اپنی ہی تصویر سمجھنے لگے۔

تاریخ وہ سرمایہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثہ میں ملتا ہے اور اسی سے قومیں بنتی ہیں اسلاف کے ایسے کارناموں سے جن میں قومی مقاصد اور قومی حوصلہ مندیاں نمایاں ہوں تاریخی روایات قائم ہوتی ہیں اور انھیں روایات میں سے قومی جذبہ کی سوتیں جاری ہوتی ہیں۔ سلطان فتح محمد خاں ٹیپو کی شخصیت ماضی کی ان شخصیتوں میں سے ہے جو دنیا کے لئے جوانمردی، عزم و ہمت، قومی حمیت، آزادی اور حریت کا اپنے اندر سبق رکھتی ہیں۔

اس بطل حریت کے حالات ہماری زبان میں آج تک اس اہتمام کے ساتھ نہ لکھے گئے تھے محمود خاں صاحب ہمارے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سلطنت میسور کی تاریخ پر ساڑھے چھ سو صفحے لکھ کر تاریخ اور ادب دونوں پر احسان کیا۔ واقعات کی چھان بین میں انھوں نے کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ کتاب کو سلطنت میسور میں مسلمانوں کے آنے سے شروع کیا ہے اور سلطان ٹیپو کے عہد کے اختتام تک میسور کی مکمل تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ابتدا کے تقریباً دو سو صفحوں میں سلطان حیدر علی کے عہد کی تاریخ ہے، اس کے بعد ابوالفتح فتح محمد خاں ٹیپو سلطان کے عہد کے حالات و واقعات ہیں۔

مصنف نے اس زمانے کے سب سیاسی حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں جو پالیسی کارفرما تھی آج بھی ہندوستان کے اندر اور باہر وہی پالیسی کام کر رہی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں بیرونی تسلط کے اثرات، سلطان ٹیپو کی قومی عزت اور حمیت اور سلطنت میسور کے زوال کے اسباب کا تفصیل سے ذکر کر کے انھوں نے اپنے اس خیال کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ ایسے واقعات بیان کئے جائیں جو موجودہ حالات سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہوں اور جن کی تفصیل سے کوئی ذہنی فائدہ مرتب ہو۔ "انتظام سلطنتِ خداداد" کے تحت میں تقریباً ساٹھ صفحات میں انھوں نے اس عہد

کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بیان کرکے تاریخ کا یہ اہم مقصد کما حقہٗ انجام دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک باب "مزارِ سلطان پر عقیدت کے پھول" کے عنوان سے ہے۔ اس میں بعض مشاہیر ملک کی وہ نظمیں جو سلطان شہید کی یاد میں وقتاً فوقتاً لکھی گئیں، جمع کردی گئی ہیں اور جو سلطان کی سیرت اور اس کے عہد کی سیاسی حالت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

حق تلفی ہوگی اگر مصنف کی محنت کی داد نہ دی جائے۔ انھوں نے بہت محنت سے تاریخی مواد جمع کیا ہے اور ایسے دور میں جب کہ قوم میں تاریخی تحقیق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے اُن کی کتاب یقینی طور پر اس کی مستحق ہے کہ عام لوگ اس کا مطالعہ کریں اور مصنف کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں۔ (ق)

اقبال ۔ گو علامہ اقبال مرحوم کے کلام اور ان کے فلسفہ پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مقصد کی توضیح پوری طرح ہوچکی ہے جسے علامہ اقبال نے ملک کے سامنے پیش کیا۔ کاش اقبال کو بھی کوئی جانسن، باسویل یا حالی مل جاتا۔ ہم مایوس نہیں ہیں۔ اقبال کو مستقبل کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ مستقبل ہی اقبال کی صحیح تفسیر بھی پیش کریگا۔

البتہ اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں اقبال کی زندگی پر مجموعی حیثیت سے بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جسے محمد حسین خاں صاحب ایم، اے بی، ٹی (علیگ) نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اقبال کی مختصر سوانح عمری بیان کرکے جستہ جستہ ان عنوانات کو مع اشعار کے پیش کیا ہے، جو اقبال کے کلام میں نمایاں ہیں۔ مگر کتاب اتنی مختصر ہے کہ ہم اسے اقبال کے کلام اور فلسفہ کی "فہرست مضامین" سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ اس کے پڑھنے سے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کے کلام میں کس قسم کے موتی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ان موتیوں کی قیمت کیا ہے۔ کتاب کی چھپائی ناقص ہے۔ اور قیمت ۱۲ ار ہے۔

خورشید اینڈ برادرز نمبر ۱۰۹۹ فراشس خانہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

راز و نیاز۔ حبیب اشعرؔ صاحب دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ گو "عرضِ مصنف" میں شاعر نے کہیں تذکرہ نہیں کیا مگر اشعار کی سلاست اور مضامین کے ستھرے پن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حبیب صاحب نے اپنے کلام کا بہت مختصر حصہ شائع کیا ہے۔ کل اڑتالیس صفحوں کی کتاب ہے جس میں تمام تر غزلیں ہیں۔ آخر میں دو صفحوں پر "متفرقات" کے عنوان سے چند اشعار دیدیے گئے ہیں۔

کلام میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اشعار کی سادگی ہے۔ زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے اور غالباً یہ مصنف کی کوشش کا کامیاب نتیجہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

صاف و رنگین و دلاویز اشعار
کیا کہے گا کوئی اشعرؔ کی طرح

دائرۃ الادب محلہ رودگران دہلی اور منزل بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۳ بلی ماران دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

شمع ازل۔ اقبال کا اثر اردو لٹریچر پر جتنا گہرا پڑا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اگر ایک طرف معنی پسند طبیعتیں اپنے غور و فکر میں گہرا فلسفیانہ رنگ اختیار کرنے لگیں تو دوسری طرف شعرا کے ایک بڑے گروہ نے بھی اس میدان کو اپنی جولانگاہ بنانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ جس کی شاہ راہ کا اقبال نے افتتاح کیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس میدان میں اگر ایک طرف جوش کے ایسے مذہب کے باغی شاعر ہم کو نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اثرؔ زبیری ایسے پرستاران مذہب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں آثر زبیری صاحب نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سب کا موضوع مذہبی بزرگوں کے کارنامے اور اسلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جن کے انداز بیان میں اقبال کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے "پیش لفظ" میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے اثر صاحب کی اس کتاب پر ایک نظر ڈالی ہے اور جستہ جستہ اشعار بھی پیش فرمائے ہیں۔

آثر صاحب نے بڑے کامیاب انداز میں ان مضامین کو "شعریت" کے رنگ و بو سے مالامال کیا ہے جن کی خشکی اردو کے تر دامن شعرا کے لئے اکثر "وجہ اعتذار" بنی رہی۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم

کی فوجیں فارس فتح کرنے کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ اور شاعر اس روانگی پر خوش ہوکر "سامان نشاط" کے نام سے ایک نظم لکھتا ہے جس کی ابتدا ملاحظہ فرمائیے۔

لے کے آیا ہوں عجب شان سے سامانِ نشاط
داورِ حشر سے باندھے ہوئے پیمانِ نشاط
قلزمِ عیش کی اٹھتی ہوئی موجوں کی قسم
فرش سے عرش پہ جانے لگا سامان نشاط

اس طرح کی نظمیں آثر صاحب نے بہت پر اثر اور والہانہ انداز میں کہی ہیں۔ ایک آدھ جگہ ہنگامی اور مقامی سیاست سے بھی متاثر ہوکر کچھ فرمایا ہے لیکن ایسی نظمیں اس کتاب میں کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً "جنگِ حبشہ" "فرانس کے مظالم" "حرم لکھنؤ" "کاغذی اصنام" "دار المبلغین لکھنؤ" وغیرہ

آثر صاحب اگر اس قسم کی تمام نظموں کو ایک علیحدہ عنوان کے ماتحت کردیں تو کتاب کی ترتیب نسبتاً بہتر ہو جائے گی۔

صفحات کی تعداد ۲۲۶ ہے جس میں ۷۵ نظمیں ہیں۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ۔ زبیر منزل۔ پاٹا نالہ۔ لکھنؤ

ص۔ ا۔ ص

معارف جمیل،" از قاآنی ہند" حکیم آزاد انصاری۔ ناشر محمد تراب علی خاں باز۔ بازار گھانسی حیدر آباد دکن۔ قیمت غیر مجلد ۸؍ مجلد ۱۲؍

یہ حکیم آزاد انصاری صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں تقریباً ۱۰ صفحے کا اپنا تعارف لکھا ہے: الطاف احمد مشہور نام۔ نظیر حسین تاریخی نام۔ ابوالاحسان کنیت۔ آزاد تخلص۔ والد کا اسم گرامی

محمد حسن خلف امیر احمد۔ سکونت سہارن پور خاص۔ محلہ شاہ ولایت۔ نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔"

اپنی خصوصیات شاعری یوں بیان کی ہیں۔

"ہر شاعر اور بالخصوص حقیقی شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ہم بھی اسی پنجاہ سالہ کوشش و مشق سے اپنی شاعری میں بری بھلی چند خصوصیات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ انھیں ہماری اختیار کردہ خصوصیات نے ہماری سعی و کوشش سے مل کر ہم کو اپنا رنگ خصوصی پیدا کرنے میں مدد دی ہے وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کلام کی اصلی ترتیب۔ ۲۔ سلاست و صفائی زبان۔ ۳۔ ندرت بیان
۴۔ تکرار الفاظ حسین۔ ۵۔ صنعت ترصیع و تقابل۔ ۶۔ صنعت ترصیع جدید کی ایجاد۔ ۷۔ شعر میں اصطلاحات علمیہ کا استعمال"

مثالیں یہ دی ہیں۔

۱۔ محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری — محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
اُسی بیم و رجا میں ہوں، اسی دُہری بلا میں ہوں — وہی تو اور جفا تیری، وہی میں اور وفا میری

۲۔ تو ہو اور تیری زلفہائے رسا — میری قسمت رسا نہیں، نہ سہی
آپ کا تو پتہ لگا لیا، لیکن — اب جو میرا پتہ نہیں، نہ سہی
زلفوں والو! یہ اندھیر — دہرے دہرے کالے ناگ
میرا سر اور تیرا در — دھن مری قسمت، دھن مرے بھاگ

۳۔ چارہ ساز زخم دل! درمانِ زخم اچھا کیا! — زخم کی سب لذتیں مجروح درماں ہو گئیں
مطرب نغمہ نگار ہو۔ ساقیؔ بادہ بار ہو — زہرہ نوا نگار ہو۔ میکدہ زا بہار ہو

۴۔ آرزوئے بہار جنت ہے — آرزوئے بہار جلوۂ روح

جستجوئے دیار وحدت ہے — جستجوئے دیار جلوۂ روح
۵۔ نام خدا جدھر گئے دل میں اتر اتر گئے — خنجر آبدار ہو۔ دشنۂ تابدار ہو
رفع ملال چاہیئے کچھ تو خیال چاہیئے — روح تن فگار ہو۔ راحت جان زار ہو
۶۔ قدر و قیمت فصل طیار شباب — حسن وصحت نقدوستار شباب
عزم و ہمت خادم کار شباب — تاب و طاقت کفش بردار شباب
۷۔ پرستش کے قابل ہو، تحقیق ہے — تصور کے ہمراہ تصدیق ہے
وہ مجھ سے قریب اور میں اس سے دور — مری، جمع، بھی رشک تفریق ہے

دراصل آزاد انصاری صاحب پرانے رنگ کے شعرا میں سے ہیں۔ بیدل سہارن پوری اور حالی کے شاگردوں سے ہیں۔ کثرت مشق سے نشست الفاظ اور بندش پر اچھی قدرت بہم پہنچالی ہے معنویت کچھ تو اپنی حدود کی بنا پر اور کچھ مناسبت طبع لفظی خوبیوں کی طرف ہونے کی وجہ سے میسر نہ آئی۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں ریاست حیدر آباد میں قدر ہے۔ جو مسلسل غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں وہ کافی اچھی ہیں۔

یاد ایام کہ عالم غیرت میخانہ تھا — نظم ہستی تحت نظم نرگس مستانہ تھا
جو جبیں تھی حاصل انوار محبوبانہ تھی — جو حسیں تھا صاحب انداز معشوقانہ تھا
وہ امنگیں تھیں کہ بے شغل طرب بنتی نہ تھی — وہ ترنگیں تھیں کہ بے بادہ کشی چارہ نہ تھا
دن کو فکر سخن خوشی تھی اور بے باکانہ تھی — شب کو شغل میکشی تھا اور آزادانہ تھا
ایک جانب مطربوں کے نغمہ ہائے مست تھے — ایک جانب مغبچوں کا رقص سرشارانہ تھا
کون سی وہ رات تھی جو کیف کی حامل نہ تھی — کون سا وہ روز تھا جو لطف سرتا پانہ تھا
جو عطا تھی بے حد و عد جو کرم تھا بیحساب — ہر سلوک دوست میرے ساتھ فیاضانہ تھا
کچھ نہیں معلوم کیوں مجرم نہ گردانا گیا — میں کہ جو مجموعہ افعال گستاخانہ تھا
اب کوئی کیونکر دکھا سکتا ہے کیا کیا لطف تھے — اب کوئی کیونکر بتا سکتا ہے کیا تھا کیا نہ تھا

ماحصل یہ ہے کہ میں تھا اور نشاط جاوداں   مختصر یہ ہے کہ میں تھا اور غم جانانہ تھا
آہ آزاد! اب وہ ہم باقی نہ وہ لطفِ حیات   "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

غزلوں کے بعد کچھ نظمیں بھی ہیں جس میں "چاند سے جھڑپ" خاصی ہے۔ اردو رباعیات اور چند فارسی رباعیات کے منظوم ترجمے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت معمولی ہے۔

انتخاب الہلال۔ ادبستان۔ چابک سواران اسٹریٹ۔ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین "الہلال" کا انتخاب ایک اشد ضرورت تھی جو ادبستان لاہور نے پوری کی ہے۔ اس انتخاب میں سترہ مضامین ہیں اور ایک نظم "تنزل اسلام کا سبب اصلی"۔

مولانا ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کے متعلق کچھ لکھنا یہاں پر بیکار ہے۔ انتخاب البتہ زائد تر مذہبی مضامین کا ہے۔ اگر اس میں سیاسی مضامین بھی شامل ہوتے تو بہتر تھا۔ ناشرین دوسری جلد میں اگر اس کا خیال رکھیں تو بہتر ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد ۱؎

رسالہ جات

مسافر۔ ماہوار ادبی رسالہ ہے جو تھوڑے عرصے سے کوکب مرادآبادی کی زیر نگرانی اور زیر ایڈیٹری مردہ عادل ادیب صاحبان کی زیر ادارت مرادآباد سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین خاصے ہیں۔ کاغذ خراب لگا ہے۔ خدا کرے قائم رہے۔ چندہ سالانہ عہ؍

نور التعلیم۔ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کا ماہوار رسالہ ہے جو ناخواندہ بالغوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تعلیم بالغان ہندوستان کی جہالت مٹانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر اس طرح بہت سے اور رسالے نکلنا شروع ہوجائیں تو ملک کو بہت جلد فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نگراں۔ نثار اللہ خاں صاحب ایم، اے

قیمت سالانہ ایک روپیہ عہ؍

نقشہ جات

نقشہ حبش، نقشہ افغانستان و سرحدی صوبہ نقشہ وزیرستان،	یہ نقشے خالد کمپنی دہلی نے انگریزی اور اردو میں تیار کئے ہیں۔ علاوہ صفائی اور درستی کے الگ گوشہ میں ان مقامات کی آب

وہوا، آبادی، مذاہب، زبانیں، پیداوار، معدنیات، ذرائع نقل و حمل اور مختصر تاریخ وغیرہ پر مفید اور مختصر معلومات بھی بہم پہنچائی ہے۔ نقشے بہت اچھے ہیں۔

حبش کے نقشے کا سائز ۳۴ × ۲۴ ہے اور قیمت ۱۰/ ہے۔

وزیرستان اور افغانستان و صوبہ سرحد کے نقشوں کا سائز ۳۰ × ۲۰ ہے۔

اور قیمت ۱۲/ اور ۸/ علی الترتیب ہے۔

انشائے سلمٰی۔ (عصمت بکڈپو دہلی) لڑکیوں کو خط و کتابت سکھانے کے حق میں یہ رسالہ ایک اچھا رہنما ہے، اولاً کتابت اور اردو زبان کی خطوط نویسی پر ایک دلچسپ اور مفید نوٹ ہے، اس کے بعد خطوط کے مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور القاب و آداب کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ مبتدیوں اور خاص کر لڑکیوں کے لئے خطوط نویسی کے باب میں یہ رسالہ ایک اچھا معلم ثابت ہو سکتا ہے۔ خطوط نویسی کے تمام ابتدائی اصول اور اصطلاحات اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ان حیثیات سے یہ خطوط نویسی سکھانے والی کتابوں میں ایک خاص درجہ اور بعض پر ایک مخصوص فوقیت رکھتا ہے۔ لکھائی۔ چھپائی معمولی۔ قیمت ۶/

مضامینِ محمد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی۔ اے آنرز فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں ان کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست، چند اوراق بربند
۲۔ مسائل ملی: سنت ثانویہ اور سنت محمودیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند
۴۔ مسلمان اور کانگرس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس
۹۔ مسلمان اور آزادی
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۔۔ صفحات مجلد قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی